قدیم سندھ

از:

بھیرومل مہرچند آڈوانی

مترجم:

مختیار احمد حاجانو

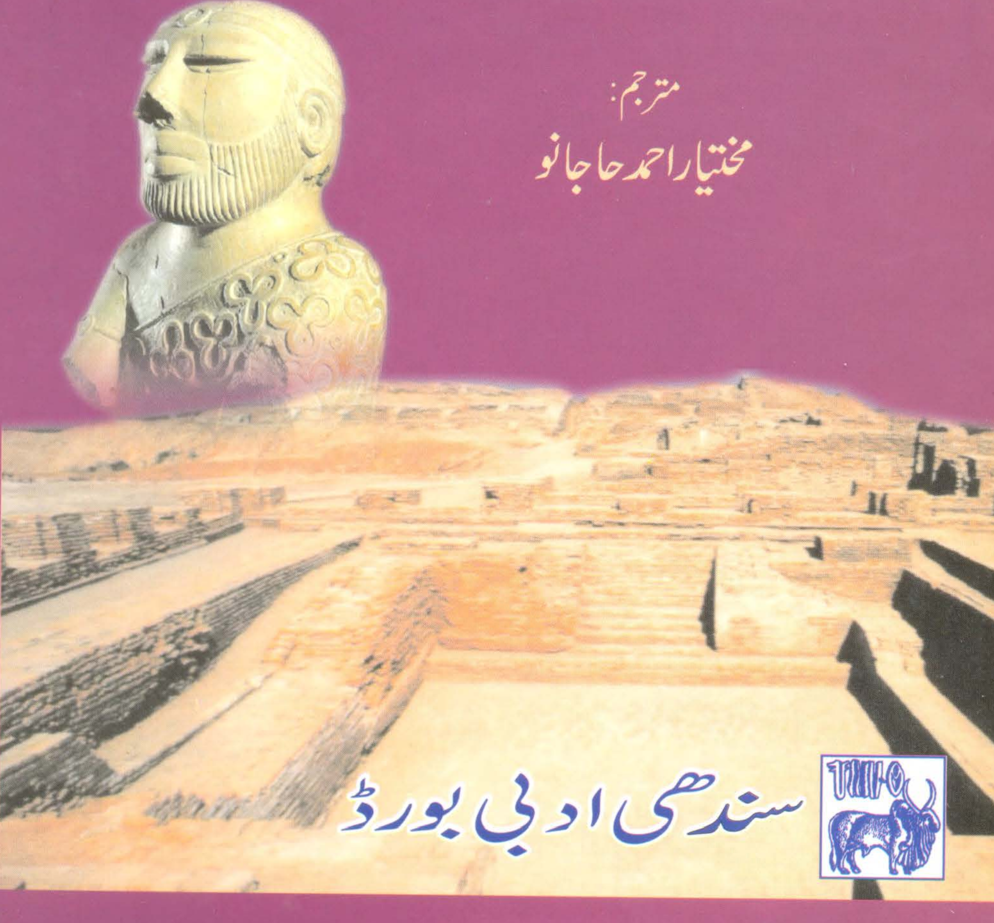

سندھی ادبی بورڈ

قدیم سندھ

از:

بھیرومل مہرچند آڈوانی

مترجم:

مختیار احمد حاجانو

سندھی ادبی بورڈ

جامشورو سندھ

2007ء

[کتاب ہٰذا کے جُملہ حقوق سندھی ادبی بورڈ کے پاس محفوظ ہیں]

اشاعت اول　　　سال 2007ء　　　تعداد ایک ہزار

قیمت: تین سو روپے
[Price Rs. 310-00]

خریداری کیلئے رابطہ:

سندھی ادبی بورڈ کتاب گھر

تلک چاڑھی، حیدرآباد سندھ
(Ph: 022-2633679, Fax: 022-2771602)
Email Address: sindhiab@yahoo.com
Website: www.sindhiab.com

یہ کتاب ذکی پرنٹرز کراچی میں چھپی اور اعجاز احمد منگی سیکریٹری سندھی ادبی بورڈ، جام شورو نے اسے شائع کیا۔

فہرست مضامین

صفحہ	مضامین
۱۲	پبلشر نوٹ
۱۳	دیباچہ............ بھیرومل مہرچند
۲۱	قدیم ہندستان کی تاریخ کیسے بنی
۲۱	زبانوں پر تحقیق
۲۲	تاریخ پر تحقیق
۲۳	دیو مالائی کہانیوں پر تحقیق
۲۷	آریوں کا اصل وطن
۳۰	ملک مصر اور مغربی ایشیا میں آریوں کی بیٹھکیں
۳۵	ویدک زمانے کی ابتدا
۴۱	تاریخ کا مرتب ہونا
۴۲	ذخیرہ برائے تاریخِ سندھ
۴۷	''ہندھ'' اور ''سندھ'' ناموں سے متعلق غلط فہمیاں
۴۹	سندھو نام اور اس کے معنی
۵۰	''ہندو'' اور ''ہندستان'' کے معنی
۵۲	تہذیب کے اوائلی مقامات
۵۴	**باب - ۱:** تاریخ سے پہلے کا زمانہ
۵۴	قدیم سندھ کا جنم
۵۵	قدیم سندھ کے اصل باشندے
۵۶	کول اور سنتھال کہاں سے آئے
۵۷	قدیم تہذیب کی ابتدا
۵۸	قدیم تہذیب کا مرکز
۵۹	کولوں کا مزید تذکرہ

باب- ۲: دراوڑوں کا زمانہ ۶۴
سندھ میں دراوڑ ۶۴
دراوڑ کہاں سے آئے؟ ۶۶
ٹھٹہ اور روہڑی کی تہذیب ۶۷
تہذیب کے ادوار ۶۹
ٹیلوں میں دبی ہوئی تہذیب ۷۰
باب- ۳: مہن جو دڑو اور اس کی کھدائی ۷۲
سرزمین کا تذکرہ ۷۲
تباہی کے اسباب ۷۳
مقامی روایت ۷۳
ٹیلے کی کھدائی ۷۴
چار زمانوں کی عمارتیں اور دریافت شدہ چیزیں ۷۵
باب- ٤: مہن جو دڑو والی عالیشان تہذیب ۷۹
وادیٔ سندھ کی قدیم تہذیب: شہر کے اوپر شہر ۷۹
شہر کا نمونہ ۷۹
عمارتیں ۷۹
مکانات ۸۰
پنچایتی ھال ۸۰
مندر ۸۰
دکان ۸۱
بڑا تالاب ۸۱
کنویں ۸۱
نالیاں ۸۱
حفظ صحت ۸۲
شکل اور شبیہ، لباس اور زیور ۸۲
لباس ۸۳
زیور ۸۳
قیمتی پتھر ۸۴
کھیتی اور دیگر ہنر، فصل ۸۴
خوراک ۸۴

کاتنے اور بُننے کا ہنر ۸۴
دھات ۸۵
ہتھیار ۸۵
باٹ اور پیمانے ۸۵
کمہاری ہنر اور کاشیگری ۸۵
سنگتراشی اور کندہ کاری ۸۶
مہریں ۸۶
فنِ تحریر ۸۶
کھیل اور کھلونے ۸۷
طبابت اور ادویات ۸۷
گھریلو زندگی ۸۷
قدیم سندھیوں کا مذہب دیوی کی پرستش ۸۸
شِو کی پوجا ۸۸
درختوں کی پرستش ۸۸
جانوروں کی پرستش ۸۸
پانی کی پرستش ۸۹
تہذیب کی قدامت ۸۹
قدیم سندھیوں کے تعلقات ۹۰
تہذیب کے بانیکار ۹۲
تحقیقات کا حاصل مطلب ۹۳
مہن جو دڑو کی اہمیت ۹۴
مصنف کی شخصی رائے ۹۴
باب۔ ۵: آریوں کا قدیم احوال ۹۶
آریہ لوگ کہاں سے آئے؟ ۹۶
آرکٹک ریجن یا قطب شمالی کا تذکرہ ۹۷
مذہبی کتب سے حوالے ۹۸
بولی سے ثبوت ۱۰۱
میرو پربت کا تذکرہ ۱۰۳
قطب شمالی کی طرف ہندوؤں کی حکومت ۱۰۸
آریوں کے علحدہ ہونے کی وجہ ۱۱۱

آریوں کا پھیل جانا	۱۱۳
ہندوؤں اور پارسیوں کا قریبی ناطہ	۱۱٦
بزرگوں کے نام	۱۱۷
دیوتاؤں کے نام	۱۱۹
پارسیوں کے مذہب کی بنیاد	۱۲۱
ہندوؤں اور پارسیوں میں انبنت	۱۲۳
اِندر دیوتا کی پوجا پر جھگڑا	۱۲۴
پارسی ہندستان میں واپس کیسے آئے؟	۱۲۷
آریوں کے وادئ سندھ کے اصل باشندوں کے ساتھ جھگڑے	۱۲۸
آریوں کی تہذیب کا پھیلاؤ	۱۲۹
ہندوؤں کی ملی جلی تہذیب	۱۳۰
دراوڑوں سے متعلق غلط فہمیاں	۱۳۱
باب- ٦: رگ وید والا زمانہ	۱۳۴
دریائے سندھ کا تذکرہ: سندھ میں سندھو کی تعریفیں	۱۳۴
زنداوستا میں سندھو کا تذکرہ	۱۳٦
باب -۷ : آریوں کے خاندان اور بیٹھکیں	۱۳۹
رگ وید والا ہندستان	۱۳۹
سندھ میں سورج ونسی	۱۴۰
چندرونسی آریوں کے خاندان	۱۴۲
سندھ میں جادو ونسی	۱۴۳
دوسرے آریوں کی بیٹھکیں	۱۴۴
آریوں کی زبان میں تبدیلی	۱۴۵
مذہبی ریتوں رسموں میں فرق	۱۴٦
لُنگ کے پوجاری	۱۴٦
باب- ۸: آریوں کی تہذیب کا اوائلی احوال	۱۴۸
تہذیب کے تین زمانے	۱۴۸
(ڈُتھ) اور شکار	۱۴۸
ہتھیار	۱۵۰
غلے رکھنے کا رواج	۱۵۴
قدیم سندھیوں کی دولت (مال مویشی)	۱۵۷

گوٹھ اور چراگاہ	۱۵۸
مال مویشی کی چوری	۱۶۰
ایک ہانڈیہ یا مشترکہ خاندان کے رواج کی بنیاد	۱۶۰
گوتر اور گھرانے	۱۶۱
سگوتر اور سپنڈ	۱۶۲
کھیتی	۱۶۴
باب- ۹: سماجی ڈھانچہ اور بادشاہتیں	۱۷۲
دیہی پنچائتیں	۱۷۲
جرگے	۱۷۴
صوبوں کی پنچائتیں	۱۷۶
مکانی حکومتیں	۱۷۶
سیاسی تنظیم سازی	۱۷۶
راجائی کی بنیاد	۱۷۷
راجا کے فرائض اور اس کی خودمختیاری میں رکاوٹیں	۱۷۹
براہمن کا زور	۱۸۰
راجاؤں کا انتخاب	۱۸۳
راجا کی تاجپوشی	۱۸۴
سبھا اور سمتی	۱۸۵
شہر اور عالم پناہ	۱۸۷
راجاؤں کے محلات	۱۹۰
سلطنت شاہی	۱۹۰
دش راجن	۱۹۱
سندھ میں پنچالون کی حکومت	۱۹۶
باب-۱۰: آریوں کی گھریلو زندگی اور عقائد	۲۰۰
گھر کی بنیاد	۲۰۰
رواجی لوگوں کے گھر	۲۰۱
گھر و انتظام	۲۰۴
رشتیدار اور اولاد	۲۰۵
بیٹیوں کی فکر اور رخصتی	۲۰۸
رشتیداری اور شادی بیاہ	۲۰۹

شادی کی رسم	۲۱۱
سسرال کے گھر پرویش	۲۱۵
پردھان آہوتی یا بڑا ہوم	۲۱۶
تین راتیں برہمچریہ	۲۱۸
بیویوں کا مرتبہ	۲۱۹
گھریلو زندگی	۲۲۰
گھر کا سامان اور برتن	۲۲۴
زمین میں دولت دفن کرنے کا رواج	۲۲۵
کھانا پینا	۲۲۵
آگ جلانے کا ہنر	۲۲۸
نشیدار چیزیں	۲۳۰
پوشاک	۲۳۳
زیور	۲۳۸
بالوں کی سجاوٹ	۲۳۹
راگ اور موسیقی کے آلات	۲۴۰
ناچ	۲۴۳
جھولے	۲۴۴
میلے اور جلسے	۲۴۴
گھوڑے سواری اور گھوڑوں پر شرطیں	۲۴۴
پانسہ کھیل	۲۴۵
جواری کا ارمان	۲۴۷
بیوی کے زندہ ہوتے ہوئے دوسری بیوی لانے کا رواج	۲۴۸
اولاد کا ماں کے نام پیچھے پکارا جانا	۲۵۰
مردوں کا دوبارہ شادی کرنا	۲۵۱
ودھوا بیاہ (بیوہ کی شادی)	۲۵۲
نیوگ	۲۵۳
ستی	۲۵۵
مُردوں کو ٹھکانے لگانا	۲۵۶
جم اور جم پری	۲۵۸
جونیاں اور کرم	۲۵۹

باب-11: اہم دھندے، ہنر اور کاریگریاں ۲۶۱
اہم دھندے ۲۶۱
طبابت اور جراحت ۲۶۴
جھاڑ جھپاڑ اور ٹونے ٹوٹکے ۲۶۷
جنگی سپاہ ۲۶۸
جنگوں کے اسباب اور سپاہیوں کے ساج ۲۶۸
باب-12: تجارت اور بیرونی ممالک میں بیٹھکیں ۲۷۰
قدیم سندھ کے تاجر ۲۷۰
بحری یا سمندری تجارت ۲۷۲
چار سمندروں کا ذکر ۲۷۵
بنگال اور چین کے ساتھ تجارت ۲۷۶
جنوبی ہندستان اور سلون سے تعلقات ۲۷۷
ملبار سے تجارت اور اس کا زبان پر اثر ۲۸۱
خلیج ایران، مغربی ایشیا اور مصر سے تجارت ۲۸۱
میسوپوٹیمیا کی طرف بیٹھکیں ۲۸۳
سندھ کی مغربی ممالک میں مشہوری ۲۸۵
سندھ کا نام ایرانیوں اور یہودیوں سے یونانیوں نے بھی سنا ۲۸۷
قرضہ اور سُود ۲۹۱
سکے ۲۹۲
باب-13: زبان، آئیوپٹا اور ساہت ۲۹۳
تہذیب کا وسیلہ زبان ۲۹۳
سنسکرت اور اس کی اقسام یا درجے ۲۹۳
''سنسکرت'' لفظ کے معنی ۲۹۶
سنسکرت'' اور ''دیوناگری'' ناموں پر غور ۲۹۶
سبت رشی امر ہیں ۲۹۷
فنِ تحریر ۲۹۸
تحریر کے قدیم دستور یا نمونے ۳۰۰
دیوناگری کا پھیلاؤ ۳۰۲
موجودہ دیسی رسم الخط ۳۰۶
ویدک ساہت ۳۰۷

ویدک ساہت کے دو حصے ہیں	۳۰۷
ویدوں کے منتروں کی تقسیم	۳۰۹
ویدوں کے حصے۔۔ سنہتا اور براہمن	۳۱۰
ویدوں کا مضمون	۳۱۲
رگ وید	۳۱۲
یجر وید	۳۱۲
سام وید	۳۱۳
اتھرو وید	۳۱۳
منتر پڑھنے کا مقصد	۳۱۴
ویدوں کے براہمن	۳۱۵
آرنیک اور اُپنشد	۳۱۵
اہم براہمن گرنتھ اور اہم اُپنشد	۳۱۶
اُپوید	۳۱۷
پانچواں وید۔۔ اتہاس اور پران	۳۱۸
اتہاس	۳۱۹
پران	۳۱۹
باب-۱۴: علم اور تعلیم کا انتظام	۳۲۱
چار پرشارتھ	۳۲۱
تعلیمی نظام	۳۲۲
تعلیم نسواں	۳۲۴
گروکل اور آشرم	۳۲۴
منی اور وراٹیہ	۳۲۶
کگول ودیا اور جوتش کا مطالعہ۔۔ وقت ناپنا	۳۲۷
باب-۱۵: نیتی یا اخلاق	۳۲۹
دان پنج	۳۲۹
مہمان نوازی	۳۳۰
اخلاق کی خوبی	۳۳۰
جرم اور سزائیں	۳۳۲
اکثر جیسا گناہ ویسی سزا	۳۳۳
ست کی مہما	۳۳۴

باب-۱۶ : سناتن دھرم ۳۳۵
''دھرم'' لفظ کے معنی ۳۳۵
دھرم کا خیال کیسے پیدا ہوا؟ ۳۳۵
ہندو مذہب اور اس کا اوائلی وطن ۳۳۶
ہندوؤں کے دیوتا ۳۳۷
آکاس اور پرتھوی۔۔ماں باپ ۳۳۷
ادتیہ اور دیئت ۳۳۸
ورن دیوتا ۳۳۹
اِندر دیوتا اور ورتر دیئت ۳۴۰
اِندر بڑا یا ورن؟ ۳۴۲
وایو، مروت اور ردر ۳۴۳
اگنی دیوتا ۳۴۳
سورج دیوتا ۳۴۵
اُشا دیوی ۳۴۷
دیگر اہم دیوتا ۳۴۸
دیوتاؤں کی تعداد ۳۴۹
کثرت میں وحدت ۳۴۹
ویدک دھرم کس زمرہ میں شمار کیا جائے؟ ۳۵۰
ٹھاکروں کی مورتی ۳۵۱
یگیہ، پوجا اور نذرانہ ۳۵۱
پرش میدھ یا نر قربانی ۳۵۴
بلی دینا/بلیدان کرنا ۳۵۷
ہندو تہذیب کے بانیکار ۳۵۸
قدیم اور جدید تہذیب کا مقابلہ ۳۶۰

☆

پبلشر نوٹ

تاریخ کے تمام ادوار میں ترجمے کو بہت اہمیت حاصل رہی ہے، جدید دور میں ہم عالمی ادب، عالمی سیاسی و صحافتی ادب کے تمام موضوعات تک رسائی تراجم کے ذریعے ہی حاصل کرسکتے ہیں۔ سندھی ادبی بورڈ کو بھی اس بات کا اچھی طرح سے ادراک ہے کہ سندھی ادب اور تاریخ کو ترجمے کے ذریعے فروغ دیا جائے۔ اسی ہی مقصد کے تحت سندھی ادبی بورڈ نے سندھ کے تاریخ کے کتب کے انگریزی اور اردو میں تراجم کو چھپوانے کا نیا سلسلہ شروع کیا ہے۔

کتاب ''قدیم سندھ'' ماہر لسانیات اور تاریخ نویس بھیرومل مہرچند آڈوانی کی ایک بہت ہی اہم تصنیف ہے، یہ کتاب سندھ کی قدیم تاریخی گوشوں کو قدر تفصیل کے ساتھ منور کرتی ہے، اس کتاب میں قدیم سندھ کا زرعی و تجارتی نظام، سندھی زبان، رسم ورواج، شادی بیاہ، سماجی قوانین، جرم و سزا کے قوانین، مختلف انسانی نسلوں کا سندھ میں اجماع، قدیم آریائی مذہب، جس میں پورا پنجاب شامل تھا، اس کے قدیم سماجی خاکی تصویر پیش کرتی تھی، سندھی ادبی بورڈ نے یہ بیڑا اُٹھایا اور الحمدللہ ہم اس میں کس قدر کامیاب رہے ہیں اس کا اصل اندازہ قارئین لگا سکتے ہیں۔ بھیرومل آڈوانی نے اس کتاب ''قدیم سندھ'' کو کلاسیکل سندھی میں تحریر کیا تھا، جس کا قدرے سلیس اردو میں ترجمہ کروانے کا سہرا جناب مختیار احمد حاجانے کے سر پر سجتا ہے، کہ انہوں نے مشاق مترجم کی طرح سے اس کتاب کا ترجمہ کیا ہے۔ سندھی ادبی بورڈ نصف صدی سے زیادہ عرصے کے دوران سرزمین سندھ کی لوک روایات اور اس دھرتی کی اصل تاریخ اور ان علمی و ادبی جواہرات کو منظر عام پر لانے کی مستقل جستجو میں محو رہا ہے اور اس وقت ہم یہ اردو اور انگریزی تراجم کی صورت پوری دنیا تک پہنچانے کا فرض ادا کیا جائے۔ اس سلسلے میں سندھی ادبی بورڈ تاریخ اور لوک ادب کے شہپارے اردو ترجمے کی صورت میں منظرعام پر لارہا ہے۔ زیرنظر کتاب اس تاریخی سلسلہ کی کڑی ہے، بہت جلد دیگر کتابیں باذوق اور اہل نظر قارئین کے خدمت میں پیش کی جائیں گی۔

جام شورو، سندھ
منگل ۲۰- ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ
بمطابق 8- مئی 2007ع

اعجاز احمد منگی
سیکریٹری
سندھی ادبی بورڈ

دیباچہ

سندھ دیس جتنا خود قدیم ہے اتنا ہی اس کا نام قدیم ہے۔ رگ وید جیسے قدیم کتاب میں بھی اس کا یہی نام درج ہے، گویا کہ کہا جا سکتا ہے کہ پوری دنیا کے ادب میں اس سے پہلے کوئی اور نام ہے ہی نہیں۔ ہماری سندھ ہی ہے، جس میں تہذیب کا سورج اس قدیم زمانہ میں طلوع ہوا تھا، جس زمانہ میں دنیا کی کئی ایک قومیں ابھی موسم سرما کی رضائی اوڑھے ہوئے سوئی ہوئی تھیں، اور بعد میں جا کر بیدار ہوئیں، تب بھی بہت عرصے تک سندھ کی نفیس ململ سے اپنا جسم ملبوس کرتی تھیں۔ یہ رواج مغربی ایشیا، ملک مصر، بحیرۂ روم کے ساحلوں، بلکہ یورپ میں کئی مقامات پر تھا۔ ان سب مقامات پر ہندو تہذیب کا پھیلاؤ بھی کسی قدر ہماری وادئ سندھ کے باشندوں نے کیا۔ یہی باتیں ثبوتوں اور اسناد کے ساتھ اس کتاب میں درج کی گئی ہیں۔ یہ دور دراز کے حصے تو کیا، خود پورے برصغیر ہند میں پہلے پہلے وادئ سندھ ہی تھی، جس نے رگ وید والے قدیم زمانے میں ہی اپنے اعلیٰ درجے کی تہذیب اور مالداری کی وجہ سے اتنا نام کمایا کہ بعد میں ساری ہندو قوم اور پورا ہندستان اسی کے نام پیچھے پکارے جانے لگے۔ اس نے یہ مہر ہندستان پر ایسی لگا دی ہے جو کبھی بھی کسی کے مٹانے کی نہیں۔

رچي جي ريتو ٽيا، ڪين اُباتجن اوءِ،
ڪنيو نه ڪاري تنهن ڪي، جو هالاري هوءِ،
توڙي ڌوبي ڌوءِ، ته به لعلي ان جي نه لهي.
(شاهه)

[نہ ہوگی ماند اس کی سرخ روئی
رہے گا دھل کے بھی رنگین کپڑا]
(شیخ ایاز)

ویدوں میں رگ وید سب سے پرانا وید ہے، جس کے دسویں منڈل کی پچہترویں سُوکت میں اسی قدیم زمانے کے ایک رشی نے اسی وقت ہی سندھ کی تہذیب اور مالداری کی تعریف کے گن گائے ہیں! ویدوں کے بعد ہندوؤں کے اتہاس اور پران ہیں، اور پھر ان کے بعد بدھ مت اور جین مت والوں کے دینی پُستک ہیں۔ ان سب دینی کتب میں بغور نظر ڈالیں گے تو دیکھنے میں آئیگا کہ ان میں سندھ کی کوئی نہ کوئی ناموس لکھی ہوئی ہے۔ گوتم بدھ سے بہت بعد میں، اور سکندر اعظم سے تھوڑا ہی وقت پہلے کے احوال دیکھے جائیں تو بھی یوں ہی معلوم ہوتا ہے کہ سندھ دیس نے دور دراز ملکوں میں ایسی شہرت پالی تھی کہ ایران، اسیریا، بابل (بئبلونیا) بلکہ یورپ کی کچھ قوموں کو اس وقت بھی علم تھا کہ سندھ ایک بخت آور دیس ہے، اور اسی لئے ایرانیوں اور یونانیوں کا منہ پانی پانی ہو رہا تھا کہ کسی بھی طرح خزانوں سے بھرا ہوا یہ دیس اپنے قبضے میں لے لیا جائے۔ یہی ایک اہم وجہ تھی، جس کے لئے وقت بوقت بیرونی قومیں سندھ پر اس طرح آ کر ٹوٹتی تھیں، جس طرح ملا لوگ حلوے پر اکٹھے ہو جاتے ہیں!

دور کی باتیں چھوڑ کر قریب کی باتوں پر غور کریں: ۱۹۲۲ع میں آرکیالاجیکل محکمہ والوں کی کدال کی ایک ہی ضرب مہن جو دڑو پر لگی، تو ایسی حیرت انگیز حقیقتیں زمین کے شکم سے نکل کر نمودار ہوئیں، کہ ان سے دنیا کے بڑے بڑے علماء کی آنکھیں کھل گئی ہیں، اور اب جوق در جوق لوگ دور دراز علاقوں سے چل کر مہن جو دڑو کے درشن کے لئے آتے ہیں۔

یہ ساری باتیں ہم سندھیوں کے لئے باعث فخر ہیں۔ اپنے وطن پر فخر، حب الوطنی کی ایک اہم خوبی ہے۔ یہی خوبی ہم میں بڑھ کر، ہمیں سچا وطن دوست تب بنائے گی، جب ہم اپنے وطن کے قدیم عروج کا دل میں ورد کر کے، اور مزید ترقی کے لئے حال کا خیال رکھ کر اپنی روح کو مستقبل سے جوڑ دینگے۔ پھر قدیم عروج کا فخر اور مستقبل کی امیدیں ہم میں نئی زندگی ڈال دیں گی، اور ایک عجیب جذبہ پیدا کردے گی۔ اِس وقت ہماری مقدس سندھ میں حالت یہ ہے کہ تاریخ خواہ دوسری باتوں کی تحقیقات کے لئے ہمارے لوگوں میں لگن بہت کم ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم میں یہ خوبی ابھی زوروں پر نہیں ہے۔

کچھ برس پہلے کی بات ہے کہ میں خود بھی تاریخ کے مطالعہ کا اتنا شائق نہیں تھا، جتنا کہ زبان کا، لیکن تاریخی امور کی تحقیق کا خیال بھی مجھے زبان کا مطالعہ کرتے ہوئے آیا، سنہ ۱۹۳۷ع میں دل میں خیال پیدا ہوا کہ سندھی زبان کی تاریخ مرتب کروں، جس میں قدیم سندھ اور اس کا اثر جو سندھی زبان پر ہوا ہے اس کا ذکر کروں۔ مجھے کوئی بھی ایسی تاریخ دیکھنے میں نہیں آئی جو میرے لئے اس کام میں کارآمد ثابت ہو! اس افسوسناک صورتحال کو دیکھ کر، تین برس مسلسل محنت

کرکے، تقریباً ڈیڑھ سو کتابوں میں سے قدیم سندھ اور سندھی زبان کے احوال جمع کرتا رہا۔ کسی کتاب سے فقط ایک دو فقرے تو کسی کتاب سے فقط دو تین سطور ملیں؛ لیکن ان ذرات کو جب جوڑا تو اچھی خاصی تاریخ بن گئی۔ اسی طرح اپنے لئے قدیم سندھ کی تاریخ مرتب کرکے اپنے کام کا آغاز کیا۔ فروری ۱۹۴۱ء میں ''سندھی زبان کی تاریخ'' شایع کروائی، تو بہت سارے لوگوں نے اسے دل لگا کر پڑھا۔ خصوصاً اس لئے کہ قدیم سندھ کی تاریخ میں سندھ کے جنم اور ویدوں کے زمانے سے لے کر عربوں کی لشکرکشی تک کے احوال درج تھے۔ اور ایسی تاریخ اس سے پہلے کسی نے بھی شایع نہیں کروائی تھی۔ زبان کی تاریخ بھی اس سے پہلے کسی نے نہیں لکھی تھی۔ بعد میں پھر میں مزید تاریخ کے احوال جمع کرنے کی سعی میں لگ گیا۔ اپریل ۱۹۳۶ء سے صوبہ سندھ بمبئی سے الگ ہوا ہے، تو میں نے ضروری سمجھا کہ سندھ کی تاریخ بھی الگ ہونی چاہئے۔ اسی ضرورت کو حکومت سندھ نے بھی محسوس کیا۔

اگست ۱۹۴۰ء میں حکومت سندھ نے سندھی ادب کے لئے ایک مرکزی مشاورتی بورڈ کراچی میں تشکیل دیا، جس کے ذمے یہ کام بھی دیا گیا کہ سندھ کے ملکی اور سماجی حالات کی تاریخ بھی تیار کی جائے۔ اسی بورڈ کا ایک رکن میں بھی ہوں۔ اس کام کے لئے حکومت سندھ نے کوئی انعام دینے کا وعدہ نہیں کیا تھا، تب بھی بورڈ کی منظوری سے یہ کام میں نے اپنے ذمے لیا، کہ اپنے مطالعہ سے اپنے ہموطنوں کو بھی فائدہ پہنچاؤں۔ میں نے پھر دوسرے دو سال محنت کرکے، قدیم سندھ کی تاریخ کے لئے مزید ذخیرہ اکٹھا کیا، جو میرے خیال میں اسے تین جلدوں میں مجھے تقسیم کرنا پڑیگا۔ تاحال اپنی مجوزہ تاریخ کی یہ فقط پہلی جلد مکمل کرسکا ہوں۔

اس جلد میں سندھ کا جنم، مہن جو دڑو اور رگ ویدک زمانے کی تہذیب مذکور ہے۔ سندھ کے جنم اور دوسری پرانی جغرافیائی باتوں کا مضمون، میں نے جیالاجیکل محکمے والوں کے تحقیقی مکالوں سے لیا ہے۔ مہن جو دڑو متعلق حقائق، آرکیالاجیکل محکمے کی سالانہ رپورٹوں، سرجان مارشل، ڈاکٹر ارنیسٹ مکی، مسٹر رکھلداس بنرجی، راء بہادر راما پرساد اور چند دیگر علماء کی رقم کی ہوئی کتابوں سے اختصار کے ساتھ دی ہیں۔ رگ ویدک زمانے کی تہذیب کی باتیں ڈاکٹر ابناش چندرداس کی مرتب کی ہوئی کتاب ''منتروں کے زمانے میں قدیم ہندستان کی زندگی'' ڈاکٹر راجیند رلال متر کی کتاب ''انڈو آرینس''، ڈاکٹر جی میوئر کے اصلی سنسکرت مضامین، لوکمانیہ تلک کی کتابوں ''اورین'' اور ''آرکٹک ھوم''، پروفیسر منکس، بابو روشین چندردت اور دیگر کئی ایک یورپی خواہ اپنے ہموطن علماء کی کتب سے اخذ کرکے ان کا موازنہ کیا ہے۔ اس موازنہ کی وجہ یہ تھی کہ شروع میں پروفیسر منک ڈونیل اور دیگر یورپی علماء نے رگ وید اور ھندوؤں کی دوسری دینی کتب

میں سے کچھ ایسے نتائج لئے تھے جو حقائق کے سراسر برخلاف تھے، اور خواہ مخواہ کچھ غلط فہمیوں کو پھیلایا تھا، جن کو بعد میں ہمارے ہموطن علماء نے رد کر دیا تھا۔ ایسی حالت میں پرانے اور نئے محققین کی سب باتیں تنقید کے ترازو میں تول کر، اپنی یہ کتاب بموجب بلکل تازہ تحقیقات تصنیف کی ہے۔ ہر ایک بات کی چھان بین کرنے کا مذکورہ بالا نمونہ اختیار کر کے، دوسری جلد میں باقی ماندہ ویدک ادب، اور اتہاسوں اور پرانوں میں سے سندھ کے احوال دیئے ہیں، اور کسی قدر مدھیہ دیس کے رہنے والے آریہ لوگوں کا بھی ذکر کرنا ہے، کیونکہ بشمول سندھ پورے ہندستان میں بہت ساری رسم و رواج اور کچھ دوسری باتوں کی بنیاد ان ہی لوگوں نے ڈالی تھی۔ اور طرح بھی قدیم سندھ کی تاریخ قدرے مدھیہ دیس کی تاریخ سے جڑی ہوئی ہے۔ تیسری جلد میں دنیا کی ابتدا سے لے کر عربوں کی لشکرکشی تک کے احوال دیئے ہیں۔ اسی طرح قدیم سندھ کے ہندوؤں کے حکمرانی کی تاریخ ان تین جلدوں میں مذکور ہو جائے گی۔

کسی بھی تاریخ میں اگر صرف سن تحریر کر کے، پرانے حاکموں کے پشت در پشت احوال دیے جائیں اور ان کی جنگوں کا ذکر کیا جائے گا تو یہ کوئی تاریخ نہیں کہلائے گی۔ ایسے حقائق تاریخ کا صرف مجسمہ بناتے ہیں۔ اس مجسمہ میں روح تب پڑتی ہے جب اس وقت کے لوگوں کی روزمرہ کی زندگی کا احوال درج کیا جاتا ہے۔ سچی تاریخ یہی ہے جس سے سابقہ لوگوں کے رہن سہن، خیالات اور جذبات، رسم و رواج، دین و مذہب اور ادب کا پتہ چلتا ہے۔ اُسی سے ہی پتہ چلتا ہے کہ تہذیب و تمدن کی ابتدا کیسے ہوئی، وقت بوقت اس کی ترقی کیسے ہوئی، اور فی الوقت جو رسم و رواج اور مذہبی امور ہیں، ان کی بنیاد کیسے پڑی۔ ایک مرتبہ جب اس قسم کی سربستہ معلومات مل جائے گی تو پھر یہ سمجھنا آسان ہو جائے گا کہ گذرے ہوئے لوگوں میں کیا کیا خوبیاں تھیں، جو ہم میں بھی پیدا ہونی چاہئیں، اور ان میں کس قسم کی خامیاں تھیں، جن سے ہمیں احتراز کرنا چاہئے۔ قدیم زمانے کی تاریخ پڑھنے کی اہم مدعا یہ ہے کہ گذرے ہوئے لوگوں کے تجربات سے استفادہ کر کے ہم اپنے لئے ایسی راہیں گھڑلیں جو ان سے بھی آگے نکل جائیں اور اپنی آنے والی نسل کے لئے مثال بنیں۔ اس طرح کے حقائق درج کرنے سے نہ صرف تاریخ کا مضمون خود بخود دلکش اور مزیدار بن جاتا ہے؛ بلکہ نہایت نصیحت آمیز اور کارآمد بھی ہو جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ میں نے اس تاریخ کو رقم کرنے کے لئے صرف ان کتب سے مدد لی ہے جو بلکل قابل بھروسہ ہیں، اور بطور سند سمجھے جاتے ہیں۔ ضروری جگہوں پر ان اسناد کا ذکر بھی میں نے کیا ہے تا کہ قارئین کو پتہ چلے کہ وہ تمام باتیں میں نے کن کتابوں اور کن مخازن سے اخذ کی ہیں؛ اور اگر وہ چاہیں تو بلاشک وہ مخازن اور اصلی کتب خود بھی پڑھیں، کیونکہ میں نے بہت ساری کتابوں کا محض خلاصہ اس تاریخ میں دیا ہے۔ گویا سمندر کو کوزے میں بند کیا ہے۔

قدیم ہندستان پر تحقیقات پہلے بعض یورپی علماء نے کی تھیں، جن میں سے سندھ کا بھی تھوڑا بہت احوال مل جاتا ہے۔ ان کی تحقیقات کا مختصر ذکر یہاں شروع میں کر چکا ہوں تاکہ قارئین کو پتہ چل سکے کہ خود میں نے وہ باتیں کہاں سے لی ہیں۔ ھندستان کی تاریخ جو فی الوقت اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائی جاتی ہے، وہ تمام ان تحقیقات کے بعد کی رقم کردہ ہیں۔ وہ اکثر محض طلبہ کے لئے ہیں، اس لئے کچھ باتیں ان میں درج ہی نہیں ہیں، اور بعض باتوں کا چند الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے۔ میں نے ہر ایک اہم بات کو واضح طور پر بیان کیا ہے، کیونکہ پورے ہندستان کی تاریخ وادیٔ سندھ ن تہذیب سے شروع ہوتی ہے، اور ضروری ہے کہ قدیم سندھ کی تاریخ میں یہ باتیں سربستہ مذکور ہوں۔ سندھ کی بعض باتیں عیسائیوں کی کتاب انجیل، تو کچھ پارسیوں کی کتاب ''زنداوستا'' میں موجود ہیں، اور کچھ باتوں کی میں نے اکیلے کھوج لگائی ہے، جن کی آج تک کسی نے کوئی کھوج نہیں لگائی تھی۔ ان باتوں کا میں نے مناسب جگہوں پر ذکر کیا ہے، اور وہ بہت سارے قارئین کو نئی لگیں گی۔ فی الوقت جو قدیم سندھ کی تاریخ موجود ہیں وہ اکثر کچھ فارسی کتب کا ترجمہ ہیں اور کچھ میں تو غلط باتیں درج ہیں، جن کا ذکر میں ابتدا میں کر چکا ہوں، تاکہ غلط فہمیاں دور ہو جائیں۔ پرانی سندھ کی دو ایک تازہ چھپی ہوئی تاریخوں میں ویدوں اور اتہاسی زمانوں کا قدرے ذکر ملتا ہے؛ لیکن ان زمانے والے لوگوں کی زندگی کا سلسلہ وار احوال ہے ہی نہیں، اس لئے اس پہلی جلد میں بہت سارا مضمون میں نے نیا دیا ہے، جو پہلے کسی سندھی خواہ انگریزی کی مرقوم تاریخوں میں موجود نہیں۔

تاریخ کا ایک اہم حصہ جغرافیہ ہے۔ ہر کسی علائقہ کی طبعی صورت، آب و ہوا اور دوسری باتوں کا خطے کی تاریخ اور لوگوں کے مزاج، رنگ، لہجہ، رہن سہن وغیرہ پر اس قدر اثر ہوتا ہے کہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ تاریخ بنتی ہی جغرافیہ سے ہے۔ اسی سبب سے اس کتاب کے پہلے ہی باب میں قدیم سندھ کی طبعی صورت کا ذکر کرتا، اور قدیم سندھ کی حدود بتا کر، ان حدود کا ہمارے ملک پر جو اثر ہوا ہے، وہ درج کرتا؛ مگر رگ وید سے پہلے زمانے کا احوال دستیاب ہی نہیں، اسی وجہ سے سندھ کے جنم کی کہانی اور اس قسم کی دوسری باتوں کے لئے ارضیات پر مجھے انحصار کرنا پڑا ہے۔ خود ارضیات کے ماہرین کو ابھی بہت ساری تحقیقات کرنی ہیں، کیونکہ اس قسم کی تحقیقات کا آغاز ہی اب ہوا ہے۔ رگ وید میں سپت سندھو (وادیٔ سندھ کے سات دریاؤں والا ملک) کا ذکر موجود ہے، اس سے بھی سندھ کا نقشہ تشکیل دینا مشکل ہے، کیونکہ اس میں سندھ کی حدود کا ذکر ہی نہیں۔ بڑی بات یہ کہ خود رگ وید کے منڈل ۲، سوکت ۱۷ میں خوفناک زلزلوں کا ذکر ھے، جنہوں نے اسی وقت ہی ملک کی طبعی صورت میں تبدیلی لائی تھی، رگ وید کے بعد کے احوال

سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وقت بوقت خوفناک زلزلوں اور سندھو دریاء کی تبدیلیوں نے کس طرح ہرے بھرے علاقے ویران کر دیئے اور ویران علاقے ہرے بھرے کر دئے۔ سن ۹۶۲ع میں ایسا خوفناک زلزلہ برپا ہوا، جو اس نے بکھر والے پہاڑ بھی توڑ ڈالے، اور الور اور دوسرے کئی ایک اور شہر ویران ہو گئے۔ سندھو ندی جو الور کی پہاڑی کے بلکل نیچے سے بہتی تھی، اس نے اپنا رخ ہی تبدیل کر ڈالا۔ اخیر والا خوفناک زلزلہ ۱۸۱۹ع میں ہوا، جس نے سندھ کے جنوبی علاقے، جسے سندھی میں لاڑ کہتے ہیں، کی طبعی صورت تبدیل کر کے رکھ دی، اور کچھ کا رن، جہاں سے پرانے زمانے میں دریاء بہتا تھا، اور راحمو کی بزار، سندھڑی اور دوسری بندرگاہیں بھی وہیں پر تھیں، انہوں نے بھی اپنی سندر صورت تبدیل کر دی، اور یہ سارا بیابان ہو گیا۔ سندھ کی یہ موجودہ طبعی صورت اسی وقت سے لے کر ہے۔ ایسی حالت میں سندھ کی طبعی صورت وغیرہ کا ذکر اگر زمانۂ متوسط یا زمانۂ حال کی سندھ کی تاریخ میں کیا جائے تو فبہا، لیکن اس قدیم سندھ کی تاریخ میں ایسی کوشش کرنا عبث ہے۔ تاہم قدیم جغرافیہ کی بعض باتیں اس کتاب میں مناسب جگہوں پر درج کی گئی ہیں، تاکہ تاریخ سمجھنے میں آسانی ہو۔

میں نے یہ تاریخ مرتب کرنے میں جن کتب سے استفادہ کیا ہے، ان میں سے بہت ساری قیمتی کتب ڈی۔جی، سندھ کالیج لئبرری سے، کچھ خالقڈنہ ھال اور فریئر ھال لئبرریوں سے اور کچھ اپنے دوست واحباب سے لی تھیں۔ جس وجہ سے کتابیں خرید کرنے کے خرچے سے بورڈ قدرے بچ گیا۔ ممکن ہے کہ اور بھی کچھ کتب ہوں، جو میرے علم میں نہ ہوں۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ اس وقت آرکیالاجیکل محکمہ اور جیالاجیکل محکمہ اپنے تیئں مزید تحقیقات کر رہے ہیں، اور کچھ یورپی خواہ ہمارے ملکی علماء بھی قدیم ھندستان کے مزید احوال جمع کرنے کی سعی کر رہے ہیں، اس لئے عجب نہیں کہ اس کے بعد اگر سندھ کی تاریخ کے لئے کوئی نیا ذخیرہ ہاتھ لگ جائے۔ یہ کتاب لکھ کر گویا میں نے بنیاد ڈال دی ہے، تاکہ جیسے جیسے مزید احوال ہاتھ لگتے جائیں، ویسے ویسے اس کتاب کو مزید مکمل کرنا آسان ہو۔

بھیرومل مہر چند

۷۷، مڈل کلاس کالونی،
اجمل خان روڈ، بندر روڈ ایکسٹینشن،
کراچی، اگست ۱۹۴۴ع

کچھ ترجمے کے بارے میں۔۔۔

تاریخ کا علم اور خاص طرح سے قدیم تاریخی علوم کی اہمیت سماجی، سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی لحاظ سے مطالعہ کرنے والوں کے نزدیک خاص طرح سے رہی ہے۔ اس جدید دور میں تاریخ کے تمام قدیم واقعات کا نئے سرے سے سائنسی جائزہ لیا جارہا ہے۔ مثلاً چنگیز خان کی قیادت میں تمام چنگیزی قبائل اپنے دور میں صحرائے گوبی سے کیوں کر نکل کھڑے ہوئے اور ان کا ایک عالم کو تہہ و بالا کرنے کے سماجی، اقتصادی اور ماحولیاتی عوامل کیا تھے، وغیرہ وغیرہ۔

یہ کتاب ''قدیم سندھ'' بھیرومل مہرچند آڈوانی نے سندھ کی قدیم تاریخ پر برسہابرس کی مطالعاتی عرق ریزی کے بعد تصنیف کی۔ اس کتاب کو برصغیر کی تاریخ میں اہم تصنیف شمار کیا جاتا ہے، کیونکہ یہ کتاب وادئ سندھ کی اس قدیم تہذیب سے تعلق رکھتی ہے، جس نے سپت سندھو (دریائے ہاکڑہ، سندھ، ستلج، بیاس، راوی، چناب اور جہلم) کے کناروں پر جنم لیا اور جس کا شمال کی جانب پھیلاؤ (Extension) گنگا و جمنا کے کناروں تک اور جنوب میں پھیلاؤ پورے سوراشٹر (کچھ، گجرات و راجستھان) تک ۱۰ لاکھ مربع میل میں ہوتا ہے۔

میرے ایک دوست پلاسٹک سرجن ڈاکٹر مہیش کمار مگریا کو جب یہ پتہ چلا کہ میں کتاب ''قدیم سندھ'' کا اردو میں ترجمہ کر رہا ہوں تو انہوں نے حیرت سے مجھ سے پوچھا کہ ''کیا آپ اس کتاب کی سندھی سمجھ لیتے ہیں؟ ہم ہندو ہوکر اس کو صحیح طور پر نہیں سمجھ پاتے''۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کتاب کا ترجمہ کرتے وقت کتنی لسانی پیچیدگیوں سے واسطہ پڑا ہوگا۔ ترجمہ کے حوالے سے مزید ایک بات بتاتا چلوں کہ جس طرح سے اردو کی جڑیں (Roots) قدیم ہندی میں پیوست ہیں، اردو اور ہندی میں ایک اہم فرق صرف فارسی و عربی اور سنسکرت کے اسماء (Nouns) کا ہے، اسی طرح سے بھیرومل کی سندھی زبان کا اسلوب عصرِ حاضر میں سنسکرت کے نامانوس و غیر مروج الفاظ سے مبرا نہیں ہے اور اس کا سلیس اردو ترجمہ ایک طرح سے قلم سے تیشہء فرہاد سے کام لینے کے مترادف ہے۔

گر قبول افتد زہے نصیب

مترجم
مختیار احمد حاجانو
شکارپور، سندھ

ابتدا

قدیم ہندستان کی تاریخ کیسے بنی: یہ بات عالم آشکار ہے کہ ۷۱۱ء میں جب عربوں نے سندھ فتح کی، اس وقت تک قدیم ہندستان کی کوئی بھی تاریخ اس طرح مرتب نہیں کی گئی تھی، جس طرح آجکل تاریخیں مرتب ہو رہی ہیں۔ اس وقت عربوں کو سندھ کے راء گھرانے اور برھمن گھرانے کے راجاؤں: راء ساھسی، چچ، چندر اور ڈاھر سے متعلق جو احوال لوگوں کی زبانی ملے، ان کو انھوں نے قلمبند کیا، وہ احوال چچ نامہ اور دیگر فارسی کتب میں درج ھیں۔ یہ احوال کس حد تک قابل یقین ہیں، اس بات پر بعد میں آئینگے، لیکن اتنا ضرور کہیں گے کہ تکلیف اٹھا کر انھوں نے کتنا مواد اکٹھا کیا ہے، جو اس وقت شاید ہمیں نھیں مل سکتا تھا۔ بعض مسلمان علماء نے بعد کے تاریخی احوال بھی لکھے ہیں؛ لیکن پرانی باتوں کی تحقیقات نہ ہندوؤں نے کی اور نہ مسلمانوں نے: انگریزوں کے دور حکومت کے اوائل تک بھی ایسی ہی صورت حال تھی۔ اب وقفہ وقفہ سے اتنی صدیوں بعد قدیم ہندستان کی تاریخیں جو لکھی گئی ھیں، ان میں نہ صرف قدیم آریہ، لیکن غیر آریہ قوموں کے احوال بھی درج ھیں، سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ اتنی پرانی باتیں آئیں کھاں سے؟ درحقیقت یہ کھانی ایک عبرت دلانے والی کہانی ہے، جو میں نے اپنی لکھی ہوئی کتاب ''سندھی زبان کی تاریخ'' کے شروع میں دی ہے، اس بات کو یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے، اس لئے زبانوں کی تحقیقات سے متعلق دو چار الفاظ کہہ کر، تاریخ پر تحقیقات کا ذکر کیا جائے گا، تاکہ تمام باتیں مربوط نظر آئیں۔

زبانوں پر تحقیق: عیسوی پندھرویں اور سولھویں صدی میں، پورچوگیزوں، ڈچوں، فرانسیسیوں اور انگریزوں نے، یکے بعد دیگرے، تجارت کے خیال سے ہندستان میں اپنی کوٹھیاں قائم کیں، تب ان میں سے کچھ حضرات نے سنسکرت پر توجہ دی۔ انہیں معلوم ہوا کہ سنسکرت میں بہت سارے ایسے الفاظ موجود ہیں جو کئی ایک یورپی زبانوں اور پارسی زبان میں بھی پائے جاتے ھیں، مثلاً: سنسکرت ''ماتر'' (ماں) اور ''بھراتر'' (بھائی) کا تلفظ پارسی میں ''مادر'' اور ''برادر'' اور انگریزی میں ''مدر'' (Mother) اور ''بردر'' (Brother) ہیں۔ اس طرح کے اور کئی الفاظ دیکھ کر

وہ حیران رہ گئے؛ لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ الفاظ یورپ، ایران اور ہندستان میں کیسے عام ہو گئے۔

سنہ ۱۷۸۳ء میں سر ولیم جونس (۱۷۴۶-۱۷۹۴ء) بنگال کے چیف جسٹس مقرر ہوئے، اس صاحب نے سنسکرت کا گہرا مطالعہ کرکے ظاہر کیا کہ سنسکرت، ایرانی اور کئی ایک یورپی زبانوں کی بنیاد ایک ہی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے بہت سارے الفاظ ایک جیسے ہیں اور ان کی نحوی ساخت بھی کسی قدر ایک جیسی ہے۔ ۱۸۱۶ء میں جرمنی کے نامور عالم فرنسس باپ (Francis Bopp) نے ایک گریمر کی کتاب چھپوا کر شائع کی جس میں اس نے سنسکرت، یونانی، لاطینی، جرمنی اور پارسی زبانوں کی گردانوں کی ایک جیسی ترتیب درج کر کے ثابت کیا کہ سر ولیم جونس کی قیاس آرائی درست تھی اور یہ زبانیں واقعی کسی ایسی قدیم زبان میں سے نکلی ہیں، جو اب وہ دنیا کے کسی بھی حصے میں نہیں بولی جاتی۔ یورپی عالموں کو علم لغات (Comparative Philology) کا علم ان زبانوں کا موازنہ کرنے کے بعد ہوا۔ ان تمام جگہوں کی زبانوں کو ایک ہی خاندان "انڈو۔ یورپین" کے نام سے پکارنے لگے، تا کہ سمجھ میں آئے کہ ہندستان اور یورپ کی زبانیں اسی ایک ہی خاندان سے ہیں۔

تاریخ پر تحقیق: یورپی لوگوں کے لئے اب ایک بڑا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ وہ کہنے لگے کہ ہندستان اور ایران، جو یورپ سے کم از کم چھ ہزار میل دور ہیں، ان کی زبانوں کا آپس میں یہ جگری ناتہ ہوا کیسے؟ یہ پہیلی بوجھے کون؟ جلد ہی ان کو ہندوؤں کے رگ وید سے پتہ چلا کہ وہ آریہ لوگ تھے، جو وہ اپنی نشانی یہ رگ وید چھوڑ گئے ہیں۔ پارسیوں کے زنداوستا سے ان کو معلوم ہوا کہ خود "ایران" لفظ اصل میں ہے "آئرین" یعنی "آریوں کا ملک"۔[1] ایران طرف انہیں دارا بادشاہ کے کندہ کتبے یا نوشتے ملے، جن پر اس کے خاندان کا شجرہ دیا ہوا ہے اور ابتدا ہی میں لکھا ہوا ہے کہ "میں آریہ ہوں اور آریہ کا بیٹا ہوں۔" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایرانی اصل میں آریہ تھے اور اپنے آریہ نسل ہونے پر انہیں بڑا فخر تھا۔[2] دوسری طرف یورپ میں "آئرلینڈ"

---

(1) Iran, Eran, Airan, the Airiyana of the Avesta, is the land of Aryans." Edward G. Browne: A literary History of Persia, Page 4.

(2) "At the time at which we begin to know them, 'Arya' meant noble, 'exalted', 'venerable; the name had become something almost sacred, it embodied the Aryan Peoples' national pride, - or a feeling deeper still more intense enduring, and inspiring: their pride of race, and that down to a very late period; for was not Dareios, the great Persian King, careful to preface his family geneology in his famous inscriptions by the statement: 'I am an Aryan, the son of an Arya'?" L.A. Ragozin: vedic India, Page 62.

ہے جو اصل میں ہے ''آریہ لینڈ'' یعنی آریوں یا شرفاء کا ملک۔ آئرلینڈ کا قومی نام ''ایرین'' (Eren) ہے اور یہ لفظ بھی اصل میں ہے ''آرین''۔[1] صرف ان ناموں ہی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ پہلے ہندستان اور ایران سے لے کر آئرلینڈ تک سارا علاقہ آریوں کا تھا۔ ان حقائق نے یورپی علماء کو مزید حیرت میں ڈال دیا، اس لئے انہوں نے اس تمام خطے کی اہم زبانوں کا موازنہ کیا، اور ساتھ ہی تاریخ کی تحقیق میں بھی پڑ گئے، تاکہ شاید مزید کچھ معلومات حاصل کر سکیں۔

ضمیات پر تحقیق: تاریخ کی تحقیق کے لئے انہوں نے یہ راستہ اختیار کیا کہ، ہندوؤں، ایرانیوں، قدیم یونانیوں، رومیوں اور دوسری یورپی اقوام کی دینی کتب کا موازنہ کیا۔ ہندوؤں کے پرانوں اور اتہاسوں میں انہوں نے دیکھا کہ پہلے زمانے کے راجاؤں اور رشیوں کے نسل درنسل احوال درج ہیں۔ اس سے ان کو یقین ہو چلا کہ یہ سچ پر مبنی تاریخی احوال ہیں، لیکن وہاں ہی کچھ باتیں اس طرح سے لکھی ہوئی ہیں کہ وہ دیو مالائی کہانیاں معلوم ہوتی ہیں۔ جلد ہی انہیں معلوم ہو گیا کہ دوسرے ممالک میں بھی تاریخ کی شروعات اسی طرح ہوئی تھی۔ پروفیسر میکڈونیل اپنی رقم کردہ سنسکرت ادب کی تاریخ میں اور دوسرے کچھ یورپی علماء بھی اپنی تحریروں میں پہلے یوں ہی لکھتے رہے کہ قدیم زمانہ کے آریوں کو تاریخ لکھنے کا فن تھا ہی نہیں، لیکن بعد میں جو حقائق سامنے آئے، ان میں سے ظاہر ہوا کہ پہلے ہندستان، ایران، یونان اور دوسری جگہوں پر تاریخ، جغرافیہ، کھگول ودیا، جوتش وغیرہ کی باتیں کہانیوں کی طرح لکھتے تھے، تاکہ لوگوں کو آسانی سے یاد رہیں، اب یہی طریقہ خود بعض یورپی علماء اختیار کر رہے ہیں اور تاریخ اور جغرافیہ کہانیوں کی صورت میں لکھ رہے ہیں، اور یہی نمونہ عمدہ تصور کیا جا رہا ہے۔

دینی کتب میں درج کہانیوں کے مطالعہ سے یورپی علماء کو جلد معلوم ہونے لگا کہ یہ کہانیاں حقائق پر مبنی ہیں اور بے بنیاد نہیں ہیں۔ ان حقائق کو سمجھنے کے لئے انہوں نے ضروری سمجھا کہ پہلے یہ کہانیاں تمام دینی کتب میں سے لے کر اکٹھی کی جائیں، تاکہ ان کا اچھی طرح سے موازنہ کرنے اور ان کا صحیح صحیح مطلب سمجھنے میں آسانی ہو۔ پس، پھر تو انہوں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ تاحال ہندوؤں کے ویدوں، اتہاسوں اور پرانوں میں سے، ایران، بئبلونیا، اسیریا، مصر اور یورپ کے یونانی، رومی، کیلٹک اور دوسری قوموں کی دینی کتب سے کہانیاں لے کر، ان کو چھپوا کر شایع کیا۔ ان میں سے کئی ایک تاریخی احوال لے کر، جدا جدا ممالک کی تاریخیں مرتب کی ہیں، بلکہ دنیا کی تاریخ بھی انہوں نے رقم کی ہے۔ یہ تمام تاریخیں کچھ ہی عرصہ پہلے ان تحقیقات کے بعد کی تیار کردہ ہیں، ورنہ اس سے پہلے نہیں تھیں۔

---

(1) "Eran, Eranian is only a slightly altered form of Aryan: so is Erin, the national name of Ireland." L.A. Ragozine: Vedic India. Page 62. footnote.

ان تحقیقات سے ایک اہم بات یہ سامنے آئی کہ کئی ایک دیو مالائی کہانیاں بلکہ دیوتاؤں کے نام بھی جس طرح ہندوؤں کی دینی کتب میں درج ہیں اسی ہی طرح پارسیوں کے زنداوستا اور رومیوں اور یونانی لوگوں کی کہانیوں میں بھی درج ہیں! مثلاً، رگ وید سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ کے آریہ لوگ آکاس یا آسمان کو ''پتا'' (باپ) اور زمین یا دھرتی کو ''ماتا'' (ماں) کہتے تھے۔ آسمان کو کہتے تھے ''دیوس پتر'' (باپ آسمان = Dyus Pitra) جس کا تلفظ لاطینی زبان میں ہے ''جوپیٹر'' (Ju-piter) اور اب اس کے معنی ہیں ''مشتری یا ورہسپت دیوتا'' ''جوپیٹر'' کا ابتدائی رکن تہجی (Syllable) ''جو'' کا تلفظ یورپی لوگوں نے تبدیل کر کے ''ٹیو'' (Tiu) بھی کیا، جس سے انگریزی لفظ ''ٹیوزڈے'' (Tuesday) بدھ بنا۔ سنسکرت ''دیوس'' کا تلفظ یونانیوں نے تبدیل کر کے ''زیوس'' (Zeus) کیا اور اسے بہت بڑا دیوتا سمجھتے تھے۔ (1)

رگ وید میں آسمان کے ایک اہم دیوتا کا نام ''ورن'' درج ہے، جس کے بنیادی معنی ہیں ''ور'' vri معنی ڈھانکنا۔ ساری زمین، جبلوں، ندیوں، سمندروں اور مہا سمندروں کو آسمان اوپر سے ڈھانکے ہوئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آسمان کے دیوتا پر ''ورن'' (ڈھانکنے والا) نام رکھا گیا۔

فی الوقت ہندو لوگ ''ورن'' دیوتا کو پانی کا دیوتا سمجھتے ہیں، لیکن رگ وید کے زمانے میں ورن دیوتا کا تعلق تاروں بھری رات سے تھا اور دن کا دیوتا ''متر'' (سورج) کہا جاتا تھا، اسی لئے رگ وید میں ''ورن'' اور ''متر'' نام بہت ساری جگہوں پر ایک ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔ ''ورن'' کا تلفظ پارسیوں کی کتاب زنداوستا میں ''ورین'' (Varena) اور یونانی زبان میں ''اریس'' یا ''یورسین'' (Ouranous or Uranos) ہے۔ (2) ''متر'' کا تلفظ زنداوستا میں ''متھر'' ہے اور آجکل کی فارسی زبان میں اس کا تلفظ بگڑ کر ''مہر'' ہوا ہے؛ لیکن آج بھی اس کے معنی ہیں ''سورج'' (سورج دیوتا)۔ سنسکرت لفظ ''متر'' کا تلفظ قدیم ایرانیوں کی طرح قدیم رومیوں نے بھی کیا ''متھر'' (Mothra) اور اسی سبب سے متر دیوتا کے پوجاری متھریسٹ (Mithraist) بولے جانے لگے، اور متر دیوتا کی پرستش پر ''متھر سیزم'' (Mithra-ism, Mithra-icism) نام پڑا۔

پچھلے زمانے کے آریہ لوگ آسمان کو ''دیوس پتر'' (باپ آکاس) اور آسمان کے اہم دیوتا (ورن دیوتا) کو سارے جہاں کا ''باپ'' اور زمین کو ''ماں'' کہتے تھے۔ سو اس زمانے میں

(1) [1] "Dyus-pitra, 'Heaven, the Father', is no other than Greek Zeus-Pater. Latin-Dies-Piter, Jupiter." L.A.Ragozin: Vedic India. Page 187.
[2] "The cognate dyaus, 'heaven', is extant, in the Greek Zeus, gen Dios, and the name of an ancient Teutonic god Tius, preserved in the word, 'Tuesday'. Dr. Martin Haug: Essays on Religion of the Parsis, Page 287 footnote.

(2) " 'Varuna' is identical with the god Uranos of the Greeks." Dr. Martin Haug: Essays on the sacred language, writings and Religion of the Parsis, Page 273. See also Prof. Max Muller's Chips from a German workshop. ii. 65.

شاعرانہ انداز میں اسی بات کو کھول کر انہوں نے سمجھایا ہے۔ افق کے مقام پر آسمان اور زمین ایک دوسرے سے بغلگیر ہیں، گویا کہ ان ہی کے ملاپ سے یہ سارا جہاں پیدا ہوا ہے، اور تمام دیوتا، انسان اور دیگر جاندار گویا کہ ان ہی سے تخلیق ہوئے ہیں۔ آسمان سے برسات کی بوندیں برستی ہیں اور ان کو زمین ''جذب کر'' لیتی ہے اور سورج کی دھوپ بھی اس کی معاونت کرتی ہے اور اسی طرح ہی وہ پھل پھول لاتی ہے۔ یہ باتیں اتھرو وید کے بارھویں منڈل اور پہلے اور بیالیسویں سوکت میں درج ہیں۔ رگ وید کے آخر میں انتریہ براہمن گرنتھ میں آسمان اور زمین کی شادی کا ذکر ہے۔ ویدک آریوں کا یہ سراسر شاعرانہ انداز حرف بحرف یونانی کہانیوں میں موجود ہے، اس لئے انسائیکلپیڈیا برٹانیکا میں ''یورینس'' (ورن دیوتا) کا ذکر کرتے ہوئے یہ الفاظ لکھے گئے ہیں کہ:

Uranas-- "Heaven, the husband of Earth, and father of Saturn and other deities. As such he represents the generative power of the sky, which fructifies the earth with the warmth of the Sun and moisture of rain."

معروف یونانی شاعر ہومر ان ہی باتوں کا ترجمہ کرتے ہوئے اپنے ایک شعر میں زمین کو جہان کی ماں (Universal Mother) کہا ہے۔[1] اسی ہی شعر کے سولھویں مصرع میں زمین کو ''قابل پرستش دیوی'' (venerable goddess) کہا ہے۔ سترھویں مصرع میں زمین کو دیوتاؤں کی ماں (Mothers of gods) اور ''تاروں بھرے ورن دیوتا کی بیوی'' (Spouse of the starry Uranos) کہا ہے۔ یہ خیالات وہی ہیں جو رگ وید اور انتریہ براہمن میں درج ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے پوکوک صاحب اور کچھ دوسرے علماء نے مزید تحقیقات کر کے کہا ہے کہ یونان ملک در اصل ہندوؤں ہی نے آباد کیا تھا؛ یہی وجہ ہے کہ ہندوؤں کی کہانیاں خواہ دوسری بہت ساری باتیں یونان میں عام ہوگئیں۔[2]

سر ولیم جونس جس نے پہلے پہلے سنسکرت کا جگری ناتہ ایرانی اور یورپی زبانوں سے جوڑا تھا، اس صاحب نے بھی ان دیو مالائی کہانیوں پر تحقیقات میں حصہ لیا۔ اس نے کہا ہے کہ ہندو لوگ خوش نصیبی کی دیوی کو ''لکشمی'' کہتے ہیں اور اس کا دوسرا نام ''شری'' ہے، جس کا تلفظ رومی اور یونانی کہانیوں میں ''سیریز'' (Ceres) ہے۔ لکشمی اناج اور دولت دینے والی دیوی ہے اور

(1) "I will sing of the earth, the Universal Mother, the firmly based, the most venerable, who feeds all creatures that are on the ground." Homer.

(2) Pococke: India in Greece.

رومی لوگ بھی اسے ''اناج کی دیوی'' کہتے تھے۔[1] اس ''سیریز'' (Ceres) لفظ سے انگریزی لفظ ''سیریلس'' (Cereals) بنا ہے، جس میں ہر قسم کا اناج شامل ہوتا ہے۔

سر ولیم جونس نے یہ بھی کہا کہ قدیم رومی لوگ اپنا سال مارچ مہینے سے شمار کرتے تھے، اس لئے جنوری گیاروان مہینہ تھا، تب بھی سال کے بارہ مہینوں میں یہ مہینہ اہم سمجھا جاتا تھا۔ اب تو انگریزی مہینہ شروع ہی جنوری سے ہوتا ہے۔ جنوری مہینہ ''جنوریس'' (Janurius) دیوتا کے نام پر ہے، جسے رومی لوگ ''جنوس'' (Janus) بھی کہتے تھے۔ جنوری مہینہ میں بڑی دھام دھوم سے اس کی پرستش کرتے تھے، تاکہ ان کا پورا سال خوش قسمتی سے گذرے۔ (آج بھی نئے سال کی مبارکبادیں جنوری مہینے کے شروعات میں دیتے ہیں۔) رومی لوگ جو بھی پوجا کرتے تھے تو دوسرے دیوتاؤں کو پوجا سے پہلے ''جنوس'' کا نام لیتے تھے۔ سر ولیم جونس نے کہا ہے کہ یہ ''جنوس'' دیوتا وہی ہے جسے ہندو ''گنیش'' کہتے ہیں۔ لفظ وہی ہے، مگر اس کا تلفظ تھوڑا سا تبدیل ہے۔ ہندو لوگ بھی ہر اچھے کام کرتے وقت پہلے پہلے گنیش کی پرستش کرتے ہیں۔ اسے ''وگھنیشور'' یعنی مشکل کشا بھی کہتے ہیں کیونکہ تمام ''وگھن'' یعنی مشکلیں وہ ہی دور کرتا ہے۔ اسی طرح سر ولیم جونس نے یونانی کہانیوں اور یونانی شاعر ہومر کے شعر میں دیوتاؤں کے مذکور ناموں کا سنسکرت ناموں سے موازنہ کرکے ایک کتاب لکھی جو اس وقت کمیاب ہے۔[2]

سر ولیم جونس کا ۱۷۴۸ء میں انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد جو تحقیقات ہوئی ہیں، ان میں سے بھی یہ معلوم ہوا کہ جرمن، یونانی، رومی اور دوسری کئی یورپی اقوام نے دینی اور فلسفی خواہ دوسری بہت ساری باتیں ہندستان کے لوگوں سے سیکھی تھیں۔ بعض دیوتاؤں کے نام بھی ایک ہی طرح کے ہیں، اور کن کے نام اگر تبدیل ہیں تو بھی ان سے متعلق جو کہانیاں ہیں، وہ ہندو کی کہانیوں سے ملتی جلتی ہیں۔ مثلاً، بدھ کے دن کو انگریزی میں کہتے ہیں ''وینزڈے'' (Wednesday)، جو اصل میں ہے ''ووڈنس ڈے'' (wodensday) یعنی ووڈن (woden) دیوتا کا دن۔ یہ جرمن، ڈچ، اسکنڈینیویا (سئیڈن، ناروے، آئیس لینڈ اور ڈینمارک، ائنگلو سیکسن اور ٹیوٹانی قوموں کا ایک بڑا دیوتا تھا۔ آج بھی جرمنی کے کسان لوگ جب فصل کاٹتے ہیں، تو آخیر کی دو چار بالیاں (خوشہ) ووڈن دیوتا کے نام پر چھوڑ دیتے ہیں۔ پروفیسر کہن کا کہنا ہے کہ اس دیوتا کی شکل شبیہہ اور دوسری باتوں سے متعلق جو کہانیاں ہیں، وہ ردر (شو

(1) Sir William Jones: The Gods of Greece, Italy and India, PP. 4,6.

(2) Ibid.

بھگوان) بنسبت دیو مالائی کہانیوں سے ملتی جلتی ہیں۔[1] پوکک صاحب اور کچھ دیگر علماء کا یہ کہنا ہے کہ یونانی اور دوسری یورپی قوموں کی کہانیاں ہندوؤں کی کہانیوں ہی سے ماخوذ ہیں۔

حاصل مطلب یہ کہ زبانوں کے موازنے سے ان کو علم لغات کا پتہ لگا اور ان کہانیوں کے موازنے (Comparative Mythology) سے مزید انہیں یقین ہو گیا کہ ھندستان، ایران اور یورپ کے قدیم آریہ لوگوں کی نہ صرف زبان ایک جیسی تھی بلکہ دین و مذھب بھی ایک ہی تھا۔[2] جرمنی کے لوگ آج تک فخر سے اپنے آپ کو "آریہ" کہلاتے ہیں۔ پروفیسر میکس ملر، جو خود جرمنی کا رہنے والا تھا، اس صاحب نے رگ وید کا ترجمہ کیا ہے اور اس میں لکھا ہے کہ "جرمن" لفظ اصل میں ہے "شرمن" (شرما)، جو برہمن کا لقب ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ جرمنی والوں کی مذہبی علامت "سواستک" (Swastika) گنیش کی پرستش کی ایک علامت ہے۔

آریوں کا اصل وطن: قدیم آریوں کی نہ صرف زبان ایک تھی، بلکہ دین و دھرم بھی ایک ہی تھا بلکہ یوں سمجھنے میں آیا کہ ان کا حسب ونسب بھی ایک ہی تھا، اس لئے از خود یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ ہندوؤں، ایرانیوں اور یورپی لوگوں کے آباء و اجداد اصل کس جگہ اکٹھے رہتے تھے، جہاں انہوں نے ایک دوسرے کی زبان سیکھی اور ایک جیسے مذہبی خیالات بھی حاصل کئے، جس کی وجہ سے ان کی کہانیاں بھی ایک جیسی ہیں؟ اس سلسلے میں بہت سارے ماہرین فن نے آراء دی ہیں، جن کے لمبے لمبے مضمون رایل ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل اور کچھ کتب میں درج ہیں؛ اور بعض صاحبان نے اپنی کتابوں میں ان تمام تحقیقات کے خلاصے بھی دیے ہیں۔[3] یہاں مختصراً بتاتا ہوں کہ علم لغات کے اصول ڈھونڈھ نکالنے میں جن صاحبان نے شروع ہی میں اچھا خاصہ

(1) Professor Kuhn writes: "Both in our ancient and modern popular traditions, there is universally spoken of Wild Hunter, who sometimes appears under the name of Wodan and Goden, and was, in heathenish times, the supreme god of the ancient German nations. This god cincides, both in character and shape with the anceint Rudra of the Vedas." (Vide page 99). Quoted by R.L. Mitra: Indo Aryans; Vol. ii, page 30.

(2) "There is not an English Jury nowadays, which, after examining the hoary decuments of language, would reject the claim of a common descent and a legitimater relationship between Hindus greek and Tuton." Prof. Max Muller: Chips from a German workshop, Volo. I, pp. 63-64.

(3) "Thus Adelung regarded Kashmir as the cradle of mankind. He was followed by J.G. Rhode who looked upon Bactria as the original home of the human race and later on, Pott, Lassen, and Grimm, all expressed their adherence to the Central Asian theory. It was popularised by Max Muller, Pietect, and Schleicher (1847 to 1862). (Cont...............)

حصہ لیا تھا، ان میں سے اہم ائڈیلنگ صاحب تھے، جس کا ۱۸۰۶ء میں انتقال ہو گیا تھا۔ اس صاحب نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ انسان ذات اول اول پیدا ہی مشرق میں ہوئی تھی اور وادیٔ کشمیر "باغ عدن" تھی، جو آج بھی بہشت کی یاد دلاتی ہے۔[1] پارسیوں کے زنداوستا میں، خصوصاً وینددیداد کے پہلے فرگرد میں، کن مقامات کے نام درج ہیں، جس سے جے۔ جی۔ رہوڈ (J.G.Rhode) صاحب کو یوں لگا کہ ایرانیوں کا اصلی وطن باختر (بختر Bactria) تھا۔ یہ بات انہوں نے ۱۸۲۰ء میں کہی تھی۔ پاٹ صاحب (Pott) کی رائے کے مطابق آکسس یا آمو دریاء (Oxus) اور جکسارٹس (Jaxartes) دریاء، جہاں ہریالی سجائے خطے کو باغ عدن بنائے ہوئی ہیں، وہ آریوں کا اصل وطن تھا۔ اس کی اس رائے سے سنہ ۱۸۴۷ع میں لسن صاحب (Lassen) اور ۱۸۴۸ء میں جیکب گرم (Jacob Grimm) نے اتفاق کیا۔ یہ وسطی ایشیا کا نظریہ دوسرے جرمن علماء نے قبول کیا اور عام لوگوں میں بہت مشتہر کیا، ان میں سے اہم پروفیسر مکس ملر تھے، یہ صاحب ٹھیک ٹھیک جگہ تو خود بھی نہیں بتا سکے، مگر صرف اتنا کہا کہ آریہ لوگ "ایشیا میں کسی جگہ" اکٹھے رہتے تھے۔[2] یوں بھی کہا کہ ان آریوں ہی نے ایشیا سے آ کر یورپ کے جزائر اور ساحل اپنے قبضے میں لے لئے تھے۔[3]

پروفیسر مکس ملر اور دوسروں کی اس راء کے باوجود ۱۸۵۱ء میں لتھم صاحب، ۱۸۶۸ء میں فک صاحب، ۱۸۷۱ء میں بینفی، کیونو اور دیگر صاحبان نے وسطی ایشیا کے نظریے کے خلاف اپنی آواز بلند کی۔ پھر تو انہوں نے تحقیقات کی دوربینی کا رخ یورپ کی طرف کر دیا اور کچھ عرصے کے لئے ہنگاری، آسٹریا اور بوہیما کو آریوں کا اصلی وطن سمجھنے لگے، جیسا کہ کیمبرج ہسٹری آف

The earliest to raise their voice against this Central Asian hypothesis were Latham (1851). Fick (1868), Benfey, Geiger (1871), and Cuno (1871). Cuno attempted moreover to demolish the assumption that Aryan blood was co-extensive with Aryan speech. He was followed by Schmidt whose new explanation as to the origin of the different languages, dealt a mortal below to the old Migration theory. In 1880, Delbruck denied altogether the existence of a uniform Aryan Speech. Though for sometime, the older hypothesis retained many adherents, yet scholars more and more came to favour the European origin of the Aryans. Prominent among these were F. Muller (1873), Posche (1878), Lindenschmit (1880), Schrader and Penka." Narayan Chandra Bandyopadhaya, Lecturer in the Departments of History and Anthropology, Calcutta University: Development of Hindu polity and political Theories, P. 19 footnote.

(1) Dr. Isaac Taylor: Origin of the Aryans, P. 12.

(2) "If an answer must be given as to the place where our Aryan ancestors dwelt before their separation, I should still say, as I said forty years ago, somewhere in Asia, and no more, "Prof. Max Muller: Good words, August 1887, reprinted in "Biographies of Words".

(3) Prof. Max Muller: History of ancient Sanskrit Literature.

انڈیا کی پہلی جلد، صفحہ ۱۶۹ میں درج ہے۔ مزید تحقیقات کرنے کے بعد یوں سمجھنے لگے کہ آریوں کا اصلی وطن رشیا اسکنڈیویا اور بالٹک کی طرف تھا........۔[1]

اس سلسلے میں اتنا ضرور کہینگے کہ یورپی علماء تکے نہیں مار رہے تھے۔ علم لغات، کہانیوں کا موازنہ، آرکیالاجی (Archaeology)، علم البشر (Anthropology) اور دیگر علوم (Sciences) کے وسیلے جوں جوں ان کو ثبوت ملتے گئے، وہ اپنی رائے بھی تبدیل کرتے گئے۔ ہمارے بعض ملکی علماء اپنی رائے پر اڑ گئے کہ آریہ لوگ اصل میں وادئ سندھ کے رہنے والے تھے اور باہر سے کہیں سے نہیں آئے تھے، اور پھر بعد میں تجارت اور دوسری وجوہ کی بنا پر ایران، وسطی ایشیا اور یورپ کی طرف گئے۔

اب تک جتنی تحقیقات ہوئی ہیں، ان کے مطابق بہت سے علماء کا کہنا ہے کہ قدیم آریہ لوگ اصل میں قطب شمالی کے موجودہ برفانی میدانوں میں رہتے تھے، جہاں ان دنوں برف زیادہ نہیں تھی اور لوگ بڑے آرام سے رہ سکتے تھے۔ جن علماء نے اس قسم کی رائے کا اظہار کیا، ان میں سے اہم پروفیسر پینکا تھے، جس نے وسطی ایشیا کے نظریے کو یکسر غلط قرار دے دیا اور کئی ایک ثبوت فراہم کر کے آریوں کا اصل وطن قطب شمالی بتایا اور یوں بھی کہا کہ وہ اصل میں اسکنڈینویا کے رہنے والے تھے۔[2] ان دنوں بوسٹن یونیورسٹی کے صدر ڈاکٹر وارن (Dr. Warren) نے ایک کتاب رقم کی جس کا نام انہوں نے رکھا ''بہشت مل گیا''۔

(Paradise Found or the cradle of the Human Race at the North Pole)

اس کتاب میں انہوں نے لکھا کہ پوری انسان ذات کا پہلا وطن قطب شمالی تھا۔ قدیم کیلٹک قوموں کی کہانیوں سے پروفیسر راہز (Professor Rhys) کو بھی یوں سمجھ میں آیا کہ ان قوموں کے آباء واجداد اصل میں شمالی قطب کی طرف رہائش پذیر تھے۔ اس نے یہ بات اپنے ''ہبرٹ لیکچرس'' میں کہی تھی،[3] جس کی وجہ سے وسطی ایشیا والا نظریہ بڑی حد تک سرے سے ختم ہوگیا۔[4]

وسطی ایشیا کے نظریے کے تابوت میں آخری کیل لوکمانیہ بال گنگادھر تلک نے لگائی۔

(1) The evidence is now all tending to show that the districts in the neighbourhood of the Baltic, from there to the northern coast of the Caspian Sea. were those from which the Aryan languages first radiated and where the race of races who first spoke them originally dwelt." Charles E. Beale: History of the World's Progress, Page 70.

(2) "Penka considers the starting point of Aryan emigration to have been Scan dinavia. "History of the World's Progress, page. 70.

(3) Rhys: Hibbert Lectureres, P. 673.

(4) "Even on strict philological grounds the theory of the primitive Aryan home in Central Asia has been now almost abandoned in favour of North Germany or Scandinavia." Sjt. B.G. Tilok: The Arctic Home in the Vedas, preface, p. viii.

ہمارے اس ملکی عالم کئی ایک جیالاجیکل اور آرکیالاجیکل ثبوت، اور ہندوؤں کے ویدوں، اتہاسوں اور پرانوں میں سے بلکہ پارسیوں کے زنداوستا میں سے بھی بہت سارے حوالے دے کر اپنی کتاب (Arctic Home in the Vedas) ''آرکٹک ہوم'' میں لکھا کہ پرانوں کے مطابق قدیم لوگ میرو پربت پر رہتے تھے، جو قطب شمالی کی طرف ہے۔ ہم نے بھی یہی راء قبول کی ہے، جس کی وضاحت کریں گے۔

ملک مصر اور مغربی ایشیا میں آریوں کی بیٹھکیں: تاریخ پر تحقیقات ہنوز جاری تھیں کہ ملک مصر اور کریٹ (Crete) میں کچھ عرصہ پہلے مغربی ایشیا میں، تحقیقات کر کے آرکیالاجیکل محکمہ والوں نے تاریخ سے پہلے زمانے پر ایک نئی روشنی ڈالی۔ مصر طرف دریائے نیل کے قریب تل ال امرنہ (Tel -el-Amarna) میں سے کچھ کاغذات ۱۸۸۰ع میں ہاتھ لگے۔ ان کہنہ کاغذات سے معلوم ہوا کہ مصر کے فرعون اور مٹنی (مغربی ایشیا طرف) کے راجا ایک دوسرے سے رشتیداریاں کرتے تھے۔ مٹنی کے کچھ راجاؤں کے نام بھی وہی تھے، جو قدیم آریوں کے تھے: مثلاً، مٹنی کے ایک راجا کا نام ''دشرت'' (Dusratha) تھا، اور یہی نام سری رامچند ر کے باپ راجا دسرتھ کا تھا۔ اسی راجا دشرتھ نے اپنی ایک بیٹی ملک مصر کے بادشاہ امینوفس چوتھے (Amenophis IV) کے ساتھ بیاہی تھی، جس کو مٹنی کی اس شہزادی میں سے ''گلوکھپ'' (Gilukhip) نامی بیٹا پیدا ہوا، جو بڑا ہو کر ملک مصر کے کہنہ رسم و رواج کو چھوڑ کر سورج دیوتا کا پوجاری بنا۔

دوسری ایک تحریر، جو ۵۱۲ سطور پر مشتمل ہے، ان میں سے صرف تین سطور سمجھی جا سکی ہیں، وہ بئبلونیا کے پرانے رسم الخط میں لکھی ہوئی ہیں۔ ان سات سطور سے معلوم ہوا کہ مٹنی کے ایک راجہ تشرتھ (Tushrutha) کو اس کے بیٹوں میں سے ایک نے قتل کر دیا، اور اس کے بعد مٹنی حکومت کا زور ٹوٹ گیا، اور اس کے بعد راجا کے ایک دوسرے بیٹے نے میٹیوئز (Matiuaza) ہٹی لوگوں[1] (Hitties) کے راجا شبلیم (Shubbillma) سے مدد مانگی، جس نے اسے اپنا آبائی راج واپس کر دیا اور اپنی بیٹی بھی اسے بیاہ دی۔ اس شادی میں دولہا اور دلہن کو انہوں نے جو دعا دی ہے، اس میں ورن دیوتا اور ناستیہ (اشونی کمار) دیوتاؤں کے نام درج ہیں۔ اس شادی میں ہٹی لوگوں کے راجا نے اپنے داماد سے کہا تھا کہ تم جتنی شادیاں کرنا چاہو، بلاشک کرو، لیکن شرط یہ ہے کہ میری بیٹی ولی عہدوں کی ماں ہوگی، اور تمہارے بعد اسی کی اولاد بادشاہی تخت پر بیٹھے گی۔ مٹنی والوں کا قریبی ناطہ ''ہری'' (Harri) لوگوں کے ساتھ تھا۔ ہری لوگوں کے راجاؤں

(1) ہٹی لوگوں سے متعلق بھی ثابت ہوا ہے کہ وہ اصل میں آریہ تھے۔ ملاحظہ فرمائیں کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، جلد اول۔

کے نام بھی وہی قدیم آریوں والے ہیں، اس لئے سمجھا گیا کہ ہری لوگ بھی آریہ تھے۔ ان کے راجاؤں ارتم اور شترن (Artatama and Shutarna) کی مٹنی والوں کے ساتھ ناسازی تھی، یہ بات بھی درج ہے۔

حال ہی میں ۱۹۰۶ء میں جرمنی کے آرکیالاجیکل محکمہ والوں کے ایک عملدار مسٹر ہیوگو ونکلر (Mr. Hugo Winckler) کو ایشیا کوچک کے کنڈوشیا کی طرف بوگھز کئی (Boghez Keui) میں سے ایک مٹی کی تختی ملی، جس پر مٹنی کے ایک راجا کے عہدنامے کی شرائط لکھی ہوئی ہیں، جو ۱۵۰۰ برس ق۔م کی ہیں۔ اس عہدنامہ کی شرائط میں حلف اٹھانے کے لئے اندر دیوتا، ورن دیوتا، متر (سورج دیوتا)، اور ناستیہ (اشونی کمار) دیوتاؤں کے نام استعمال کئے گئے ہیں۔ یہی نام رگ وید میں بھی ہیں۔

بوگھز کئی اس وقت ایک چھوٹا سا گاؤں ہے؛ لیکن اصل میں یہ ہٹی (Hitti) لوگوں کی تہذیب کا مرکز تھا۔ یہاں پر کچھ قدیم یادگار اور کھنڈرات ہیں۔ ایک قدیم کھنڈرات کی کھدائی کرتے ہوئے نارمن قوم (اسکنڈ ینیویا کی طرف) سے متعلق ایک کتاب ہاتھ لگی۔ ایک کتبہ پر ''ائک'' (ایک) ترےے (Tryi = تین)، پنز (panza = پانچ)، اور ست (satta = سات) ہندسے درج ہیں، اور ہم یہی آج تک استعمال کرتے آرہے ہیں۔ جس کتبہ پر یہ ہندسے درج ہیں، اس میں ان ہندسوں کے ساتھ ''ورتن'' (Vartana) لفظ استعمال کردہ ہے، جس کے معنی ہیں ''کام'' وغیرہ۔ اس دریافت شدہ کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرق کی طرف (وادئ سندھ) سے گھوڑوں کے تاجر لوگ یہاں گھوڑوں کی تجارت کرتے تھے، اور یہاں کے لوگوں کے ملک مصر کے ساتھ تعلقات تھے۔ عجیب بات ہے کہ ملک مصر، جس کے مینار دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتے ہیں، وہاں کے باشندوں کو بڑے عرصے تک یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ گھوڑا کس کام کی چیز ہے! انہیں تب معلوم ہوا جب ''هکسوس'' یا چرواہے بادشاہوں (Hyksos the shepherd kings) کے گھوڑے دوهزار سال ق۔م ان پر حملہ آور ہوئے! اس وقت تک انہیں شاید لڑائی کرنے کا فن بھی نہیں آتا تھا، اسی لئے هکسوس کو ایک ضرب بھی نہیں لگانی پڑی، مصریوں کو محض دھمکا کر تقریباً تین صدیاں مسلسل جنوبی مصر پر حکومت کرتے رہے۔

قدیم بابل (بئبلونیا) کی سیمیٹک قوموں کو بھی گھوڑوں سے متعلق کچھ پتہ نہیں تھا؛ انہیں فقط گدھوں کا پتہ تھا۔ ان کی زبان میں گھوڑے کے لئے کوئی لفظ ہی نہیں تھا، اس لئے گھوڑے کو ''مشرقی گدھا'' (Ass of the East) کہنے لگے! رگ وید میں خواہ مہا بھارت میں سندھ کے

گھوڑوں کی شہرت مذکور ہے۔ اس لئے یوں لگتا ہے کہ پہلے سندھ کے گھوڑے وہاں پر فروخت ہوتے تھے اور بعد میں عراق اور نجد کے گھوڑے مشہور ہوئے۔[1]

۱۹۱۱-۱۹۱۲ء میں مسٹر ہیوگو ونکلر (وفات ۱۹ اپریل ۱۹۱۳ع) ایک دفعہ پھر ایشیا کوچک کے مشرق میں بوگھر کئی والے ٹیلوں کی کھدائی کروائی۔ تا حال جو تحقیقات آرکیالاجیکل محکمہ والوں نے وہاں کی ہیں، ان کا چند الفاظ میں مطلب یہ ہے کہ وہاں جو بھی کتبے یا نوشتے ہاتھ لگے ہیں، ان میں سے کچھ تین ہزار سال ق۔م کے ہیں، اور ان میں آریوں کا ذکر ہے؛ قدیم آریہ لوگ در اصل کہاں سے آئے، یہ بات ان میں درج نہیں: صرف اتنا معلوم ہوا ہے کہ اس قدیم دور میں وہ آریہ لوگ موجودہ پرشیا (ایران) کے مغرب میں میڈیا (Media)[2] اور ان کے ارد گرد تھے، جہاں پر وہ بڑی طاقت رکھتے تھے۔ کھیتی باڑی اور دوسرے فنون اور دھات سے متعلق معلومات رکھتے تھے، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ کئی ہزار برس پہلے اچھی خاصی ترقی پر تھے اور پھر ایسا انہوں نے زور پکڑا کہ میڈیا اور اس کے ارد گرد اپنی بادشاہتیں قائم کر لیں۔ ان کے مغرب میں ملک شام (Syria) کی طرف دوسرے آریوں کی بیٹھکیں بابل (بئبلان -- بئبلونیا) میں تھیں۔ کاشی کے پنڈت جو آج تک مشہور ہیں، ان کے آباء و اجداد کاشی آریہ لوگ تھے، ۱۷۴۶ برس ق۔م میسوپوٹیما (موجودہ عراق) کے جنوبی حصے مین اپنی دھاک بٹھا دی تھی اور ۱۱۸۰ برس ق۔م تک یعنی ۵۶۶ برس مسلسل وہاں ان کی حکومت تھی۔ وہ سورج دیوتا اور مروت (طوفان کے دیوتا) کو پوجتے تھے۔ ائیسپر یا میں بھی ان کے دیوتاؤں کے مندر تھے۔ ان کی تجارت مشرق میں آفریقی شہروں سے ہوتی تھی۔ ان تحقیقات کی تفصیل رایل ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل میں درج ہے، جو کیمبرج ہسٹری آف انڈیا کی پہلی جلد میں بھی مختصراً درج ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی کی ہسٹری (تاریخ) اور علم البشر کے پروفیسر نارائن چندر بندیہ اُپادھیا نے بھی ان تحقیقات کا مختصراً ذکر کیا ہے۔[3]

---

(1) "Renowned as it has become in Moslem literature, the horse was nevertheless a late importation into Ancient Arabia. This animal, for which Najid is now famous, is probably of Aryan origin.....The Hyksos passed the horse on from Syria into Egypt and the Lydians from Asia Minor into Greece." Phililp. K. Hitti: History of the Arabs. page 20.

(2) سندھ مین میر لوگ اصل میں اِسی میڈیا سے آئے تھے؛ وہ اصل میں سِتھیوں یا ساک لوگوں میں سے تھے، جیسا کہ ائکن صاحب والے سندھ گزیٹر کی جلد اول صفحہ ۱۸۷ کے تحت درج ہے۔ ''مید'' اور ''میر'' ایک ہی قسم کے الفاظ ہیں، جو ''ڈ'' اور ''ذ'' کبھی کبھار تبدیل ہو کر ''ر'' ہو جاتے ہیں۔ مثلاً، سنسکرت لفظ ''ادیتۃ وار'' کا تلفظ سندھی میں تبدیل ہو کر ہوا ''آذتوار'' اور اب کہتے ہیں ''آرتوار''۔ (مصنف)

(3) Narayan Chandra Bandyopadhaya: Development of Hindu Polity and Political, Theories, pages 20-23.

ان تحقیقات سے ایک الٹی قیاس آرائی کر کے کیمبرج ہسٹری آف انڈیا میں درج کیا گیا ہے کہ یہاں سے آریہ لوگ ایک دوسرے سے الگ ہوئے اور ہندستان والے آریہ لوگ یہاں سے مشرق کی طرف ایران کے راستے چلے گئے۔[1] درحقیقت یہ رائے یکسر غلط ہے: یہ تحقیق خود ظاہر کر رہی ہے کہ آریہ لوگ پہلے ہی سے وادیٔ سندھ میں تھے اور وہاں سے گھوڑے (مشرقی گدھے!) لاکر یہاں فروخت کرتے تھے۔ ان تحقیقات کے مطابق تین ہزار سال ق۔م آریوں کی بیٹھکیں پرشیا کے مغرب میں "میڈیا" سے لے کر بابل (بئبلونیا) تک تھیں اور ملک مصر کے ساتھ ان کے تعلقات تھے۔ اسی خطے کے وسط میں عرب لوگ رہتے ہیں، جن کی عربی زبان پر آج تک کوئی اثر نہیں ہوا ہے اور نہ ہی عربی زبان کا سنسکرت خواہ یورپی زبانوں پر ہوا ہے۔ عربی سیمیٹک خاندان کی زبان ہے اور سنسکرت اور یورپی زبانیں "آریہ" زبانیں ہیں: اگر تمام آریوں کا اصلی وطن یہاں ہوتا تو جس طرح سنسکرت، ایرانی اور یورپی زبانوں کا ایک دوسرے کے ساتھ گہرا تعلق ہے، اُسی طرح عربی سے بھی ہوتا، لیکن ایسا ہے ہی نہیں۔ یہ سچ ہے کہ عربی میں کچھ سنسکرت الفاظ موجود ہیں، مثلاً، سنسکرت لفظ "چندن" اور "کپور" کا تلفظ عربی میں "صندل" اور "کافور" ہے۔ ایسے الفاظ صرف تجارت کی وجہ سے عربی میں آ گئے ہیں۔ عرب لوگ مصالحہ جات وغیرہ کی تجارت ہندستان، سومالی لینڈ میں کرتے تھے، اس لئے یونانیوں نے اس بات کا ذکر کیا ہے۔ ایسے الفاظ بہت بعد میں عربی زبان میں مروج ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود اتنا ضرور کہا جائیگا کہ آریہ تہذیب کے کچھ کچھ اثرات اسی طرف ہوئے تھے۔

قدیم آریوں کی طرح، قدیم مصر کے باشندے اور قدیم یہودی سورج دیوتا کی پرستش کیا کرتے تھے۔ قرآن مجید میں تین بتوں "منات"، "عزیٰ" اور "لات" کے نام درج ہیں۔ ان تینوں کو دیویاں سمجھا جاتا تھا۔ "منات" کے معنی ہیں "تقدیر" یا "قسمت"، جسے ھندو لوگ عام طور پر "ودھاتا" (وردھاتا) یعنی قسمت یا نصیب کی دیوی کہتے ہیں۔ ھندو اور مسلمان آج بھی تقدیر یا قسمت پر اعتماد رکھتے ہیں۔ "عزیٰ" معنی "اعلیٰ یا بلند" ھٹی صاحب کی مرتب کردہ عربستان کی تاریخ کے مطابق یہ زہرہ یا شکر دیوتا (Venus) ہے اور "لات" سورج کی دیوی ہے۔ ان تینوں دیویوں کے مندر عربستان میں تھے۔ جیسا کہ ھٹی صاحب والی تاریخ میں درج ہے (صفحہ ۹۸ اور ۹۹)۔ یوں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے عربستان میں بت پرستی تھی، جو شاید ان دنوں شروع ہوئی تھی، جن دنوں آریوں کی بیٹھکیں میڈیا سے لے کر میسوپوٹیمیا

(1) The most feasible explanation of those discoveries seems to be that here, far to the west we have stumbled upon the Aryans on the move towards the East" Cambridge History of India Vol. 1 page 72.

تک تھیں۔ مصر کے لوگوں سے بھی آریوں کے تعلقات تھے، یہی وجہ ہے کہ مصری لوگ بھی سورج دیوتا کو پوجنے لگے تھے۔ بنی اسرائیل میں بھی شاید ان دنوں اس پرستش کا رواج پڑ گیا، جیسا کہ بائیبل میں درج ہے۔(1)

آریوں کی اسی طرف حکومت کا عربوں پر دوسرا بڑا اثر یہ ہوا کہ کچھ عرصے کے لئے عربوں نے تصوف یا صوفی ازم اختیار کیا۔ تصوف اور ویدانت بنیادی طور پر ایک ہی ہیں۔ ہندو آریوں کے آباء و اجداد اور ایرانی آریوں کے آباء و اجداد جن دنوں میڈیا سے لے کر میسوپوٹیمیا تک راج کرتے تھے، ان دنوں بعد تصوف ایران میں مزید پھلا پھولا۔ منصور، بایزید بسطامی؛ شیخ فریدالدین عطار اور دوسروں نے 'انا الحق' کا نعرہ لگایا، تو اس وقت کے ملا اور مولوی ان کے خلاف ہو گئے؛ اسی وجہ سے منصور کو تختۂ دار پر چڑھنا پڑا، لیکن بعد میں تو سارا ملک ہی منصور ہو گیا!

سيت پچار پرينءَ جي، سيت هوت حضور،
ملڪ مڙيوني منصور، ڪهي ڪهندين ڪيترا؟
(شاھ)

[ساری دنیا ہے حُسن سے معمور
فرش سے تا بہ عرش تیرا نور
ذرہ ذرہ ہے پیروِ منصور]
(ایاز)

ادھر ویدانیت کی شجرکاری نے ہندستان میں بہت سارے پھول کھلائے، اس کی جڑیں اب اتنی پختہ ہو گئی ہیں کہ جب تک ہندو قوم زندہ ہے، تب تک نکلنے والی نہیں ہیں۔ صوفی ازم سندھ میں بھی ایسا ہی وسیع میدان بنایا، جو آج تک ہندو خواہ مسلمان حقیقی بھائیوں کی طرح ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور اکٹھے 'حق موجود' کا نعرہ لگاتے ہیں۔ ہندو مسلم اتحاد کے لئے یہی راستہ ایک تیر بہدف علاج ہے۔ صوفیوں اور ویدانتوں کا کلام سندھی ادب کی بھی روح ہے۔ سندھی میں سے اگر یہ سارا کلام نکال لیا جائے تو سندھی ادب بعینہ مردہ مثل ہو جائیگا۔ ان حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر آریوں کا اصل وطن مغربی ایشیا کی طرف ہوتا، تو جیسے مذہبی باتوں کا اثر عربوں وغیرہ پر ہوا، اسی طرح عربی زبان بھی سنسکرت کے رنگ میں رنگی ہوتی؛ لیکن ایسا نہیں

(1) The religious custom alluded to in Esekiel undoubtedly refers to the religion of the Magi. The prophet complains that some of the Jews worship the Sun, holding towards their face certain twigs. Exactly the same custom of holding a bundle of twigs in the hands is reported by Strabo (XV. 314). Dr. Martin Haug: Essays on the Religion of the Parsis page. 4. footnote.

ہے۔ اس سے مزید ظاہر ہوتا ہے کہ وادیٔ سندھ کے پنی لوگوں کے اس طرف آنے سے پہلے ہی عربی زبان اپنے رُو ترقی کرکے، ایسے پختہ پائے پر کھڑی تھی، جو آج تک اس کا تعلق سنسکرت خواہ یورپی زبانوں سے کسی کو نظر نہیں آیا۔

ویدک زمانے کی ابتدا: یورپی لوگوں کو اپنے آباء و اجداد کے قدیم احوالوں کا کچھ پتہ نہیں تھا، بعد میں جب زبانوں پر تحقیقات اور ویدوں میں سے تاریخ کی کرنیں تجلّے دیتی ہوئی انہیں نظر آئیں، اور ویدوں میں انہوں نے گہرا فلسفہ بھی دیکھا، تو ان کا مطالعہ کرنا ایک ضروری اور اہم امر سمجھا گیا۔ ساتھ ہی یہ فطری سوال بھی از خود پیدا ہوا کہ ویدک زمانہ کب شروع ہوا؟ اب دیکھیں کہ وہ کس طرح تحقیقات کرتے ہیں۔

ہندوؤں کے ویدوں میں 'منتر' اور 'چھند' ہیں اور ان کے بعد 'براہمن' (گرنتھ) اور 'سوتر' ہیں۔ ان چاروں کی زبان میں تبدیلی دیکھ کر، پروفیسر منکس ملر نے کہا یہ ایک دوسرے سے دو دوسو برس بعد کے لکھے ہوئے لگتے ہیں۔ اس طرح ہوئے فی الجملہ آٹھ سو برس۔ سوتروں والے زمانے کے بعد کے بدھ مت اور جین مت والوں کے مذہبی پستک ہیں، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ان مذاہب کی ابتدا سے کچھ عرصہ پہلے ویدک زمانہ اختتام پذیر ہو چکا تھا۔ گوتم بدھ اور مہا بیر سوامی، جس نے بدھ دھرم اور جین دھرم کی بنیاد ڈالی تھی، وہ چھ صدیاں ق۔م گذر چکے ہیں؛ لیکن پروفیسر منکس ملر اس وقت تقریباً چار صدیوں کا شمار کرتے ہیں۔ یوں حساب لگا کر اس نے کہا کہ ویدک زمانہ ایک ہزار یا بارہ سو برس ق۔م شروع ہوا تھا۔ پروفیسر منکس ملر نے خود رگ وید کا ترجمہ کیا تھا۔ اس کے پہلے ایڈیشن کے ابتدائی صفحات ۵ اور ۷ میں یہ بات انہوں نے خود کہی ہے؛ لیکن صاف ظاہر ہے کہ یہ سارا تکے کا حساب ہے۔

پروفیسر منکس ملر کے دور میں ایک دوسرا نامور عالم ڈاکٹر مارٹن ہاگ تھا۔ ویدک ادب کے منتروں، چھندوں، براہمنوں اور سوتروں کی زبان میں اس صاحب کو بھی فرق دیکھنے میں آیا؛ اور اس نے کہا کہ یہ ایک دوسرے سے پانچ پانچ سو برس بعد کے لکھے ہوئے لگتے ہیں، یوں فی الجملہ دو ہزار سال ہوئے۔ اس صاحب کے مطابق بھی گوتم بدھ چار صدیاں ق۔م گذر چکا تھا، اس لئے ان چار صدیوں کو ملا کر اس نے کہا کہ ویدک زمانے کا آغاز چوبیس سو سال ق۔م ہوا تھا۔ رگ وید کے آخر میں جو ائتریہ براہمن گرنتھ ہے، اس کا ترجمہ اسی ڈاکٹر مارٹن ہاگ نے کیا تھا اور اپنی اسی کتاب کے ابتدائی صفحات میں سے ۴۸ویں صفحہ پر یہ بات اس نے خود درج کی ہے۔ لیکن یہ بھی ایک قیاس پر مبنی حساب ہے جو کسی پختہ پایہ پر نہیں۔

پروفیسر کیتھ، پروفیسر منکڈونیل، پروفیسر وٹنی، ڈاکٹر اولڈنبرگ اور کچھ دیگر حضرات بھی، جو ویدک علماء تھے، انہوں نے بھی یہی کہا کہ ویدوں کے منتر دس، گیارہ یا بارہ برس ق۔م کے ہیں؛ لیکن پختہ ثبوت کسی نے بھی نہیں دیا۔ ایسے علماء کی جب اس طرح کی آرائیں ظاہر ہوئیں تو جنہوں نے قدیم ہندستان کی تاریخیں مرتب کیں، انہوں نے یہی کہا کہ ویدک زمانہ ہزار ڈیڑھ یا دو ڈھائی ہزار برس ق۔م شروع ہوا تھا اسی زمانہ میں آریہ لوگ ہندستان میں آئے تھے! الغرض، بعض نے پروفیسر منکس ملر، پروفیسر کیتھ اور دوسروں کی آراء کو درج کیا، تو کچھ نے ڈاکٹر مارٹن ہاگ کی رائے درج کی؛ لیکن اپنی ذہانت سے کام نہیں لیا۔ پھر تو دوسرے تاریخ نویس بھی اپنی سوچ بچار کے بغیر یہی سر الاپنے لگے اور آج تک تاریخوں میں یہی سر الاپتے آرہے ہیں! ان تاریخ نویسوں کی آنکھیں کھولنے کے لئے گذارش ہے کہ کسی بھی یورپی عالم ویدک زمانہ کا آغاز ۲۴۰۰ ق۔م سے زیادہ نہیں کہا، اس کی دو وجوہ تھیں:

(۱) سنہ ۱۸۵۹ع سے پہلے ساری دنیا کے عیسائی لوگ یوں سمجھتے تھے کہ جس سال خدا نے آسمان، زمین وغیرہ خلق کئے، حضرت آدم اور بیبی حوا کو پیدا کیا، وہ سن ۴۰۰۴ ق۔م تھا! یہ سن ان کی بائیبل میں، پیدائش کی کتاب (Genesis) کے پہلے ہی صفحہ پر حاشیہ میں لکھا ہوا ہے۔ بلاشک آج بھی کوئی صاحب بائیبل دیکھ کر تسلی کر لے۔(1) آج وہی یورپی اور دوسرے عیسائی لوگ اس بات پر ہنستے ہیں اور کھلم کھلا کہتے ہیں کہ بائیبل کے الگ الگ صفحات پر، حاشیوں میں، جو بھی سن درج ہیں، وہ تمام کے تمام سراسر غلط ہیں، اور ان پر کسی بھی طرح یقین نہیں کرنا چاہئے۔ بائیبل جیسے دینی اور پاک کتاب میں یہ غلط سن کس نے لکھے؟ یہ حقیقت بھی معلوم ہوسکتی ہے۔

یہودیوں کی دینی کتب میں کچھ باتیں درج ہیں، ان کے مطابق آرچ بشپ اشر نے اپنے طور حساب لگایا؛ کہا کہ فلاں بات اتنے عرصے کے بعد ہوئی ہوگی، اور اتنا عرصہ بعد فلاں بات ہوئی ہوگی، یوں اپنی طرح حساب لگا کر، اس بات پر آکر رک گیا کہ دنیا کی پیدائش ۴۰۰۴ برس ق۔م ہوئی تھی! تمام عیسائی اس کی یہ تحریر ان دنوں صحیح سمجھ رہے تھے، لیکن اب وہ خود تسلیم کرتے ہیں کہ آرچ بشپ اشر نے یہ سن درج کرکے خود کو مضحکہ خیز بنا دیا ہے۔(2) اب اچھی

(1) "Prior to 1859 A.D. the people of Christendom rested secure in the supposition that the chronology of man's history was fully known, from the very year of his creation. One has but to turn to the first chapter of Genesis to find in the margin the date 4004 B.C. recorded in all confidence as the year of man's first appearance on the globe. "Historians History of the World, Vol. 1, page 23. Edited by Henry Smith William L.L.D. (London 1908).

(2) "Sinologists, Assyriologists, Egyptologists have not been able to agree on results sought by this method, and, though Archbishop Usher's attempt to discover in this way, from the Hebrew records, the correct date of the creation was long accepted, it is now more matter for derision." Cambridge History of India, Vol. 1, Page 171.

طرح سمجھ میں آئیگا کہ تمام دنیا کی پیدائش سے متعلق جن کا ایسا الٹا عقیدہ تھا، وہ ویدک زمانے کی شروعات بھی ضرور اسی دماغ میں بیٹھے ہوئے خیالات کے مطابق ہی بتائیں گے۔ حقیقت یہی ہے کہ زبانوں اور تاریخ کی تحقیقات کے دوران، جیسے جیسے آرکیالاجی اور جیولاجی میں ترقی کرتے گئے، ویسے ویسے ان کا دماغ بھی کھلتا گیا۔ پھر وہ جان گئے کہ اس دنیا کو پیدا ہوئے بے شمار برس ہو چکے ہیں، اور آرچ بشپ اُشر نے بلکل غلط حساب لگایا تھا؛ اس بنا پر ہم کہ سکتے ہیں کہ اس وقت کے یورپی لوگوں سے ہمارے آریہ سماج والوں کا دماغ مزید کھلا ہوا تھا، جنہوں نے جوتش کے حساب مطابق کئی سالوں سے یوں کہا ہے کہ اس دنیا کو پیدا ہوتے ہوئے ایک عرب، ستانوے کروڑ اور کئی ایک ھزار برس ہو گئے ہیں۔

دنیا کی پیدائش سے متعلق یورپی علماء کا گذشتہ خام خیال اگرچہ کئی برسوں سے بلکل مٹ گیا ہے، پھر بھی ویدک زمانے کی شروعات سے متعلق یوں ہی کہتے رہے ہیں اور اب بھی کہتے ہیں کہ ویدک زمانہ ایک ڈیڑھ ہزار یا دو ڈھائی ھزار برس ق۔م شروع ہوا تھا! اس کی ایک اور وجہ ہے۔ وہ یہ کہ:

رگ وید کی زبان اور پارسیوں کے زنداوستا کی زبان ایک دوسرے کے بلکل قریب ہیں۔ زنداوستا بہت بعد کی لکھی ہوئی ہے، اور اس کی زبان کسی قدر قدیم پارسی جیسی ہے، اس لئے انہوں نے یوں سمجھا کہ رگ وید بھی اتنا زیادہ قدیم نہیں ہے؛ لیکن یہ ان کا محض قیاس تھا، جو کسی بھی شمار میں نہیں۔ اس کے لئے سندھی سے ایک مثال لیتے ہیں۔ سندھ میں اسلام کی آمد کو سوا گیارہ سو برس بیت چکے ہیں، پھر بھی عربی اور فارسی کا سندھی پر کوئی بینادی اثر نہیں ہوا ہے۔ اسی وجہ سے کیا یوں کہا جائے گا کہ اسلام کی آمد کو سوا گیارہ سو سال نہیں ہوئے؟ انگریزوں کو یہاں آئے فقط ایک سو سال ہوئے ہیں، تو بھی بہت سارے انگریزی الفاظ سندھی میں عام ہو گئے ہیں، بلکہ کچھ نوجوان Indirect Speech والے جملے سندھی میں استعمال کرتے ہیں! اسی وجہ سے کیا یوں کہا جائیگا کہ انگریزوں کو یہاں آئے ہوئے ایک صدی نہیں بلکہ کئی صدیاں ہوئی ہیں، کیونکہ سندھی زبان کے جملوں پر یہ ایک بہت بڑا اثر ہوا ہے جو مسلمانوں کی حکمرانی کے دنوں میں بھی نہیں ہوا؟ ایک زبان کا دوسری زبان پر اثر حالات کی مناسبت سے کبھی جلد کبھی بدیر ہوتا ہے، اس لئے اس قسم کے عرصوں کو معلوم کرنے کے لئے زبان کو معیار بنانا بلکل فضول ہے۔ الغرض، تاریخوں میں درج یہ سن کسی بھی بنیاد پر نہیں ہیں، اس لئے انہیں سراسر غلط سمجھنا چاہیے۔

ہندوؤں کا عام طور پر عقیدہ یہ ہے کہ وید ازلی ہیں، یہ بات آجکل کے ہندوؤں نے اپنے اندر سے نہیں گھڑی، لیکن اتہاسوں اور پرانوں میں ایسے ہی لکھا ہوا ہے۔ سایَن آچاریہ، جس نے ویدوں پر شرح لکھی ہے، اس نے بھی یوں ہی لکھا ہے کہ وید "اپَورشیہ" ہیں، یعنی کسی بھی آدمی کے

بنائے ہوئے نہیں ہیں؛ لیکن خدا کا کلام ہیں، ''آنادی'' ہیں یعنی ان کی آد (شروعات) ہے ہی نہیں، اور ''انتیـــہ'' یعنی ابدی ہیں۔ (Existinginalleternity)۔ اب جب تاریخوں کے وسیلہ سے یکسر غلط اور بے بنیاد باتیں پھیلیں، تو یہ گویا کہ ہوا ہندوؤں کے عقیدے کا مذاق اڑانا کہ وید ''آنادی'' نہیں ہیں؛ لیکن ایک ڈیڑھ ھزار یا دو ڈھائی ھزار برس ق۔م کے ہیں! بہت سارے غیرمند ہندوؤں کو یہ بات اچھی نہیں لگی، لیکن پروفیسر منکس ملر اور ڈاکٹر مارٹن ہاگ جیسے ویدک عالموں کو رد دے کون؟

پورے ہندستان میں پہلا پہلا ملکی عالم لوکمانیہ بال گنگادھر تلک تھا جس نے بوسیلہ اپنے سنسکرت علم اور علم جوتش، ان یورپی علماء کو ان کی غلطی کا احساس دلایا۔ اس بات کو یہاں مختصراً بیان کیا جاتا ہے:

وید کی کتابوں میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جن کا جوتش سے تعلق ہے۔ مثلاً، آجکل مکر سنکرانت یا ''اتران'' اکثر اوقات ہر سال ۱۴ جنوری کو ہوتا ہے۔ یہ سندھی مہینہ پوھ ہے۔ جس میں سورج سنکرانت کر کے یعنی پھر کر ''اترائن'' یعنی اتر (شمال) کی جانب رخ رکھتا ہے۔ رگ وید والے زمانے میں 'اترائن' کے وقت (Summer Solitice) میں، سورج ''مرگھ شیرش'' یعنی منگھر یا ناہری نکھتر میں ہوتا تھا۔ ''مرگھ شیرش'' کے لفظی معنی ہیں ''مرگھ (ہرن) کی سری'' (Antelope's head) اور عام طور پر اسے ''اورین'' (Orion) کہا جاتا ہے۔ اس نکھتر کے تارے اس انداز میں نظر آتے ہیں، جو گویا کہ آسمان میں ہرن کی سری لگی ہوئی ہے۔ ان میں سے تین تارے سیدھی لائین میں ہوتے ہیں، جن کو ہم سندھی میں 'ٹیڑو' کہتے ہیں۔

کتين کر موڙيا، تيڙو اُيا تيئي،
راڻو رات نه آيو، ويل ٽري ويئي.
(شاھ)

[ختم ہوتی ہے رات آ بھی جا
اے نگار حیات آ بھی جا
وہ ستارے چھپے چراغ بجھے
بجھ گئی کائنات آ بھی جا
تا بہ کے اشکباریٔ پیہم]
(ایاز)

رگ وید کے زمانے میں سورج اترائن وقت اسی مرگھ شیرش نکھتر میں ہوتا تھا، لیکن ویدوں کے براہمن گرنتھ کے زمانے میں ''کرتکا'' (Pleiades) نکھتر میں ہوتا تھا۔ ان دنوں نکھتر چیٹ

کے مہینے سے شمار ہوتے ہیں، اس لئے سندھی سال کا پہلا مہینہ ''چیٹ'' ہے۔ اتنی تبدیلی کتنے عرصے میں واقع ہوسکتی ہے، اس کا علم جوتش کے حساب کے مطابق شمار کر کے سنہ ۱۸۹۳ع میں لوکمانیہ تلک ''اورین'' (Orion or Researches into the Antiquity of the Vedas) کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس میں کئی ایک ثبوت فراہم کر کے اس نے ثابت کیا کہ رگ وید کے جن منتروں میں سے معلوم ہوتا ہے کہ اترائن (Summer Solitice) وقت سورج مرگھ شیرش (منگھر یا ناھری) نکھتر میں ہوتا تھا، وہ ساڑھے چار ہزار سال قبل مسیح کے ہیں۔ ان منتروں سے کچھ قدیم منتر چھ ہزار برس ق۔م کے ہیں۔ اس سلسلے میں مزید تحقیقات کر کے اپنی تصنیف کردہ کتاب ''آرکٹک ہوم'' میں لکھا کہ خود رگ وید سے معلوم ہوتا ہے کہ رگ وید کے موجودہ منتروں سے کچھ قدیم منتر تھے، جنہیں ''نوذ'' اور ''نگد'' کہا جاتا تھا، جو آٹھ دس ہزار برس ق۔م بڑے سیلاب کے زمانے میں گم ہو گئے، جیسا کہ مہا بھارت کی شانتی پرو سے معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ وید اس زمانے سے بھی بہت پہلے کے ہیں، اس لئے سے ہندو یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ وید آنادی ہیں۔

ویدوں کے اخیر میں جو براہمن گرنتھ (فقہ کی کتب) ہیں، ان میں سے حوالے دے کر جوتش کے حساب کے مطابق اس نے لکھا کہ براہمن کے زمانے میں ڈھائی ہزار برس ق۔م سورج ''کرتکا'' (Pleiades) نکھتر میں ہوتا تھا، اور وہ زمانہ ۱۴۰۰ ق۔م تک جاری رہا، جیسا کہ وید انگ جوتش میں درج ہے۔ (ملاحظہ فرمائیں ''اورین''، آٹھواں باب، صفحہ ۱۹۸ سے لے کر ۲۰۷ تک)۔

لوکمانیہ تلک کی یہ ''اورین'' کتاب سنہ ۱۸۹۳ع میں چھپ کر شایع ہوئی۔ پروفیسر میکس ملر اور دوسرے یورپی علماء، جنہوں نے ویدوں سے متعلق الٹہ حساب لگایا تھا، ان میں سے بہت ابھی زندہ تھے۔ ان دنوں کچھ یورپی عالم بھی جوتش کا علم رکھتے تھے۔ ڈاکٹر جیکبی (Dr. Jacobi, of Boren) اپنے طور لوکمانیہ تلک کے حساب کو جانچ کر، علانیہ کہا کہ لوکمانیہ کا حساب بلکل صحیح ہے۔ ڈاکٹر وٹنی، جس نے ویدک سنسکرت کی گریمر تصنیف کی تھی، اسے، خواہ دیگر کن یورپی علماء کو بھی یہ حساب دل سے لگا؛ پھر بھی کہنے لگے کہ ابھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس بات کا کوئی قطعی فیصلہ ہو گیا ہے۔ دوسرے یورپی علماء نے ان کی اس رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ پروفیسر بلومفیلڈ (Professor Bloomfield)، ایم۔ بارتھ (Mr. Barth)، ڈاکٹر بلہر (Dr. Bulher) علانیہ اظہار کرتے ہوئے کہا کہ لوکمانیہ کے دلائل بلکل وزندار ہیں۔

لوکمانیہ کے بعد ہمارے دوسرے علماء بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ مسٹر ایس۔ بی۔ ڈکشت (Mr. S.B. Dixit) اور معروف جوتشی مسٹر کیٹکر (Mr. V.B Ketkar) ویدوں کے براہمن، خصوصاً شتپتھ براہمن (شکل یجروید) اور تیتریہ براہمن (کرشن یجر وید) میں سے اور بھی

دوسرے ثبوت فراہم کر کے ثابت کیا کہ لوکمانیہ کا حساب بلکل درست ہے۔ یوں یورپی علماء کے بھیجے کھل گئے اور پہلے والے ان کے خیالات کافی حد تک جاتے رہے، جلد ہی جان ہاپکن کی یونیورسٹی کے اٹھارویں اجلاس میں لوکمانیہ تلک کی کتاب ''اورین'' کی تقریظ کرتے ہوئے پروفیسر بلومفیلڈ نے یہ الفاظ کہے:

> "The language and literature of the Vedas is, by no means, so primitive as to place with it, the real beginnings of Awyan life... These in all probability and in all due moderation reach back several thousands of year more."

پروفیسر بلومفیلڈ کے یہ الفاظ لوکمانیہ تلک اپنی کتاب ''آرکٹک ہوم'' کے دیباچے کے صفحے ۲ پر درج کئے ہیں۔ ہندوؤں کی تہذیب کے بارے میں جب اس طرح کی آرائیں آشکار ہوئیں کہ یہ ہزارہا برس پرانی ہے، تو دوسرے علماء مزید تحقیقات میں لگ گئے۔

ڈاکٹر ابناش چندر داس رگ وید میں سے کچھ حوالے اور ان سے متعلق جیولاجی کے اور کچھ دوسرے قسم کے ثبوت فراہم کر کے اپنی کتاب ''رگ ویدک انڈیا'' میں تحریر کیا کہ رگ ویدک تہذیب پچیس ہزار برس ق۔م شروع ہوئی اور سات ہزار سال ق۔م عروج پر پہنچ گئی۔(1) ڈاکٹر ونٹرنز اور دیگر کچھ علماء نے اس بات پر یقین نہیں کیا، تو بھی آج کئی ایک علماء یہ کہہ رہے ہیں کہ جس طرح ھندوؤں کی تہذیب قدیم ہے اسی طرح ان کا دھرم بھی قدیم ہے، اور اس بات میں پوری دنیا میں سے کوئی بھی قوم ہندوؤں سے برابری نہیں کرسکتی۔(2)

اس سلسلے میں ہمارا کہنا فقط یہ ہے کہ انسان ذات کی پیدائش کو کئی ایک جگ بیت چکے ہیں۔ قدیم آریہ لوگ بھی کوئی آجکل پیدا نہیں ہوئے تھے۔ ان کی تہذیب کی ابتدا کب ہوئی، ویدک زمانہ کب شروع ہوا، ان سے متعلق اگرچہ تخمینہ لگانا مشکل کام ہے، پھر بھی اتنا ضرور کہیں گے کہ اب جو خود یورپی علماء میں سے کچھ مان رہے ہیں کہ جتنی ہندوؤں کی تہذیب قدیم ہے، اتنا ان کا دھرم بھی قدیم ہے، تو اس بات کو کوئی بھی رد نہیں کرسکتا۔

دوسری بات یہ کہ اس وقت جو بہت تاریخ نویس لکھ رہے ہیں کہ ویدک زمانہ ایک ڈیڑھ ہزار یا دو ڈھائی ہزار برس ق۔م شروع ہوا تھا اور آریہ لوگ تب ہندستان میں آئے تھے، یہ سراسر غلط باتیں

---

(1) "The Rg Vedic civilization had its beginnings in Sapta Sindhu about 25000 years ago, and was at its height probably in the seventh Millennium B.C." Dr. A.C. Das: Rg Vedic India, preface to the second edition and p.p. 590-591.

(2) No nation on earth can rise with the Hindus in respect of the antiquity of their civilization and antiquity of their religion." Count Bjornstjerna: Theogony of the Hindus. page 250.

ہیں۔ ویدک زمانہ نہایت ہی قدیم ہے اور آریہ لوگ بہت بعد میں میرو پربت سے ہندستان میں آئے، اس لئے یہ دو الگ الگ زمانے ہیں اور اس تفاوت کو تاریخوں میں ضرور درج کرنا چاہئے۔

تاریخ کا مرتب ہونا: یورپی علماء نے یوں ہر ایک بات پر بہت سارے بحث مباحث کر کے، ہندوؤں کی ویدک کتب میں سے کئی ایک تاریخی احوال حاصل کر لئے، حقیقتاً ویدک کتب میں مذہبی باتیں ہیں؛ لیکن ان میں بہت سی سماجی خواہ دوسرے امور سے متعلق حوالے ہیں، اس لئے ہندوؤں کی زندگی کا نقشہ ان میں سے اچھی طرح کھینچا جا سکتا ہے۔ اتہاسوں اور پرانوں میں تو کئی ایک قدیم راجاؤں اور رشیوں کے شجرے اور ان کے کارنامے درج ہیں، لیکن وہ تمام کے تمام مذہبی باتوں اور کہانیوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ یورپی علماء نے بڑے ہوش سے کام لے کر، ان مذہبی باتوں اور کہانیوں میں سے تاریخی احوال یوں بیٹھ کر نکالے، جیسے کوئی شخص عیسائیوں کے انجیل یا مسلمانوں کے قرآن مجید میں سے تاریخ کے لئے مواد بیٹھ کر نکالے۔ یہ ایک نیا طریقہ تھا جو انہوں نے اختیار کیا تھا، جس میں دونوں خوبیاں اور خامیاں موجود ہیں۔ اس طریقہ میں خوبی یہ ہے کہ اس طرح مذہبی کتب میں سے اندرونی ثبوت دے کر، اس وقت کے احوال کو ظاہر کیا جاتا ہے، اس لئے وہ احوال قابلِ بھروسہ ہوتے ہیں۔ یوں بھی ہے کہ اگر کسی لفظ یا محاورہ کی ایک شخص ایک معنیٰ لیتا ہے تو دوسرا دوسری معنیٰ لیتا ہے، تو پھر بات بدل جائیگی، اس لئے پھر ایسے احوال پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کام بہت ہی احتیاط سے کرنا ہے۔ یورپی علماء نے اگرچہ حتی المقدور سنبھال کر کام کیا، پھر بھی وہ کچھ غلطیاں کر بیٹھے۔ تاہم، اتنا ضرور کہینگے کہ وہ اپنے کام میں بڑی حد تک کامیاب رہے، اس لئے انہیں آفرین ہو۔

اتہاسوں اور پرانوں میں سے تاریخی احوال نکالنے میں انہیں ایک اور مشکل کا سامنا ہوا۔ ہندوؤں کے پرانوں میں جو راجاؤں، رشیوں اور دوسرے لوگوں کے احوال ہیں، ان کا پھیلاؤ پچھلے زمانے میں نسل در نسل سینہ بسینہ ہوتا تھا۔ ہندوؤں نے انہیں بہت ہی بعد میں قلمبند کیا۔ اس کا ایک نتیجہ تو یہ نکلا ہے کہ کچھ باتیں کسی پران میں ایک طرح، تو کسی میں قدرے دوسری طرح درج ہیں۔ کن پرانوں میں راجاؤں کے شجروں میں کچھ ایسے نام ہیں، جو دوسرے پرانوں میں نہیں ہیں۔ کن پرانوں میں کوئی ایسا بھی احوال ہے، جو دوسرے پرانوں میں نہیں ہے۔ کسی کسی جگہ پر کچھ اختلافات بھی پائے جاتے ہیں، ان چھوٹے موٹے تفاوتوں کے باوجود تمام پرانوں اور اتہاسوں کے مضامین بڑی حد تک ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں تمام پرانوں کا اول آپس میں موازنہ کر کے، پھر درست بات ڈھونڈھ نکالنی ہے، جو نہایت ہی کٹھن کام ہے۔ مسٹر ایف۔ جی۔ پارجیٹر، جو پہلے کلکتہ ھاءِ کورٹ کا جج تھا، اس نے یہ کٹھن کام اپنے سر لیا۔ اس صاحب نے تمام پرانوں اور اتہاسوں کا ایک دوسرے سے موازنہ کر

کے، اور ہر ایک بات کو تنقید کے ترازو میں تول کر، ان میں سے خالص تاریخی احوال نکال کر، ایک نہایت ہی کارآمد کتاب (Ancient Indian Historical Tradition) رقم کی، جو ۱۹۲۲ء میں لنڈن کی آکسفورڈ یونیورسٹی پریس میں سے چھپوا کر شایع کی، ایسی دوسری کتاب (Chronology of Ancient India) ڈاکٹر ستیاناتھ پردھان سلہٹ کالیج کے سابقہ پروفیسر نے لکھی، جو ۱۹۲۷ء میں چھپ کر شایع ہوئی۔ اسی کتاب پر بھی اچھی خاصی محنت کی گئی ہے۔ اس کتاب میں انہی تحقیقات اور دیگر بلکل تازہ تحقیقات کے مطابق احوال درج ہیں؛ لیکن قدیم ہندستان کی تاریخیں، جو پہلے ہی چھپ کر شایع ہو چکی ہیں؛ ان میں بہت سارے احوال ہیں ہی نہیں۔ مہن جو دڑو بھی انگریزوں نے حال ہی میں کھدوایا ہے، اس لئے پہلے مرتب کی گئی تاریخوں میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں۔ اس کے باوجود ہم اتنا کہیں گے کہ گذشتہ انیسویں صدی میں کئی ایک یورپی علماء نے ان تھک اور بغیر اکتائے ہوئے، خالص تاریخی احوال ہندوؤں کے ویدوں، اتہاسوں (زامائن اور مہا بھارت) اور پرانوں بلکہ ویدوں کے براہمن گرنتھوں اور اپنشدوں میں سے، جین مذہب اور بدھ مذہب والوں کے مذہبی کتب اور جاتک کتھاؤں (گوتم بدھ کی جنم کہانیاں) میں سے، کچھ یونانی، لاطینی اور چینی سیاحوں کے سفرناموں میں سے، مہاراجا اشوک کے کندہ نوشتوں اور کچھ قدیم سکوں میں سے، سمیٹ کر، ہمیں قدیم ہندستان کی تاریخ مرتب کر کے دی۔ اس میں اگرچہ کچھ باتیں انہوں نے درج ہی نہیں کیں اور غلطیاں بھی کی ہیں، جو بعد میں معلوم ہوئیں، تاہم، انہیں شاباس ہو، جو ایک دفعہ انہوں نے بُنائی کی مشین لگا دی۔ کچھ عرصوں کے احوال آج تک انہیں نہیں ملے، اس لئے تاریخوں میں ابھی تک یہ خال موجود ہیں، اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ قدیم ہندستان کی تاریخیں، جو دور حاضرہ میں اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائی جاتی ہیں، وہ سب نامکمل ہیں۔ آج کے بعد اگر آرکیالاجیکل محکمہ والے مزید تحقیقات کر کے، یہ موجودہ خال پُر کردیں تو یہ اور بات ہے۔ اتنا ضرور کہیں گے کہ ''ناست سے آست اچھی'' یعنی ''نہ ہونے سے ہونا بہتر''، جو پہلے تو کوئی آسرہ ہی نہیں تھا، کہ ہندستان کی تاریخ مرتب ہو سکے گی۔

یورپی علماء کو اس طرح کے جذبے کے ساتھ کام کرتے ہوئے دیکھ کر، ہمارے کچھ ملکی علماء کو بھی رشک آیا۔ انہوں نے اپنے طور تحقیقات کر کے یورپی علماء کی کی ہوئی غلطیوں کی اصلاح کی ہے اور قدیم سندھ کے مزید احوال بھی چھپوا کر شایع کئے ہیں۔ اس وقت تک ہندوؤں کی، بلکہ پورے مشرق کی، ساری مذہبی کتب انگریزی میں ترجمہ ہو چکی ہیں، جن میں سے کچھ یورپی اور کچھ ملکی علماء نے ترجمہ کی ہیں۔ ویدوں کے منتروں والے زمانے میں قدیم ہندستان کے لوگ اپنی زندگی کیسے گذارتے تھے، یہ دلکش باتیں مسٹر پی۔ ٹی۔ شرینواس آینگر نے لکھی ہیں۔[1] بابو رومیش چندردت نے آریوں کی تہذیب کی تاریخ لکھی ہے۔ ڈاکٹر راجیندر لال متر نے ''انڈو آرینس (ہندستان کے آریوں) سے متعلق

(1) Mr. P.T. Sirinivas Iyenger: Life in Ancient India in the Age of the Mantras.

لکھا ہے، جس میں قدیم آریوں کی عمارت سازی اور دیگر امور کا تذکرہ ہے: کچھ علماء نے آریوں کے ہتھیاروں، تو کچھ نے رسم و رواج سے متعلق لکھا ہے۔ لوکمانیہ بال گنگادھر تلک اپنے طور تحقیقات کر کے ''اورین'' اور ''آرکٹک هوم'' ناموں سے کتب لکھی ہیں، جس کی وجہ سے پورے ہندستان، بلکہ ہندستان سے باہر بھی، مشہور ہو گیا ہے: ڈاکٹر اناش چندرداس بہت محنت کر کے ''رگ وید انڈیا'' اور ''رگ ویدک کلچر'' ناموں سے مفید کتابیں لکھی ہیں۔ کچھ قدیم کتب بھی ڈھونڈھ لی گئی ہیں۔ مثلاً، سنہ ۱۸۷۵ء میں ڈاکٹر راجیند رلال متر ''شکرنیتی'' نے ڈھونڈھ نکالی۔ تقریباً چالیس برس پہلے مسٹر شام شاستری کو نروندرم (مدراس محکمہ) میں سے کوٹلیہ کی ''ارتھ شاستر'' ہاتھ لگ گئی، جو تقریباً سوا تین سو برس ق۔م کی کتاب ہے۔ ان کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم زمانے میں ہندوؤں کی حکومت کا نظام کس طرح کا تھا۔ اسی طرح بانا بھٹ کی کتاب ''سری ہرش چرتر''، کلھن کی کتاب ''راجترنگنی'' (کشمیر کے راجاؤں کی تاریخ سنہ ۱۱۴۸ع مین رقم کردہ) اور دوسری کئی کتب اب تک چھپ کر شایع ہو چکی ہیں۔ ''انڈین اینٹیکری'' (Indian Antiquary) اور ہسٹاریکل سوسائٹیوں والے بھی بخوبی سعی میں مصروف عمل ہیں، جس وجہ سے قدیم ہندستان کی تاریخ تیار کرنے کے لئے ذخیرہ دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔

کیمبرج آف انڈیا کی جلد اول کے دیباچہ میں درج ہے کہ پہلے یوں لگتا تھا جیسا کہ قدیم ہندستان کی تاریخ جانے کو چلی گئی ہے اور اسکے مرتب ہونے کا کوئی آسرا نہیں تھا؛ لیکن اس وقت تک اتنا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے، کہ کسی بھی ایک شخص کی کیا مجال ہے کہ قدیم ہندستان کی مکمل تاریخ تیار کر سکے۔ اب جب بہت سارے افراد اس کام میں لگ جائیں، تب جا کر یہ کام اپنے پائے تکمیل تک پہنچے گا۔ اس کے باوجود اتنا ضرور کہیں گے کہ آج کے بعد بھی تاریخ کے لئے چاہے کتنا ہی مواد ہاتھ لگے، تو بھی قدیم ہندوؤں کی زندگی اور رسم و رواج کا جیسا مکمل پتہ گریھ سوتروں میں سے پڑتا ہے، ویسا کسی بھی کتاب سے نہیں پڑ سکتا۔ پوری دنیا میں اگر عمرانیات (Sociology) بنسبت کوئی پرانے دینی کتب ہیں تو وہ گریھہ سوتر ہیں، نہ صرف سندھ، بلکہ پورے ہندستان کے ہندو ان سوتروں کے مطابق زندگی گذارتے ہیں۔ ان سوتروں میں درج رسم و رواج کا موازنہ جب قدیم یورپ کے رسم و رواج کے ساتھ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ہندوؤں کے رسم و رواج کا یورپ، خصوصاً یونان اور روم پر گہرا ہی اثر ہوا ہے۔ اس وجہ سے بہت یورپی علماء نے گریھہ سوتروں کی اہمیت اب بڑی حد تک محسوس کی ہے[1] اور ان کی مدد سے مزید تحقیقات کر

(1) The Grith..Sutras, insignificant though they may be as literary works, afford us a deep insight into the life of ancient Indians. They are in truth a real treasure for the ethnologist... The numerous parallels in the manners and customs of the Indo-European peoples, which have been discovered long ago, with the usages described in the Grith Sutras make these documents all the more important. In particular, the comparison of the Greek, Roman, Teutonic and Slavonic marriage customs with the rules contained in the Grith-Sutras has shown that the relationship of the Indo-European peoples, is not limited to language, but that these peoples, related in language, have also preserved common features from prehistoric times in their manners and customs." Dr. Wintermitz; History of Indian Literature, Vol. 1, p.274.

رہے ہیں۔ ہندوؤں کی تہذیب کا اثر مغربی ایشیا، ملک مصر، یونان اور یورپ کے کچھ دوسرے حصوں پر کیسے ہوا اور کس قدر ہوا، اس سے متعلق پوکوک صاحب اور کچھ دیگر علماء نے کتب رقم کی ہیں۔ ہندو تہذیب کا پھیلاؤ امریکا میں ہوا، اس سے متعلق مسٹر چمن لال ''ہندو آمریکا'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، جو قابلِ مطالعہ ہے۔

ذخیرہ برائے تاریخ سندھ: قدیم سندھ کی تاریخ، سندھ کی سلسلے وار تاریخ، سندھ کے جنم سے لرکر، مرتب کرنے میں پہلے بڑی سہولت ہمیں جیولاجیکل محکمہ اور آرکیالاجیکل محکمہ والوں نے کر کے دی ہے۔ وہ تاریخ سے پہلے کا زمانہ (Pre-historic period) ہے یعنی اس وقت کی لکھی ہوئی کوئی بھی کتاب نہیں ہے، اس لئے ہمارا سارا انحصار ان محکموں کی طرف سے کی گئی تحقیقات پر ہے۔ سندھ کی جیولاجی کی باتیں پہلے مسٹر بلنفورڈ (Mr. W.T Blanford) نے ظاہر کیں، جس نے انہیں جیولاجیکل محکمہ والوں کے دفتر سے نکال کر، الگ کتابی صورت میں چھپوایا ہے۔ مسٹر واڈیا اور دیگر علماء نے ہندستان کی جیولاجی کا تذکرہ کرتے ہوئے سندھ سے متعلق بھی تھوڑا سا احوال دیا ہے، لیکن پروفیسر پتھاوالا نے اپنی کتاب Marvels of Earth میں الگ ایک باب سندھ سے متعلق لکھا ہے۔

انگریزوں کے دورِ حکومت کے اوائل سے لے کر آرکیالاجیل محکمہ والوں نے جو تحقیقات مہن جو دڑو کی کھدائی سے پہلے کی تھیں، ان کا مختصر سا تذکرہ مسٹر ہینری کزنس اپنی کتاب The Antiquities of Sindh میں کیا ہے، اس کتاب کی قیمت ۴۵ روپے ہے۔ علاوہ ازیں مسٹر اے۔ ایف۔ بلاسس Mr. A. F. Bellasis برہمن آباد کی طرف تحقیقات کر کے ان سے متعلق الگ احوال An account of Ancient and Ruined city of Brahmanabad میں لکھا ہے۔ اسی طرح برہمن آباد اور منصورہ سے متعلق میجر جنرل ہیگ نے بھی گریٹ برٹن اور آئرلینڈ کے رایل ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل (جلد ۱۶؛ حصہ ۲) میں اچھا خاصا احوال دیا ہے۔ کراچی، حیدرآباد اور شکارپور ضلعوں میں جو تحقیقات انگریزوں کے دورِ حکومت کے اوائل میں ہوئیں، وہ احوال بمبئی کی گورنمنٹ سینٹرل پریس ۱۸۷۹ع میں الگ چھپوائے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے مہن جو دڑو حکومت نے کھدوایا تو اس سے متعلق بہت سی کتب چھپ چکی ہیں، جن میں سے سب سے عمدہ کتاب Mohen Jo Daro And Indus Civilization سر جان مارشل نے دو دیدہ زیب جلدوں میں چھپوائی ہے، جس کی قیمت دس گیاں (ڈیڑھ سوَ روپے، بلکہ اس سے بھی زیادہ) ہے۔

قدیم لکھی ہوئی کتب میں سے وادیٔ سندھ کا احوال اول اول ہندوؤں کے رگ وید اور پھر دوسرے ویدوں، براہمن گرنتھ، اتہاسوں، پرانوں، بدھ مذہب اور جین مذہب والوں کی مذہبی پستکوں میں سے ملتا ہے، اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت کی تاریخی روایات اور کہانیوں (Traditions) پر مبنی ہے۔ وہ بھی تاریخ سے پہلے کا زمانہ ہے؛ لیکن اس سے متعلق اتنا کہا جائیگا کہ یورپی اور ملکی علماء نے محنت کر کے، کئی ایک اس دور کے تاریخی احوال مذہبی پستکوں میں سے اچھی طرح ٹھیک نکالے ہیں، اس لئے وہ بھی اب تاریخ کے زمانے والے احوالوں کی طرح مستند سمجھے جاتے ہیں، بلکہ اس بھی زیادہ۔[(1)]

۵۱۵ برس ق۔م ایرانی لوگ پنجاب اور سندھ پر حملہ آور ہوئے تھے، یہ باتیں آج تک ایران میں کئی کتبوں پر کندہ ہیں، یہ باتیں بھی بلاشبہ وزن رکھتی ہیں، اگرچہ وہ بھی تاریخ سے پہلے کے زمانے کی ہیں۔ حقیقی تاریخی زمانہ ہیروڈوٹس کے دور سے لے کر شمار ہوتا ہے۔ یہ صاحب ۴۵۰ برس ق۔م کا ہے اور یورپی لوگ اسے ''بابائے تاریخ'' (The Father of History) کہتے ہیں۔ ۳۵۰ برس ق۔م سکندرِ اعظم پنجاب اور سندھ پر حملہ آور ہوا۔ اس دور کے سندھ سے متعلق احوال یونانی تاریخ اور جغرافیہ نویسوں جیسا کہ: ٹالمی، ایرین اور دیگر حضرات نے، یونانی زبان میں لکھے تھے، جن کا انگریزی میں ترجمہ مسٹر منک کرنڈل اور دیگر علماء نے کیا ہے۔ اس کے بعد کچھ یونانی اور چینی سیاح ہوان شیانگ سندھ میں آئے، انہوں نے بھی سندھ کا تھوڑا تھوڑا احوال دیا ہے۔ سنہ ۷۱۱ء میں عربوں نے سندھ فتح کی، تو انہوں نے ان دنوں سندھ کے قدیم ہندو حاکموں کے احوال حاصل کئے اور سندھ فتح کرنے کے بیانات قلمبند کئے، جو چچ نامہ اور دیگر کتب میں درج ہیں۔ کچھ سندھی لوگوں کے تھوڑے سے احوال کچھ عربی کتب میں ملتے ہیں۔ کچ بھج کے جو جاڑیجہ حاکم ہیں، وہ جاڑہ ولد لاکھہ کی اولاد ہیں، جو ننگر ٹھٹہ کے سمہ راجپوتوں میں سے تھا۔ گرنارکوٹ کا حاکم راءِ ڈیاچ سندھ کے چوڑاسما راجپوتوں میں سے تھا۔ بڑے عرصے تک وہ حصے راجپوتانا سمیت سندھ میں شامل تھے۔ ان وجوہ کی بنا پر سندھ کا کچھ کچھ احوال کچ بھج اور کاٹھیاواڑ کی تاریخوں اور کرنل ٹاڈ کی کی کتاب ''راجستھان'' اور فاربس صاحب کی کتاب ''راس مالا'' میں ملتا ہے۔

چچ نامہ کے وقت کے بعد بھی کن مسلمانوں نے سندھ کی تاریخیں تصنیف کی ہیں۔ مثلاً، میر معصوم شاہ بکھری، جس کا مینار سکھر شہر میں پہاڑی پر آج تک موجود ہے، اس صاحب نے

(1) The old traditions of the Hindus are not simply traditions, but being corroborated by inscriptions and literary evidences, are of great importance even from the historical point of view" Mr. D.S. Trivadā. Itihasa-Shiromani, Sadholal Scholar: Journal of Indian History, December, 1937, p. 239.

سندھ کی تاریخ فارسی زبان میں لکھی، جو ''تاریخ معصومی'' کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اس کا سندھی ترجمہ مرحوم دیوان نندیرام میرانی سیوہانی نے کیا تھا۔ وہ کتاب آج تک دستیاب ہے۔ ارغونوں اور ترخانوں کے زمانے کا احوال ''بیگلار نامہ'' میں درج ہے۔ سید طاہر نسیانی بن سید حسن ٹھٹوی سن ۱۰۳۰ ہجری مطابق سن ۱۶۲۱ع میں ''تاریخ طاہری'' لکھی ہے۔ پھر سن ۱۱۸۷ ہجری مطابق سن ۱۷۷۲ع میں سید علی شیر ''قانع'' ٹھٹوی نے ''تحفۃ الکرام'' لکھی، جس کے تیسرے حصے میں سندھ کے کئی ایک علماء اور فضلاء، شعراء اور مصنفین، درویشوں اور اولیاء اور ان کی کرامات کا تذکرہ ہے، اور سندھ کے حاکموں کا احوال درج ہے۔ کلہوڑوں اور میروں کی حکمرانیوں کا احوال محمد عظیم ٹھٹوی کی کتاب ''فتح سندھ'' اور میر یار محمد خان کی کتاب ''فرید نامہ'' میں ہے۔ مسلمانوں کی حکمرانی کے آخری دور میں کچھ یورپی علماء سندھ میں آئے تھے، جنہوں نے سندھ کے کچھ کچھ ایسے احوال لکھے ہیں، جو پچھلے عرصوں کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہیں۔ مثلاً، سنہ ۱۷۴۴ع میں کیپٹن الیگزانڈر ہیملٹن ''ایسٹ انڈیز کا نیا احوال'' (A New Account of the East Indies) لکھی؛ سنہ ۱۸۱۶ع میں سر ہینری پاٹنجر بلوچستان اور سندھ کی سیر کر کے اپنا سفرنامہ (Travels in Balochistan and Sindh) لکھا۔ اسی طرح برنس (۱۸۳۱ع)، آؤٹرام (۱۸۴۰ع)، کینیڈی (۱۸۴۰ع)، سر رچرڈ برٹن، سر چارلس نیپئر کی تصنیف کردہ کتب، میجر جنرل ہیگ کی کتاب ''انڈس ڈیلٹا کنٹری''، ایبٹ صاحب کی کتاب ''سندھ کا احوال'' اور دوسروں کی تصنیف کردہ کتب تقریباً پچھتر کتب مصنف کے ذہن میں ہیں۔

بمبئی حکومت کے دفتر میں کچھ پرانے احوال کلہوڑوں اور میروں کی حکمرانی کے تھے، ان میں سے کچھ متفرقہ مضموں منتخب کر کے دو ضخیم جلدیں چھپوائی گئی ہیں، جن میں سے ایک میں زیادہ تر دریائے سندھ اور دوسری میں زیادہ تذکرہ شکارپور اور چانڈکہ علاقوں کا ہے۔ ایسی تیسری جلد بھی ہے، جس میں اگرچہ کچ بھج کا احوال زیادہ ہے، تاہم اس میں غلام شاہ کلہوڑہ، دیوان گدومل اور دوسروں کا کافی احوال ہے۔ سندھ کے مہران سے متعلق میجر روَرٹی نے نہایت ہی مفید کتاب رقم کی ہے، جس میں سندھ کی تاریخ اور جغرافیہ بھی مختصر درج کیا ہے۔ حاصل مطلب یہ کہ سندھ کی تاریخ خواہ جغرافیہ مرتب کرنے کے لئے بہت ذخیرہ موجود ہے، لیکن کچھ ہمدرد ہوں جو کمر کس کے، یہ سارا خزانہ سنبھال کر، سندھ کی مکمل تاریخ تیار کریں۔ اس وقت تک اس طرح کی تحقیقات کا شوق ہمارے لوگوں میں اتنا زیادہ پیدا نہیں ہوا ہے، جس وجہ سے سندھ کی ایک بھی مکمل تاریخ نہیں ہے۔ جو فارسی تاریخیں موجود ہیں، ان میں بھی دیکھیں تو مسلمانوں کی حکمرانی کا سربستہ احوال موجود نہیں ہے۔ فقط سومروں کی حکمرانی کا احوال دیکھیں تو بعض تاریخ نویسوں نے ایک

طرح تو بعض نے دوسری طرح درج کیے ہیں۔ کچھ نے تو یوں بھی لکھا ہے کہ سومرہ ''سامرہ'' سے آئے تھے! ایسی غلط باتیں سندھ میں اور بھی پھیلی ہوئی ہیں، جن میں سے چند ایک مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

''ہندھ'' اور ''سندھ'' ناموں سے متعلق غلط فہمیاں: سنہ ۱۷۸۶ع میں سر ولیم جونس نے سنسکرت کا ناطہ ایرانی اور یورپی زبانوں سے جوڑا، اس کے بعد زبانوں اور تاریخوں پر تحقیقات نہایت سائنسی طرح پر ہوئیں۔ سر ولیم جونس سے پہلے بھی کچھ صاحبان یورپ میں زبانوں پر تحقیقات کرتے تھے؛ لیکن اکثر یورپی زبانوں کا موازنہ یہودیوں کی زبان عبرانی، عربی اور دیگر سیمیٹک خاندان کی زبانوں سے کرتے تھے، جن سے یورپی زبانوں کا کوئی بھی ناتہ آج تک ثابت نہیں ہوا۔ ان صاحبان کو علم لغات کے اصولوں کی بھی کوئی معلومات نہیں تھی، اس لئے زبانوں کے موازنے سے نتائج بھی اندھے اور الٹے اخذ کرتے تھے، ان کے اندھے اور الٹے نتائج کی ایک دلچسپ مثال یول اور برنیل صاحبان نے اپنی کتاب ''ہابسن جابسن'' میں دی ہے۔ اس کا یہاں تذکرہ کیا جاتا ہے، کیونکہ اس بات سے ہمارا بڑا واسطہ ہے۔

عیسائیوں کی بائیبل ''پیدائش کی کتاب'' (Genesis) سے شروع ہوتی ہے۔ پیدائش کی کتاب کے چوتھویں باب میں درج ہے کہ ''حوا کو حضرت آدمؑ میں سے دو بیٹے قابیل اور ہابیل (Cain and Abel) پیدا ہوئے۔ بڑا ہو کر قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کا قتل کیا، تو خدا اس پر غضب ناک ہوا اور اسے جلاوطن کر دیا۔ وہ پھر باغ عدن کے مشرق میں ''ناڈ'' (Nod) کی طرف ہجرت کر کے وہاں رہنے لگا۔ (آیت ۱ سے ۱۶ تک)

''ناڈ'' (Nod) لفظ میں حروف صحیح صرف دو ہیں: ن اور ڈ (N,D)۔ ''انڈیا'' (India) نام میں بھی یہی دو حرف صحیح ہیں، اور باقی سارے حروف علت ہیں۔ جو صاحبان یورپی زبانوں کا موازنہ کر رہے تھے، انہوں نے سمجھا کہ انہوں نے شاید بڑی تحقیق کر لی ہے، سو فی الفور اس بات کو پھیلا دیا کہ باغ عدن چھوڑنے کے بعد قابیل ''انڈیا'' (ہندستان) میں آ کر رہائش پذیر ہوا تھا! لگتا ہے کہ اس افواہ کے بعد لوگوں نے پھر اسی بات کو اپنے رنگ میں رنگ کر کچھ کتابوں میں لکھا کہ مشرق کی کچھ قومیں قابیل کی اولاد ہیں۔(1)

(1) "Some have imagined that the name of the land of Nod ('wandering') to which Cain is said to have migrated, and which has the same consonants, is but a form of this (India) which is worth nothing, as this idea may have had to do with the curious statement in some medieval writers (e.g. John Marignolli) that certain eastern races were "the descendants of Cain." Yule and Burnell's" "Hobson, Jobson" i.e. Glossary of Anglo Indian Colloquil words and phrases (London 1886) article India.

پچھلے یورپی لوگوں کو زبانوں اور تاریخ پر تحقیقات کرنے کا فہم دیکھا یہی تھا! اب دوسری مثال لیتے ہیں۔ ''پیدائش کی کتاب'' (Genesis) کے دسویں باب کی پہلی آیت میں درج ہے کہ حضرت نوحؑ کے ہاں شیم (Shem)، ہَم (حام Ham) اور جفیت (Japheth) نامی بیٹے ہوئے؛ اور دنیا میں جو طوفانِ نوح ہوا تھا، اس کے بعد انہیں بھی بیٹے ہوئے تھے۔

ان شیم اور ہَم ناموں میں سے ''سیمیٹک'' اور ''ہمیٹک'' الفاظ ماخوذ ہیں۔ یہودیوں کی زبان عبرانی، عربی اور کلڈی وغیرہ سیمیٹک خاندان کی زبانیں ہیں اور تورانی خواہ آفریقی زبانیں ہمیٹک خاندان کی زبانیں سمجھی جاتی ہیں۔ (ملاحظہ فرمایئے: انسائیکلوپیڈیا)۔ ''شیم'' (سیم) اور ''ہَم'' ناموں سے ''سندھ'' اور ''ہند'' ناموں کا کوئی بھی تعلق نہیں ہے، تب بھی یہ افواہ پھیلی کہ یہ حضرت نوحؑ کے بیٹوں کے نام ہیں! یہ افواہ عربستان تک پہنچ گئی! مصنف کو یوں لگتا ہے کہ سید علی شیر قانع ٹھٹوی کسی وقت حج کرنے گیا تھا یا کوئی اور شخص حج کر کے واپس آیا تھا اور یہ افواہ وہاں سے سن کر آیا تھا، اس کے بعد یہ بات سید علی شیر اپنی کتاب ''تحفۃ الکرام'' میں لکھی، جو ہجری سنہ ۱۱۸۷ع والی معروف تقدید سے بھی چودہ برس پہلے کی لکھی ہوئی ہے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب یورپی لوگ زبانوں اور تاریخ پر تحقیقات الٹی طرح کر رہے تھے۔[1] سنہ ۱۹۲۵ع میں مرحوم شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ ''قدیم سندھ'' کے نام سے ایک کتاب لکھی، جو زیادہ تر پورے کی پوری ''تحفۃ الکرام'' کا ترجمہ ہے۔ وہ کتاب اس صاحب نے شروع ہی ان الفاظ سے کی ہے۔

سندھ ملک پر نام ''سند'' پر سے پڑا ہے، جس طرح ھندستان یا ھند پر نام ''ھند'' پر سے پڑا ہے۔ سند اور ہند دونوں بھائی تھے اور حام بن نوحؑ کے بیٹے تھے، اور حضرت نوحؑ مشہور نبی تھے، جس نے طوفان کے بعد دنیا کو آباد کیا۔'' دیکھیں کہ کہاں کی بات کہاں آ کر پہنچی ہے! ان بے بنیاد باتوں کو اِس وقت کے یورپی علماء درست نہیں سمجھتے، جیسا کہ ہٹی صاحب نے اپنی تصنیف کردہ ''عربستان کی تاریخ'' میں لکھا ہے۔[2] حقیقت بھی یہی ہے کہ قدیم یورپی لوگوں کو اُس وقت نہ علم لغات کے اصولوں کی اور نہ ہی دنیا کی تاریخ کا فہم تھا، اس لئے یہ بیہودہ باتیں پھیلا رہے تھے۔ ''فلالاجی'' کا ذکر کرتے ہوئے، اینسائیکلوپیڈیا برٹینیکا

(1) The term Semite comes from Shem in the Old Testament (Genesis 10:1) through the Latin of the Vulgate. The traditional explanation that the so-called Semites are descended from the eldest son of Noah, and therefore racially homogeneous, is no longer accepted. philip k. Hitti; History of the Arabs, p. 9.

(2) "It is astonishing what an amount of real learning and ingenuity was wasted on this question during the 17th and 18th Century." Prof. Max Muller; Lectures on the Science of Language P. 140.

میں بھی قدیم یورپیوں کے اس طرح کے غلط نتائج برآمد کرنے کا تذکرہ وضاحت کے ساتھ کیا گیا ہے۔(1)

یکسر ان سابقہ یورپی لوگوں کو زیادہ تر مجرم قرار نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ اس وقت ان کے پاس واقعی اندھیرہ تھا۔ اِس وقت وہ پچھلا اندھیرا نہیں ہے، تب بھی اپنی سندھ میں دیکھیں کہ سندھی میں جو ہندستان کی تاریخیں پڑہائی جاتی ہیں، ان میں کیا لکھا ہوا ہے۔ پہلے آپ ان کی کتاب کا نام ملاحظہ فرمائیں۔ کتاب کا نام رکھا ہے ''ہندستان کی تواریخ''! نام ہی غلط۔(2) کتاب کے اندر دیکھیں، شروع میں لکھا ہوا ہے کہ ''ہندستان کے معنی ہیں کالے لوگوں کے رہنے کی جگہ، (ہندو = کالا + آستان = جگہ)! انہی تاریخ نویسوں نے یوں بھی لکھا ہے کہ '' آریہ لوگ شکل کے حسین اور قدآوز اور مضبوط تھے'' (''مضبوط'' کی بجاءِ ''مظبوط'' لکھا گیا ہے!)۔ جب انہوں نے خود لکھا ہے کہ آریہ لوگ شکل کے حسین تھے، تو پھر ''ہندستان'' کالے لوگوں کا ملک ہوا کیسے؟ الغرض، جن کو نہ زبان کا پتہ، نہ تاریخ کا پتہ، بلکہ جس ملک میں خود رہتے ہیں، اس کے نام کے معنی کا بھی پتہ نہیں ہے، تو پھر یوں سمجھا جائے گا کہ یہ کتابیں شاگردوں پر محض تھوپنے کے لئے لکھی گئی ہیں، اور یہ نہایت ہی افسوسناک بات ہے۔ ''سندھو'' اور ''ہندو'' الفاظ کے معنی یہاں واضح کیے جاتے ہیں، تا کہ قارئین کرام کو ان الفاظ کے صحیح معنی کا پتہ چل سکے۔

سندھو نام اور اس کے معنی: سندھ پر دریائے سندھ پر سے نام پڑا ہے۔ سنسکرت میں ''سندھو'' معنی سمندر یا بحرِ اعظم۔ پہلے قابل ندی، گومتی (گومال) وغیرہ دریائے سندھ کے معاون ندیاں (Tributaries) تھیں، اس لئے سندھو رواجی ندیوں سے بہت بڑی ہوا کرتی تھی، اور سمندر سے اس کا مقابلہ ہوتا تھا۔ اس لئے قدیم آریہ لوگوں نے اس پر یہ نام رکھا۔(3) آج بھی دریائے سندھ کا شکم دیرہ اسماعیل خان سے لے کر کالا باغ تک اتنا بڑا ہے کہ، اگر کوئی کشتی بیچ دریاء میں ہوگی، تو نہ اِس کنارے سے نہ اُس کنارے سے دیکھنے میں آئے گی۔(4)

---

(1) "The first essays in comparison were made upon the classical tongues (Hebrew etc) and were as erroneous in method and fertile in false conclusions as was to be expected." Encyclo: Brittanica, "Philology".

(2) ہمارے کچھ ہندو بھائی یوں سمجھتے ہیں کہ ''تاریخ'' لفظ کے معنی ہیں ''تت'' (Date) اور ''تواریخ'' معنی ''بیان یا احوال'' (History)، یہ غلط بات ہے۔ ''تاریخ'' لفظ کی یہ دونوں معنی ہیں اور ان کا جمع کا صیغہ ہے ''تواریخ''۔ کتاب میں احوال جب ہندستان کا ہو، تب لکھنا چاہئے ''ہندستان کی تاریخ''۔ اس صورت میں جمع کا صیغہ ''تواریخ'' استعمال کرنا ہی غلط ہے۔ (مصنف)

(3) Cambridge History of india. Vol. I p. 80.

(4) "These are places where people could swim across the Indus, there are others where no eye could tell whether the boundless expanse of water should be called river or sea. The two run into each other, as every sailor knows, and naturally the meaning of Sindhu, river runs into the meaning of Sindhu, 'Sea'." Prof. Max Muller's: India: What Can it Teach Us? p. 171.

ہندستان کے امپریل گزیٹیئر، ینفی صاحب والی سنسکرت ڈکشنری، پروفیسر آپٹی والی سنسکرت ڈکشنری اور دیگر کئی کتب کے مطابق ''سندھو'' لفظ کا مادہ ہے سنسکرت لفظ ''سینڈ'' (Syand) معنی بہنا۔(1) اسی سبب ''سندھو'' کے بنیادی معنی ہیں ''وہ ندی جو دائماً بہتی رہے''! پروفیسر میکس ملر کے خیال میں ''سندھو'' لفظ کا مادہ ہے ''سندھ'' معنی بچا لینا، بچاؤ کرنا۔ سندھو ندی جن مقامات کے پاس سے بہتی ہے، ان مقامات پر رہنے والوں کا بیرونی لوگوں کے حملوں اور جنگلی جانوروں کے حملوں سے بچاؤ کرتی ہے۔ دونوں مادے درست لگ رہے ہیں لیکن پہلے معنی زیادہ عام ہیں۔(2)

''ہندو'' اور ''ہندستان'' کے معنی: رگ وید والے زمانے میں قدیم آریہ لوگ سندھو ندی اور اس کے معاون دریاء کے کنارے پانی کی سہولت کی وجہ سے آباد کیے ہوئے تھے، اس لئے قدیم ایرانیوں نے تمام مقامات پر رہنے والوں کو اکٹھے ''سندھو'' کہنا شروع کیا، لیکن تلفظ بدل کر ''ہندو'' کر دیا، کیونکہ ایرانی لوگ ''س'' کو ''ھ'' سے بدل دیتے ہیں: اس طرح ''ہندو'' لفظ کے معنی ہوئے ''سندھو ندی کے کنارے پر رہنے والا''۔(3)

قدیم ایرانی لوگ وادیٔ سندھ (پنجاب اور سندھ) سے دور نہیں گئے، اس لئے انہوں نے جو علاقے دیکھے کہ آریہ لوگ بسائے ہوئے ہیں اسے ہندوستان = ہندستان (ہندو + ستان) کہہ کر پکارا۔ حاصل مطلب یہ کہ ''ہندستان'' لفظ کے اصل معنی ہیں ''سندھو دریاء والا ملک''۔(4)

---

(1) "Sindhu from the root Syand-to flow." Imperial Gazetteer of India, V.1, p.2.

(2) "Sindhu probably meant originally the divider, keeper, and defender, from Sidh "to keep of" ..... No more telling name could have been given to a broad river, which guarded peaceful settlers both against the inroads of hostile tribes and the attacks of wild animlas." Prof. Max Muller's India What Can It Teach Us? P.170.

(3) "The word 'Hindu' is in medieval Persian 'Hindo' representing the ancient Avesta hendava (Sanskrit Saindhava), a dweller on the Sindhu or Indus...........'Hindi' means 'of or belonging to India' while 'Hindu' now means 'a person of Hindu religion" Encyclo. Brit: foot-note, under 'Hindostani".

(4) "They (the early Indians) called the Indus river in Sanskrit by the word which they gave to the ocean itself----Sindhu (from the root Syand "to flow"), a name afterwards applied to the ocean-- god (Varuna). The term extended itself to the country around the river, and in its plural form, Sindhhavas, to the inhabitants thereof. The ancient Persians softening the initial sibilant to an aspirate, called it Hindu in the Zend language: the Greeks, again softening the initial by omitting the aspirate altogether, derived from it their Indikos, and Indos" Imperial Gazetteer of India, Vol. VI, p. 2.

"The name for India in the Avesta is Hindu, which like the Old Persian Hi(n)du, is derived from the river Indus Sanskrit Sindhu," Cambridge History of India. Vol I, P.324.

"Sanskrit 'Sindhu' -- the sea became (eventually) in Persian Hindu, and so passed on to the Greeks and Latins: viz: Indoi for the people, Indos for the river, Indica and India for the country on its banks............India itself is Latin form."Yule and Burnell's Hobson- Jobson or Glossary of Anglo-Indian colloquial words and phrases, article "India"

قدیم ایرانیوں سے قدیم یونانیوں کو ہندستان کا پتہ چلا۔ سکندر اعظم کے ساتھ بھی جو تاریخ نویس تھے، انہوں نے بھی وادیٔ سندھ میں رہنے والوں کو ''سندھو'' (ہندو) کہہ کر پکارا، لیکن انہوں نے تلفظ تبدیل کر کے کہا ''انڈو -- اندوئی'' (Indoi) اور پورے ملک کو انہوں نے کہا ''انڈیکا'' (Indica) اور ''انڈیکوس'' بعد میں لاطینی زبان میں بولنے والوں نے ''انڈوس'' (Indos) کا تلفظ تبدیل کر کے کہا ''انڈس'' (Indus) اور ہندستان کو ''انڈیا'' (India) کہا۔ اسی طرح ایک ہی سنسکرت لفظ ''سندھو'' کے تلفظات لاطینی زبان میں تبدیل ہو کر ''انڈس'' اور ''انڈیا'' ہو گئے ہیں۔[1] چند لفظوں میں یوں کہا جائیگا کہ ''سندھ'' لفظ کے اصل معنی تھے ''وادیٔ سندھ''، جس میں پورا پنجاب بھی شامل تھا۔ ''سندھو'' (ہندو) لفظ کے اصل معنی تھے: ''سندھو دریاء کے کنارے پر رہنے والا'' نہیں کہ ''کالا'' یا ''چور''، جیسا کہ کچھ لوگ غلط طرح سے سمجھتے ہیں؛ اور ''ہندستان'' لفظ کے اصل معنی تھے ''سندھو دریاء والا ملک''۔ خود سنسکرت ادب میں بھی ''سندھو'' لفظ کے بہت جگہوں پر معنی ہیں ''سندھو دریاء والا ملک''۔ اور ''سندھو'' یا ''سَیندھو'' کے معنی ہیں ''وادیٔ سندھ کے رہنے والے''، قدیم آریہ لوگوں نے شمالی ہندستان سے جنوبی ہندستان کی طرف پیش قدمی کی، اور وہاں بھی جا کر انہوں نے اپنی بیٹھکیں بنالیں، تو وہ سارا ملک بالائی کشمیر سے لے کر کیپ کاموورن تک ''ہندستان'' کہا جانے لگا۔ پھر جب مسلمانوں کی حکمرانی قائم ہوئی تو ''ہندو'' لفظ کے معنی ہوئے ''برہمنی دین کو ماننے والا''۔

قدیم عربوں کو ''ہند'' (ہندستان) کا پتہ قدیم ایرانیوں سے چلا۔ سنہ ۷۱۱-۷۱۲ع میں عربوں نے سندھ اور ملتان اپنے قبضے میں لے لئے، تو انہیں معلوم ہوا کہ ''سندھ'' کا علاقہ علحدہ ہے اور ''ہند'' پورے ہندستان کا نام ہے۔ اس وقت سے انہیں ''سندھ'' اور ''ہند'' کا فرق معلوم ہوا، لیکن بعض فارسی نویسوں نے پھر بھی ''سندھ اور ہند'' ناموں کو ایک ساتھ لکھا ہے۔[2] سترہویں اور ارٹھویں عیسوی صدی میں کچھ یورپی لوگ زبانوں اور تاریخ کی تحقیقات، بلکل الٹی طرح کر رہے تھے اور بیہودہ افواہیں پھیلا رہے تھے، تو کچھ فارسی تاریخ نویسوں نے بھی وہ افواہیں سچی سمجھ کر، اپنی کتابوں میں لکھا کہ سندھ اور ہندھ حضرت نوحؑ کی اولاد کے نام ہیں۔ بعد میں مزید تحقیقات سے ثابت ہوا کہ یہ واہیات باتیں ہیں۔ تہذیب کا سورج دوسری بہت

(1) "Sindh anciently meant the valley of the Sindhu." Sindh Gaze.

(2) "The aspirated and persianised form Hind (Sanskrit "Sindhu") as applied to the great country beyond the Indus, passed on to the Arabs. But when they invaded the valley of the Indus and found it called Sindhu, they adopted that name in the form Sind, and thence forward "Hind and Sind" were habitally distinquished, though generally coupled and conceived as two parts of a great whole". Yule Burnell: Hobson-Jobson under article "India".

ساری جگہوں سے پہلے وادیٔ سندھ میں طلوع ہوا تھا، اس بات کو بھی یہاں ابتدا ہی میں درج کیا جاتا ہے تا کہ سندھ کی اہمیت سمجھنے میں آسانی ہے۔

تہذیب کے اوائلی مقامات: ہر کسی ملک کی تہذیب کا گوشہ پہلے اس جگہ ابھر کر عروج کو پہنچتا ہے جس جگہ ندیاں اور نالے ہوں۔ قدیم زمانے میں لوگوں کے پاس نہ بھل صفائی کے لئے، نہ ہی کنویں کھودنے کے لئے کوئی کارآمد اوزار تھے، اس لئے وہ اپنی بیٹھکیں ہی اس جگہ کرتے تھے، جس جگہ قدرتی طرح پانی کی سہولت میسر ہوتی تھی، جس جگہ دریاء بہتا تھا، وہاں تو اناج، سبزیاں، میوے، کپاس اور دیگر پیداوار آسانی سے ہوسکتی تھی، لیکن ہنر اور کاریگری بھی وہیں پر زور پکڑتے، بلکہ علم کی نہر پہلے وہاں جاری ہوگی، جس وجہ سے وہ مقام علماء اور فضلاء کی قیام گاہ بن جائے گا۔ یہی باتیں ذہن میں رکھ کر اپنے ملک کے حالات کا موازنہ دوسرے ممالک سے کریں، کیونکہ اسی طرح ہی قدیم سندھ کی مکمل طرح قدر کی جاسکتی ہے۔

علماء کو تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ کئی ہزار برس پہلے، ایسے سہل مقامات ایشیا اور آفریقا میں فقط دو چار تھے، جہاں تہذیب کے گوشے پہلے ابھرے، جو پھر بڑھ کر درخت ہو گئے۔ ایک ملک مصر میں وادیٔ نیل دوسرا میسوپوٹیمیا (موجودہ عراق) کی طرف دریاءِ فرات (یوفریٹس) اور دریاءِ دجلہٗ (ٹائگرس) کی وادیاں، تیسرے ملک چین میں ہوئنگ ہو اور یانگشیکا نگ والی وادی اور چوتھے پنجاب اور سندھ میں سندھو دریاء والی وادی۔ حاصل مطلب یہ کہ دنیا میں چار خوش قسمت قومیں ہیں، جن کو اوائل میں پانی کی سہولت میسر تھی، جس وجہ سے دوسری قوموں سے پہلے انہوں نے ترقی کی۔ ان میں سے ایک آریہ قوم تھی، جس کی اولاد آج تک ہندستان، ایران؛ وسطی ایشیا اور یورپ کے اچھے خاصے علاقے میں بنی ہوئی ہے۔ دوسری تورانی قوم تھی، جس کی اولاد چین، جپان اور تھبیٹ میں ہے۔ تیسری سیمیٹک قوم تھی، جس کے ہاتھ میں عربستان اور مغربی ایشیا بھی تھا۔ چوتھی ہیمیٹک قوم تھی۔ ان چار خوش قسمت قوموں میں سے ہمارا بڑا واسطہ آریہ قوم سے ہے، جس نے رگ وید والے قدیم زمانے میں وادیٔ سندھ بسائی، اور اسی قوم کی اولاد ہندستان کے کئی ہندو ہیں اور قدیم ہندوؤں میں سے اس وقت بہت سارے مسلمان ہیں۔ اب اچھی طرح سمجھ میں آئیگا کہ قدیم دنیا میں تہذیب کے جو اوائلی مقامات تھے، ان میں سے ایک وادیٔ سندھ تھی، جس جیسی وسیع اور خوش قسمت وادی پورے جنوبی ایشیا میں کوئی دوسری نہیں۔[1]

(1) Sir John Marshall: Mohen Jo Daro and Indus civilization, Vol. 1., p. 94.

علماء کو تحقیقات سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ وادیٔ سندھ کے باسیوں نے کسی دوسری تہذیب کی نقل نہیں اتاری، لیکن خود بہت ساری دوسری اقوام نے ان سے سیکھا، اس لئے سندھ کی اوائلی تاریخ کو کسی قدر دنیا کی تہذیب کی شروعات کی تاریخ سمجھنی چاہئے۔ اس وقت تک کئی ممالک، بلکہ پوری دنیا کی تاریخیں چھپ کر شایع ہو چکی ہیں، ان تاریخوں کا اگر آپ ذرا سا ہی مطالعہ کریں گے، تو آپ کو یقین ہو چلے گا کہ وادیٔ سندھ کے آریہ لوگوں کی تہذیب نے بہت ساری جگہوں کے لوگوں پر حیرت انگیز اثر ڈالا ہے، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ پروفیسر میکس ملر وادیٔ سندھ (ہندستان) کو سراہنے میں حق بجانب ہیں۔[1]

☆

(1) "If I were to look over the whole world to find out the country most richly endowed with all the wealth, power, and beauty that nature can bestow--in some parts a very paradise or earth-- I should point to India. If I were asked under what sky the human mind has most fully developed some of its choicest gifts, has most deeply pondered on the greatest problems of life, and has found solutions of some of them which well deserve the attention even of those who have studied Plato and Kant-- I should point to India. And if I were to ask myself from what literature we, here in Europe, we who have been nurtured almost exclusively on the thoughts of Greeks and Romans, and of one Semitic race, the Jewish, may draw that corrective which is most wanted in order to make our inner life more perfect, more comprehensive, more universal, in fact more truly human, a life, not for this life only, but a transfigured and eternal life-- again I should point to India." Prof. Max Muller: India: What Can It Teach Us? p. 6.

باب ۱

تاریخ سے پہلے کا زمانہ

سندھ کا جنم: قدیم سندھ کی تاریخ شروع سے لے کر پوری طرح سمجھنے کے لئے موجودہ سندھ اور موجودہ زمانہ بھلا کر ہمیں وہ قدیم زمانہ اپنی آنکھوں کے سامنے لانا چاہئے، جس زمانہ میں سندھ کی مغرب میں پہاڑ چوٹیوں تک نظر آتے تھے، اور دیگر اطراف زیادہ تر سمندر کے پانی تلے تھے۔

سندھ کو پانی سے نکلے ہوئے کئی زمانے گذر چکے ہیں۔ اُس قدیم زمانے کی کتب تو موجود نہیں ہیں، پھر بھی جو صاحب ماہر ارضیات ہیں، وہ ان زمانوں کی باتون کا بھی ادراک کر لیتے ہیں۔ ان علماء نے زمین کی بلکل نچلی تہہ سے لے کر ایک ایک طبق (Stratum) جانچ کر معلوم کیا ہے کہ ہر ایک تہہ کو بننے میں کتنا عرصہ لگا ہوگا۔ ان ہر ایک زمانوں پر الگ الگ نام (Cambrian, Cretaceous etc.) رکھے گئے ہیں۔

ماہر ارضیات (Geologists) کا کہنا ہے کہ "جیالاجی" کے تیسرے زمانے (Tertiary Age) میں سندھ سمیت شمالی ہندستان کا اچھا خاصہ حصہ "ٹیتھیا" نامی سمندر (Tethya Sea) تلے تھا، جس کی لہریں کوہ ہمالیہ سے لے کر کوہ وندھیا تک لہراتی تھیں۔ کسی زمانے میں کوہ ہمالیہ کی طرف ایسے خوفناک زلزلے برپا ہوئے، جو زمیں اوپر کی طرف آ گئی اور سمندر ہٹ کر بہت دور چلا گیا! اسی طرح زمین نمودار ہوئی،[1] تو قدرت نے پھر دوسرے کام کیے۔ وقت بوقت جو تیز ہوائیں اور طوفان اٹھتے تھے، ان کی وجہ سے ریت پھیلتی چلی گئی، برساتوں کی وجہ سے زمین جمتی گئی اور گرمی کی وجہ سے پختہ ہوتی گئی۔ ایک طرف برسات کا پانی برسا تو دوسری طرف دریاؤں کی گرد زمین پر وقت بوقت چڑھتی گئی، تو زمین کاشت کے قابل ہوتی چلی گئی۔ اسی طرح پورے ہندستان کی رونق ہی اور طرح کی ہو گئی۔ آج ہندستان میں علحدہ علحدہ مقامات پر نرل نظارے نظر آ رہے ہیں۔ ہمالیہ جبل کی چوٹیوں کا برف سے بھرا ہوا ہونے کا اپنا منظر ہے، تو کشمیر طرف کی گلکاری گلزار کا نمونہ اپنا ہے۔ اسی

(1) "Sindh is mainly a sea-born land." Prof. M.B. Pithawalla; Marvels of the Earth P. 51. Wadia: Geiology of India P. 5 et sep.

طرح شمالی ہندستان سے لے کر جنوبی ہندستان تک ہریالی سے اچھی خاصی رونق رہتی ہے۔ ہندستان کی زرخیز زمین میں سے پیداوار بھی اتنی ہوتی ہے جو بمشکل کوئی دوسرا ملک اس کا مقابلہ کر سکے۔[1] بعض مؤرخوں نے تو ہندستان کو بہشت کے برابر درجہ دے رکھا ہے۔[2]

ہندستان کو اتنا رونقدار اور خوش بخت اس کے دریاؤں نے کیا ہے، جن میں سے سندھو نہایت قدیم ہے۔ علماء بتاتے ہیں کہ سندھ کے علائقے نے سمندر سے جنم لیا، اس سے پہلے سندھو دریاء تھا! مطلب یہ کہ جیسا کہ بچہ کے جنم سے پہلے ہی خدا اس کے لئے خوراک تیار رکھتا ہے، جو ماں کی چھاتی میں دودھ آ جاتا ہے، اسی طرح سندھ کو پال پوس کر بڑا کرنے کے لئے طاقتور سندھو پہلے ہی سے یہاں موجود تھی۔[3] آج بھی ہماری زندگی کا دارومدار اسی خوبصورت سندھو پر ہے، جس کے بغیر شاید ہمارا ملک صحرا بن کر رہ جائے۔

سائینم ! سدائین ڪرين، مٿي سنڌ سڪار،
دوست تون دلدار، عالم سڀ آباد ڪرين !
(شاھ)

["سندھ" پر بھی ترا کرم ہوجائے
اے دھنی تو ہے سب کا پالن ھار۔]
(ایاز)

قدیم سندھ کے اصل باشندے: جب سمندر سندھ میں سے ہٹ کر دور ہوا تو پہلے وہ کونسی قومیں تھیں جنہوں نے یہ ریت والے میدان آباد کئے، اس کا پتہ نہیں چلایا جا سکتا۔ جس

(1) "It (India) has always appeared to the imagination of the Western World adorned with whatever is most splendid and gorgeous; glittering, so it were, with gold and gems, and redolent of fragrant and delicious odours. Though there be in these magnificent conceptions something romantic and illusory, still India forms unquestioonably one of the most remarkable regions that exist on the surface of the globe. The varied grandeur of its scenery and the rich productions of its soil are scarcely equalled in any other country." Murray's History of India, P. 1.

(2) The historian Abdullah Wassaf writing in the 14th century A.D. says of India in his history. Taziyat-ul-Amsar'. "India according to the concurrent opinion of all writers, is the most agreeable abode on the earth and the most pleasant quarter of the world. Its dust is purer than air and its air purer than purity itself. Its delightful plains resemble the garden of paradise. If it is asserted that paradise is in India, be not surprised, "because Paradise itself is not comparable to it". Elliot's history of India, Vol. III. PP. 28--29.

(3) "It (the Indus) is and example of an antecedent drainage, having existed even before the great Himalyan up-heavals." Prof. Pithawala: Marvels of the Earth PP 56-57.

زمانے (Tertiary Age) میں سندھ کی زمین ظاہر ہوئی تھی، اس وقت کے لوگوں کے اجسام، اِس وقت تک تبدیل ہو کر پتھر ہو گئے ہیں۔ اُس زمانے کے درختوں کا بھی یہی حال ہے۔ یہ تیسرے زمانے والے پتھر (Tertiary fossils) سندھ میں زمین کی اندرونی تہوں سے بہت ہی ملے ہیں۔ قدیم سندھ کے اصل باشندے یہی کہے جائینگے۔ لیکن اس حالت میں انہیں کوئی پہچان بھی نہیں سکے گا۔ علماء کو تحقیقات کرنے سے اتنا معلوم ہوا ہے کہ موجودہ قوموں میں سے قدیم سے قدیم لوگ، جنہوں نے شمالی ہندستان کو آباد کیا، وہ موجودہ سنتھالوں، بھیلوں اور منڈلوکوں کے آباء و اجداد تھے۔ وہ سندھ میں بھی تھے یا نہیں، اس سلسلے میں ہمیں پہلے یقین نہیں تھا؛ لیکن بعد میں بعض کی کھوپڑیاں سیوہن کے نزدیک ملی ہیں۔[1] ۱۹۲۲-۱۹۲۳ع میں بعض کولوں اور سنتھالوں کی کھوپڑیاں مہن جو دڑو میں سے بھی ملی ہیں، یہ بات آرکیالاجیکل محکمہ کے ڈریکٹر جنرل سرجان مارشل نے لکھی ہے۔ اس طرح اب یقین ہو گیا ہے کہ وہ قدیم لوگ سندھ میں بھی تھے، اس لئے قدیم سندھ کے اصل باشندے اب ان کو سمجھا جانا چاہئے۔

کول اور سنتھال کہاں سے آئے: جیالاجیکل محکمہ والوں کو تحقیقات کرنے سے معلوم ہوا ہے کہ قدیم زمانے میں جب شمالی ہندستان زیادہ تر سارے کا سارا سمندر تلے تھا، تب جنوبی ہندستان آفریقا، سلون (لنکا) اور آسٹریلیا سے خشکی کے راستے ملا ہوا تھا، اور وہ بہت پہلے روءِ زمیں پر ظاہر ہوا تھا۔ اس وقت مشرق بعید کی طرف جزیرۂ انڈمان اور دوسرے چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں؛ لیکن اُس طرف ایک بڑا برِ اعظم تھا جو فی الوقت پئسفک مہا ساگر کے شکم میں سما گیا ہے۔ اُسی غرق شدہ برِ اعظم کو "لیموریا" (Lemuria) کا نام دیا گیا ہے، کیونکہ لیمور (Lemur) نامی ایک جانور کی ہڈیاں اُسی پورے خطے میں سے (آفریقا سے لے کر آسٹریلیا تک) کثیر تعداد میں ملی ہیں۔ اُسی برِ اعظم کی کھدائی کچھ عرصہ پہلے بھی کی جا رہی تھی؛ لیکن اس وقت جرمنی اور جاپان کی جنگ کے سبب سے روکی ہوئی ہے۔ اِس تحقیقات کے نتائج جب تک چھپ کر شائع نہیں ہوتے تب تک اُس سے متعلق کچھ بھی مزید کہا نہیں جا سکتا۔

زبانوں کی تحقیقات سے علماء کو یوں لگا ہے کہ یہ قدیم لوگ اصل میں خشکی کے راستے آسٹریلیا سے براستہ چین آسام اور بینگال کی طرف گئے اور پھر شمالی ہندستان کی طرف پیش قدمی کی۔ اِس وقت ان کی اولاد وسطی ہندستان میں سنتھال علائقوں چھوٹا ناگپور کی طرف رہائش پذیر ہے۔ موجودہ کول اور سنتھال جو زبانیں بولتے ہیں، ان کی نحوی ساخت ان زبانوں ہی سی ہے، جو

(1) W.T. Blanford: Geology of Western Sind. (Memoirs of Geological survey, Vol. XVII. paart 1.)

انڈوچینا اور خلیج ملایا سے لے کر آسٹریلیا اور پالینیشا تک بولی جاتی ہیں۔ ان تمام مقامات کی زبانوں کا آپس میں جگری ناتہ ہے، اس لئے کولوں، سنتھالوں وغیرہ کی زبانیں آسٹریلیا کی زبانوں کے خاندان (Austric family) کی ایک شاخ سمجھی جاتی ہیں۔ یہ حقائق سر گریئرسن اپنی تصنیف کردہ کتاب ''لنگئسٹک سروے آف انڈیا'' (Linguistic Survey of India) کی پہلی جلد اور پہلے حصے میں درج کی ہیں۔

قدیم تہذیب کی ابتدا: سندھ کے جنم کے بعد بھی رن کچھ اور تھر کی طرف کئی ایک صدیاں مسلسل سمندر تھا۔ ضلع کراچی اور ضلع حیدرآباد کے لاڑ کے بھی بہت سارے ٹکڑے، کچھ سمندر کے پانی تلے تو کچھ سندھو دریاء کے پانی تلے تھے، ان میں سے شاہ بندر، سجاول اور جھرکوں والا تھوڑا سا علائقہ بلکل حال ہی میں پانی سے نکل کر نمودار ہوا ہے۔[1] تاریخ کے زمانے کی جو تحقیقات ہوئی ہیں، ان میں سے یوں سمجھ میں آ رہا ہے کہ شاہ بندر، ٹھٹہ اور جھرکوں والی پہاڑیاں، کوٹڑی کی طرف کوہ سورجانو، حیدرآباد والا گنجو ٹکر اور رنی کوٹ والی پہاڑیاں یا تو اُس وقت تھی ہی نہیں، یا اگر تھیں بھی تو اردگرد پانی کی وجہ سے، جزیروں کی طرح تھیں، اس لئے سندھ کا صرف مغربی پہاڑی علائقہ پہلے آباد ہوا تھا۔ یہ ''قدیم حجری زمانہ'' یعنی ''پرانہ پتھر والا زمانہ'' (Paleolithic or Old Stone Age) تھا، جس میں زمین کسی قدر برف میں چھپی ہوئی تھی، اور کچھ ٹکڑوں پر برف نہیں تھی، جہاں لوگ رہ سکتے تھے۔ اُس وقت لوگوں کو گھر بنانے کا فن نہیں تھا، اس لئے گرمی، سردی خواہ برسات سے خود کو بچانے کے لئے مغرب میں پہاڑوں کی غاروں میں جا کر رہتے تھے۔ آج بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ کوہستان میں جو لوگ غیر شادی شدہ ہیں اور انہیں کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا، وہ غاروں اور شگافوں میں رہتے ہیں۔ اُس وقت لوگوں کو کھیتی باڑی کا بھی فن نہیں تھا، جس وجہ سے ''ڈتھ'' (جنگلی اَناج اور جنگلی میوہ وغیرہ) پر گزارہ کرتے تھے۔ چھاپرو بیر، لیار، گانگیاں، گولاڑنے، منگھے اور دیگر اس طرح کی جنگلی پیداواریں آج بھی کوہستان خواہ تھر کے لوگوں کے لئے بڑی غنیمت ہیں۔ ان علاقوں کے لوگوں نے آج تک زیادہ ترقی نہیں کی ہے، جس وجہ سے وہ قدیم سے قدیم دستور آج تک چلا رہے ہیں۔

لوگوں کے دانتوں اور دوسری چیزوں کا جائزہ لے کر، بہت علماء نے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ انسان مزاجاً سبزی خور (Vegetarian) ہے، لیکن پچھلے حالات بھی دھیان میں رکھنے چاہئیں۔ کسی وقت زیادہ برف گرنے یا برسات بلکل نہ ہونے سے، درخت خشک ہے جاتے ہیں، تو پھر کوئی بھی پیداوار نہیں ہوسکتی۔ آج بھی تھر کے علاقے میں دیکھیں کہ جب دو تین موسم مسلسل

(1) Major H.G. Raverty: The Mihran of Sind and its Tributaries PP. 317 & 468--69.

برسات کا ایک قطرہ بھی نہیں برستا تو درخت، پودے وغیرہ خشک ہو جاتے ہیں۔ مال مویشی مکھیوں کی طرح مر جاتے ہیں۔ بھوک کی وجہ سے لوگوں کے پیٹ پیٹھ سے لگ جاتے ہیں اور تھر سے حقیقتاً خون کی بو آ رہی ہوتی ہے! ایسے حالات میں لوگوں نی مچھلی کا گوشت کھانے کی عادت اپنائی۔[1] پرندوں کا شکار کرنا چاہتے تھے تو زمین سے پتھر اٹھا کر ان کو مارتے تھے۔ کوئی بندہ مر جاتا تھا تو اس کی لاش کے اوپر پتھر رکھ کر اسے ڈھانپ دیتے تھے۔ مطلب یہ کہ ان گھڑے پتھر کا استعمال بہت تھا، اس لئے اسے قدیم حجری زمانہ کہتے ہیں جو کئی ہزار برس ق۔م شروع ہوا تھا۔

قدیم تہذیب کا مرکز: سندھ میں اس وقت تک آرکیالاجیکل محکمہ والوں نے زیادہ تحقیقات نہیں کی لیکن جو تھوڑی بہت کی ہیں، ان سے یوں لگتا ہے کہ اس قدیم تہذیب کا مرکز سیوہن کا علاقہ تھا۔ میجر جنرل کننگھام نے کہا ہے کہ ''سیوہن نہایت ایک اچھی جگہ، علحدہ ایک بلند پہاڑی پر ہے؛ اور منچھر جھیل اس کے پہلو میں ہے، جس کا پانی پہلے سیوہن کی دیواروں سے ٹکراتا تھا، اس لئے پانی اور خوراک کی سہولت، سندھ کے پہلے باشندوں کی توجہ ضرور اول اسی کی طرف مبذول کروائی ہوگی۔[2] مصنف کی بھی یہی رائے ہے کہ پوری سندھ میں سے پہلے سیوہن والا علاقہ آباد ہوا تھا۔ اس کے یہ اسباب ہیں:

مہن جو دڑو کی کھدائی سے بہت پہلے، اس قدیم زمانے کے لوگوں کی کھوپڑیاں، سیوہن کے نزدیک، شاہ بلاول والے راستے پر سے ملی تھیں۔ یہ حقیقت جیالاجیکل محکمہ والوں کے دفتر میں درج ہے۔[3] خود ''سیوہن'' نام ہی نہایت قدیم ہے اور اس جیسا پرانا نام اور کسی بھی شہر کا نہیں۔ یہ نام یجر وید والے زمانے میں اس شہر کو ملا، اس لئے اس بات کا ذکر بعد میں کریں گے۔ اس وقت ہم اس سے بھی بہت پہلے زمانے کی بات کر رہے ہیں، سو اسی نہایت قدیم زمانے کے جو احوال مل سکے ہیں، انہیں یہاں درج کیا جاتا ہے:

لکی کے پہاڑوں میں گرم پانی کے چشموں سے کچھ دور، کچھ غار ملے ہیں، جو پہاڑوں میں سے گھڑے گئے ہیں۔ ان کی نسبت رائے کا اظہار کیا گیا ہے کہ پرانے زمانے میں ان میں لوگ رہتے تھے۔ اِس وقت ان غاروں میں سے کچھ باربردار جانوروں کے لئے باڑے کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ موجودہ سیوہن اسٹیشن کے قریب ایک پہاڑی پر اُس قدیم زمانے کا ایک غار ہے، جو ''یک تھنبھی'' (One pillared Cave) کہلاتا ہے۔ اس کا تذکرہ ڈاکٹر ولسن نے کیا ہے۔[4] یہ بھی نہایت قدیم زمانے کا غار ہے، جس میں لوگ پناہ لیتے تھے۔

---

(1) Rev. E.O. James: Introduction to Anthropoloy, PP 65--66.
(2) Major General Cunnigham: Geography of Ancient India, PP. 264--266.
(3) W.T. Blanford: Geology of western Sind. (Memoirs of Geological Survey. Vol. XVII. Part 1).
(4) Mr. Henry Cousens. The Antiquities of Sind. Page 6.

لکی کے پہاڑوں میں گرم پانی کے چشموں کے نزدیک، کئی ایک قبریں ملی ہیں، ان کی بنسبت وہاں کے مسلمان باشندے کہتے ہیں کہ یہ قدیم ''کافروں کی قبریں'' ہیں۔ یہ قدیم لوگوں کی قبریں پندرہ بیس فوٹ لمبی، آٹھ نو فوٹ چوڑی اور تقریباً دو فوٹ اُونچی ہیں۔ ایسی قدیم زمانے کی ان گھڑے پتھر کی قبریں منگھو پیر کے قریب شاہ بلاول[1] والے راستے پر، خواہ وہ راستہ جو کراچی سے کوٹڑی اور سیوہن کی طرف جاتا ہے، اس شاہراہ پر ہیں۔ وہاں کے مسلمان باشندے ان کو بھی ''کافروں کی قبریں'' کہتے ہیں۔ ہندوؤں میں بھی پہلے مُردے دفن کرنے کا رواج تھا۔ مُردوں کو جلانے کا رواج بہت بعد میں جاری ہوا، کیونکہ آگ جلانے کا فن لوگوں نے بعد میں سیکھا تھا۔ ان حقائق سے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ موجودہ حب ندی اس قدیم زمانے میں بھی تھی، اور برساتی موسم میں برسات کا پانی پہاڑوں پر سے اتر کر اسی میں جا گرتا تھا، اس لئے اس طرف بھی پانی کی سہولت کے سبب لوگ رہ سکتے تھے؛ لیکن وہ پھر بھی بلوچستان کی حد شمار کی جائیگی، اس لئے سندھ کا آباد علاقہ صرف سیوہن والا علاقہ کہا جائیگا۔

سر بارٹل فریئر، جس کے نام پیچھے کراچی کا ''فریئر ہال'' ہے، اس صاحب نے ۱۸۵۱ع میں تاریخ سے پہلے والے زمانے کی قبروں کا بیان رایل ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل میں لکھا تھا۔ مسٹر ہینری کزنس، جو پہلے آرکیالاجیکل محکمہ کا سپرنٹنڈنٹ تھا اور سنہ ۱۹۱۰ع میں سندھ میں آ کر، میرپور خاص کی طرف ''کاہو جو دڑو'' کی کھدائی کروائی تھی، اس صاحب نے اپنی کتاب ''اینٹیکئیٹیز آف سندھ'' میں ان قدیم غاروں اور قبروں کا احوال، سر بارٹل فریئر اور دیگر علماء کی رپورٹوں سے دیا ہے، جس کا مختصر مطلب وہ ہی ہے جو اوپر گذر چکا۔

اِن حقائق سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ قدیم سے قدیم سندھیوں کی آبادیاں، اگر کسی کو تلاش کرنا ہیں تو سندھ کے مغرب میں سلسلۂ کوہ، اور سیوہن اور لاڑکانہ کے وہ مقامات جو سندھو دریاء اور مغربی نارہ کے قریب ہیں، وہ خصوصاً لکی اور سیوہن کے علاقے میں تلاش کرے، کیونکہ سندھ کی قدیم تہذیب کا پتہ وہیں سے ہی ہونا ہے۔ قدیم لوگوں کو پانی اس طرف آسانی سے دستیاب ہوسکتا تھا، اور انہیں غاروں میں رہنے کی سہولت بھی میسر تھی، اس لئے یہ سیوہن اور لاڑکانہ کا علاقہ قدرتاً سندھ کی تہذیب کا پہلا گھر بنا۔

کولوں کا مزید تذکرہ: کولوں اور سنتھالوں کی زبان میں ''کول'' لفظ کے معنی ہیں ''فرد'' یا ''آدمی''۔ جیسے حال ہی میں مہاتما گاندھی نے اچھوتوں کو نام دیا تھا ''ہریجن'' یعنی ہری یا بھگوان

(1) شاہ بلاول دو ہیں: ایک سیوہن۔۔دادو کی طرف اور دوسرا کراچی سے تقریباً باہتر میل دور لاہوت لامکان سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔ شاہ بلاول کی درگاہ پب جبل کے بیچ میں ہے، اس لئے عام طور پر اُسے ''پب کا پہلوان'' کہا جاتا ہے۔ (مصنف)

کے لوگ (People of God)، اسی طرح کول لوگ بھی پکارے جاتے تھے۔ ان کی اولاد کئی صدیاں مسلسل پورے شمالی ہندستان میں تھی؛ اس لئے ان کے آریوں کے ساتھ روابط ہو گئے تھے، اور اسی سبب سے سنسکرت میں بھی ''کول'' لفظ مروج ہو گیا، لیکن اس کے معنی ''جنگلی یا غیر مہذب'' کے ہو گئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم آریوں نے کولوں کو غیر مہذب حالت میں، یا خود سے بہت ہی کمتر دیکھا تھا، اس لئے ''کول'' لفظ کے یہی معنی ہوئے۔

کولوں اور سنتھالوں کے درمیان کچھ ''منڈھ'' لوگ بھی تھے، جن کا تذکرہ مہا بھارت (پرو ۶۔۔۲۴۱۰) اور وایُو پران (۱۴۔۔۱۲۳) میں ہے۔ اسی سبب سے کولوں، سنتھالوں اور منڈھ لوگوں وغیرہ کی زبانیں ان ہی ناموں پیچھے ''کولیرین'' یا ''منڈا'' زبانیں (Kolarian or Munda Languages) کہلاتی ہیں۔ سنسکرت میں ''منڈھ'' لفظ کے ایک معنی ہیں ''کمذات یا نیچ'' اور دوسرے معنی ہیں ''غبی، کند فہم''، اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم آریوں نے ان قدیم کولوں کو خود سے بہت کمتر سمجھتے تھے اور انہیں اپنے اصل نسل پر فخر تھا، یہی وجہ ہے کہ ''کول'' اور ''منڈھ'' لفظوں کو یہ تلخ معنی پہنائے گئے۔ یہ لوگ آریوں کی نسل سے نہیں تھے، اس لئے ''اَن آریہ'' (غیر آریہ) کہے جانے لگے۔ رفتہ رفتہ ''اَن آریہ'' لفظ کا تلفظ بگڑ کر ہوا ''اناڑی'' یعنی بے وقوف، اور آج کل اس کے معنی ہیں ''جنگلی یا غیر مہذب''۔ ان قدیم کول لوگون کو ''ملیچھ'' بھی کہتے تھے، جس کے اصل معنی تھے ''جسے زبان (یعنی سنسکرت) پوری طرح بولنے نہ آئے۔'' ان لوگون کا رہن سہن بھی آریہ لوگون کا سا نہیں تھا، اس لئے ''ملیچھ'' کے بعد میں معنی ہوئے ''پلید'' یعنی ناپاک وغیرہ۔ ان حقائق سے دو باتیں ثبوت کے طور پر سامنے آتی ہیں: ۱- آریوں کو اپنی زبان پر بہت فخر تھا۔[1] ۲- کولوں، سنتھالوں اور منڈھ لوگوں نے، آریوں کے دور تک بھی کوئی خاص ترقی نہیں کی تھی۔ اس لئے ان کی تہذیب کے آثار بھی اس وقت ویسے ہی ملتے ہیں، جن کی چند ایک مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

۱- قدیم کولوں وغیرہ میں کچھ وہ لوگ بھی تھے جنہیں ''بھیل'' کہا جاتا ہے۔ وہ لوگ آج تک سندھ میں، خصوصاً تھر میں، بہت ہیں۔ آج کل کے بھیل بھلے راجپوتانا سے کسی اور جگہ سے حال ہی میں آئے ہوں؛ لیکن اصل میں ان قدیم لوگوں میں سے ہیں۔ بھیلوں میں سے اکثر لوگ آج تک شکار کر کے گزارہ کرتے ہیں، اس لئے انہیں ''پارادھی'' (شکاری) کہا جاتا ہے۔ ڈھاٹکی زبان میں یعنی ڈھٹ یا تھر کی زبان میں بھیلوں کو ''تھوری'' (ٿوري) بھی کہتے ہیں۔

(1) اس طرح کا فخر ایک قدرتی بات ہے۔ عربوں کو بھی اپنی فصیح زبان پر فخر ہوا کرتا تھا۔ ایرانی لوگ ان کے تابع ہوئے، لیکن انہیں عربی اچھی طرح بولنے نہیں آتی تھی، تو عرب انہیں ''عجم'' یعنی گونگا کہتے تھے۔ (مصنف)

تون لنگھايين لطيف چئي، ترن جا توري،
آهيان ازوري، تنهنجي زوري، جبل جھاڳيان

(شاہ)

اس شعر میں سسئی اپنا مسکینی حال اور انکساری ظاہر کرنے کے لئے خود کو تھر کے تھوریوں (ایک کم ذات کا نام) سے تشبیہ دے کر، بتاتی ہے کہ میں نیچ سے نیچ ہوں۔ تھر کے سوڈھا راجپوت، کرار (بپاری) اور دوسرے ہندو لوگ بھیلوں کو اچھوتوں میں شمار کرتے ہیں۔

٢- کولوں کی زبان کا اس وقت سندھ میں کوئی نام نہیں، البتہ نیشان موجود ہیں۔ مثلاً، ہمارے بہت سارے دیہاتی لوگ اور دیگر ان پڑھ لوگ اکثر اوقات بیس بیس کے حساب سے گنتی کرتے ہیں۔ وہ ''پچاس'' کی بجاءِ کہتے ہیں ''ڈھائی کوڑیاں'' اور ''ساٹھ'' کی بجاءِ کہتے ہیں ''تین کوڑیاں یا بیسیں''۔ اسی سبب سے ایک ضرب المثل ہے کہ ''جیسی ساٹھ تیسی تین بیسیں (کوڑیاں)''۔ قدیم آریوں کا شمار کرنے کا نظام ''اعشاری نظام'' (Decimal system) تھا، اس وجہ سے اعداد پر انہوں نے نام ہی اس طرح کے رکھے اور ہم وہی اعداد تلفظ میں ہلکی پھلکی تبدیلی کے ساتھ آج تک استعمال کر رہے ہیں۔ مثلاً، بارہ (اصل میں ہے: با = دو، رہ = دہ = دس) معنی ہوئے دو اور دس (١٢)، تیرہ (تیدہس) معنی تین اور دس، اور چودہ معنی چار اور دس۔ یہ دس دس کر کے گننے کا رواج پہلے قدیم آریوں نے شروع کیا، جسے اہلِ یورپ اور اہلِ ایران نے بھی اختیار کیا۔[1] انگلیوں پر شمار کرنے کا رواج قدرتی اور نہایت آسان ہے، اس لئے آج بھی ہم انگلیوں پر شمار کرتے ہیں۔ لگتا ہے کہ قدیم آریوں کو دس دس کے حساب سے شمار کرنے کا خیال ہاتھ کی دس انگلیوں سے آیا۔ کولوں اور سنتھالوں نے شاید پاؤں کی انگلیوں کو بھی شمار میں لایا۔ اس لئے انہوں نے بیس بیس کے حساب سے شمار کرنیکی ترتیب (Vegesimal system) رائج کیا اور یہ آج ہمیں مضحکہ خیز لگتی ہے، جس لئے اسے غیر مہذب لوگوں کا رواج سمجھتے ہیں۔ سر گریئرسن نے لکھا ہے کہ یہ بیس بیس کے حساب سے گننے کا دستور کولوں اور سنتھالوں کا ہے، جو شمالی ہندستان کے ان پڑھ لوگ آج تک اسے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اور خود ''کوڑی'' (Score) منڈھا زبان کا لفظ ہے۔[2]

٣- سندھی زبان میں آوازوں میں سے بنے ہوئے بہت الفاظ ہیں، مثلاً: کتے کی آواز ''بھئُ بھئُ''، بلی کی آواز ''میاؤ میاؤ''، علاوہ ازیں کھنکھن، جھنجھن، ٹھا ٹھا، ٹھک ٹھک، ٹھکا ٹھوکی اور دوسرے آوازوں سے بنے ہوئے کئی ایک الفاظ ہیں۔ وسطی ہندستان کے موجودہ کول اور

(1) Prof. Max Muller: India: What can it Teach us?
(2) Sir Grierson: Linguistic Survey of India, Vol. 1, Part 1, PP. 35 & 132.

سنتھال لوگ بھی اسی طرح آوازوں سے بنے ہوئے الفاظ کثیر تعداد میں استعمال کرتے ہیں۔ ان کے آباء واجداد کی زبان کا اثر آریوں کی سنسکرت پر ہوا ہو تو یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔

ان کی زبانوں کے اور کونسے اثرات ہوئے ہیں، اس سلسلے میں بعض علماء تحقیق کر رہے ہیں، لیکن وہ پہلے ہی اتنا بتا چکے ہیں کہ کول اور سنتھال اتنے مہذب لوگ نہیں تھے۔

۴- سندھ میں کھیتی باڑی کرنے والے اور دوسرے لوگ بھی اکثر اوقات فقط لنگوٹی باندھ کر کام کاج کرتے ہیں۔ یہ دراصل سنتھالوں اور کولوں کا جاری کیا ہوا رواج کہا جاتا ہے، جسے وسطی ہندستان کے طرف ان کی اولاد آج تک جاری رکھے ہوئے ہے۔ لگتا ہے کہ جب کپڑہ بُننے کا رواج شروع ہوا، تب ان قدیم لوگوں نے لانگوٹی اور لنگوٹی باندھنے کا رواج ڈالا، جسے بعد میں فقیروں اور سادھو لوگوں نے بھی اختیار کیا۔

۵- منچھر جھیل کے میر بحر جس طریقے سے پرندوں کا شکار کرتے ہیں، وہ طریقہ نہایت پرانا ہے۔ وہ میر بحر جب جھیل کے پرندوں کا شکار کرنے جاتے ہیں، تب ان میں سے بعض ترونے پر تیرتے جاتے ہیں۔ ترونے پر سامنے سے پابوڑے (پبن درخت کے پتے) وغیرہ لگا دیتے ہیں، اس لئے دور سے یوں لگتا ہے، جیسا کہ پانی پر پتے تیر رہے ہیں۔ کچھ میر بحر پبن درخت کے پتوں سے ٹوپ (بڑی ٹوپی) بنا کر اس سے اپنا سر اور چہرہ چھپا لیتے ہیں۔ وہ خود پانی میں اندر ہوتے ہیں، باقی صرف ان کا ان پتوں سے چھپا ہوا سر باہر ہوتا ہے، ان پتوں سے بنے ہوئے ٹوپلوں میں دو سوراخ کرتے ہیں، اور ان میں سے پرندوں کو نظر میں رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ پرندے سمجھتے ہیں کہ کوئی ''پابوڑا'' بہتا ہوا آ رہا ہے، اس لئے بے خوف ہو کر پانی پر تیرتے ہیں۔ بعض اوقات تو پرندے ان پابوڑوں کے اردگرد جمع ہو جاتے ہیں۔ اس لئے موقع پا کر میر بحر پانی میں اندر ہی اندر سے ہاتھ بڑھا کر، پرندوں کو ٹانگوں سے پکڑ کر قابو کر لیتے ہیں۔ زندہ پرندوں کو پکڑنے کا یہ عجیب نمونہ ہیوز صاحب کے سندھ گزیٹیئر کے مطابق بھی نہایت قدیم زمانے کا ہے۔ جیسا کہ کولوں کی تہذیب کا مرکز سیوہن کا علاقہ تھا اور زندہ پرندوں کو پکڑنے کا یہ طریقہ صرف منچھر جھیل میں ہوتا ہے، اس لئے یوں لگتا ہے کہ یہ قدیم کولوں کا دستور ہے، جسے منچھر جھیل کے میر بحر آج تک جاری رکھے ہوئے ہیں۔

۶- بعض میر بحر آڑی اور دیگر پرندوں (بطخ وغیرہ) کو گُند تیروں سے نشانہ بناتے ہیں، تو وہ پرندے بے دم ہو کر گر جاتے ہیں، جس وجہ سے انہیں آسانی سے پکڑ لیتے ہیں۔ مچھلیوں کو پکڑنے کے لئے میر بحر لوگ یوں کرتے ہیں کہ پانی میں جال پھیلا کر تھالیاں بجاتے ہیں، تو اس آواز پر مچھلیاں ڈر کے مارے بھاگنے لگتی ہیں، اور کئی ایک جال میں جا کر پھنس جاتی ہیں۔ یہ

رواج بقول ان کے حضرت آدمؑ کے زمانے سے ہے، جسے منچھر، کینجھر اور دوسرے مقامات کے میر بحر جاری رکھے ہوئے ہیں؛ لیکن پابوڑوں سے چہرہ چھپانے کا رواج صرف منچھر کے میر بحروں میں ہے۔ ان میر بحروں کی زبان بھی اتنی مختلف ہے کہ کوئی دوسرا سندھی سمجھ بھی نہیں پائیگا۔ جس طرح انگریزوں کے پاس خلاصیوں کی زبان منفرد ہے، اسی طرح سندھ میں بھی بہت کا سب لوگوں کی زبان منفرد ہوتی ہے؛ لیکن منچھر کے میر بحروں کی زبان کا نمونہ اور ہی نرالہ ہے۔ ضلع کراچی کے میر بحروں کی ایک اور بات بہت ہی نرالی ہے، وہ بھی اچھی خاصی توجہ طلب ہے۔

۷۔ کراچی ضلع میں شاہ بندر کی طرف ''ستاہ'' نامی ایک کنئال ہے، اس کے قریب دریائے سندھ کے ایک حصہ کو ''مگدو'' کہتے تھے، کیونکہ اُس طرف دریاء کا کنارہ دراصل ''مگدو'' ذات کے بلوچ لوگوں نے آباد کیا تھا۔ اس مگدے کے قریب دریائے سندھ کے دوسرے حصہ کو ''پوپٹ'' کہتے تھے۔ ''پوپٹ'' کے معنی ہیں ''طوطہ''۔ ہمارے دریاء پر یہ نام کیسے پڑا؟ سندھ سے متعلق متفرقہ احوال بمبئی حکومت کے دفتر سے منتخب کر کے، دو جلدوں میں چھپوایا گیا ہے، جن میں سے دوسری جلد میں زیادہ تر تذکرہ دریائے سندھ اور اس کی تبدیلیوں کا ہے؛ دریائے سندھ کے علحدہ علحدہ حصوں پر پرانے زمانے میں جو نام رکھے گئے تھے، ان کا تذکرہ کرتے ہوئے درج کیا گیا ہے کہ دریائے سندھ کے اسی حصے پر ''پوپٹ'' نام اس لئے پڑا، کہ قدیم زمانے میں اس طرف کے میر بحر دریاء میں اترنے کے وقت اپنے پیر کے لئے ایک پوپٹ (طوطہ) قربانی کے طور پر پیش کرتے تھے۔

سندھ میں طوطوں کی قربانی کا رواج نہ ہندوؤں میں ہے اور نہ ہی مسلمانوں میں، کولوں اور سنتھالوں سے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ آسٹریلیا کی طرف سے چین کے راستے آئے تھے۔ آسٹریلیا میں روزہ رکھنے اور قربانی چڑھانے کا رواج نہ پہلے تھا اور نہ آج بھی ہے۔ اسی کتاب (بمبئی حکومت کا دفتر) میں درج ہے کہ یہ رواج چین میں پایا جاتا ہے۔[1] جیسا کہ کولوں اور سنتھالوں سے متعلق علماء کا کہنا ہے کہ یہ چین کے راستے ہندستان میں آئے تھے، اس لئے یوں لگتا ہے کہ یہ طوطوں کی قربانی کا رواج ان لوگوں نے چین سے آتے ہوئے دیکھا تھا، اور سندھ میں آ کر انہوں نے اسے جاری کیا اور ان کی اولاد ان کے بعد اسے جاری رکھے ہوئے تھی۔ فی زمانہ یہ رواج نہیں ہے۔ ان باتوں پر تحقیق آج تک کسی بھی عالم نے نہیں کی۔ ہم نے یوں ہی فرض کر لیا ہے کہ یہ رواج کولوں اور سنتھالوں کے زمانے کا ہے، کیونکہ آریوں کے ہاں یہ رواج تھا ہی نہیں۔

---

(1) Ponat is derived from a tradition that in ancient times a parrot used to be sacrificed.... For a similar custom among the Chinese see 'Barrow's Travells'. Selections from the Racords of the Bombay Government. Part II, p. 428.

باب ۲

دراوڑوں کا زمانہ

سندھ میں دراوڑ: علماء کہتے ہیں کہ قدیم حجری (پتھر والے) زمانے کے بعد برف کم گرنے لگی اور زمین کی حالتیں تبدیل ہوئیں، لوگ بھیڑ بکریاں پالنا، کھیتی باڑی کرنا، آگ جلانا، اور برتن بنانا سیکھے۔ دھاتوں میں سے سونے کے علاوہ کسی اور دھات کا انہیں کوئی علم نہیں تھا۔ پرانے زمانے میں لوگ ان گھڑے پتھر کام میں لاتے تھے، لیکن اِس زمانے میں پتھروں کو گھڑنا انہوں نے سیکھا، اور پھر چھریاں، درانتیاں اور دوسرے اوزار پتھروں میں سے بنا سکتے تھے۔ یہ "نیا حجری زمانہ" (Neolithic or New Stone Age) کہلاتا ہے، جو آج سے تقریباً پندرہ ہزار برس پہلے شروع ہوا تھا۔ بعض علماء یوں سمجھتے ہیں کہ جانوروں کی ہڈیوں کی ہمواری کو دیکھ کر اس وقت کے لوگوں کو پتھروں کو گھڑنے کا خیال آیا، اس لئے ان گھڑے پتھروں کی بجاءِ گھڑے ہوئے پتھر کام میں لانے لگے۔ حقیقت کچھ بھی ہو، لیکن اتنا ضرور کہیں گے کہ قدیم کولوں اور سنتھالوں سے اس زمانے کے لوگ زیادہ سدھرے ہوئے تھے، اسی وجہ سے یہ تہذیب کے ترقی کا دوسرا دور شمار ہوتا ہے۔

نئے حجری زمانہ کی تہذیب کی بنیاد رکھنے والے دراوڑ لوگ سمجھے جاتے ہیں۔ ان سے متعلق علماء نے تحقیقات کر کے بتایا ہے کہ کولوں اور سنتھالوں پر یہ لوگ حملہ آور ہوئے اور ان میں سے بہتوں کو وسطی ایشیا کی طرف دھکیل دیا اور خود شمالی ہندستان کے والی بن کر بیٹھ گئے۔ حال ہی میں موہن جو دڑو میں سے کچھ کولوں اور سنتھالوں کی کھوپڑیوں کے ساتھ ساتھ دراوڑوں کی کھوپڑیاں بھی ملی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دراوڑوں کے آنے کے بعد بھی کچھ کول اور سنتھال ان کے ساتھ رہ رہے تھے۔[1] انہوں نے پھر آریوں سے بھی تعلقات استوار کر لئے تھے، اس لئے سنسکرت ادب میں ان دونوں قوموں کا تذکرہ موجود ہے۔

(1) "It may be that the two races (Kolarians and Dravidians) dwelt side by side, an.. this is the theory now generally accepted. Or it may be that the Kolarians first inhabited the country and that the Dravidians came later either from the North-West or from the South, at a time when the land now submerged beneath the sea, is supposed to have stretched from India in the direction of Australia." E.Marsden and Sir Henry Sharp: A History of India, P. 13.

سندھ میں اس وقت جو ''اوڈ'' لوگ رہتے ہیں، وہ در اصل دراوڑوں کی نسل ہیں۔ یہ اصل میں جنوبی ہندستان میں تھے، شمالی ہندستان کی طرف آنے سے پہلے راستے میں جس جگہ بس گئے تھے، وہ مقام ان کے نام پیچھے ''اوڈ ردیش'' کہا جانے لگا، جس کا تلفظ بعد میں تبدیل ہو کر ''اوڑیسا'' (Orissa) ہوا۔ بمبئی علاقے کی ذاتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے، یہ حقیقت اینتھوون صاحب نے لکھی ہے۔ ان اوڈ لوگوں میں سے کچھ مارواڑ چلے گئے، جہاں سے پھر سندھ میں آئے؛ لیکن زبان آج تک مارواڑیوں جیسی بولتے ہیں۔ یہ اصل میں ہندو لوگ ہیں، لیکن اکثر ان کی شکلیں مسلمانوں سے ملتی جلتی ہیں، اور کپڑے بھی ان ہی کی طرح کے پہنتے ہیں۔ ان کا پیر ''رامڈیو'' ہے، جس کا میلہ سال بسال منایا جاتا ہے۔ ''اوڈ'' لفظ کے بنیادی معنی ہیں ''تعمیر کرنے والا''؛ وہ آج تک دیواریں تعمیر کرنے کا کام کرتے ہیں۔

سندھ میں اس وقت دوسرے ''ماجر'' ذات کے میر بحر ہیں۔ وہ سندھ کے قدیم دراوڑوں کی اولاد ہیں، یا پھر بعد میں جنوبی ہندستان سے آئے، اس بات کا پکا یقین نہیں۔ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ کئی صدیوں سے سندھ، کچھ اور گجرات کے تاجر لوگ ملبار کی طرف تجارت کے خیال سے جایا کرتے تھے۔ آج بھی مغلبھین، تحصیل جاتی، کچھ بھج اور گجرات علاقے کے میر بحر اپنی کشتیاں ملبار کی طرف لے جاتے ہیں۔ ''ماجر'' ذات کے میر بحر ملبار میں بھی بہت ہیں، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ملبار کنارے والے لوگوں سے تعلقات ہونے کی وجہ سے وہ سندھ میں آئے ہوں تو اس میں کوئی عجب والی بات نہیں ہے۔

تون سمون آءُ گندري، مون ۾ عيبن جوءِ،
پسي راڻين روءِ، متان ماڱر مٽئين.
(شاھ)

[ہزاروں عیب وابستہ ہیں مجھ سے،
''سمہ'' تو اور میں ''گندری'' ہوں پیارے،
کہاں میں اور کہاں محلوں کی رانی،
کہیں بھول نہ جانا مجھ کو پیارے۔]
(ایاز)

سندھ کا حاکم جام تماچی، جو سمہ گھرانے سے تھا، اس نے نوری نامی ایک میر بحر عورت، ذات گندری، کے ساتھ شادی رچائی تھی۔ مذکورہ بالا شعر میں شاہ صاحب نے نوری میر بحر کو ''ماگر''

کہا ہے۔ نوری میر بحر کینجھر جھیل کی طرف رہتی تھی۔ وہ جھیل ہیلایا، تحصیل ٹھٹہ میں ہے۔ ان دنوں کینجھر کی طرف "ماگر" ذات کے لوگ نہیں ہیں، البتہ سجاول کی طرف بہت ہیں۔ انہیں سجاول طرف آج تک "ماجر" کہا جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں ٹھٹہ اور سجاول کا بڑا علاقہ پانی تلے تھا۔ اُن دنوں دریائے سندھ نصرپور کے پاس سے گذرتا تھا۔ سنہ ۱۷۵۸ع میں دریائے سندھ نصرپور سے اپنا رخ تبدیل کر کے، موجودہ راستہ لیا، تو پھلیلی بہنا بند ہوگئی۔[1] اس وقت دریاء نے بھی یہاں سے اپنا رخ تبدیل کرلیا ہے، جس وجہ سے یہ میدان نمودار ہوئے۔ سجاول کا علاقہ ان دنوں آباد ہوا، ورنہ وہاں اصل میں "ماجر" ذات کے میر بحر رہائش پذیر تھے، جو مچھلیوں کا شکار کرتے تھے، اور مسافروں کو بھی دریاء کی اُس طرف لے جایا کرتے تھے۔ سجاول کی طرف "ماگر" کی بجائے "ماجر" کہتے ہیں، یعنی "گ" کو "ج" میں تبدیل کر دیا ہے، ورنہ لفظ تو ایک ہی ہے۔ یہ دراصل دراوڑی لفظ ہے اور اس کے بنیادی معنی ہیں "جال رکھنے والا یعنی میر بحر" سجاول کی طرف "ماجر" نامی ایک جھیل بھی ہے، جس پر بھی ان ہی میر بحروں کا نام پڑا ہوا ہے۔

سجاول ۾ واهه گهوٽارو وهي وچان بازار،
ماجر ۾ تا مڇر پون مانيءَ منجھ هزار.
(غريب)

شہر سجاول، نہر گھوٹارہ، بہتی جائے بیچ بزار،
مانجر میں جو کھانا کھائے، مچھر پڑیں کئی ہزار۔

دراوڑ کہاں سے آئے؟: دراوڑ لوگ کہاں سے آئے، اس سے متعلق علماء کی علحدہ علحدہ آرائیں ہیں، جن میں سے دو اہم آرائیں ہیں: ایک گروہ کا کہنا ہے کہ دراوڑ لوگ اصل میں ہندستان کے رہنے والے تھے، اور وہاں سے شمالی ہندستان میں تب آئے، جب وہ حصہ خشکی کے راستے آسٹریلیا سے ملا ہوا تھا۔ حال ہی میں جو تحقیقات ہوئی ہیں، ان کے مطابق کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ دراوڑ بحیرۂ روم کی طرف بسی ہوئی قوموں میں سے تھے۔ وہ پہلے کچھ وقت میسوپوٹیمیا کی طرف آباد ہوئے؛ لیکن بعد میں دوسری سیمیٹک قوم والوں نے انہیں وہاں سے نکال دیا، جس سبب سے بلوچستان کے راستے ہندستان میں آئے۔ ان میں سے کچھ نے وادیٔ گنگا، تو کچھ نے وادیٔ مہران میں رہائش پذیر ہوئے۔

بلوچستان میں اس وقت جو بروہی ہیں، ان کے آباء و اجداد بھی قدیم زمانے میں شاید میسوپوٹیمیا کی طرف رہتے تھے اور وہاں پر یہی زبان بولتے تھے۔ اسی سبب بروہی زبان کی نحوی

(1) Mr. Henry Cousens: The Antiquities of Sindh, Page 6.

ساخت دراوڑی زبانوں جیسی ہے، باقی کسی اور طرح بروہی لوگوں کی مدراس والوں کے ساتھ کوئی بھی رشتیداری نہیں ہے۔ بروہی زبان کے اس گہرے ناطے کی وجہ سے بعض علماء یوں سمجھتے رہے کہ بروہی اور دراوڑ دونوں وسطی ایشیا کی طرف سے آئے تھے، جن میں سے بروہی بلوچستان میں ہمیشہ کے لئے وہاں کے رہنے والے ہو گئے اور دین اسلام کو اختیار کر لیا، اور دراوڑ پہلے شمالی ہندستان میں آئے، جہاں سے پھر جنوب کی طرف گئے، کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ دراوڑ اصل میں بحیرۂ روم کی طرف بسنے والی قوموں میں سے نہیں تھے، وہ دراصل ہندستان کے رہنے والے تھے، جہاں سے بحیرۂ روم اور دوسری طرف چلے گئے۔ حال ہی میں مہن جو دڑو اور ہڑپا سے جو مہریں ملی ہیں، ان پر لکھے ہوئے الفاظ پڑھ کر اور دوسرے ثبوت فراہم کر کے، فادر ہیرس نے بھی اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ دراوڑ لوگ ہندستان سے بحیرۂ روم والے ممالک کی طرف گئے تھے اور اپنی تہذیب کا پھیلاؤ یورپ تک کیا تھا۔ (1)

ٹھٹہ اور روہڑی طرف کی تہذیب: قدیم زمانے کے اوائل میں سندھ کا صرف مغربی جابلو حصہ آباد تھا، اور اس وقت کے لوگوں (کولوں وغیرہ) کی تہذیب کا مرکز سیوہن اور لاڑکانہ کا علاقہ تھا۔ "نیا حجری زمانہ" کی تہذیب کے آثار ٹھٹہ اور کوٹڑی سے لے کر روہڑی تک ملے ہیں۔ لگتا ہے کہ ٹھٹہ سے سمندر پیچھے ہٹ جانے کے سبب یہ میدان ظاہر ہوئے تھے، جس وجہ سے نئے حجری زمانے میں لوگ اس طرف بھی رہ سکتے تھے۔

---

(1) "After the study of above one thousand eight hundred inscriptions which upto now have been deciphered by the present writer, it is easy to realize that the wave of migration of the Mediterranean race which was supposed to have been from west to East, must now be finally settled as having taken place in the opposite directioon, i.e. from East to West. The development of the script of Mohen-jo-Daro in relation with the Sumerian script, the relion of these two countries and that of Egypt, the titles of Kings, the number of Zodiacal Constellations among the proto-Indian people and the relative positions of these constellations, the changing of the pro-o-Indian constellation of the Harp (val) for taurus (the bull) which must have taken place in Sumer, the tradition of the ancient people of Mesopotamia recorded by Berousus, the parralel biblical account in Genesis II, 1-5-all point to the same concusion that the migration of the Mediterranean race commenced from India and extended through Southern Mesopotamia and Northern Africa, spread through Crete, Cyprus, Greece, Italy and Spain, and crossing the Pyrenes reached Central Europe and the British isles. this route starting from Ceylon up to Ireland is marked by an interruptedd chain of dolmens and other megaliths, that seem to be relics of this enterprising and highly civilized race which is termed mediterranean by the anthropologists and which in India has been quite unreasonably despised under the name Dravidian." Rev. H. Heras. S.J. Journal of Indian History, Vol. XVI. Part 1, April 1937. Serial No. 46.

نئے حجری زمانے کے بائیکار دراوڑ لوگ سمجھے جاتے ہیں۔ اس زمانے کے نشانات ڈھونڈ نکالنے کا کام سندھ میں پہلی پہلی دفعہ مسٹر کارٹر آء۔سی۔ایس نے کیا تھا۔ سن ١١۔۔١٩١٩ع کے لگ بھگ یہ صاحب سندھ میں آیا اور بہت عرصہ تک ٹھٹہ ڈویژن کا اسسٹنٹ کلیکٹر تھا۔ سن ١٩١٧ع میں حیدرآباد سندھ کی میونسپالٹی معطل ہوئی، تو وہ میونسپل کمشنر مقرر ہوا تھا؛ لیکن اس قسم کی تحقیقات کا شوق اس میں کوٹ کوٹ کے بھرا ہوا تھا۔ جو تحقیقات وہ کرتا تھا، انہیں وہ بمبئی کے انگریزی اخباروں میں لکھتا تھا۔ اس کے مضامین مصنف نے خود پڑھے تھے۔ حال ہی میں معلوم ہوا ہے کہ وہ صاحب اپنی تحقیقات کی رپورٹیں آرکیالاجیکل محکمہ والوں کو بھیج دیتا تھا۔ ان رپورٹوں کا احوال مسٹر ہینری کزنس نے اپنی کتاب ''اینٹیکیٹیز آف سندھ'' (The Antiquities of Sindh) میں دیا ہے، جس کا خلاصہ یہاں ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

کراچی سے بیس میل دور ''مول'' نامی وادی میں مسٹر کارٹر نے دیکھا کہ ایک جگہ پتھروں کے اوپر پتھر ڈھیر لگے ہوئے پڑے ہیں۔ ان پتھروں پر کن چکروں، اونٹوں اور گھوڑوں کی تصویریں کندہ تھیں۔ اس جگہ کو انہوں نے ''ٹھُل'' کا نام دیا ہے۔ مسٹر کارٹر کا خیال ہے کہ یہ ٹھُل فقط ١٥٠ برس ق۔م کا ہے؛ لیکن اسی وادی میں اس نے نئے پتھر والے زمانے کے لوگوں کی بیٹھک کے نشانات بھی دیکھے۔ اس زمانے کے گھڑے ہوئے پتھر سے بنے ہوئے کچھ اوزار بھی اُسے ملے۔ اسی طرح یہ صاحب تحقیقات کرتا گیا، تو نئے حجری زمانہ کی بیٹھکیں کراچی سے لے کر اُنڑپور تک دیکھیں۔ ادھر پھر ننگر ٹھٹہ کے نزدیک، گجی گاؤں کے راستے پر تھرڑی کے پاس، نئے حجری زمانے کا عجیب طرح سے تعمیر شدہ ایک شہر اُسے دیکھنے میں آیا، جس کی چاروں طرف دیوار تھی۔ اسی جگہ سے خواہ جھرک کی طرف بدھک پہاڑوں میں سے، اسی زمانے کے پتھر کے بنے ہوئے اوزار وغیرہ بھی اُسے مل گئے۔

حال ہی میں آرکیالاجیکل محکمہ والوں نے بھی ان حصوں کا جائزہ لیا، اس لئے نئے حجری زمانے کی بیٹھکوں کا تذکرہ سر جان مارشل نے بھی اپنی تصنیف کردہ کتاب مہن جو دڑو اور سندھو تہذیب کے جلد پہلے صفحہ ٩٢ پر کیا ہے۔ اس صاحب کا کہنا ہے کہ نئے حجری زمانے کے نشانات سندھ میں لکی کے پہاڑوں، کھیرتھر سلسلہ کوہ اور روہڑی والی پہاڑیوں میں بھی کثرت سے پائے گئے ہیں۔ حاصل مطلب یہ کہ اس زمانے میں نہ صرف سیوہن کا علاقہ آباد تھا، بلکہ سندھ کی مشرق میں موجود پہاڑیوں یعنی ٹھٹہ اور جھرک والے بودھکن پہاڑوں اور اُنڑپور سے لے کر روہڑی والی پہاڑیوں تک کا حصہ آباد تھا۔ (1)

(1) اگر ان کے بعد مزید بیٹھکیں دریافت نہیں ہوئیں تو یوں فرض کرنا پڑے گا کہ بقایا سندھ کا حصہ اور بھی کچھ سمندر کے پانی تلے، تو کچھ دریائے سندھ کے پانی کے تلے تھا، سندھ کے کچھ کچھ ٹکڑے علحدہ علحدہ اوقات میں پانی تلے نکل کر نمودار ہوئے ہیں، کیونکہ دریائے سندھ میں اب سے پہلے پانی دگنا تگنا تھا، جس وجہ سے کچھ حصہ ڈوبے ہوئے ہوتے تھے۔ عربوں کے وقت سے لے کر اب تک سمندر بھی تقریباً چالیس میل دور چلا گیا ہے۔ (ملاحظہ فرمائیں میجر روَرٹی کا ''سندھ کا مہران'')

تہذیب کے ادوار (Epochs of Civilization): انسان ذات کی پیدائش کو کئی زمانے گذر چکے ہیں، لیکن پوری دنیا میں کسی بھی ملک کی ایسی قدیم تاریخ نہیں ہے، جس سے معلوم ہو سکے کہ ہر ایک زمانہ میں اس ملک کی تہذیب کیا تھی اور وقت بوقت اس کی ترقی کیسے ہوئی۔ تاہم، ہر ملک میں قدیم لوگوں نے اپنی تھوڑی بہت نشانیاں چھوڑی ہیں۔ جن کا جائزہ لینے سے آرکیالاجیکل محکمہ والے تہذیب کی ترقی کی منزلیں یا تہذیب کے ادوار (Epochs of Civilization) کا ادراک کر سکتے ہیں۔ ان ادوار کی زیادہ تر سمجھ پتھروں اور دھاتوں میں سے بنے ہوئے اوزاروں اور دیگر اشیاء سے ہوتی ہے، جو علحدہ علحدہ زمانوں میں لوگوں کے استعمال میں تھیں۔ اسی سبب ان زمانوں پر نام ہی اسی طرح کے رکھے گئے ہیں۔ ان میں سے پہلا ہے ''قدیم حجری زمانہ'' اور دوسرا ''نیا حجری زمانہ'' (نیا پتھر والا زمانہ)، جس کا تذکرہ پہلے ہی اوپر گذر چکا ہے۔ اس کے بعد وہ زمانہ شمار ہوتا ہے، جس میں لوگ تانبہ استعمال کرنے لگے۔ اس لئے اسے ''تانبے والا زمانہ'' (Copper Age) کہتے ہیں۔ لوگوں نے بعد میں مزید ترقی کی۔ تانبہ اور قلعی ملا کر ایک مرکب دھات ''برانز'' (Bronze) بناتے تھے اور ان میں سے اوزار، برتن وغیرہ بناتے تھے، اس لئے وہ ''برانز'' یعنی ''تانبہ اور قلعی مرکب والا زمانہ'' (Bronze Age) کہتے ہیں۔ اس کے بعد لوگوں نے لوہا مارنا سیکھا، تو دروازوں کی چٹخیاں، چھرے، چھریاں، کلہاڑے، کدالیں، کرپیاں اور تلواریں وغیرہ بنانے لگے۔ یہ ''لوھے کا زمانہ'' (Iron Age) کہلاتا ہے۔ اس وقت ہم ''مشینوں کا زمانہ'' (Machine Age) میں ہیں۔ آگ پر چلنے والی گاڑیاں، آگبوٹ، کپڑے بُننے اور سینے کی مشینیں، تیل نکالنے اور کپاس تاننے کی مشینیں بلکہ بال کاٹنے کی مشینیں بھی عام ہوگئی ہیں۔ ہوائی جہاز، آبدوزیں وغیرہ بھی موجودہ زمانے کی پیداوار ہیں۔ اور یہ پتہ دیتی ہیں کہ انسان کس طرح ترقی کرتا جا رہا ہے۔

ان باتوں کا ذکر ہم نے اس لئے کیا ہے کہ ہم نے قدیم پتھر والے یا نئے پتھر والے زمانے کا جو تھوڑا بہت احوال دیا ہے، اتنا ہم تانبے اور برانز والے زمانے کا نہیں دے سکتے۔ یورپ سے ان دونوں زمانوں کی چیزیں اچھے خاصے تعداد میں ملی ہیں۔ ہندستان سے تانبے کی تھوڑی سی چیزیں ملی ہیں، باقی برانز والا زمانہ جیسا کہ ہندستان میں ہوا ہی نہیں تھا، اس لئے یورپی علماء یوں سمجھ رہے تھے کہ ہندستان کے لوگوں نے کم ترقی کی ہے۔ اس قسم کی غلط فہمی کے لئے یہی ایک واحد سبب ہے کہ ہندستان میں اس قسم کی تحقیقات کرتے ہوئے انہیں کوئی بڑا عرصہ نہیں ہوا۔ سندھ میں اسی طرح کی تحقیقات خرچہ بھی بڑا مانگتی ہیں، کیونکہ دریائے سندھ کی تبدیلیوں نے وقت بوقت آباد حصوں کو سنسان تو سنسان حصوں کو آباد کیا ہے، اور قدیم تہذیب

کے کئی ایک نشانات کچھ ایسے ٹیلوں میں دبے ہوئے ہیں، جن کے اوپر دوسرے ٹیلے بن گئے ہیں۔ اب جب ان تمام ٹیلوں کی کھدائی کر کے پاتال تک پہنچا جائے تب جا کر کچھ پتہ چلے۔ سنہ ۱۹۲۲ع مین اچانک مہن جو دڑو کی طرف شک کی نگاہ چلی گئی۔ جب اس ٹیلے کی کھدائی کی گئی تو وہاں سے تانبے اور برانز میں سے بنی ہوئی چیزیں تو ملیں، بلکہ ایک درمیانی دور کی تہذیب کے ایسے ثبوت ملے، جو خود آرکیالاجیکل محکمہ والے حیرت زدہ ہو گئے۔ یہ درمیانی دور وہ دور ہے، جس میں لوگوں نے ہنوز لوہا مارنا نہیں سیکھا تھا، لیکن نئے حجری زمانہ کے لوگوں کی طرح گھڑے ہوئے پتھروں سے اوزار اور دیگر اشیاء بناتے تھے، اور ساتھ ہی تانبے کا استعمال زیادہ کرتے تھے، اس لئے اسے کتلکولتک تہذیب (Chalcolithic Culture) کہا جاتا ہے یعنی وہ تہذیب جس میں تانبہ اور پتھر دونوں استعمال ہوتے ہوں۔ سارے ہندستان کے علاقوں میں سے، پہلا علاقہ سندھ ہی ہے، جس میں اس اعلیٰ تہذیب کے اچانک ثبوت مل گئے، تو ہر کسی کی آنکھیں مہن جو دڑو پر مرکوز ہو گئیں۔

ٹیلوں میں دبی ہوئی تہذیب: آرکیالاجیکل محکمہ والوں کو جس وقت اس تہذیب کا پتہ چلا، اس وقت ساری سندھ میں اس بات کو پھیلا دیا گیا، جلد ہی ان کو معلوم ہوا کہ مہن جو دڑو کے علاوہ سندھ میں اور بھی کئی مقامات ہیں، جہاں یہی تہذیب تھی۔ مثلاً، ننگر ٹھٹہ سے بارہ میل دور گاؤں گجی کی طرف تھرڑی میں، کوٹڑی کے شمال میں کارڑی میں، آمری اسٹیشن سے تقریباً دو میل دور آمری کے گاؤں میں، لاڑکانہ ضلع میں، باڈہ کی طرف لوہم کے ٹیلے میں، لاڑکانہ شہر کے نزدیک جھوکڑ کے ٹیلے میں، اور روہڑی کے اُس طرف ریتی اسٹیشن سے پانچ میل دور ونجھوٹ کے شہر میں۔ سنہ ۹۶۲ع میں ایک خوفناک زلزلہ ہوا تھا، جس میں سکھر اور بکھر کے پہاڑ بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے۔ اُن دنوں الور سے دریا نے اپنی سمت تبدیل کی، تو پانی کی تکلیف کے سبب لوگ نقل مکانی کر کے روہڑی چلے گئے۔ ونجھوٹ بھی دریا کا رخ تبدیل ہونے کی وجہ سے ویران ہو گیا،(1) ورنہ یہ بھی ایک عالیشان شہر تھا۔ سرحد سندھ میں کھدائی کروائی گئی تو پتہ چلا کہ ''لیمو جونیجو'' بھی مہن جو دڑو والے زمانے میں آباد تھا۔ ان تمام مقامات کی تہذیب ایک ہی تھی۔(2) یہ سارے حصے دریا بادشاہ نے باری باری ویران کئے ہیں۔ اس لئے ان مقامات کی قدیم تہذیب وہاں کے ٹیلوں میں دبی ہوئی ہے۔

سنہ ۱۹۲۸ع مسٹر ایم۔ جی مجمدار (مجموعدار) نے ایک اور مقام ڈھونڈ نکالا۔ نواب شاہ ضلع میں سکرنڈ سے تقریباً پانچ میل دور، شمال مشرق میں، ''چانہو جو دڑو'' ہے جو'' گاؤں جمال

(1) Mr. Henry Cousens: The Antiquities of Sind. PP.5,6-149.
(2) Sir John Marshall: Mohan Jo Daro and Indus Civilization P. 92.

کیریو'' کے نزدیک ہے۔ وہاں جانے کے لئے ''نواز ڈاہری'' اسٹیشن پر اترنا پڑتا ہے، جہاں سے ''چانہو جو دڑو'' تقریباً آٹھ میل دور ہے۔ وہاں فقط تین ٹیلے ہیں۔ مسٹر مجمدار وہ تینوں ٹیلے سطحی طور پر کھدوائے تو وہاں سے بھی وہی چیزیں ملیں جو مہن جو دڑو سے ملی تھیں۔ یہ بات جب اخباروں میں چھپ کر شایع ہوئی، تو بعض یورپی علماء کو ''چانہو جو دڑو'' کی مزید کھدائی کا خیال آیا۔ سنہ ۳۵۔۔ ۱۹۳۶ع میں دو سوسائٹیوں (American Society of Indian and Iranian Studies and 'Boston Museum of Foreign Arts) والوں نے آپس میں مل کر، آرکیالاجیکل محکمہ کے سپرنٹینڈنٹ مسٹر منکی کو اپنا سربراہ بنا کر، چانہو کے تین ٹیلوں میں سے دو کی مزید کھدائی کروائی۔ اس کھدائی کے نتائج کی رپورٹ آج تک چھپ کر شایع نہیں ہوئی ہے، اس لئے اس سے متعلق کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اس وقت تک جو احوال مخازن اور اخبارات میں چھپ کر شایع ہوئے ہیں، ان میں صرف اتنا درج ہے کہ مہن جو دڑو والی تہذیب پر یہاں سے کچھ مزید روشنی پڑے تو یہ ایک عجیب بات نہیں ہوگی۔ جیسا کہ اس وقت تک مہن جو دڑو سے متعلق بہت کتب چھپ چکی ہیں،[1] اس لئے اس قدیم تہذیب کا یہاں اختصار کے ساتھ تذکرہ کیا جاتا ہے، تا کہ قارئین کو سندھ کے قدیم عروج کی سمجھ آ جائے۔

☆

(1) See Annual Bibliography of Indian Archeology, from 1928 to 1934, Vol I to IX. Published by the Kem Institute, Leyden Holland.

باب ۳

مہن جو دڑو اور اس کی کھدائی

سر زمین کا تذکرہ: لاڑکانہ ضلع میں لبِ دریا تعلقہ میں، لاڑکانہ شہر سے پچیس میل دور، اور ڈوکری اسٹیشن سے فقط ساڑھے تین میل کے فاصلے پر، ایک ویرانہ ہے، جسے عام طور پر ''مہن جو دڑو'' کہا جاتا ہے۔ آرکیالاجیکل محکمہ والوں نے اس نام کے معنی بتائے ہیں 'Mound of the Dead'۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ نام دراصل ہے ''مہن جو دڑو'' یعنی ''مرے ہوئے لوگوں کا ٹیلہ'' اور محض غلطی سے ''مئن کے بجائے'' ''موہن'' لکھا ہے۔ سرزمین پر جا کر تفتیش کرنے سے یقین ہو جائیگا کہ صحیح تلفظ ہے ''مہن جو دڑو'' اور کچھ لوگ ''مہین جو دڑو'' بھی کہتے ہیں۔ دونوں کے معنی ہیں ''مات ہو جانے والوں کا ٹیلہ''۔ [1]

قدیم زمانے میں دریائے سندھ مہن جو دڑو کے پاس سے گذرتا تھا۔ وہاں کا اصلی شہر دریائے سندھ اور مغربی نارے کے درمیان میں ایک جزیرہ تھا۔ سرزمین کا جائزہ لینے سے یوں سمجھ میں آ رہا ہے کہ وہاں پر دراصل پانچ جزیرے تھے، جو بعد میں دریاء کے وہاں سے سمت تبدیل کرنے اور ان کے اوپر ریت چڑھ جانے کے سبب سے اکٹھے ہو گئے اور اب جزیروں کا گویا ایک گچھا ہو گیا ہے۔ اب وہاں صرف ٹیلے ہی ٹیلے ہیں، جو تقریباً ڈھائی سو ایکڑ اراضی لئے ہوئے ہیں۔ کچھ ٹیلے بیس تو کچھ تیس فوٹ اونچے ہیں۔ ان کے درمیان میں ایک بڑا ٹیلہ جو تقریباً ستر فوٹ اونچا ہے، اس پر ایک مندر تعمیر شدہ ہے، جو کئی ایک سالوں سے گرا ہوا تھا؛ لیکن اب اسے اچھی خاصی مشہوری مل گئی ہے۔

---

(1) سندھی میں ''ماہو'' معنی قتل یا کوس۔ کہیں لاٹھی سے جھگڑا ہوتا ہے اور کچھ لوگ بلکل مر جاتے ہیں، تو کہا جاتا ہے کہ ''ماہو'' ہوا، اسی طرح جنگوں اور زلزلوں کے سبب بھی ماہو ہوتا ہے، ''ماہو'' کا مادہ ہے سنسکرت لفظ ''مش'' معنی ذبح کرنا یا ناس کرنا۔ پراکرت میں اس کا تلفظ ہے ''مہہ'' سندھی میں کہتے ہیں ''مہو۔۔ماہو''۔ اس کی اگر گردان کی جائیگی تو عام صورت واحد میں کہیں گے ''مہی۔۔ماہی'' جمع کا صیغہ ''مہن۔۔ماہن''، لیکن ''مہین'' بھی کہتے ہیں: اسی سبب ''مہن جو دڑو'' معنی ''مات کا قتل ہو جانے والوں کا ٹیلہ'' (Mound of the Killed)

تباہی کے اسباب: مہن جو دڑو کی زمین پر اصل میں ایک عالیشان شہر آباد ہے، جس کے نام کا کسی کو بھی پتہ نہیں۔ وہ شہر بعد میں مسمار ہو کر ٹیلہ بن گیا، اور اس کے رہواسی اسی میں دب کر مر گئے۔ اس لئے ''مہن جو دڑو'' کہا جانے لگا۔ یہ شہر کیسے تباہ ہوا، اس سلسلے میں کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ دریائے سندھ کے سیلاب سبب اور قریب میں واقع پہاڑوں پر سے برساتی پانی کے تیزی سے اترنے کے سبب زمین دوز ہو گیا۔ ٹیلے کے اندر سے جو مکانات اب ملے ہیں، ان میں کسی کسی جگہ آگ لگنے کے آثار بھی دکھائی دے رہے ہیں، لیکن اس علاقہ کے باشندے اس آباد شہر کے ویران ہونے سے متعلق عام طور پر مندرجہ ذیل کہانی سناتے ہیں۔

مقامی روایت (Local Tradition)**:** سومرہ خاندان کے حکمرانی کے دور میں دلوراءِ نامی ایک راجہ گذر چکا ہے، جس نے بہت سارے مظالم ڈھائے تھے۔ وہ اس لعنت میں تھا کہ اس کی حاکمیت کی حدود میں جس بھی جوان لڑکی کی شادی ہوتی تھی، اُسے سہاگ رات اپنے پاس بلا لیتا تھا۔ اس قہری عمل کے سبب رعایا کے بال بال سے اس کے لئے بد دعا نکلتی تھی۔ کسی وقت خود اس کی حقیقی بھانجی بیاہی جا رہی تھی تو اس کے لئے بھی حکم دیا گیا کہ سہاگ رات اُسے راجہ کے محل میں بھیجا جائے۔ اس پر اس کی بہن اسکے قدموں پر جا گری، اور ہاتھ جوڑ کر منت سماجت کر کے کہنے لگی کہ ''میرے بطن سے جنم لینے والی کو اپنی بیٹی سمجھ اور اس کی عصمت خراب نہیں کر''! لیکن یہ بے رحم شخص باز نہیں آیا۔ وہ بضد رہا تو یہ دونوں ماں بیٹی کی جان نکل گئی اور زارو قطار رونے لگیں۔ سچ کہتے ہیں کہ ''آہ غریباں قہر خدائی!'' اِن بچاریوں کی آہ عرش تک پہنچ گئی، تو دیکھیں قادر کی قدرت جو دلوراءِ کی بری مراد بر آنے سے پہلے ہی ایسا سخت طوفان برپا ہوا، جس نے زمین و آسمان ایک کر دیا۔ اس وقت برسات بھی ایسی زور کی برسنے لگی جو کبھی نہ کسی نے دیکھی اور نہ سنی۔ اچانک شہر کے اوپر بجلی گری اور زمین بھی ہلی، جس سبب دلوراءِ کی نگری (برہمن آباد) نیست و نابود ہو گئی اور دوسرے کئی آباد شہر جو اس کی حکمرانی کے دوراں بڑے دلکش تھے، وہ سارے ویران ہو گئے۔[1] اسی الاھی آفت کے وقت لاڑکانہ طرف اس وسیع شہر کے مکانات زمین دوز ہو گئے اور کئی لوگ دب کر مر گئے۔ یہ ''ماہو'' (موت) ہوا، اس لئے یہ ''موہن جو دڑو'' یعنی مرے ہوئے لوگوں کا ٹیلہ کہا جانے لگا۔ اس نام میں ''مہن'' لفظ عام صورت میں جمع کا صیغہ ہے۔ اس سے لگتا ہے کہ یہاں کم از کم دو دفعہ لوگوں میں ''ماہو'' (موت) ہوا ہے۔ ''دڑو'' (ٹیلہ) سے ظاہر ہے کہ یہ شہر زیر و زبر ہو کر، ریت اور مٹی کا ٹیلہ بن گیا، اس کے بعد اس پر یہ نام پڑا۔

(1) ''تحفۃ الکرام'' کے مطابق برہمن آباد، بھنبھور اور اس طرح کے دوسرے شہر آٹھویں عیسوی صدی کے وسط دوران ویران ہوئے تھے۔

ٹیلے کی کھدائی: انگریزوں کے دورِ حکومت کے اوائل میں اس قسم کی تحقیقات فقط الور، برہمن آباد اور دیگر کچھ مقامات پر ہوئی تھیں، کیونکہ ان دنوں یہ مقامات نہایت ہی قدیم سمجھے جاتے تھے۔ سنہ ۱۹۱۰ع میں میرپور خاص کے نزدیک ''کاہو جو دڑو'' کی کھدائی مسٹر ہینری کزنس آرکیالاجیکل محکمہ کے سپرنٹینڈنٹ نے کروائی، تو وہاں سے بدھ دھرم والے زمانے کے کچھ حقائق معلوم ہوئے۔ مہن جو دڑو سے متعلق اگرچہ آرکیالاجیکل محکمہ والے خواہ لاڑکانہ ضلع کے روینیو عملدار جانتے تھے، مگر کسی نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ یہاں پھر سنہ ۱۹۲۲ع میں کھدائی ہوئی اور اس کے لئے ایک اتفاقیہ سبب بن گیا۔

۱۹۱۸ء سے لے کر مسٹر رکھلداس بنر جی۔ ایم۔ اے۔ آرکیالاجیکل محکمہ کے سپرنٹینڈنٹ، پنجاب کی طرف، بیاس ندی کے خشک جزائر کا جائزہ لے رہے تھے۔ اس کی اہم مقصد یہ تھا کہ تقریباً ۳۲۵ برس ق۔م بیاس ندی کے کنارے، سکندر اعظم جو بارہ ستون بنوا کر، ان پر یونانی اور ہندستانی زبانوں میں نوشتے کندہ کروائے تھے، ان کو ڈھونڈ نکالا جائے۔ تقریباً چار برس تک جنوبی پنجاب کے بیکانیر اور بہاولپور ریاست کے چکر لگاتا ہوا، مہران (ہاکڑی) کے خشک جزائر کا جائزہ لیتے ہوئے، سندھ میں پہنچا۔ راستے میں بہاولپور ریاست اور لاڑکانہ کے درمیان دریائے سندھ کے اٹھارہ خشک جزائر اسے نظر آئے! علاوہ ازیں بدھ دھرم والے زمانے کے ستائیس بڑے اور ترپن چھوٹے شہروں کے ویرانے سرحد سندھ، سکھر اور لاڑکانہ ضلع میں دیکھے۔ (1) ان تمام مقامات کو ایک نظر دیکھتے ہوئے، سن ۱۹۲۲ع میں لاڑکانہ کی طرف مہن جو دڑو کے پاس آ کر رک گیا۔ اس وقت ایک اونچے ٹیلے پر گرا ہوا ستون اور بدھ دھرم والوں کا ایک مندر تھا، جس کی دیواریں دریائے سندھ کی سطح سے چھیالیس فوٹ اونچی تھیں۔ مندر کے چاروں طرف بھکشوں (بدھ دھرم کے سادھو لوگوں) کے رہنے کے لئے کمرے تھے اور کمروں کے وسط میں مندر کی عمارت تھی۔ وہاں سے اوپر چڑھنے کے لئے ایک سیڑہی تھی اور پچھلی طرف سے نیچے اترنے کے لئے بھی ایک سیڑھی تھی، وہاں ایک بڑا چبوترہ تھا، جس پر ایک ستون تعمیر شدہ تھا، اس کے پہلو والی دیواروں پر دو تنگ سیڑہیاں تھیں، جن میں سے ایک شمال تو دوسری جنوب کی طرف جاتی تھی۔ وہاں ایک چھوٹے کمرے میں گوتم بدھ کا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس مجسمہ پر پہلے سونے کا پتر چڑہا ہوا ہوتا تھا۔ قرب و جوار میں بسے ہوئے لوگ سمجھتے تھے کہ یہاں کوئی بڑی دولت مدفون ہے، وہ یہاں آ کر وقت بوقت زمین کھودتے تھے۔ اگر ان کو اینٹوں کی ضرورت ہوتی تھی تو یہاں سے نکال کر لے جاتے تھے۔

مسٹر بنرجی یہاں آ کر، پاؤں سے گند کچرے کو اِدھر اُدھر کیا تو اس نے مٹی کے برتنوں کے ٹکڑے دیکھے، جن پر نہایت عمدہ اور عجیب کام کیا ہوا تھا۔ اُسے کچھ پتھر سے بنی چھریاں بھی

(1) Dr. Suniti Kumar Chatterji: Modern Review, December, 1924.

ملیں، جو نئے پتھر والے زمانے کی تھیں۔ یہ سمجھدار شخص تھوڑی سی چیزوں کے ہاتھ آتے ہی سمجھ گیا کہ یہ جگہ کھدائی جانے کے لائق ہے۔ اُس وقت یہ بات خود اُس کے دل و دماغ میں بھی نہیں تھی کہ یہاں سے اُسے ایک ایسی تہذیب کا پتہ لگے گا، جو پہلے کسی نے بھی نہیں ڈھونڈ نکالی، لیکن یہاں کی زمین، جو پانچ ہزار برس کی پرانی تہذیب اپنے شکم میں لئے ہوئے تھی، وہ اُسے کدال کی پہلی ہی ضرب سے ظاہر کرنے لگی، جس وجہ سے مسٹر بنرجی کا دل مزید اس کی طرف راغب ہوا۔[1] آرکیالاجیکل محکمہ والے کھدائی کا کام کرواتے ہی موسم سرما میں ہیں۔ مسٹر بنرجی سنہ ۲۲-۱۹۲۳ع کے موسم سرما میں وہاں کھدائی کروائی، اور دوسرے موسم سرما میں بھی وہاں آ کر، مزید کھدائی کروائی اور اس کی کوششیں نتیجہ خیز ثابت ہوئیں۔

چار زمانوں کی عمارتیں اور دریافت شدہ چیزیں: مسٹر بنرجی مہن جو دڑو سے متعلق جو رپورٹیں دونوں برسوں میں حکومت کو بھیجیں، وہ آرکیالاجیکل محکمہ کی سالانہ رپورٹوں میں شایع ہوچکی ہیں۔ اس میں اس صاحب نے درج کیا ہے کہ ٹیلے کی کھدائی کرتے ہوئے معلوم ہوا کہ اس میں چار الگ الگ زمانوں کی عمارتیں ہیں۔ ان عمارتوں کے اندر الگ الگ زمانوں کے سکے، چقمق کے ٹکڑے، شیشے کی چوڑیاں، کھیل کھیلنے کے لئے چھکے، سفید سنگ مرمر، دھوپ سے بچاؤ کی چھتریاں اور مجسمے ملے ہیں۔ ایک نقش و نگار شدہ مجسمہ ملا ہے، جو داڑھی سے کسی شخص کی سری ہے اور اس کے سر پر کھوپڑی کی شکل کی سی ٹوپی ہے۔ ٹیلے کے اندر مُردے بھی مدفون تھے اور مُردوں کو دفن کرنے کے نمونے بھی نرالے تھے۔ مسٹر بنرجی کو یہاں کی عمارتوں میں سے جو چیزیں ملیں ان میں تنت مال پتھر، عاج اور گوند سے بنی ہوئی مہریں ہیں، جن پر کئی انواع کے جانوروں کی شکلیں کندہ ہیں۔ ان پر کچھ حروف بھی کندہ ہیں، جو موجودہ کسی بھی زبان کے رسم الخط سے مشابہ نہیں ہیں، وہ حروف آج تک کوئی بھی مکمل طرح نہیں پڑھ سکا؛ لیکن ان حروف کو پڑھنے کی کوششیں بہت سارے علماء کر رہے ہیں۔[2] مسٹر بنرجی وہ مہریں دیکھ کر بہت خوش ہوا، کیونکہ وہ سمجھ رہا تھا کہ چیز ہے کوئی انمول، جو مجھے ہاتھ لگی ہے۔

---

(1) Mr. Banerji, one of the greatest scholars that India has ever produced, at once realized the great importance of that discovery (at Mohan Jo Daro). The civilization, the relics of which so accidently came into his hands, was a totally unknown civilization, not only in India, but all over the world. That was the beginning of the discovery of a new period in the history of man." Rev. H. Heras: Journal of Indian History. April 1937. P.1.

(2) فادر ہیرس کا کہنا ہے کہ وہ خود ان تحریروں کو سمجھ سکا ہے، لیکن جو اس نے سمجھا ہے وہ درست بھی ہے یا نہیں، اس بات کی تصدیق آج تک کسی نے نہیں کی۔ ملاحظہ فرمائیں صفحہ ۶۵ کا انگریزی فوٹ نوٹ

پنجاب کے جنوب میں، منٹگمری ضلع میں، لاہور اور ملتان کے درمیان آدھے فاصلے پر، دریائے راوی کے ایک خشک مقام کے پاس، ایک قدیم ویرانہ ہے۔ اس ویران شہر کا نام ہے ''ہرپا''، جو لفظ اصل میں ہے ''ہرپد'' یعنی ہری (شو بھگوان) کا پیر، اس ویرانے کی طرف سب سے پہلے مسٹر منسن (Mr. Masson) کی توجہ سنہ ۱۸۲۶ع میں ہوئی۔ پانچ برسوں کے بعد مسٹر برنیس (Mr. Burness) کو وہاں سے کچھ ایسی مہریں ملیں۔ میجر جنرل کننگھام کو بھی سنہ ۱۸۵۳ع، ۱۸۵۶ع اور ۱۸۷۲۔۱۸۷۳ع میں ویسی ہی مہریں وہاں سے ملیں۔ ان پر دیوناگری حروف کی طرح کے اعراب کے ساتھ کچھ حروف کندہ تھے۔ سنہ ۱۹۲۱ع میں راء بہادر دیارام سہنی ایم۔ اے۔ آرکیالاجیکل محکمہ والے کو بھی اُسی طرح کی مہریں ملیں۔ مہروں پر کندہ حروف سے متعلق اس وقت یوں سمجھا جا رہا تھا کہ قدیم زمانے میں یہ رسم الخط صرف پنجاب میں مروج تھا۔ اب ہرپا کے ویرانے سے چار سو میل دور، موہن جو دڑو میں سے، مسٹر بنرجی نے ایسے ہی حروف سے مہریں دریافت کیں، تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس زمانے میں پنجاب میں یہ رسم الخط مروج تھا، اُسی زمانے میں سندھ میں بھی جاری تھا۔ ہرپا میں سے بھی موہن جو دڑو جیسی عمارتیں اور دیگر اشیاء ملی ہیں، اس لئے بلاشک کہا جا سکتا ہے کہ پنجاب سے لے کر سندھ تک تہذیب ایک ہی تھی۔ اس نئی تحقیق نے مسٹر بنرجی کے شوق میں اضافہ کیا۔ وہ اس کام کو مزید چپک گیا، اور بہت محنت کر کے بیمار پڑ گیا، جس وجہ سے یہ تحقیقی کام کچھ عرصے کے لئے رک گیا۔

اُس وقت ہندستان کے آرکیالاجیکل محکمہ کا ڈائریکٹر جنرل سر جان مارشل تھا۔ ہرپا اور موہن جو دڑو میں سے ساری چیزیں منگوا کر اس نے خود ان کا جائزہ لیا۔ وہ صاحب جلدی سے سمجھ گیا کہ ایسی تحقیق سندھ اور پنجاب میں پہلے کسی نے بھی نہیں کی۔ مہروں پر جو حروف کندہ تھے، وہ حروف اگرچہ وہ خود بھی نہیں پڑھ سکا، پھر بھی اس نے اتنا سمجھ لیا کہ ان مہروں پر جو حروف کندہ ہیں اور شکلیں بنی ہوئی ہیں، وہ بحیرۂ روم والے ممالک کی قدیم تہذیب سے کسی قدر مشابہت رکھتی ہیں، پھر اس صاحب نے یہ کیا کہ جو موہن جو دڑو میں سے ملی ہوئی عمارتوں اور اشیاء اور تمام مہروں کے فوٹو، ''السٹریٹیڈ لنڈن نیوز'' میں چھپوا کر شایع کیے، تا کہ شاید کوئی عالم ان نئی چیزوں پر کوئی روشنی ڈال سکے۔ اس کا یہ مضمون تصویروں سمیت ''السٹریٹیڈ لنڈن نیوز'' کے ۲۰ ستمبر ۱۹۲۴ع والے پرچے میں چھپ کر شایع ہوا، تو فی الفور دوسرے ہفتے اُسی مخزن میں پروفیسر اے۔ ایچ۔ سئس نے ظاہر کیا کہ اسی ہی تہذیب کے آثار میسوپوٹیمیا کی طرف بھی ملے ہیں۔ مہریں بھی اسی طرح کی تو عمارتوں کی بناوٹ بھی اسی طرز کی! جلد ہی بعد میں ایران کی طرف بھی ایسی ہی تہذیب کے ثبوت ملے، جس وجہ سے آرکیالاجیکل محکمہ والوں کو یوں لگا کہ پنجاب اور سندھ سے

لے کر، عراق اور میسوپوٹیمیا تک کسی قدیم زمانے میں ایک ہی تہذیب تھی۔ اس نئی تحقیق نے کئی مقامات کے علماء کی توجہ مبذول کروائی۔ ہندستان، یورپ اور امریکا میں جو بھی اخباریں اور مخازن چھپتے ہیں، ان سب میں مہن جو دڑو سے متعلق مضامین در مضامین شایع ہوئے، جس وجہ سے مہن جو دڑو ساری دنیا میں مشہور ہو گیا!

اب تو اور بھی ضروری ہو گیا کہ مہن جو دڑو کی کھدائی کروائی جائے تاکہ کچھ مزید دریافت ہو؛ لیکن اس کام کے لئے بڑا سرمایہ چاہئے۔ جلد ہی ہند لیجسلیٹو اسمبلی کے بجٹ کے اجلاس میں یہ تجویز پیش ہوئی ہے کہ ہندستان کے آرکیالاجیکل محکمہ کو حکومتِ ہند ایک فنڈ پچاس لاکھ روپوں کا منظور کر کے دے دے، جس میں سے آئندہ ایسے ٹیلوں کی کھدائی کروائی جائے۔ یہ تجویز پیش کرتے ہوئے سیکریٹری نے اس بات پر زور دیا کہ پنجاب اور سندھ میں سے اس وقت جس تہذیب کا پتہ چلا ہے، اس پر سارے ہندستان کو فخر ہے اور یہ فنڈ ضرور منظور ہونا چاہئے۔ اسمبلی نے اتنا پیسہ منظور نہیں کیا تو ہندستان میں ناراضگی پیدا ہوئی۔ تاہم، اسمبلی کو آفرین ہو جو اس نے ڈھائی لاکھ روپے سالانہ منظور کئے۔ [1]

سر جان مارشل سندھ میں آیا اور مہن جو دڑو کی مزید کھدائی کرانے کے لئے کچھ عرصہ خود وہاں جا کر ٹھہرا۔ ڈوکری اسٹیشن سے لے کر مہن جو دڑو تک راستہ تعمیر کروایا، اسٹاف کے لئے مکان بنوائے اور تقریباً ایک ہزار مزدور ٹیلے کی کھدائی کے لئے مقرر کئے، جن میں سے کئی بروہی تھے، جو اپنی جھونپڑیاں بنا کر وہیں ٹھہر گئے: مہن جو دڑو کے پاس ایک گاؤں وجود میں آ گیا۔ سر جان مارشل بذاتِ خود مزدوروں کو سمجھاتا تھا کہ کھدائی کس طرح کرنی چاہئے۔ مزدوروں کے لئے یہ نیا کام تھا، لیکن اتنا مانوس ہو گئے، جو اگر اناج کا دانہ بھی انہیں ملتا تھا تو وہ بھی لے آ کر اسے دیتے تھے۔ اس طرح ٹیلے میں سے بہت ساری چیزیں ملیں۔

جیسے جیسے نئی چیزیں مل رہی تھیں ویسے ویسے ان کا مختصر تذکرہ اخباروں میں چھپتا رہا۔ امریکا اور یورپ کے کئی عالموں نے پوچھنے کی بوچھاڑ لگا دی کہ ہمیں واضح طور پر بتایا جائے کہ وہاں سے کیا کیا ملا ہے! سر جان مارشل نے ان کی اس فکرمندی کو دیکھتے ہوئے اپنے دستخط کے ساتھ ''السٹریٹیڈ لنڈن نیوز'' اور دوسرے مخازن میں مضمون لکھے۔ بالآخر ایک دیدہ زیب کتاب، دو جلدوں میں، باتصویر، مہن جو دڑو اور سندھو تہذیب سے متعلق چھپوائی، جس کی قیمت دس گینیاں (ڈیڑھ سو روپے، بلکہ اس بھی زیادہ) ہے۔ سنہ ۱۹۲۲ع سے لے کر ۱۹۲۷ع تک جو

(1) Journal of Indian History, Vol V. 1926, pp. 101-106.

کھدائی ہوئی، اس کا سربستہ تذکرہ اس میں کیا گیا ہے۔ اس کے بعد بھی ٹیلے کی کھدائی ہوئی ہے۔ مسٹر بنرجی جس نے پہلے یہ ٹیلا کھدوایا تھا، اس نے مہن جو دڑو سے متعلق علحدہ ایک کتاب لکھی۔ مسٹر دکشت اور مسٹر مکی نے بھی کچھ عرصہ اپنی نظرداری میں ٹیلے کی کھدائی کروائی تھی۔ مسٹر مکی نے بھی الگ سے کتاب رقم کی ہے۔ اسی طرح مہن جو دڑو سے متعلق دوسروں نے بھی کتب لکھی ہیں۔ اس وقت تک قدیم سندھ کی تاریخ لکھنے کے لئے جو مواد ملا ہے، وہ علحدہ باب میں درج کیا گیا ہے: یہ سارا مواد سر جان مارشل کی کتاب اور اس کے مضامین میں سے نکالا گیا ہے۔ مسٹر بنرجی اور دیگر علماء نے کوئی خاص بات کی ہے تو وہ بھی قارئین کرام کی معلومات کے لئے درج کی گئی ہے۔

☆

باب ٤

مہن جو دڑو والی عالیشان تہذیب

وادیٔ سندھ کی قدیم تہذیب: شہر کے اوپر شہر: مہن جو دڑو کی تقریباً تیرہ ایکڑ زمین اب تک کھدوائی گئی ہے۔ یہاں سے سات شہر ایک دوسرے کے اوپر ملے ہیں۔ آبکلانی میں دریائے سندھ کا کناروں سے اوپر بہنا اور برساتی موسم میں پہاڑوں پر سے پانی کی تیز رو کا نیچے اترنے کی وجہ سے یہ ایک دفعہ ویران ہو جاتا تو پانی کے سوکھ جانے کے بعد لوگوں نے اس ویران شہر کے اوپر دوسرا شہر تعمیر کیا کرتے تھے۔ اس طرح شہر کے اوپر شہر تعمیر کرتے گئے، جن میں سے سات شہروں کا پتہ چل سکا ہے۔ لگتا ہے کہ یہ شہر تجارت یا کسی دوسری وجوہ سے اہم تھا، جس وجہ سے لوگ بار بار اسی شہر کو آباد کرتے رہے۔ اس طرح سات دفعہ اسی جگہ کو آباد کیا، ان ویرانوں کے نیچے سے پانی نکلا ہے، جس سے لگتا ہے کہ آٹھواں شہر نہیں تھا۔

شہر کا نمونہ: مہن جو دڑو میں سے جو شہر ہنوز ظاہر ہوئے ہیں، ان میں سے آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ کوئی پانچ ہزار سال پہلے لوگ اسی طرح محلے بنا کر رہتے تھے، جیسے آج ہم رہتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ شہر کا نمونہ جو آجکل ہے وہ بہت پرانہ ہے۔ یہاں کے راستے کشادہ اور ہموار ہیں، جو سیدھے شمال سے لے کر جنوب کی طرف جاتے ہیں۔ ان راستوں میں سے گلیاں ایک دوسرے کے سامنے سے نکلتی ہیں، جس وجہ سے ہر ایک محلہ علحدہ علحدہ نمایاں ہے۔

عمارتیں: ہر ایک شہر میں جو عمارتیں ہیں، ان میں سے کسی بھی عمارت کے اوپر چھت نہیں تھے۔ لگتا یوں ہے کہ چھتوں کے شہتیر اور کڑیاں بڑا عرصہ گذرنے کی وجہ سے گل سڑ کر ریزہ ریزہ ہوگئی ہیں، یا پھر آگ لگنے کی وجہ سے جل کر بھسم ہوگئی ہیں۔ تمام عمارتیں پکی اینٹوں سے بنی ہیں اور دیکھنے میں ایسی تازہ نظر آتی ہیں، جو گویا کہ کل ہی یہ شہر تعمیر ہوئے تھے۔ اینٹیں نہایت ہی

عمدہ طرح گھڑی ہوئی ہیں، اور تاریخ والے زمانے میں ھندستان میں جو اینٹیں آتی تھیں، ان سے بلکل علحدہ نمونے کی ہیں۔[1]

۱- **مکانات:** جو عمارتیں دریافت ہوئی ہیں، ان میں سے کئی ایک لوگوں کے رہنے کی ہیں۔ تمام مکانات کشادہ اور ہوادار ہیں۔ کچھ مکانات کے صحن میں سیڑھی ہے، جس سے سمجھا جاتا ہے کہ مکانات کے اوپر اور منزلیں بھی ہوا کرتی تھیں، ہر ایک مکان کا علحدہ علحدہ کنواں اور غسلخانہ ہے۔ غسلخانوں میں اینٹوں سے فرشبندی کی ہوئی ہے! کمروں میں ایک کونے میں سے پانی کی نکاسی کا اہتمام ہے، جہاں سے پانی بہہ کر، کلیوں کی نالیوں میں جا کر گرتا تھا۔ گلیوں کی نالیاں ڈھکی ہوئی ہیں، جن سے اندر ہی اندر سے پانی کی نکاسی ہوتی تھی! کچھ غسلخانوں میں اینٹوں کو کوٹ کر، وہ پاؤڈر چونے سے ملا کر اس سے غسلخانوں کے فرش پر پلاسٹر کیا ہوا ہے، تا کہ دھرتی پانی جذب نہ کر لے! دیواروں پر پلاسٹر تین انچ موٹا چڑھا ہوا ہے۔ اینٹوں کو چپکانے کے لئے پتلی مٹی استعمال کی گئی ہے، لیکن کسی کسی جگہ پر جپسم (Gypsum) استعمال کیا ہوا ہے، جو نئی گاج میں آج بھی بڑی مقدار میں پیدا ہوتا ہے۔[2] عمارتوں پر نقش و نگار کا کام نہیں کیا ہوا، پھر بھی سر جان مارشل کا کہنا ہے کہ ہندستان میں ایسی عمدہ تعمیر مہن جو دڑو کے زمانے کے بعد بھی کہیں نہیں ہوتی تھی۔[3] ایسی عمدہ پکی اینٹوں سے بنے ہوئے مکانات بڑا خرچ مانگتے ہیں، اس لئے مسٹر مکی کا یہ اندازہ صحیح ہے کہ یہاں کے لوگ بڑے مالدار تھے۔[4]

۲- **پنچائتی ھال:** کچھ عمارتیں ستونوں پر کھڑی ہیں، جن میں سے ایک ھال جو تقریباً اسی فوٹ کا ہوگا، وہاں شاید پنچائت بیٹھتی تھی، یا کچھ مواقع پر لوگ آ کر اکٹھے ہوتے تھے۔

۳- **مندر:** کچھ عمارتیں شاید مندر کے طور پر استعمال ہوا کرتی تھیں۔ ایسی عمارتوں کی بنا (بنیاد۔۔ plinth) دوسری عمارتوں سے اوپر ہے۔ ان میں کمرے چھوٹے ہیں، لیکن دیواریں بہت موٹی ہیں۔ کچھ دیواروں کی موٹائی دس فوٹ بھی ہے! ان سے سر جان مارشل نے یہ قیاس

(1) 'These well-chiselled brick, however, differ conspicously from any used during the historic period in India.' Sir John Marshall.

(2) "In the Gaj beds of the Khirthar Range, near the top of the group, gypsum of tolerable purity is abundant and is not unfrequently found in beds three to four feet thick." Mr. W.T. Blanford: Geology of Western Sind P. 195.

(3) The construction of these buildings is far superior to anything of the kind in later India. "sir John marshall: The illustrated London News, February 27, 1926.

(4) "The fact that the city was built of burnt brick, an expensive commodity, argues that those who lived within it were a prosperous people." Mr. Ernest Mackay Mohan-jo-Daro and the i.e.

آرائی کی ہے کہ ان کے اوپر شاید بہت منزلیں بنی ہوئی تھیں، جس وجہ سے نچلی دیواریں اتنی موٹی بنائی ہوئی ہیں۔

۴- **دکـــــان:** کچھ عمارتوں سے لگتا ہے کہ وہ دکان کے طور پر استعمال ہوتی تھیں۔ ایسی ایک عمارت سے رنگریز کی بھٹی ملی ہے، اور رنگوں کے نقش و نگار بھی دیکھنے میں آئے ہیں۔

۵- **بـڑا تـالاب:** تمام عمارتوں میں سے ایک عمارت، جو زیادہ توجہ مبذول کرواتی ہے، وہ وہ ہے جہاں سے ایک بڑا تالاب ملا ہے۔ اس کی دیواریں موٹائی کے حساب سے سات آٹھ فوٹ ہیں۔ تالاب کے دو اطراف سے قدمچے بنے ہوئے ہیں، تا کہ کوئی ایک طرف سے قدمچوں کے ذریعہ سے نیچے اتر جائے اور دوسری طرف سے اوپر چڑھ آئے۔ یہ تالاب انتالیس فوٹ لمبا، تیئیس فوٹ چوڑا اور آٹھ فوٹ گہرا ہے! تالاب کے باہر سے برابر والے کمروں میں سے ایک میں ایک گہرا کنواں ہے، جس کا پانی آج تک استعمال کے لائق ہے۔ شاید اس کنویں کے پانی سے تالاب بھرتے تھے۔ اس تالاب کے ایک سرے سے ایک بڑی نالی بنی ہوئی ہے، جس سے شاید پانی کی نکاسی ہوا کرتی تھی۔ وہ نالی نہایت ہی عمدہ طریقے سے بنی ہوئی ہے اور اتنی گہری ہے، جو اس میں چھ فوٹ کا لمبا شخص کھڑا ہو سکتا ہے! پوری نالی ڈھکی ہوئی ہے؛ لیکن اوپر سے چھت سے تھوڑا سا ٹکڑا کھلا ہوا (Man-hole) ہے، جس میں سے ایک شخص اندر داخل ہو کر ساری نالی صاف کر سکتا ہے۔ پانی کے رِسنے کو روکنے کے لئے رومی کولتار (Bitumen or Asphalt) دوراندیشی کر کے انہوں نے لگا دیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وادیٔ سندھ کے باشندے پانچ ہزار برس پہلے نہ صرف قابل معمار تھے، بلکہ دورِ حاضرہ کے سرویروں اور انجنیئروں کی طرح آگا پیچھا بھی سوچ سکتے تھے۔

کنویں: مہن جو دڑو کے ہر ایک مکان میں علحدہ کنواں ہے۔ کچھ تو چھوٹے کنویں ہیں۔ کئی گلیوں اور بڑے راستوں کے پاس سے بڑے کنویں ملے ہیں، جو پکی اینٹوں سے بنے ہوئے اور گول ہیں۔ ایک دو کنویں بیضوی شکل کے بھی ہیں۔ دو کنووں کے پاس پکی اینٹوں سے بنے بینچ بھی ہیں۔ یہ شاید اس لئے کہ جب تک کسی کی پانی بھرنے کی باری آئے تب تک اس پر بیٹھ کر انتظار کرے۔

نالیاں: سارے شہر کے گندے پانی کی نکاسی کی ترتیب نہایت ہی اچھی طرح کی ہے۔ مسٹر بریلسفورڈ کا کہنا ہے کہ یورپ میں ایسی عمدہ ترتیب انیسویں صدی تک بھی نہیں تھی۔[1] مسٹر

(1) Mr. Brailsford: The Manchester Guardian, January 1932.

آینگر کہتے ہیں کہ نالیوں کا نظام اگرچہ الجھا ہوا ہے، پھر بھی اتنا مکمل ہے کہ کوئی بھی آجکل کا شہر سچ پوچھو تو فخر سے اسے اختیار کرلے۔ [1] پانی کی نکاسی کی اتنی ساری تعریف کرنے میں تمام علماء حق بجانب ہیں۔ سر جان مارشل نے خود بھی لکھا ہے کہ پانی کی نکاسی کا طریقہ غیر معمولی طرح پر سدھرے ہوئے نمونہ کا ہے۔ ہر ایک راستے، گلی اور گذرگاہ کو علحدہ علحدہ ڈھکی ہوئی ایک نالی ہے، اور ان کی اینٹیں ایسے عمدہ طریقے سے گھڑی ہوئی اور ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں، جو اس سے زیادہ عمدہ طریقے سے کام کرنے کا راستہ کوئی بھی نہیں بتا سکے گا۔ [2]

حفظ صحت: شہر کی رونق سے یوں سمجھ میں آرہا ہے کہ اس شہر کی میونسپلٹی سوج بھوج والی تھی۔ جسے شہر کی حفظ صحت کی بہت فکر تھی۔ شہر کی بنیاد کس نمونہ پر رکھی جائے، اور صفائی ستھرائی کس طرح رکھی جائے، ان باتوں کی جتنی اس وقت کے لوگوں کو معلومات تھی، اُتنی ہماری چار پانچ نسلوں والے آباء واجداد کو بھی نہیں تھی۔ ہر ایک گھر ایک دوسرے سے اس قدر دور ہے، کہ کسی بھی گھر کو ہوا اور روشنی ملنے میں کسی رکاوٹ کا کوئی امکان نہیں۔ لوگوں کو انجنیری کاموں کی بھی معلومات تھی، جو دریاہ کے سیلاب سے شہر کے بچاؤ کے لئے خاطر خواہ بندوبست کر سکتے تھے، اور گندے پانی خواہ برساتی پانی کی نکاسی کے لئے نالیاں نہایت عمدہ طرح بنا سکتے تھے۔ نالیوں کی وقت بوقت صفائی کرنے کے لئے ان میں "مین ہول" (Man-hole) بھی رکھتے تھے، جیسا کہ آجکل میونسپلٹیاں کرتی ہیں۔ گھر کے گند کچرہ (فضلہ) کو نکالنے کے لئے دیواروں میں سوراخ کر دیتے تھے، تاکہ کچرہ (فضلہ) وہاں سے بہہ کر باہر گلی میں جا کر گرے۔ گلیوں میں کچرہ کے جمع ہونے کے لئے گڑھے تھے، جنہیں بعد میں بھنگی صاف کیا کرتے تھے۔ آرکیالاجیکل والوں کی بتائی ہوئی یہ سب باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ تقریباً پانچ ہزار برس پہلے جب دوسری کئی قوموں کو ابھی اپنا جسم ڈھانپنے کی بھی سوجھ نہیں تھی، تب ہمارے سندھی نہایت مہذب لوگوں کی طرح اپنی زندگی گذارتے تھے۔

شکل شبیہہ، لباس اور زیور: مہن جودڑو میں سے جو مجسمے ملے ہیں، ان کو دیکھ کر قدیم سندھیوں کی شکل اور شبیہہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ قد کے چھوٹے اور جسم میں بھرے

(1) "Sewage and arrangement of drains are complicated and yet so perfect that any modern town will really be proud of having," Mr. A.S. Iyenger:The Hindustan Times, 21st February, 1932.

(2) "The drainage system in particular is extraordinariey well developed. Every street and alley--way and passage--seems to have had its own covered conduit of finely chiselled brick, land with a precision which could hardly be improved upon." Sir John Marshall: The illustrated London News, Feb. 27, 1926.

ہوئے تھے۔ ہونٹ موٹے اور آنکھیں چھوٹی تھیں۔ یہ شبیہات صرف مہن جو دڑو کے لوگوں کی تھیں، یا عام طرح سارے سندھیوں کی تھیں، اس سے متعلق کوئی بھی کافی ثبوت نہیں ہیں۔

سارے مجسموں میں دیکھا گیا ہے کہ لوگوں کی گردن موٹی اور بھری ہوئی ہے، اور گالوں کی ہڈیاں ابھری ہیں۔ مجسموں سے یہ بات بھی ظاہر ہے کہ مرد حضرات داڑھی چھوٹی رکھا کرتے تھے۔ موچھیں کن کی صاف تو کن کی رکھی ہوئی ہوتی تھیں۔ سر کے بال پیشانی پر سے موڑ کر، پیچھے سے لپیٹ کر، ان میں کنگہ (بکل) لگا دیا کرتے تھے۔ جس وجہ سے ان کو لپٹنے کی ان کو ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

زنانہ شکل کے مجسموں سے پتہ چلتا ہے کہ کچھ عورتیں اپنے بال گردن سے موڑ کر پیچھے کی طرف سے کھلے چھوڑ دیتی تھیں۔ اور کچھ عورتیں اپنی چوٹیہ لپیٹ کر سینگ کی طرح نوکدار بناتی تھیں۔

لباس: مردوں کا لباس دھوتی اور چادر تھا، جس کا ایک چھیڑا دائیں بغل کے نیچے سے گذار کر بائیں کندھے پر ڈال دیتے تھے۔ کچھ مجسموں سے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ دھوتی کے بجائے ایک ایسی کھگھری انہیں پہنی ہوئی ہے، جیسی آجکل شہنائی والے (ڈھول بجانے والے) پہنا کرتے ہیں۔ کچھ مجسمے بلکل ننگے ہیں، اور کن میں لوگوں کو لنگوٹ چڑھے ہوئے نظر آتے ہیں۔

زیور: مہن جو دڑو والے زمانے میں عورتیں خواہ مرد زیور عام طور پر پہنتے تھے: ہسی، تائتھ اور انگوٹھیاں، مرد بھی پہنا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں عورتیں پنڑے، منکوں کے ہار، چاندی یا سونے کی چوڑیاں اور پازیب پہنا کرتی تھیں۔ کن مجسموں میں عورتوں کو کہنی سے لے کر کندھے تک چوڑیاں پہنی ہوئی نظر آتی ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں چوڑیگر بھی ہوا کرتے تھے۔ کچھ زیورات پر جڑت کا کام بھی دیکھنے میں آیا ہے، اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت جڑت کرنے والے بھی ہوا کرتے تھے۔ کچھ مکانات میں زمیں کے اندر مدفون تانبے کے برتن آرکیالاجیکل محکمہ کے سپرنٹینڈنٹ مسٹر دکشت کو ملے، جن کے ساتھ ایک مڑی ہوئی آری بھی تھی۔ ایک برتن میں قیمتی زیور پڑے ہوئے تھے، جن پر جڑت کا کام کیا ہوا تھا۔ سر جان مارشل ان زیوروں کے دریافت ہونے کے جلد بعد "السٹریٹیڈ لنڈن نیوز" میں لکھا کہ "سونے کے زیور ایسی عمدہ طرح گھڑے ہوئے ہیں اور ان پر پالش اتنی اعلیٰ قسم کی ہے، جو گویا کہ لنڈن کی بانڈ اسٹریٹ صرافوں کی گلی) میں سے ابھی ابھی بن کر کر آئے ہیں اور پانچ ہزار برسوں کے پرانے لگتے ہی نہیں ہیں۔[1]

(1) "The gold ornaments are so well tinished and so highly polished that they might have come out of a Bond Street Jeweller rather than from a prehistoric house of 5,000 years ago," Sir John Marshall: The illustrated London News, Feb 27, 1926.

قیمتی پتھر: مہن جو دڑو میں سے جو زیورات ملے ہیں، اُن سے پتہ چلتا ہے کہ، قدیم سندھ کے باشندے عقیق یا سنگ سلیمانی (Agate)، نیلم، پیروز اور دیگر قسم کے قیمتی پتھر، ہار کے منکوں خواہ زیوروں کے لئے جڑت کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ ہرپا خواہ مہن جو دڑو میں سے شیشہ نہیں ملا ہے، لیکن اس زمانے میں کاریگر ایک ایسا لیپ بناتے تھے، جو سوکھنے کے بعد شیشے کی طرح تجلیاں دیتا تھا۔ ان سے منکے بناتے تھے جو قیمتی پتھروں کے عوض کام میں لاتے تھے۔ سنہ ۲۴۔۱۹۲۵ع میں ایک خوبصورت ہار ملا، جو خود اپنی تعریف آپ کر رہا تھا کہ اسے کسی قابل کاریگر نے بنایا ھے۔

مسٹر رکھلداس بنئر جی، جس نے مہن جو دڑو پہلے پہلے کھدوایا تھا، اس کا تو ہار بنانے والوں کی تعریف میں سے پیٹ ہی نہیں بھرتا، کہتا ہے کہ رگ وید میں جن آریوں کا ذکر ہے، ان کو بھی ایسا ہنر نہیں تھا جیسا مہن جو دڑو کے کاریگروں کو تھا۔ (1) سر جان مارشل نے بھی اس ہار کی بڑی تعریف کی ہے۔ (2)

کھیتی اور دیگر ہنر، فصل: قدیم سندھ کی کھیتی باڑی سے متعلق اتنی زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوئی ہے: باقی مہن جو دڑو میں سے گندم اور جَو ملے ہیں۔ اگرچہ تلوں کا ایک دانہ بھی وہاں سے نہیں ملا، لیکن لگتا ہے کہ وہاں تلوں کی فصل بھی ہوا کرتی تھی۔ کیونکہ رگ وید سے معلوم ھوتا ہے کہ اس قدیم دور میں پنجاب اور سندھ میں تلوں اور جَو کی فصلیں بہت ہی اچھی ہوتی تھیں۔ اس وقت اناج پیسنے کے لئے جو چکیاں استعمال ہوتی ہیں، وہ دو صدیاں ق۔م مروج ہوئی تھیں۔ پہلے ان چکیوں کے نمونے بھی مختلف ہوا کرتے تھے۔ وہ چکیاں مہن جو دڑو سے بہت ملی ہیں۔ اس سے مسٹر مکی نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ان دنوں اناج کی فصلیں بہت ہوا کرتی تھیں، اس لئے لوگوں کے پاس چکیاں بھی بہت ہوا کرتی تھیں۔

خوراک: گندم اور جَو کے علاوہ لوگ کھجور بھی بہت کھاتے تھے۔ کھجوروں کی گٹھلیاں کھدائی کرتے ہوئے ہاتھ لگی ہیں۔ اس وقت لوگ مچھلی، بلکہ بڑا گوشت بھی کھاتے تھے۔ دریاء کی مچھلی کے تو شوقین تھے؛ لیکن کچھوے بھی نہیں چھوڑتے تھے!

کاتنے اور بُننے کا ہنر: کئی چرخے اور چرخے میں استعمال ہونے والی لوہے کی سیخیں ملی ہیں: کچھ سادہ تو کچھ قیمتی۔ اس سے لگتا ہے کہ غریبوں خواہ امیروں کے گھروں میں چرخہ

(1) The modern Review, November 1927, p. 559.
(2) Mohen-jo-Daro and the I.C vol: I p. 34.

چلانے کا رواج تھا۔ ٹیلے میں سے ایک چاندی کا برتن، جواہرات اور منکوں سے بھرا ہوا ملا ہے، جو اعلیٰ طرح بُنے ہوئے کپڑے میں لپیٹا ہوا تھا۔ اس میں دیسی روئی استعمال کی ہوئی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پانچ ہزار برس پہلے سندھ میں کپاس کی فصل ہوتی تھی، اور اُسی قدیم زمانے میں ہی سندھیوں کے پاس کپڑے بُننے کے کر گھے بھی تھے۔

دھات: قدیم زمانے کے لوگوں کی طرح، مہن جو دڑو کے باشندے، پتھر کے اوزار اور برتن استعمال کرتے تھے، لیکن تانبے کا بھی ان کو علم تھا، جس سے وہ برتن، اوزار بلکہ زیور بھی بناتے تھے اور لوہے کا تو ایک ذرہ بھی ہاتھ نہیں آیا، لیکن یہ زمانہ ہی ایسا تھا، جس میں لوگوں کو لوہا مارنے کی عقل ابھی نہیں آئی تھی۔ قلعی بھی الگ سے نہیں ملی، لیکن فقط تانبے کے ساتھ استعمال شدہ ملی ہے۔ مہن جو دڑو کے لوگ تانبہ اور قلعی ملا کر ''برانز'' (Bronze) بناتے تھے، اس سے بھی اوزار اور برتن بناتے تھے۔ مسٹر ثناء اللہ، حکومت ہند کا آرکیالاجیکل کیمسٹ کہتا ہے کہ تانبہ اور قلعی میں سے ''برانز'' بنانے کا علم وادیٔ سندھ کے لوگوں کو تین ہزار برس ق۔م بلکہ اس سے بھی پہلے تھا۔

ہتھیار: مہن جو دڑو میں سے چند پتھر اور تانبے میں سے بنے گُرز (Maces)، چند بھالے، کٹار، تیر اور کمانیں ملی ہیں۔ تلوار بنانے کا رواج تو بہت بعد کی بات ہے، اس لئے تلوار وہاں سے نہیں ملی۔ اسی وجہ سے لگتا ہے کہ ملک میں اکثر لڑائی وغیرہ نہیں لگتی تھی اور لوگ امن و سکون سے زندگی گذارتے تھے۔

باٹ اور پیمانے: باٹ اور پیمانے کئی انواع کے ملے ہیں۔ وہ اکثر نازک اور چھوٹے ہیں۔ کچھ مخروطی شکل کے بڑے پتھر ملے ہیں، جن پر اوپر سے سوراخ ہے۔ ان سوراخوں سے رسی گذاری جا سکتی ہے۔ ان پتھروں کو تول کے وقت باٹ کے طور پر استعمال کیا کرتے تھے۔ کچھ چھوٹے باٹ خاکستری رنگ کی سلیٹ کے، پیپے کی شکل جیسے ہیں۔ جو ایلم اور میسوپوٹیمیا کے باٹوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ مسٹر اے۔ ایس۔ مَکّی کا کہنا ہے کہ ''مہن جو دڑو کے یہ باٹ ایلم اور میسوپوٹیمیا کے قدیم باٹوں سے زیادہ کھرے ہیں۔[(1)]

کمہاری ہنر اور کاشیگری: مہن جو دڑو کے لوگوں کی پاس چاندی اور تانبے کے برتن اور چمکیلے لیپ سے بنی گلاباشیاں وغیرہ ہوا کرتی تھیں؛ لیکن روایتی برتن شرتن اکثر مٹی کے بنے ہوئے ہوتے تھے۔ سندھ میں برتن سازی کا ہنر کئی زمانوں سے عام تھا؛ لیکن مہن جو دڑو والے زمانے میں سندھی لوگ مٹی کے برتن بنانے میں اتنے ماہر ہو گئے تھے، کہ ان پر نقش و نگار

(1) Sir John Marshall: Mohan-jo-Daro and Indus Civilization Vol. 1, pp. 36-37.

بھی کرتے تھے! کچھ برتن اتنے نفیس بناتے تھے، کہ وہ عام طور پر ''کاغذی'' کہلاتے ہیں۔ کاشی کے کام کے قدیم نمونے بھی فقط مہن جو دڑو سے ملے ہیں۔ مسٹر ارنیسٹ مکی کہتا ہے کہ ''رومن کے وقت سے پہلے مصر ملک میں اس ہنر کا مصری لوگوں کو کوئی علم نہیں تھا''، کچھ مٹی کے برتنوں پر جانوروں کی شکلیں ایسی بنی ہوئی ہیں، جیسی دریافت شدہ مہروں پر ہیں۔

سنگتراشی اور کندہ کاری: سنگتراشی اور کندہ کاری کے کام میں مہن جو دڑو کے باشندوں نے اپنی قابلیت کا اچھا ثبوت دیا ہے۔ بیلوں، گینڈوں اور دیگر جانوروں کی شکلیں نہایت ہی عمدہ طریقے سے بنائی ہیں۔ کچھ شکلیں نویلوں کی ہیں، جن میں نویلے دم اوپر کئے ہوئے کھڑے ہیں، اور اگلے پنجوں سے کوئی چیز اپنے منہ کی طرف کئے ہوئے، کچھ کھا رہے ہیں! ان کی لمبائی دو انچ بمشکل ہوگی۔ ایک دانے پر تین بندروں کی تصویر ہے، جن کی شکلوں سے ان کی شوخی ظاہر ہو رہی ہے، لیکن باہوں سے ایک دوسرے سے بغلگیر ہیں۔ یہ دانہ اتنا ہے جو اخروٹ کے خول میں سما سکتا ہے، ''منچیسٹر گارڈین'' میں مسٹر بریلسفورڈ نے لکھا ہے کہ یہاں سے جو لوگوں اور جانوروں کی شکلیں ملی ہیں، وہ اس وقت کی میسوپوٹیمیا کی کاریگری سے سبقت لئے ہوئے ہیں۔

مہریں: مہن جو دڑو سے فی الجملہ ۵۵۸ مہریں علحدہ علحدہ نمونوں اور سائیز کی ملی ہیں۔ کچھ ویلن کی شکل کی سی تو کچھ چورس، کچھ کشتی کی طرح تو کچھ زاویۂ قائمہ کی طرح، کچھ چھوٹی اور نفیس تو کچھ بڑی اور زیادہ نمایاں۔ کچھ عاج کی بنی ہوئی تو کچھ صابونی پتھر کی، چند ایک مہریں پکائی ہوئی مٹی کی بھی ہیں۔ کن مہروں میں سوراخ ہے جس سے دھاگہ گذارا جا سکتا ہے۔ لگتا ہے کہ مہن جو دڑو کے لوگ ان مہروں کو گلے میں باندھ دیتے تھے، یا کلائی اور بازو پر تائتھ کی طرح باندھ دیتے تھے۔ ان مہروں پر شکلیں بنی ہیں۔ جن سے کاریگروں کی کاریگری کا ثبوت ملتا ہے۔ ان مہروں پر ابھرے ہوئے نقش ہیں، جس سے لگتا ہے کہ وہ سیل مہر کرتے وقت بھی انہیں استعمال میں لاتے تھے۔ قدیم زمانے میں دستور تھا کہ لوگ جب کہیں باہر جاتے تھے تو دروازوں کو باہر سے مہر لگاتے تھے۔ ہر ایک مہر پر دیوتا کی شکل بنی ہوئی ہوتی تھی۔ وہ دیوتا گویا کہ مکان کی رکھوالی کرتا تھا، اور ان کی ملکیت کو کوئی بھی ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔ مہن جو دڑو کے لوگوں کا بھی شاید یہی دستور تھا۔

فنِ تحریر: مہن جو دڑو سے دریافت شدہ مہروں پر جانوروں کی شکلوں کے علاوہ ایک دو سطور بھی لکھی ہوئی ہیں، لیکن حروف تصویروں کی صورت میں ہیں۔ ساری دنیا میں جو رسم الخط مروج ہیں، ان کے حروف اکثر ایسی تصویری تحریروں میں سے بنے ہیں۔ پہلے حروف کی بجاءِ

جانوروں وغیرہ کی شکلیں بناتے تھے۔ وہ شکلیں بعد میں اپنی صورت مٹا کر موجودہ حروف بنی ہیں۔ مہروں میں ایسے حروف کے درمیان کہیں کہیں، دیوناگری طرز کے اعراب (زیر و زبر و پیش وغیرہ) ہیں، جس سے لگتا ھے کہ یہاں پر فنِ تحریر کی اچھی خاصی ترقی ہوئی تھی۔ اس قسم کی مہریں میسوپوٹیمیا کی طرف سے بھی دریافت ہوئی ہیں، جو تین ہزار برس ق۔م کی ہیں۔ اس سے سر جان مارشل نے قیاس آرائی کی ہے کہ مہن جو دڑو کی تہذیب بھی اسی قدیم زمانے کی ہے۔

کھیل اور کھلونے: مہن جو دڑو میں سے سنگ سلیمانی اور دیگر پتھروں میں سے بنی ہوئی گولیاں، شطرنج اور چھکے ملے ہیں۔ وہ آجکل کے چھکوں کی طرح لمبے نہیں، بلکہ کعب شکل کے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کے لوگوں کی فرصت میں تفریح کا سامان یہ کھیل تھے۔ اس وقت کے لوگوں کو اپنے بچوں کی تفریح کی بھی بڑی فکر ہوا کرتی تھی، جو بہت ہی قسم کے کھلونے وہاں سے دریافت ہوئے ہیں، جو لوگوں، بیلوں اور گھوڑوں کی شکل کے ہیں۔ ایک بیل کو دم سے کھینچا جاتا ہے تو وہ اپنی گردن ہلاتا ہے! ایک ہاتھی کی شکل کا جھنجھنہ ہے۔ مہن جو دڑو میں سے ایک پکائی ہوئی مٹی کی بنی ہوئی گاڑی پہیوں سمیت ملی ہے۔ اس قسم کی گاڑیاں بتیس سو برس ق۔م میسوپوٹیمیا کی طرف مروج تھیں، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ گاڑیوں کا سب سے پرانہ نمونہ ہے۔[1]

طبابت اور ادویات: مہن جو دڑو سے تھوڑا سا سلاجیت ملا ہے۔ سلاجیت دو قسم کا ہوتا ہے: ایک سفید اور دوسرا کالا۔ یہاں سے کالا سلاجیت ملا ھے، جو بدہضمی، ادرار، جگر اور تلی کے بڑھ جانے جیسی بیماریوں میں مفید ہے۔ ہرن کے سینگ بھی یہاں سے دریافت ہوئے ہیں، یہ بھی شاید دواؤں میں کام آتے تھے۔ ہندوؤں کے مذہبی کتب سے بھی معلوم ہوتا ھے کہ سندھ کے لوگ قدیم زمانے سے طب سے واقف تھے اور کئی کارآمد جڑی بوٹیوں کا ان کو علم تھا۔

گھریلو زندگی: ٹیلے کی کھدائی سے جو چیزیں لوگوں کے مکانات سے ملی ہیں، ان سے ان کی گھریلو زندگی پر اچھی خاصی روشنی پڑ رہی ہے۔ سر جان مارشل کا کہنا ہے کہ مہن جو دڑو کی تہذیب اُس وقت کے ملک مصر میں مغربی ایشیا کی تہذیب جیسی ہے؛ لیکن کچھ باتوں میں وہاں کی تہذیب سے بھی بالا ہے۔ وہاں سے کوئی اس قسم کی عمدہ طرح بنے ہوئے غسلخانے اور ایسے کشادہ مکان نہیں ملے ہیں، جن کا مہن جو دڑو کی عمارتوں سے موازنہ کیا جا سکے۔ ان ملکوں میں لوگ اپنا تن، من، دھن صرف دیوتاؤں کے لئے مندروں، اور راجاؤں کے لئے عمدہ محلاتوں اور

(1) Sir John Marshall: Mohan-jo-Daro And I.C. Vol. 1. p. 35.

مخروطی مناروں کو تعمیر کرنے پر لگاتے تھے؛ باقی عام لوگ مٹی سے بنے ہوئے مکانوں میں رہتے تھے۔ ہرپا اور مہن جو دڑو میں قصہ ہی اور ہے۔ یہاں بھی لوگوں نے اپنے حاکموں کے لئے عالیشان عمارتیں تعمیر کی ہونگی، جو ابھی تک نہیں ملیں، لیکن اپنے لئے کشادہ اور ہوادار مکانات تعمیر کرتے تھے۔ یہ ہوادار مکانات، نہانے کے لئے تالاب، ڈھکی ہوئی نالیاں وغیرہ پتہ دے رہی ہیں کہ یہاں کے لوگ اپنی گھریلو زندگی جس آرام میں گذارتے تھے، ویسی اُس وقت دنیا میں دوسرے مقامات پر کوئی بھی نہیں گذارتا تھا۔ (1)

قدیم سندھیوں کا مذہب: ۱- دیوی کی پرستش: مہن جو دڑو کی کھدائی کرتے ہوئے دیوی کے مجسمے ملے ہیں، جس سے لگتا ہے کہ پانچ ہزار برس پہلے سندھی لوگ دیوی کی پرستش کرتے تھے۔ اس وقت دیوی کو امبا، درگا، اور دوسرے ناموں سے پکارا جاتا ہے، لیکن حقیقت میں وہ بنیادی طاقت یا شکتی ہے۔ مالک ہے ''برش'' اور یہ ہے ''پرکرتی''۔ مالک ہے ''قادر'' اور یہ ہے ''قدرت'' یا شکتی، جسے مجسم کر کے قدیم سندھی پوجتے تھے۔ قدرت پر ہی سوچ و فکر کرنے سے دل اڑ کر قادر کی طرف جاتی ہے اور روحانی معرفت حاصل ہوتی ہے، اس لئے اس قسم کی پرستش سے قدیم سندھیوں کے مذہبی خیالات اور عقائد کا پوری طرح پتہ چلتا ہے۔

۲- شو کی پوجا: ماتا کی مورتی کے علاوہ ایک مرد دیوتا کا بھی مجسمہ ملا ہے۔ سر جان مارشل کے بقول یہ مجسمہ شو بھگوان کا ہے، جو یوگ آسن میں بیٹھا ہے۔ یہاں سے شو کے لنگ بھی ملے ہیں، اس لئے مزید یقین پختا ہو جاتا ہے کہ سندھ میں شو اور شکتی کی پرستش کا رواج نہایت قدیم ہے۔

۳- درختوں کی پرستش: کئی مہروں پر جو شکلیں بنی ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم سندھی لوگ پپر اور دوسرے درختوں کی پوجا کیا کرتے تھے۔ یہ پوجا دو اقسام کی ہوا کرتی تھی۔ ایک قسم یہ تھی کہ خود درخت کو پوجتے تھے، دوسری قسم یہ تھی کہ درختوں کے دیوتا کو مجسم کر کے پوجتے تھے۔

۴- جانوروں کی پرستش: مہن جو دڑو سے کئی جانوروں جیسا کہ ایک سینگ والے جانور اور کوہیں والے بیل کی تصویریں ہاتھ آئی ہیں۔ قدیم زمانے میں ملک مصر میں ایک سینگ والے جانور (Unicom) کی پرستش کرنے کا رواج تھا اور یہ ہندستان کا جانور شمار ہوتا تھا۔ وشنو بھگوان کو ''ایک شرنگ'' یعنی ایک سینگ والا کہتے ہیں۔ کوہیں والے بیل کی پرستش کا شو بھگوان کی

(1) سر جان مارشل: موہن جو دڑو دیباچہ، صفحہ ٦۔

پرستش سے تعلق سمجھ میں آتا ہے۔ شو بھگوان کی سواری بیل پر کہی جاتی ہے، اس لئے شو کے پوجاری آج تک بیل کی پرستش کرتے ہیں۔

۵- **پانی کی پرستش:** مہن جو دڑو میں سے زیادہ تر ہر ایک گھر سے کنواں ملا ہے۔ ان کنوؤں کے علاوہ عام لوگوں کے لئے الگ کنویں تھے۔ غسلخانہ بھی ہر ایک گھر میں موجود ہے، اور ایک بڑا تالاب بھی ملا ہے، اس سے لگتا ہے کہ قدیم سندھیوں کو صفائی ستھرائی کا خیال تھا اور نہانا شہانا ایک مذہبی بات شمار ہوتی تھی۔ آج بھی ھندو نہانے کے بعد کھانا کھاتے ہیں۔ قدیم زمانے سے لے کر ہندوؤں کا یہ سلسلہ جاری ہے، دریاء کی پوجا بھی شاید بہت زمانوں سے ہے۔

ایک جیسی تہذیب والے مقامات: اوپر یہ بات مذکور ہو چکی ہے کہ سندھ میں چانہو جو دڑو، جھکڑ جو دڑو، لیمو جونیجو اور دیگر کچھ مقامات ہیں، جو مہن جو دڑو کے وقت میں آباد تھے، اور ان مقامات پر یہی تہذیب تھی، پنجاب کی طرف ہرپا میں سے بھی اسی تہذیب کا پتہ چلتا ہے۔ اُدھر ایران اور میسوپوٹیمیا کی طرف سے بھی کئی مہریں اور دیگر اشیاء ملی ہیں، ویسی جیسی مہن جو دڑو سے ملی ہیں۔ اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ پنجاب اور سندھ سے لے کر ایران اور میسوپوٹیمیا تک ایک ہی تہذیب تھی۔ اس تہذیب کا اوائلی گھر وادیٔ سندھ بھلے نہ ہو، تو بھی سر جان مارشل کی رائے کے مطابق قدیم سندھ کے باشندے اپنے ہمعصر عراقیوں اور مصریوں سے زیادہ آرام کی زندگی گذارتے تھے، اور مہن جو دڑو کی تہذیب مصر اور میسوپوٹیمیا کی تہذیب سے بہت ساری باتوں میں سبقت لئے ہوئے ہے۔ (1)

تہذیب کی قدامت: سر جان مارشل نے ظاہر کیا ہے کہ مہن جو دڑو سے جو مہریں ملی ہیں، ان میں سے کچھ ۲۷۵۰ برس ق۔م تو کچھ ۳۲۵۰ برس ق۔م کی ہیں، یعنی اس تہذیب کی عمر تقریباً پانچ ھزار برس ہے۔ کچھ لوگ کہہ رہے ہیں کہ پانچ ہزار برس یہ تہذیب اس اعلیٰ درجے کو پہنچی ہوئی تھی، تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس تہذیب کی بنیاد تقریباً دو ہزار سال پہلے پڑی ہوگی، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اس تہذیب کا آغاز آج سے سات ہزار برس پہلے ہوا ہوگا۔ حال ہی میں اکتوبر ۱۹۳۷ع میں نامور عالم ریورنڈ فادر ایچھ۔ ہیرس مدراس یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام اس مضمون پر تقریر کرتے ہوئے جو کچھ کہا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مہن جو دڑو سے جو مہریں ملی ہیں، ان کی تحریریں وہ کسی حد تک سمجھ سکا ہے۔ وہ صاحب کہتا ہے کہ کئی مہروں میں نظام شمسی پر راسیوں اور نکھشتروں کا بالواسطہ یا بلاواسطہ اشارہ ہے، اور ایک مہر پر اہم

(1) "A marvellous culture, surpassing in many respects the splendour of Egypt and Mesopotamia," Sir John Marshall.

راس (برج) سے متعلق لکھا ہے کہ "اُس کی رفتار تیز ہے"۔ پھر جوتش کے حساب سے اس نے درج کیا ہے کہ مہروں سے سمجھا جا سکتا ہے کہ قدیم سندھ کے لوگوں کو علم جوتش کی معلومات ۵٦١٠ برس ق۔م تھی، اور میسوپوٹیمیا کے لوگ یہ علم بعد میں سیکھے اور لکھنے کا علم بھی انہوں نے بعد میں ہندستان کے لوگوں سے سیکھا۔ میسوپوٹیمیا کے لوگوں نے بعد میں یہ فن یورپ کی طرف پھیلایا۔ مطلب یہ کہ فادر ہیرس کے مطابق یورپ کے لوگوں پر ہندستان کی تہذیب کا قدیم زمانے میں بہت اثر ہوا تھا۔ [1]

قدیم سندھیوں کے تعلقات: مہن جو دڑو سے جو چیزیں ملی ہیں، ان میں سے صرف چند ایک پر غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ پانچ ہزار برس پہلے قدیم سندھیوں کے کہاں کہاں کے لوگوں سے تعلقات تھے۔

مہن جو دڑو میں سے کچھ تانبے کے برتن اور اوزار ملے ہیں۔ سندھ میں لکی کے پہاڑوں سے کسی کسی جگہ سے تانبہ تھوڑے انداز میں مل جاتا ہے؛ لیکن یہ کچی دھات اتنی مقدار میں نہیں ہوتی جس سے عام طرح کے برتن بنا کر استعمال کیے جا سکیں۔ مطلب یہ کہ تانبے کی کانیں سندھ میں نہیں ہیں، اس لئے یہ دھات قدیم سندھیوں نے ضرور درآمد کی ہوگی۔ ہندستان اور اُس کے پڑوسی ممالک کے جغرافیہ سے جسے آگاہی ہوگی، وہ جلد ہی سمجھ جائے گا کہ سندھیوں نے اپنے روزمرہ کی ضرورت کے لئے تانبہ ضرور مدراس، راجپوتانا یا کشمیر سے درآمد کیا ہوگا، یا پھر ایران اور جنوبی افغانستان سے لائے ہونگے۔ کیونکہ وہاں تانبے کی کانیں موجود ہیں۔ اسی طرح صرف تانبے کے برتنوں اور اوزاروں پر غور کرنے سے سمجھا جا سکتا ہے کہ قدیم سندھ کے باشندوں کے مدراس، راجپوتانا، کشمیر، ایران اور جنوبی افغانستان یا ان میں سے کچھ مقامات کے لوگون سے تعلقات تھے، جس وجہ سے انہیں تانبہ دستیاب ہوسکتا تھا، جس سے اپنے گھروں کی چیزیں بناتے تھے۔ اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ پانچ ہزار برس پہلے سندھ میں دھات سے برتن بنانے والے قابل کاریگر ہوتے تھے، جو اس طرح کے عمدہ برتن بنا سکتے تھے۔

مہن جو دڑو سے کچھ سونے کے زیور بھی ملے ہیں۔ سونے کا ذکر رگ وید میں کئی ایک مقامات پر ملتا ہے۔ قدیم رشیوں نے دریائے سندھ کو "سونے کی" کہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دریائے سندھ کی ریت سے آج تک سونے کے ذرات ملتے ہیں۔ درحقیقت بڑے دریاؤں کی ریت سے سونے کے ذرات ملتے ہیں۔ قدیم زمانے میں لوگوں کا یہی دھندھا ہوتا تھا کہ وہ دریا کی ریت میں سے سونے کے ذرات ہاتھ کر کے، انہیں بیچ کر، اپنا گزارا کرتے تھے۔ آج بھی

(1) Sind Observer Karachi, Wednesday, 27 October, 1937, p. 7.

سندھ میں کچھ ہنرمند ہیں، جنہیں کہا جاتا ہے ''دھوڑ دھیا'' یعنی دھوڑ دھونے والے، لیکن آجکل ان میں سے کئی صرافوں کی بھٹی کی راکھ کم قیمت میں خرید کر، اُسے دھوکر، اس سے سونے کے ذرات نکالتے ہیں۔ مطلب یہ کہ سندھی لوگوں کو دریائے سندھ ہی سے سونا مل جاتا تھا، لیکن وہ کتنی مقدار میں انہیں ملتا تھا، یہ نہیں کہہ سکتے۔ سونا ہاتھ کرنے کے لئے قدیم سندھیوں کے پاس ایک اور طریقہ بھی تھا۔

۵۱۰ برس ق۔م دارا بادشاہ پنجاب اور سندھ پر حملہ کر کے، انہیں اپنا خراج دہندہ بنایا تھا۔ یہ دارا بادشاہ کو ۳۶۰ ٹیلنیٹ سونے کے خاکے کے یعنی تقریباً ۲۶۰ من سونا ہر سال خراج کے طور پر دیتے تھے۔ یہ سونا انہیں کشمیر کی طرف سے داروستان کی سونے کی کانوں سے ملتا تھا۔ کشمیر میں تانبے کی بھی کانیں ہیں۔ اہل سندھ کے اہل کشمیر کے ساتھ بڑے تعلقات تھے، اس بات کا ثبوت خود سندھی زبان سے ملتا ہے، کیونکہ اس میں کشمیر اور داروستان طرف کی زبانوں کی کئی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔[1] یہ زبانوں کا ایک دوسرے پر اثر اس بات کا اور بھی ثبوت ہے کہ اہل سندھ کے اہل کشمیر کے ساتھ بڑے تعلقات تھے۔ لیکن اس قدیم تعلقات کا اور کیا ثبوت چاہیئے جو ''چچ نامہ'' میں لکھا ہوا ہے کہ عیسوی ساتویں صدی میں سندھ کی حکومت کشمیر تک تھی۔ ہمارے سندھی لوگ وہاں تک حکومت کرتے تھے، اس لئے سندھ اور کشمیر طرف کی زبانوں کا ایک دوسرے پر قدرتی اثر ہوا ہے۔ یونانی تاریخ نویسوں نے بتایا ہے کہ سکندرِ اعظم کے حملے کے وقت الور (روہڑی کی طرف) میں سونا اور چاندی کی کانیں تھیں۔ ''چچ نامہ'' تو شروع ہی الور کی دولتمندی اور بستی کی تعریف سے ہوتا ہے۔ اگر پڑوسی ممالک پر نظر ڈالیں گے تو معلوم ہوگا کہ قندھار سے فقط تین میل دور سونے کی کانیں ہیں، اور ایران میں ایسے بہت ہی مقامات ہیں جہاں سے سونا بڑی مقدار میں مل سکتا ہے۔ اس وقت پورے ہندستان میں جو سونا کام میں لایا جاتا ہے اس کا نوے فی صد کولار کی سونے کی کانوں میں سے آتا ہے۔ حیدرآباد دکھن، میسور اور مدراس میں کئی ایسے مقامات ہیں، جہاں سے علماء کو یہ آثار دیکھنے میں آئے ہیں، کہ قدیم زمانے میں لوگ وہاں سے بڑی مقدار میں سونا نکالتے تھے، قدیم سندھیوں کے جنوبی ہندستان کے لوگوں کے ساتھ تعلقات تھے، اس بات کا ایک پکا ثبوت یہ ہے کہ مہن جو دڑو سے ایک خوبصورت سبز پتھر ملا ہے، جس سے متعلق سر جان مارشل کا کہنا ہے کہ یہ پتھر نیلگری پھاڑیوں کے علاوہ کسی بھی دوسری جگہ سے ملنے کا نہیں۔

---

(1) مثلاً، کشمیر اور پنجاب کے مغربی حصے سے لے کر سندھ تک ''اسین'' اور ''تسین'' ضمائر استعمال کرنے کا رواج ہے، مگر شمالی ہندستان میں دوسری جگہوں پر ''ہم''، ''تم''، کہتے ہیں۔ یہ ایک بہت ہی اہم بات ہے۔ (مصنف)

مہن جو دڑو سے ایک مجسمہ ملا ہے، جس پر گیڑو یا داء رنگوں سے نقش و نگاری کی ہوئی ہے۔ سندھ میں گیڑو یا داء رنگ ہوتے ہی نہیں ہیں۔ سندھ میں نزدیک سے نزدیک مقام جہاں سے گیڑو رنگ دستیاب ہوسکتا ہے وہ لکھپت کا شہر ہے۔ وسطی ہندستان سے بھی کئی مقامات سے گیڑو رنگ مل سکتا ہے، لیکن قدیم زمانے سے لے کر خلیجِ ایران کی طرف سے سندھ اور دوسرے مقامات کی طرف گیڑو بڑی مقدار میں درآمد ہوتا رہا ہے، کیونکہ وہاں کا گیڑو، رنگ میں بہت تیز ہے۔ قدیم سندھ کی مغربی ممالک سے تجارت ہوتی ہی خلیج ایران کے راستے تھی۔ حاصل مطلب یہ کہ مہن جو دڑو سے دریافت شدہ چیزوں میں سے صرف ان چند ایک چیزوں پر غور کیا جاتا ہے تو یوں سمجھ میں آتا ہے کہ قدیم زمانے میں اگرچہ بھاپ پر چلنے والی گاڑیاں نہیں تھیں، پھر بھی سندھ کی تجارت اِدھر کشمیر اور قندھار، اُدھر وسطی ہندستان خواہ جنوبی ہندستان کی طرف ہوا کرتی تھی۔ ہمارے ملک کو قادر نے اپنی قدرت سے سمندر خواہ خشکی کے راستے ایران سے جوڑے رکھا ہے، اور اُس طرف والوں سے قدیم سندھیوں کے روابط ان ہی راستوں سے ہوتے تھے۔

تہذیب کے بانیکار: مہن جو دڑو کی کھدائی کرتے ہوئے وہاں سے کچھ انسانی کھوپڑیاں بھی ملی ہیں، جن کا اچھی طرح جائزہ لے کر کرنل آر۔ بی۔ سیویل ہندستان کی زولاجیکل سروے کے ڈائریکٹر اور ہمکار ڈاکٹر بی۔ ایس۔ گوہا نے انکشاف کیا ہے کہ مہن جو دڑو میں کم از کم چار قومیں آباد تھیں۔ جن میں سے ایک کول اور سنتھال، دوسری دراوڑ، تیسری آلپائین، اور چوتھی منگول۔ ان قوموں میں سے مہن جو دڑو کی تہذیب کی بنیاد کس قوم نے رکھی، اس سلسلے میں عالموں کی مختلف آرائیں ہیں، لیکن زیادہ وزن آرکیالاجیکل محکمہ والوں کی رائے میں ہے۔

مسٹر رکھلد اس پئر جی، آرکیالاجیکل محکمہ کا سپرنٹینڈنٹ، جس نے سب سے پہلے مہن جو دڑو کی کھدائی کروائی تھی، اس کا خواہ آرکیالاجیکل محکمہ کے ڈائریکٹر جنرل سر جان مارشل کا کہنا ہے کہ مہن جو دڑو کی تہذیب دراوڑ لوگوں کی ہے، اور وہ ہی اسی تہذیب کے بانیکار ہیں۔

راءِ بہادر راما پرساد چند، سپرنٹینڈنٹ، آرکیالاجیکل سیکشن، انڈین میوزم، کلکتے والا کہتا ہے کہ ''اس وقت تک جو چیزیں ملی ہیں، ان میں سے کوئی بھی ایسا ثبوت نہیں ملا، جس سے سمجھا جائے کہ ہرپا اور مہن جو دڑو کے شہر جنھوں نے قائم کیے، ان کی تہذیب رگ وید والے آریوں کی سی تھی۔ اس کے برعکس یہ ثبوت ملے ہیں کہ اس قدیم تہذیب کے بانیکار ویدوں کو ماننے والے نہیں تھے''۔ مزید یوں بھی اس نے کہا ہے کہ ''وہ ''پنی'' یعنی تاجر لوگ تھے، جنھوں نے ہرپا اور مہن جو دڑو کے شہروں کی بنیاد رکھی، رگ وید میں ''پنی'' لوگوں کا ذکر ملتا ہے۔ راءِ بہادر کے

کہنے کے مطابق وہ پنی لوگ دراوڑ تھے، اور ان کے قلعے آریہ لوگوں نے آ کر مسمار کیے، جیسا کہ رگ وید میں درج ہے۔[1] مطلب یہ کہ تاحال جو ثبوت ملے ہیں، ان میں سے آرکیالاجیل محکمہ والوں کو یوں سمجھنے میں آتا ہے کہ مہن جو دڑو کی تہذیب ویدوں کو ماننے والے آریوں سے پہلے کی ہے، اور اس کا کریڈٹ (شرف) دراوڑ لوگوں کو دے رہے ہیں۔ فادر ہیرس کا بھی یہی کہنا ہے کہ یہ قدیم دراوڑوں کی تہذیب ہے، جس کا پتہ ہمیں ابھی ابھی ہوا ہے۔[2]

تحقیقات کا حاصل مطلب: مذکورہ بالا مضموں سے معلوم ہوگا کہ تقریباً تین ہزار سال ق۔م پہلے وادئ سندھ میں ایک مہذب قوم بڑے اور اچھی منصوبہ بندی تحت قائم شہروں میں رہتی تھی۔ لوگوں کے مکانات کشادہ، ہوادار اور پکی اینٹوں سے بنے تھے، جن میں فرشبندی کی ہوئی تھی۔ کچھ مکانات دو منزلہ اور تین منزلہ بھی تھے۔ ہر ایک گھر میں غسلخانہ تھا، جس کا فرش پلاسٹر کیا ہوا تھا۔ پانی کی نکاسی کا مکمل انتظام تھا، شہر کے راستے کشادہ اور سیدھے بنے ہوئے تھے۔ تالاب اور کنویں بھی تھے، اور لوگ اپنے ہمعصر عراقیوں اور مصر ملک کے لوگوں سے اعلیٰ طرز کی زندگی بسر کرتے تھے، مہن جو دڑو سے ملی ہوئی لاشوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں علحدہ علحدہ قومیں رہتی تھیں۔ جن کے لباس میں اتنا ہی فرق تھا، جتنا ان کی شکلوں میں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ابھی لوگوں نے لوہا مارنا نہیں سیکھا تھا، یہی وجہ ہے کہ روزمرہ کے کام کے لئے پتھر سے بنی چھریاں اور دیگر اوزار بہت ہاتھ آئے ہیں۔ سونا اور تانبہ مارنے کا فن وہ جانتے تھے۔ علاوہ ازیں، ٹین (Tin) سے تھوڑا سا کام لیتے تھے۔ اس لئے یہ تانبے سے ملا کر اپنے اوزار بناتے تھے۔ گز، کات، بھالے، اور کلہاڑیاں بھی بنانا جانتے تھے۔ تلوار بنانے کا فن ابھی نہیں سیکھے تھے۔ باقی بُنائی کے کام اور کاتنے کے کام میں نہایت ہی ماہر تھے۔ ہیروں، جواہروں، انگوٹھیوں، چوڑیوں اور زیورات کا بہت شوق رکھتے تھے۔ وہ مٹی سے عمدہ بنے نقش و نگار شدہ برتن استعمال کرتے تھے، کچھ لوگوں کے پاس تانبے اور چاندی سے بنے برتن بھی ہوا کرتے تھے، وہاں سے دریافت شدہ مہروں پر کن جانوروں کی شکلیں ہیں، جس سے سمجھا جاتا ہے کہ گائے، گھوڑے، بھیڑ، بکریاں، کتے وغیرہ پالتے تھے، اس زمانے میں چیتہ، مانگر مچھ، گینڈا اور ہاتھی بھی سندھ میں پائے جاتے تھے۔ یہ جانور اکثر جنگلوں میں رہنا پسند کرتے تھے۔ اس سے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ اس زمانے میں سندھ میں اچھی خاصی برساتیں ہوا کرتی تھیں، جنگلات بہت اور گھنے ہوتے

(1) Memoir of the Archaeological Survey of India No. 31 p.5.

(2) "The consequence deduced by Sir John Marshall after the study of the Mohan Jo Daro remains that this civilization probably is Dravidian is now fully confirmed by the decipherment by the present writer of about 1800 inscriptions found in all these sites. "Rev. H. Heras: Journal of Indian History. April 1937, P.1.

تھے۔ مہروں پر جن چھوٹے سینگوں والے بیلوں اور دیگر جانوروں کی شکلیں ہیں، ان سے نہ صرف کاریگروں کی کاریگری کا پتہ چلتا ہے، بلکہ خصوصاً بیل کا تعلق شو بھگوان کی پوجا سے سمجھ میں آتا ہے، کیونکہ شو کے لنگ بھی یہاں سے ملے ہیں۔ درختوں اور پانی کی پوجا کے نشانات بھی یہاں سے ملے ہیں۔ لوگوں کو لکھنے پڑھنے کا فن تھا۔ ان کی کمائی کا اہم طریقہ کھیتی باڑی اور دھندھا دھاڑی تھا۔ پہیوں والی شاید ان کے پاس گاڑیاں بھی تھیں، کیونکہ اس طرح کے کچھ کھلونے ہاتھ آئے ہیں۔ اسی ہی تہذیب کے آثار ایران اور میسوپوٹیمیا سے ملے ہیں، جس سے ظاہر ہے کہ ان علاقوں سے خشکی خواہ سمندر کے راستے تجارت کے خیال سے ان کے ساتھ بہت روابط تھے۔

مہن جو دڑو کی اہمیت: سندھ میں مہن جو دڑو اور پنجاب میں ہرپا، کی کھدائی سے پہلے آرکیالاجیکل محکمہ والوں نے مصر ملک اور وسطی ایشیا میں اعلیٰ درجے کی تہذیب کے آثار معلوم کئے تھے، اور ہندستان میں سے انہیں اسی طرح کے کوئی بھی آثار نہیں ملے تھے؛ اسی وجہ سے یہی اثر ان کے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا کہ قدیم ملک مصر اور وسطی ایشیا کے باشندوں نے جب اعلیٰ درجے کی ترقی کی تھی، تب اہل ہند کی حالت جنگلیوں اور غیر مہذب لوگوں سے بہتر نہیں تھی۔ اب جب مہن جو دڑو میں سے جو حقائق معلوم ہوئے ہیں، انہوں نے دنیا کے بڑے بڑے علماء کے بھیجے کھول دیے ہیں، اور پہلے والی غلط فہمی اب دور ہوگئی ہے۔ کئی علماء اب ماننے لگے ہیں کہ وہ زمانہ گزر گیا جب قدیم مصر اور قدیم یونان کی تہذیب سب سے آگے شمار کی جاتی تھیں، وہ وقت گذر گیا، جب فرات اور نیل دریاؤں کے کنارے جو کام ہو چکے، وہ ساری دینا میں سب سے آگے سمجھے جاتے تھے۔ اب پہلا نمبر ہماری وادئ سندھ شمار ہوتی ہے، جس کی قدیم تہذیب ان سب مقامات کی تہذیبوں سے سبقت لیے ہوئے ہے۔ اس سے مزید یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم سندھ کے لوگوں نے اپنی تہذیب کی بنیاد خود ڈالی تھی اور دوسروں سے نقل نہیں کی تھی۔ اس وقت اگر کوئی دنیا کی تاریخ لکھے گا، تو اُسے ضرور اپنی تاریخ سندھ کی قدیم تہذیب کی تعریف سے شروع کرنا پڑے گی۔ حال ہی میں مسٹر ڈبلیو۔ ایچھ۔ موئر لنڈ اور بابو اٹلچند ر چٹر جی قدیم ہندستان کی تاریخ چھپوا کر شایع کی ہے، تو انہوں نے شروعات ہی وادئ سندھ کی قدیم تہذیب سے کی ہے۔ دیگر کچھ یورپی اور ملکی علماء نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ اب تو کرنا ایسا ہوگا، کیونکہ مشرق کے سب ممالک میں آج مہن جو دڑو بڑی اہمیت والا مقام ہے۔

مصنف کی شخصی رائے: مہن جو دڑو اور ہرپا میں سے جس طرح کی مہریں ملی ہیں، اسی طرح کی وہی مہریں میسوپوٹیمیا سے بھی ملی ہیں۔ اور ان میں سے کئی ۳۲۵۰ برس ق۔م کی

ہیں۔ اس وجہ سے سر جان مارشل کا کہنا ہے کہ موہن جو دڑو کی تہذیب کی عمر پانچ ہزار برس ہے۔ اگر میسوپوٹیمیا سے آٹھ دس ہزار برس پہلے کی مہریں مل جاتیں، اور وہ موہن جو دڑو کی مہروں سے مشابہہ ہوتیں تو پھر خود سر جان مارشل کہتے کہ موہن جو دڑو کی تہذیب بھی آٹھ دس ہزار برس پہلے کی ہے۔ مطلب یہ کہ تہذیب کی عمر کا تخمینہ دریافت شدہ مہروں پر مبنی ہے، اس لئے مصنف کے خیال موجب یہ تخمینہ ہنوز درست نہیں سمجھا جانا چاہئے۔ اس کی ایک اور وجہ ہے۔

سر جان مارشل اور دیگر آرکیالاجیکل محکمہ والوں کا کہنا ہے کہ موہن جو دڑو کی تہذیب دراوڑ لوگوں کی ہے، جو آریوں کی آمد سے پہلے ہندستان میں تھے۔ تاریخی زمانوں کے حوالے دیتے ہوئے، ہم کئی حوالے اور اسناد دے کر ثابت کریں گے کہ مہا بھارت والی جنگ کو آج تقریباً پانچ ہزار برس گذر چکے ہیں۔ اگر موہن جو دڑو کی تہذیب کی عمر بھی پانچ ہزار برس ہے، تو پھر یوں کہینگے کہ یہ مہا بھارت والے زمانے کی تہذیب ہے۔ جبکہ آریوں کی ہندستان میں حکمرانی مہا بھارت والے زمانے سے کوسوں دور کی ہے، اس لئے کہیں گے کہ اس تہذیب کے بانیکار آریہ لوگ تھے۔ اگر سچ پچ یہ دراوڑوں کی تہذیب ہے، تو پھر کہیں گے کہ اس تہذیب کی عمر پانچ ہزار برس نہیں بلکہ اس سے بھی دگنی تگنی ہے، اسی وجہ سے مصنف کی شخصی راءِ ہے کہ جب تک کوئی پکے پختہ ثبوت نہیں ملتے، تب تک تہذیب کی عمر اور بانیکاروں کا احوال جوں کا توں ہی رہنا چاہئے۔

☆

باب ۵

آریوں کا قدیم احوال

آریہ لوگ کہاں سے آئے؟: رگ وید میں آریوں اور غیر آریوں کے بیچ جنگوں کا بہت تذکرہ ملتا ہے۔ اس سے یورپی علماء نے یہ قیاس آرائی کی ہے کہ آریہ لوگ کہیں باہر سے آئے تھے، اس لئے ملک ہتھیانے کے لئے انہیں غیر آریوں سے جنگیں لڑنا پڑیں۔ وہ کہاں سے آئے، یہ پتہ انہیں ہندوؤں کے کسی بھی پستک سے نہیں چل سکا۔ پھر انہوں نے زبانوں پر تحقیقات اور دیگر تحقیقات کر کے علحدہ علحدہ آرائیں قائم کیں، جس سے اہم رائے یہ تھی کہ آریہ اصل میں وسطی ایشیا سے آئے تھے، اوپر پہلے ہی ذکر کیا گیا ہے کہ یہ وسطی ایشیا کا نظریہ بعد میں جرمنی کے پروفیسر پینکا اور دوسروں نے غلط قرار دیا اور آریوں کا اصل وطن قطب شمالی قرار دیا گیا۔[1] پروفیسر راہز نے بھی اپنے ''ہبرٹ لیکچرس'' میں قدیم کلٹیک قوموں کی کہانیوں سے ثبوت فراہم کر کے، اسی طرح ہی لکھا ہے۔ وسطی ایشیا والے نظریہ پر آخری چوٹ لوکمانیہ بال گنگادھر تلک نے لگائی، جس نے ہندوؤں کے ویدوں، اتہاسوں اور پرانوں سے، بلکہ پارسیوں کی ''زنداوستا'' سے کئی حوالے دے کر، اپنی کتاب ''آرٹک ہوم'' میں درج کیا کہ قدیم آریہ لوگ ''پیرو پربت'' پر رہتے تھے، جو سئبیریا کے قطب شمالی طرف تھا (صفحہ ۱۷)۔

لوکمانیہ تلک نے اپنی کتاب ''آرٹک ہوم'' میں ویدک ادب سے حوالے دیے ہیں، ساتھ ساتھ کچھ کہانیاں بھی ویدک ادب سے نکال کر، اپنی تشریح کے ساتھ دی ہیں۔ ان کہانیوں سے شاید کوئی ایک مطلب لے تو کوئی دوسرا، اس لئے اس کی لکھی ہوئی باتوں سے شاید ہر شخص شامل رائے نہ ہو۔ اس لئے ہمیں ان کہانیوں اور ان کی وضاحتوں کو چھوڑ کر، ہمیں صرف اس بات پر سوچنا ہے کہ اس اتنی ساری کتاب لکھنے میں اس کا اہم مقصد کیا تھا؟ اس کی کتاب سے ہی ظاہر

(1) The works of German scholars like Posche and Penka freely challenged the Asiatic theory regarding the original home of the Aryan race and it is now generally recognised that we must now give up that theory, and seek for the original home of the Aryans somewhere in the further north." Sjt. B.G. Tilak: The Arctic Home in the Vedas, p.4.

ہے کہ اُسے صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ "قدیم آریوں کا اصلی وطن میرو پربت تھا، جو قطب شمالی کی طرف تھا، اور یہ بات جو ویدک ادب، اتہاسوں اور پرانوں سے ظاہر ہے وہ سچ ہے"۔

حال ہی میں مسٹر پارجیٹر، کلکتہ ہائی کورٹ کے جج نے اپنے طور ہندوؤں کے پرانوں سے تاریخی احوال نکالے ہیں۔ اس صاحب نے بھی یہی درج کیا ہے کہ قدیم آریہ لوگ اصل میں ہندستان کے باشندے نہیں تھے، لیکن وسطی ہمالیہ کے ملکوں کے راستے ہندستان میں آئے تھے۔ (1)

اس وقت ہمارے کئی ملکی علماء بھی اسی رائے کے ہیں کہ تمام قدیم آریہ لوگ اگر میرو پربت پر نہیں رہتے تھے، تو بھی ان میں سے اکثر وہاں کے رہنے والے تھے۔ لوکمانیہ تلک رگ وید میں سے جو حوالے دیے ہیں، ان پر بھی سوچ بچار کر کے، ہمارے کئی ویدک عالموں نے ظاہر کیا ہے کہ رگ وید کی کچھ کچھ رچنائیں واقعی اسی زمانے کی ہیں، جس زمانے میں تمام قدیم آریہ لوگ یا ان میں سے بیشتر قطب شمالی کی طرف میرو پربت پر رہائش پذیر تھے۔ ایسی صورتِ حال میں ضروری ہے کہ یہاں پہلے قطب شمالی اور میرو پربت کا مختصر سا ذکر کیا جائے، تاکہ قارئین کو سارا قصہ سمجھنے میں آسانی ہو۔

آرکٹک ریجن یا قطب شمالی کا تذکرہ: اُس وقت قطب شمالی میں بہت برف ہونے کے سبب، وہاں کوئی بھی جاندار نہیں رہ سکتا. لیکن آرکیالاجیکل محکمہ والوں کو تحقیقات کے ذریعے یقین ہو چلا ہے کہ برف گرنے کے باوجود کوئی ایسا درمیانی زمانہ (Inter-glacial Period) بھی گذرا ہے، جس دوران وہاں کچھ مقامات پر لوگ آرام سے رہ سکتے تھے۔ (2)

اس قسم کے ثبوت پروفیسر گیکی (Prof. Geikie) اور دوسری جیالاجی کی کتب سے دے کر، پھر آرکٹک ریجن کا جو احوال لوکمانیہ نے دیا ہے، وہ اختصار کے ساتھ ملاحظہ فرمائیے:

قطب شمالی کی طرف جایا جائیگا تو پہلے یہ بات توجہ منذول کروائے گی کہ سورج اور دیگر سیارے نہ مشرق سے طلوع ہوتے ہیں اور نہ ہی مغرب میں غروب ہوتے ہیں؛ لیکن سارا نظام شمسی اس طرح گولائی میں پھرتا ہے، جیسے کوئی آدمی کھلی ہوئی چھتری اپنے سر کے اوپر پھیرے۔ یہ چکر مغرب سے شروع ہوتا ہے اور مشرق میں ختم ہوتا ہے۔ ہر ایک چکر چوبیس گھنٹوں میں مکمل ہوتا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک سو اسی چکر پورے ہوں یعنی چھ مہینے گذریں تو سورج اس طرح

(1) F.E. Pargiter: Ancient Indian Historical Tradition, p. 297
(2) The geological evidence is complete as to the existence of a genial climate in Tertiary times as far north as present land extends, and of a climate, less severe than that of today in the Quarternary period Encycl: Britt: article "Polar Regions."

طلوع ہوتا ہوا نظر آتا ہے گویا کہ جنوب سے طلوع ہو رہا ہے[1] اور شمال کی طرف بڑھتا جا رہا ہے۔ پھر جب سورج جنوب کی طرف جانے لگتا ہے، تب تارے چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح وہاں چھے مہینے دن تو چھے مہینے رات! مطلب یہ کہ موٹا حساب لگائیں تو پورے سال میں دن صرف ایک ہوتا ہے، جو چھ مہینے مسلسل جاری رہتا ہے، اور رات بھی چھ مہینوں کی لگاتار ہوتی ہے۔ اتنی بات ضرور ہے کہ یہ مسلسل چھ مہینوں کی رات میں سارا وقت گہرا اندھیرا نہیں چھایا رہتا۔ صبح اور شام کے شفق کی روشنی بھی ہوتی ہے۔ یہ شفق بھی کمہار کے چکرے یا چاک کی طرح پھرتی رہتی ہے، اور ہر ایک چکر چوبیس گھنٹوں میں پورا کرتی ہے۔ چھ مہینوں کی رات کے بعد صبح صادق ہونا شروع ہوتی ہے۔ تو پہلے تھوڑی سی روشنی ہونے لگتی ہے، اور پھر چمکتے ہوئے تاروں میں سے تھوڑے تھوڑے غائب ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ پھر لعلی بڑھتی جاتی ہے، تو رفتہ رفتہ سارے تارے غائب ہو جاتے ہیں، اور پھر صبح صادق ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر وارن اور دیگر علماء کی کتب سے حوالے دے کر، لوکمانیہ تلک نے درج کیا ہے، کہ ہر سال، ۲۹ جنوری کو، صبح صادق ہونا شروع ہوتی ہے، اور سینتالیس دن مسلسل صبح صادق کی لعلی دیکھنے میں آتی ہے؛ اس کے بعد سورج طلوع ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ سورج ایک دفعہ نمودار ہوتا ہے تو ایک سو چورانوے دنوں تک مسلسل موجود رہتا ہے۔ ہر سال ۲۵ ستمبر کو سورج غروب ہوتا ہے، تو بھی نماشام والی شفق اٹھتالیس دنوں تک مسلسل رونق افروز رہتی ہے، یعنی ۱۳ نومبر سے لے کر رات ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ سال کے ۳۶۵ دنوں میں سے سینتالیس دن صبح صادق، ایک سو چورانوے دن سورج کی روشنی، اٹھتالیس دن نماشام کی شفق اور چھیتر دن رات ہوتی ہے۔ کبھی کبھار، رات کا اندھیرا چھیتر دنوں کی بجاءِ فقط ساٹھ دن رہتا ہے۔ یہ فرق وہاں کے ماحول اور دیگر اسباب کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یہ کچھ یورپی لوگوں کے آنکھوں دیکھے احوال ہیں، جو لوکمانیہ ان کی کتابوں سے نکال کر، اپنی کتاب ''آرکٹک ہوم'' میں درج کئے ہیں۔

مذہبی کتب سے حوالے: قدیم آریہ لوگ اصل میں آرکٹک ریجن میں رہتے تھے، اس سے متعلق لوکمانیہ تلک نے جو ''آرکٹک ہوم'' کتاب لکھی ہے، اس میں ۵۰۰ صفحات (ڈیمی سائز) کے ہیں۔ پوری کتاب ثبوتوں، کہانیوں اور ان کی تشریحات سے بھری ہوئی ہے؛ لیکن یہاں ذیل میں چند ایک اہم ٹکڑے دیے جاتے ہیں:

(1) To such a man (stationed at the North Pole) the sun going into the northern hemisphere in his annual course will appeaar as coming up from the South, and he will express the idea by saying that 'the sun has risen in the south,' however strange the expression may seem to us," B: G: Tilak: The Arctic Home in the vedas p. 46.

یجر وید کے آخر میں جو تیتر ییہ براہمن گرنتھ ہے، اس میں لکھا ہے کہ "عام لوگوں کا ایک سال دیوتاؤں کے ایک دن کے برابر ہے" (تیتر ییہ براہمن ۳، ۹، ۲۲، ۱)[1] یہی الفاظ منوسمرتی کے ادھیاء پہلے، شلوک ۶۷ میں بھی درج ہے۔

مہا بھارت کے ون پرو (ادھیاء ۱۶۳ اور ۱۶۴) میں لکھا ہے کہ پانڈون کا درمیانی بھائی ارجن میرو پربت کی طرف گیا تھا۔ وہاں کے جو آنکھوں دیکھے احوال اس نے دیے ہیں، ان میں کہتا ہے کہ "میرو پربت کی طرف سورج اور چاند مغرب سے مشرق کی طرف گردش کرتے رہتے ہیں۔" اس کے بعد کہتا ہے کہ "میرو پربت کی تجلی رات کے اندھیرے پر اتنا غالب آ جاتی ہے، کہ رات بھی دن جیسی لگتی ہے"۔ مزید برآں یوں بھی کہا ہے کہ "وہاں دن اور رات وہاں کے باشندوں کے لئے ایک سال کے برابر ہیں"۔ یہی باتیں ہندوؤں کے پرانوں میں بھی لکھی ہوئی ہیں۔

بھاسکر آچاریہ کے "سوریہ سدھانت" (۱۲، ۶۷) میں بھی لکھا ہے کہ "میرو پربت کی طرف دیوتاؤں کو سورج صرف ایک دفعہ طلوع ہوتا ہوا دیکھنے میں آتا ہے، جب سورج اپنا آدھا چکر اہم راس سے لے کر شروع کرتا ہے۔"

پارسیوں کی دینی کتب میں بھی اسی طرح کی باتیں لکھی ہوئی ہیں۔ مثلاً، ویندیداد کے فر گرد دوسرے میں پارسیوں کا اصلی بہشت جیسی جگہ "ائرین ویجو" یعنی وہ جگہ جہاں آریوں کا بیج یا بنیاد پیدا ہوا (The nursery or place of origin of the Aryans) سے متعلق لکھا ہے کہ "وہ تارے، چاند اور سورج سال میں ایک دفعہ طلوع اور غروب ہوتے ہیں، اور جو سال ہے، وہ وہاں ایک رات اور دن شمار کرتے ہیں"۔ ہندوؤں اور پارسیوں کے مذہبی کتب میں لکھی ہوئی یہ تمام باتیں آتلنک ریجن کے علاوہ اور کسی بھی مقام سے لاگو نہیں ہوسکتیں، اس لئے یہاں مزید حوالے دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

ہندستان کی تاریخ پہلے پہلے آنربل ماؤنٹ سٹیوئرٹ ایلفنسٹن نے تیار کی تھی، جو پہلی دفعہ ۱۸۴۱ع میں چھپ کر شایع ہوئی تھی۔ اس وقت ہی کچھ یورپی علماء یوں سمجھ رہے تھے کہ پرانوں میں جسے میرو پربت کہا گیا ہے، وہ قطب شمالی ہے؛[2] تب بھی عام رائے یہ تھی کہ پرانوں کے رچنے والوں کو دنیا کے جغرافیہ سے واقفیت نہیں تھی، انہوں نے صرف اپنے خیالی گھوڑوں کو دوڑایا تھا۔ ایلفنسٹن صاحب اور دیگر حضرات نے اسی رائے کا اظہار کیا کہ خود

(1) پہلا ہندسہ کانڈ، دوسرا پر پاٹھک، تیسرا انو واک اور چوتھا ورک کے لئے استعمال ہوا ہے۔ (مصنف)

(2) Some consider Mount Meru as the 'North Pole.' 'Elphinstone's History of India (1841) Vol, 1, p 252.

ہندوؤں کے ذہنوں پر بھی یہی بات بیٹھ گئی تھی کہ ''میروؔ'' ایک خیالی پربت ہے۔ پروفیسر آپٹی والی سنسکرت کی ڈکشنری دیکھیں، اس میں بھی یہی کچھ لکھا ہے۔ پہلا عالم لوکمانیہ تلک تھا جس نے یہ غلط فہمی دور کی۔ اب ہمارے کئی ملکی عالم اب سمجھنے لگے ہیں کہ رگ وید کی کچھ رچنائیں واقعی اس زمانے کی تھیں، جب تمام آریہ لوگ، یا ان میں سے بیشتر، میرو پربت کی طرف رہتے تھے۔

ایک اہم بات جو لوکمانیہ تلک کی کتاب میں لکھی ہوئی دیکھنے میں نہیں آتی، وہ یہ کہ میرو پربت کا نام نہ صرف ہندوؤں کے مذہبی کتب میں درج ہے بلکہ یونانیوا ں کی کہانیوں میں بھی درج ہے۔ یونانی لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ ان کا دیوتا ''دوٗنیسوس''، جو نباتات کا دیوتا ہے، اس کا جنم ہی میرو پربت پر ہوا تھا۔ یہ بات ۱۷۸۴ع میں سر ولیم جونس نے کہی تھی۔ (1) اسی وقت بلکہ اس سے تقریباً ایک سو برس بعد بھی کئی علماء یوں سمجھتے رہے کہ ''میروؔ'' ایک خیالی پربت کا نام ہے، اس لئے شاید سر ولیم جونس کی کہی ہوئی اس بات پر کسی عالم نے بحث نہیں کی؛ لیکن مصنف کے خیال کے مطابق یہ ایک بہت ہی اہم بات ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندوؤں کے آباء واجداد کے ساتھ قدیم یونانی لوگوں کے آباء واجداد بھی میرو پربت پر رہتے تھے۔ یونانی لوگ خود کہتے ہیں کہ ہم ''دوٗنیسوس اور دیگر دیوتاؤں کی اولاد ہیں۔'' جب ان کے دوٗنیسوس دیوتا کا جنم ہی میرو پربت پر ہوا تھا، تب تو بلا پوچھے یوں کہینگے کہ قدیم یونانیوں کا اصل وطن بھی میرو پربت تھا۔ دوٗنیسوس دیوتا سے متعلق قدیم یونانی لوگ یوں بھی کہتے ہیں کہ وہ ''زیئوس'' (Zeus) ''دیوس پتر'' (The Sky-Father) کا بیٹا تھا اور پرتھوی اس کی ماں تھی۔ رگ وید میں قدیم آریوں نے آسمان اور زمین کو باپ اور ماں کہا ہے (ملاحظہ ہو صفحہ ۴)۔

اب جب تحریری ثبوت عالم آشکار ہو چکے ہیں، اور پروفیسر پیٹکا، ڈاکٹر وارن اور پروفیسر راہزا اپنے طور تحقیقات کر کے، ایک ہی رائے کا اظہار کیا ہے کہ قدیم آریوں کا اصلی وطن قطب شمالی کی طرف تھا، اور لوکمانیہ تلک نے بھی ہندوؤں اور پارسیوں کی مذہبی کتب سے حوالے دے کر، قطب شمالی کا نظریہ صحیح ثابت کیا ہے، اور میرو پربت کا نام ہندوؤں کی مذہبی کتب اور یونانیوں کی کہانیوں میں لکھا ہوا ہے؛ تو پھر وسطی ایشیا والا نظریہ، جو فقط بولیوں میں سے لی گئی قیاس آرائیوں پر مبنی تھا، وہ سو فی صدی غلط شمار ہوگا۔ تحریری ثبوتوں کے ہوتے ہوئے قیاس آرائیوں پر چلنا ہی عبث ہے، اس لئے ہم نے اپنے تعیں قطب شمالی والے نظریے کو مان لیا ہے۔ اس کی

(1) "Meros is said by the Greeks to have been a mountain of India on which their Diomysos was born, and that Mero generally means the north pole in Indian geography." Sir William Jones: The Gods of Greece, Italy and India, p. 28 (Written in 1784 and since revised).

ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ خود ہماری زبان میں بھی ایسی بات موجود ہے، جو ہمیں قطب شمالی والے نظریہ کو ماننے پر مجبور کرتی ہے۔ اس بات کو یہاں وضاحت کے ساتھ درج کیا جاتا ہے۔

بولی سے ثبوت: چاروں اطراف پر جو نام رکھے ہوئے ہیں وہ ''نظام شمسی'' (Solar System) کے الفاظ ہیں، جن میں سے ''اُتر'' (شمال) اور ''ڈکڻ'' (جنوب) نہایت ہی قدیم زمانے کے الفاظ ہیں، اور خاص توجہ چاہتے ہیں۔

''اُتر'' معنی بالائی حصہ، شمال (North)؛ لیکن یہ لفظ اصل میں اسم صفت ہے اور اس کے معنی ہیں ''بالا، دوسروں سے اوپر''۔ سنسکرت میں ''اُد'' معنی ''اوپر، بالا'' (High)، ''اُتر'' (اُد + تم) معنی سب سے اوپر (Highest)۔ آج بھی سندھی میں یہ لفظ صفت کے طور پر کام آتا ہے، جیسا کہ کہتے ہیں کہ ''وہ دونوں بے وقوف ہیں- ایک دوسرے سے اُتر'': یہاں ''اُتر'' معنی ''زیادہ'' (اوپر)۔

''اُتر'' لفظ جب بطور اسم استعمال ہوتا ہے، تب بھی اپنے بنیادی معنی ''اوپر'' کے ظاہر کرتا ہے۔ مثلاً، ''پرشن اور اُتر'' معنی ''سوال و جواب''۔ یہاں ''اُتر'' کے لفظی معنی ہیں ''جو کچھ اوپر سے دیا جائے'' (سوال کے جواب میں)۔ ایک چیز تبدیل کر کے دوسری لی جاتی ہے تو کبھی کبھار کچھ رقم اوپر سے دینی پڑتی ہے، اُسے بھی ''اُتر'' کہتے ہیں۔ یہاں بھی ''اُتر'' کے معنی جو اوپر سے دیا جائے'' (چیزوں کے تبادلے میں)۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ''اُتر'' لفظ، جو اصل میں صفت، ہے، اور اس کے معنی ہیں ''بالا یا دوسروں سے اوپر''، تو اس کے معنی ''شمال'' (North) کس حساب سے ہوئے؟ اس سلسلے میں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ اس وقت ''اتر'' کی ضد کہتے ہیں ''ڈکڻ'' (South)؛ لیکن اصل میں ایسا ہے ہی نہیں۔ سنسکرت میں ''اُتر' کے معنی بالا، اوپر والا''، اور اس کی ضد ہے ''آدھر'' معنی ''نچلا''، : سنسکرت میں ''اُتر'' کی ضد ''پورب'' بھی ہے، جس کے معنی ہیں ''پچھلا''، مثلاً، کسی عملدار کی جگہ پر کوئی دوسرا عملدار مقرر ہو کر آئے گا تو اسے کہینگے ''اُتر ادھکار'' (Successor) یعنی جو اوپر آتا ہے، اور پچھلا عملدار کہلائے گا ''پورب ادھکاری'' (Predecessor)۔ اس حالت میں ''اُتر'' کی ضد ہے ''پورب''، اب تو اور واضح ہو گیا کہ اصل میں ''اُتر'' کی ضد ''ڈکڻ'' ہے ہی نہیں۔ تو پھر اب کا یہ رواج کیسے چالو ہوا؟

سندھی لفظ ''ڈکڻ'' اصل میں سنسکرت لفظ ''دکشن''، ہے اور اس کے معنی ہیں ''دایاں'' (Right)، سنسکرت میں اس کی ضد ہے ''وام''، جس کا تلفظ ھندی اور ھندستانی میں ہے ''بام، باوان، بانوان'' معنی ''بایاں'' (Left)، ''بائیں ہاتھ'' کے معنی ہیں ''بائیں ہاتھ کی طرف''، سنسکرت

میں ''دکشن'' (ذکِش) کے دوسرے معنی ''مستعد'' (Dexterous) کے بھی ہیں۔ اب کوئی یہ بات ہمیں سمجھائے کہ ''ذکِش'' کے معنی ''جنوب'' (South) پھر کیسے ہوئے، اور اس لفظ کے معنی میں اتنی تبدیلی کیسے واقع ہوئی؟ اس بات سے یہ نظر آتا ہے کہ ''اُتر'' اور ''ذکِش'' الفاظ جو بظاہر آسان لگ رہے ہیں، سچی بات تو یہ ہے کہ انہیں سمجھنا ہی مشکل ہے۔

چاروں اطراف کے ناموں کے قدیم اور جدید معنی سمجھنے میں تب آسانی ہوگی، جب فرض کرلیں گے کہ قدیم ہندوؤں اور یونانی لوگوں کے آباء و اجداد اصل میں میرو پربت کی طرف رہتے تھے، جیسا کہ ان کی مذہبی کتب میں لکھا ہے۔ میرو پربت قطب شمالی میں تھا، جہاں آج تک نئے سال کی شروعات میں سورج جنوب کی طرف سے طلوع ہوتا ہوا نظر آتا ہے؛ اس لئے ''ذکِش'' لفظ کے اصل معنی ہی تھے ''مشرق''۔ سنسکرت میں ''دکشن'' (ذکِش) کا مادہ ہے ''دکش''، جس کے معنی ہیں ''اُبھرنا''۔ ساری دنیا میں سورج صرف قطب شمالی کی طرف ''ذکِش'' (جنوب) سے طلوع ہوتا ہے، تب تو کہا جائیگا کہ ''ذکِش'' لفظ اسی وقت کا بنا ہوا ہے، جس وقت قدیم آریہ لوگ شمال کی طرف رہتے تھے، اور جس طرف سے وہاں سورج کو طلوع ہوتے ہوئے انہوں نے دیکھا، سے ''ذکِش'' کہتے تھے۔ قطب شمالی میں سورج کمہار کے چکرے کی طرح چکر لگاتا ہوا اوپر کی طرف جاتا ہے، اس لئے ''اُتر'' کے معنی ہوئے ''بالائی حصہ'' (North)۔ قدیم لوگ پھر جب قطب شمالی کو خیرباد کہہ کر نیچے ذکِش (شمال: وسطی ایشیا، ایران، ہندستان) کی طرف آئے، اور وہاں سورج سیدھا مشرق کی طرف سے طلوع ہوتے ہوا دیکھا تو اس طرف کو کہنے لگے ''پورب'' یعنی ''اگلی طرف'' یا وہ طرف جہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے، اور اس کی ضد بنی ''پچھم'' یعنی ''پچھلی طرف'' یا وہ طرف جہاں سورج غروب ہوتا ہے۔ مشرق کی طرف منہ کر کے کھڑے ہونگے تو دائیں ہاتھ والا طرف ''ذکِش'' (جنوب) ہوگا، اور اسی سبب سے ''ذکِش'' کے معنی بعد میں ہوئے ''دایاں'' یا ''دائیں ہاتھ والا طرف''۔ کچھ لوگ بائیں ہاتھ سے کام کرتے ہیں، لیکن عام طور پر وہ کوئی کھانے پینے خواہ دوسرے کام دائیں ہاتھ سے کرتے ہیں، اور بڑی مستعدی سے کرتے ہیں۔ لگتا ہے کہ اسی سبب سے ''ذکِش'' کے معنی ''مستعد'' کے بھی ہوگئے۔ بولی سے یوں بھی سمجھ میں آتا ہے کہ میرو پربت چھوڑنے کے بعد بھی یورپی لوگوں کے آباء و اجداد ایشیا والے آریوں کے ساتھ کچھ عرصہ رابطے میں تھے، اور اس وقت ''ذکِش'' لفظ کے معنی ان کے ہاں عام ہوگئے تھے۔ یہ قیاس آرائی اس بات سے کی جارہی ہے کہ لاطینی زبان اور انگریزی زبان میں ''ڈیکسٹر'' (Dexter) کے معنی ہیں ''دایاں یا دائیں ہاتھ والا'' اور ''ڈیکسرٹی'' (Dexerity) کے بھی معنی ہیں ''دایاں یا دائیں ہاتھ والا'' اور ''ڈیکسرٹی''

(Dexerity) کے بھی ایک معنی ہیں ''دایاں پن'' (Right handedness) اور دوسرے معنی ہیں ''مستعدی''۔ ان الفاظ کے شروع میں جو ''ڈیکس'' (Dex) ہے، یہ وہی سنسکرت لفظ ''ڈکش'' ہے، اور اس کے یہ دونوں معنی ہیں۔

''ڈکش'' لفظ کے اصل معنی تھے ''مشرق'، اس بات کا عام طور پر بہت سارے لوگوں کو پتہ نہیں تھا۔ لوکمانیہ تلک نے اپنی کتاب ''آرکٹک ہوم'' میں درج کیا کہ قدیم لوگ اصل میں میرو پربت کی طرف رہتے تھے، جو قطب شمالی کی طرف تھا اور وہاں سورج جنوب کی طرف سے طلوع ہوتا ہے۔ اس بات پر اگست اور اکتوبر ۱۹۱۲ع والے شماری ''ماڈرن رویو'' مخزن میں مضموں شایع ہوئے، جن میں سے تھوڑا سا ٹکڑا قارئین کی معلومات کے لئے ذیل میں جوں کا توں درج کیا جاتا ہے۔[1] مطلب یہ کہ زبان سے بھی یہی ثبوت ملتا ہے کہ چاروں اطراف کے نام، خصوصاً ''اُتر'' اور ''ڈکش'' الفاظ اسی ہی وقت کے بنے ہوئے ہیں، جب آریہ لوگ ''آرکٹک ریجن'' میں (قطب شمالی کی طرف) رہتے تھے۔ آرکٹک ریجن میں میرو پربت کس مقام پر تھا، اس سے متعلق ہندوؤں کے پرانوں میں جو کچھ لکھا ہے، وہ یہاں مختصراً پیش کیا جاتا ہے۔

میرو پربت کا تذکرہ: ہندوؤں کے پرانوں کے مطابق ''ساری دنیا سات دویپوں (جزائر یا براعظم) میں بٹی ہوئی ہے۔ ان دویپوں کے نام: جموں دویپ، پلکش دویپ، شالملی، کش، کرونچ، شاک اور پشکر ہیں۔ ہر ایک دویپ کے ارد گرد سمندر ہے، اور ان سات سمندروں کی وجہ سے یہ سات دویپ ایک دوسرے سے علحدہ علحدہ ہیں'' (وشنو پران)۔ مسٹر ہربلاس سردا نے اپنی تصنیف کردہ انگریزی کتاب ''ہندو سپیریرٹی'' کے صفحہ ۱۶۰ پر ان دویپوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: ۱- جموں دویپا - ایشیا ۲- پلکش - جنوبی آمریکا ۳- پشکر - شمالی آمریکا ۴- کرونچ - آفریکا ۵- شاک - یورپ ۶- شالملی - آسٹریلیا ۷- کش - اوشینیا۔

---

(1) "If we agree with the view of Mr. B.G. Tilak expressed in his "Orion," and place the ancient home of the Aryan rates in the circumpolar regions (which were habitable in 8000-1000 B.C.), the significance of the names of the cardinal points becomes easy of understanding. There, the sun would rise into view (at the beginning of each new yea) after a dawn lasting for several days. The orb would not be seen to rise in east, but a little to the south i.e. South-West. The autumnal sun would set in the South-West, after which the long night would follow. Originally دکشن (ڈکش) must have signified the direction in which the sun rose (and set also), but in course of time when the four cardinal points were definitely defined, the south got the name دکشن (ڈکش) in remembrance of the fact that the sun moved from the front to the right in his circular motion along the horizon in the Arctic regions." Modern Review, August 1912.

سچی بات یہ ہے کہ پرانوں میں درج ان دویپوں کو اس دور میں پہچاننا ہی مشکل کام ہے، اور یہ بات خود مسٹر ہر بلاس سردا نے قبول کی ہے، اس لئے سمجھا یہ جائیگا کہ مذکورہ باتیں صرف قیاس آرائیاں ہیں۔ اسی طرح یہ قیاس آرائی بھی کی جا سکتی ہے کہ ایشیا، یورپ، آمریکا اور گرینسلنڈ کے شمالی حصے، جو آرکٹک سرکل یا پولر ریجن کی طرف ہیں، ان کے، یا وہاں کے جزائر کے، اصل نام یہی تھے۔ یہ تمام سنسکرت الفاظ ہیں، اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوئی ہے کہ یہ نام رکھے ہی آریا لوگوں نے تھے، اور انہیں دنیا کے جغرافیہ کی قدیم زمانے میں ہی معلومات تھی۔

پرانوں کے مطابق مذکورہ بالا سات دویپوں کا مرکز جموں دویپ تھا، جس کے بیچ میں ''میرو'' نامی ایک نہایت ہی اونچا پربت (پہاڑ) تھا، اور اسے ''مہا میرو'' بھی کہا جاتا تھا۔ اس سے متعلق یوں بھی کہا گیا ہے کہ ''میرو پربت سارا سونا ہے اور اسے کے پہلو ہیروں اور جواہر کے ہیں۔ اس کی تجلی ایسی ہوتی ہے، کہ رات بھی دن کی طرح روشن لگتی ہے'' (وشنو پران)۔

یورپی علماء پہلے یوں سمجھتے تھے کہ یہ ایک خیالی پربت کا تذکرہ ہے، لیکن اب وہ بھی مان رہے ہیں کہ پرانوں میں تاریخی حقائق درج ہیں۔ (1)

لوکمانیہ تلک کے خیال موجب وہ ''ائرورابوریلس'' کی تجلی کا ذکر ہے جو قطب شمالی کی طرف دیکھنے میں آتا ہے، (2) لیکن ڈاکٹر اناش چندرداس کا کہنا ہے کہ یہ تجلی قطب شمالی کی طرف فقط تھوڑی دیر کے لئے دیکھنے میں آتی ہے اور لگاتار نہیں ہوتی۔ (3) اس صورت حال میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ میرو پربت میں واقعی سونا اور ہیروں اور جواہر کی کانیں تھیں، یا وہاں کوئی تجلی ہوا کرتی تھی جس سے اندھیرا روشنی میں تبدیل ہو جاتا تھا، ممکن ہے کہ یہ ''سورج پتھر'' کی طرف اشارہ ہو۔

آگرہ کے قلعے میں مصنف نے ایک خانہ دیوار میں بنا ہوا دیکھا، جس کا منہ ڈاک خانہ کے ڈبے کی طرح کا سا تھا۔ ڈاک کے ڈبے میں خطوط وغیرہ ڈالے جاتے ہیں تو تلے میں جا کر گرتے ہیں، اور باہر سے دیکھنے میں نہیں آتے؛ لیکن آگرہ کے قلعے کے اس خانہ میں اندر دیکھا جاتا ہے تو تلے میں جو مٹی یا دھول پڑی ہوتی ہے، وہ بھی صاف صاف نظر آتی ہے، اور خانے کا

(1) "These uniquely precious historical documents (the Puranas) extending to many hundreds of pages of manuscripts, have been down through to centuries neglected, and wholly appreciated as to their historical significance," Dr. L. A. Waddell: The Makers of Civilization in Race and History, preface VIII.

(2) The reference to the lustre of the mountain is specially interesting, in as much as in all probability, it is a description of the splendour of the Aurora Borealis visible at the North Pole." B.G. Tilak: The Arctic Home in the Vedas, pp. 69-70.

(3) Dr. A. C. Da: Rag Vedic India, P. 395.

تلا خواہ اس کے اطراف بھی منعکس ہو رہے تھے! اس خانے میں اندر کی طرف سے ''سورج پتھر'' لگا ہوا ہے، جس کی روشنی کی وجہ سے خانہ میں اندر اندھیرا نہیں ہوتا۔ سورج پتھر کے محض اتنے سے ٹکڑے میں سے اتنی روشنی ہوتی ہے تو سارا میرو پربت یا اس کا بڑا حصہ اگر سورج پتھر کا تھا تو وہ کتنی روشنی کرتا ہوگا، اس بات کا تصور ہر کوئی کر سکتا ہے۔ پرانوں کے رچنے والوں نے اسی سبب سے ''میرو پربت'' کو ''سمیر پربت'' یعنی خوبصورت کہا ہے اور اس کی اس تجلی کا تذکرہ کیا ہے۔

وشنو پران میں لکھا ہے کہ ''جموں دویپ کے بیچ میں میرو پربت کی چوٹی پر، ایک شہر آباد ہے، جو زمین پر ایک بہشت ہے اور وہ برہما کا لوک (رہنے کی جگہ، دنیا) ہے۔ جموں دویپ خود نو ورشوں میں تقسیم شدہ ہے، جن میں سے ایک بھارت ورش ہے، جو کوہ ہمالیہ کی جنوب میں ہے اور خود کوہ ہمالیہ میرو پربت کی جنوب میں ہے۔ جموں دویپ کی دوسری حدود پر بھی جبل ہیں۔ (1)

یہ جغرافیہ کی باتیں، جو وشنو پران میں درج ہیں، اور دیگر پرانوں خواہ مہا بھارت میں بھی ان کا تذکرہ موجود ہے، ان کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ سارے ہندستان کے ہندو آج تک یوں کہتے رہتے ہیں کہ ان کے دیوتا شمال کی طرف ہیں۔ ہندستان کی شمال میں کوہ ہمالیہ ہے؛ اور پرانوں کے مطابق ہمالیہ جبل خود جموں دویپ کی جنوب میں ہے۔ یوں پرانوں سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ میرو پربت، جو جموں دویپ کے درمیان میں تھا، وہ کوہ ہمالیہ کی اُس طرف والے ممالک (Trans-Himalayan Regions) کی طرف تھا، جس میں ہندوکش والا علاقہ بھی شامل ہے۔

پارسیوں کی کتاب ''زنداوستا'' کے مطابق خدا نے جو سب سے پہلے ملک خلق کیا وہ ''ائرین ویجو'' (Airyana Vaejo) تھا، جس کے لفظی معنی ہیں وہ جگہ جہاں آریوں (ایران والے آریہ) کا بیج (اصل نسل) پیدا ہوا، اور اسے بہشت کہا گیا۔ پروفیسر سپیگل جس نے ''زنداوستا'' کا ترجمہ کیا ہے، اس کے خیال موجب وہ ملک ایران کے بالائی علاقہ کے بلکل مشرق میں تھا۔ جہاں سے آکسس (آموٗ دریاء) اور جکسارٹس ندیاں نکلتی ہیں۔(2) لیکن دوسرے علماء اس کی اس راءِ سے اتفاق نہیں کرتے۔ اس کی یہ وجہ ہے کہ پارسیوں کے ویندیداد کے فرگرد (ادھیاء) اول میں ایرانیوں کے بہشت (''ائرین ویجو'') سے متعلق کہا گیا ہے کہ وہاں دس مہینے موسم سرما ہوتی ہے اور باقی دو مہینے موسم گرما۔ موسم گرما میں بھی ٹھنڈ اتنی پڑتی ہے، جو پانی

(1) Vishnu puran, Wilson's Translation, vol. II, PP. 101-118.
(2) Special places Aisyana Vaejo "in the farthest east of the Iranian palteau in the region where the Oxus and Jaxartes take their rise."

بھی یخ ہو جاتا ہے، زمین ٹھنڈی ہو جاتی ہے، درخت ٹھنڈے ہو جاتے ہیں اور پھر چاروں طرف برف گرتی ہے تو بڑی بھیانک مصیبت کھڑی ہو جاتی ہے۔(1)

جکسارٹس اور آکسس ندیاں جہاں سے نکلتی ہیں وہاں اتنی ٹھنڈ ہوتی نہیں، اس لئے ڈاکٹر مارٹن ہاگ اور دیگر علماء کی رائے ہے کہ قدیم آریہ لوگ اس سے بھی دور شمال کی طرف رہتے تھے۔ لوکمانیہ تلک اگرچہ میرو پربت سے متعلق کچھ نہیں بتا سکا کہ وہ کس جگہ تھا؛ تاہم، اس نے اتنا کہا ہے کہ قدیم آریہ لوگ رشیا یا اسکنڈینیویا شمال کی طرف نہیں، بلکہ سئبیریا کی شمال میں تھے۔(2) مطلب یہ کہ لوکمانیہ تلک اور کئی یورپی علماء اس قدر متفق رائے ہیں کہ قدیم آریوں کا اصلی وطن آرکٹک سرکل یا پولر ریجن میں تھا؛ باقی صرف یہ فرق ہے کہ پروفیسر پینکا اور ڈاکٹر واڈل جیسے لوگ کہہ رہے ہیں کہ یورپ کا شمالی علاقہ جو قطب شمالی کی طرف ہے، وہ آریوں کا اصلی وطن تھا، وہاں سے پچھم کی تہذیب پورب کی طرف پھیلی۔ لوکمانیہ کی رائے کے مطابق برِ اعظم ایشیا کا شمالی علاقہ (سئبیریا کا بالائی علاقہ)، جو قطب شمالی کی طرف ہے، وہ آریوں کا اصلی وطن تھا۔ دونوں میں سے کس کی رائے زیادہ وزندار ہے، اس لئے یہ بات ذہن نشیں رہے کہ ایسا کوئی بھی ثبوت ابھی تک نہیں ملا، جس سے یہ سمجھا جائے کہ یورپ کی تہذیب کا پھیلاؤ پورب تک ہوا۔ اس کے برعکس یوں ثابت ہوا ہے کہ یورپ کی تہذیب کی بنیاد ایشیا والوں نے رکھی اور بعد میں بھی یورپ کے لوگ ایشیا، خصوصاً ہندستان میں سے بہت کچھ سیکھتے رہے۔(3)

اس سلسلے میں ایک بات ذہن میں رہے کہ ہر کسی ملک کی تہذیب اول زبان سے شروع ہوتی ہے۔ یورپ کو زبان کہاں سے ملی؟ اگر سنسکرت یورپی زبانوں کی ماں نہیں، تو بڑی بہن تو بلاشبہ ہے ہی، اور سنسکرت ہندستان کی زبان ہے، اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ یورپ کو زبان پوربی بنیاد والی ملی ہے۔ خود انگریزی رسم الخط بھی دیوناگری حروف پر سے بنی ہوئی ہے، یہ بات سر مونیئر ولیمس اپنی تصنیف کردہ سنسکرت ڈکشنری کے دیباچہ میں درج کی ہے۔ قدیم دیوناگری حروف

(1) Dr. Martin Haug: Essays on the Sacred Language. Writings and Religion of the Parsis, p. 292.

(2) "But considering the fact that the traditions of the original Polar home are better preserved in the sacred books of the Brahmans and Parsis, it is not unlikely that the primaeval home was located to the north of Siberia rather than to the north of Russia and Scandinavia," Sjt. B.G. Tilak: The Arctic Home in the Vedas. p. 418.

(3) "If the evidences of Saxon colonization in this island (Great Britain) are strong both from language, and political institutions, the evidences are still more decisive in the parallel case of an Indian colonization of Greece-- not only her language but her philosophy, her religion, her rivers, her mountains and her tribes, her subtle turn of intellect, her political institutes, and above all, the mysteries of that noble land, irresistably prove her colonization from India," Pococke: India in Greece.

موجودہ حروف سے بہت مختلف تھے، اور وہ تبدیل ہو کر کس طرح موجودہ انگریزی رسم الخط کی صورت اختیار کی، یہ بات بھی اس نے حروف کی تصاویر فراہم کر کے واضح کی ہے۔ یہ بات بھی عالم آشکار ہے کہ مغرب (یورپ) میں کوئی بھی اوتار پیدا ہی نہیں ہوا۔ حضرت عیسیٰ، حضرت موسیٰ، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، زردشت (زورسٹر)، سری رامچندر، سری کرشن، کانفیوشس اور دیگر اوتار اور پیغمبر سب کے سب پورب میں گذر چکے ہیں۔ یورپی لوگوں کو بائبل یا انجیل بھی ایشیا سے ملے، اور مذہب بھی ایشیا سے ملا۔ سر مونیئر ولیمس یہ باتیں درج کر کے یوں بھی کہا ہے کہ ہندسوں کے نام اور اعشاری نظام بھی انہوں نے ہندستان سے سیکھا۔ (1)

پاٹ صاحب کا کہنا ہے کہ جیسا کہ سورج طلوع ہی مشرق میں ہوتا ہے، اسی طرح تہذیب کا سورج بھی اول پورب (ایشیا) میں طلوع ہوا، جس سے بعد میں پچھم یعنی مغرب (یورپ) کو روشنی ملی؛ بلکہ ساری انسانذات نے پورب سے ہی سیکھا۔ (2)

سنہ ۱۸۸۲ع میں پروفیسر میکس ملر نے اعلانیہ مان لیا کہ ہم یورپی لوگ پورب سے آئے ہیں، اور وہ سب کچھ، جو ہم قیمتی سمجھتے ہیں، سو ہم نے پورب سے سیکھا ہے۔ (3)

گرم صاحب، جس نے علم لغات کے اصول یا ترتیب قائم کیے تھے، جس وجہ سے وہ آج تک اس کے نام پیچھے ''گرم کے قوائد'' (Grimm's Laws) کہے جاتے ہیں، اس کا بھی یہی کہنا تھا کہ یورپ کی تمام قومیں اصل میں آئی ہی ایشیا سے ہیں''۔ (4)

لوکمانیہ تلک سے پہلے جرمنی کے عالم پروفیسر پینکا نے اظہار کیا تھا کہ قدیم آریہ لوگ اصل میں شمال کی طرف رہتے تھے اور ان کا اصل وطن یورپ کے قطب شمالی کی طرف اسکینڈ ینیویا کی طرف تھا۔ اب معلوم ہوا ہے کہ اسکینڈ ینیویا کے باشندے قدیم ہندو کھتریوں کی اولاد ہیں۔ خود ''اسکینڈ ینیویا'' (Scandinavia) لفظ اصل میں سنسکرت لفظ ''سکندھ نابھی'' (سکندھ ناوی)

(1) "Europe has learnt to perceive that in imparting some of the benefits of her modern civilization to Eastern races, she is only making a just return for the lessons imparted to her by Asiatic wisdom in past ages. For did she not receive her Bible and her religion from an Eastern people? Did not her system of counting by twelves and sixties come to her from Babylonia, and heer invaluable numerical symbols and decimal notation from India through the Arabs? Did not even her languages have their origin in a Common Eastren parent Sir Moniar William's Sanskrit-English Dictionary, Preface PP. XXII--XXIII.

(2) "The path of the sun must be the path of culture. In Asia, Pott declares, or nowhere was the school--house where the families of mankind were trained." Quoted by Dr A. C. Das: Reg Vedic India, P. 357.

(3) "We all come from the East--all that we value most has come to us from the East," Prof. Max Muller: What can India teach us? pp. 31--32.

(4) "All the nations of Europe migrated anciently from Asia," Jacob Grimm.

ہے، اور اس کے معنی ہیں ''اہم یا جنگی سردار'' (Scand Chiefs or Warrior Chiefs)۔[1] سکنڈینیویا کے قدیم لوگوں کی مذہبی کتب ''اید'' (Edda) کہی جاتی ہیں۔ یہ ''اید'' اصل میں ہے سنسکرت لفظ ''وید'' اور وید ہندوؤں کی مذہبی کتب ہیں۔[2]

سئبر یا اور فنلنڈ میں اس وقت جو ''سموئیڈس'' (Samoyedes) ہیں، وہ اصل میں ''سمایدو'' ہیں، یعنی وہ سما راجپوت ہیں، جو اصل ''یادو ونی'' (جادو ونی) نسل سے تھے، جن سے سری کرشن پیدا ہوا تھا۔ سندھ میں سومروں کے بعد جن سما حاکموں نے راج کیا، وہ بھی سما راجپوت تھے، اور اسی ہی جادو ونی نسل سے تھے۔ سئبیر یا اور فنلنڈ مین ''شوڈ'' (Tchoudes) بھی ہیں، اور وہ بھی ''جوڈ'' یعنی راجا یدو (جدو) کی اولاد ہیں، اس لئے وہ بھی جادو ونی نسل سے ہیں''۔ ان دونوں قوموں کی زبانوں کی بھی ایک دوسرے سے بڑی نسبت ہے۔ یہ حقائق کرنل ٹاڈ اپنی تصنیف کردہ کتاب ''راجستان کا احوال'' میں درج کی ہیں۔[3] ان حقائق سے یوں لگتا ہے کہ لوکمانیہ تلک کا یہ خیال صحیح تھا کہ قدیم آریوں کا اصل وطن (میرو پربت کا علاقہ) سئبیر یا کی شمال کی طرف آرکٹک ریجن میں تھا، جہاں سے کچھ آریہ لوگ یورپ کی شمال میں فنلنڈ اور اسکنڈینیو کی طرف پھیل گئے۔ وہ حصہ ہندو کھتریوں نے آباد کیا، اور برہمنوں نے جرمنی کا علاقہ آباد کیا، جس وجہ سے وہ ''جرمن'' یونی ''شرمن'' (شرما) بلائے جانے لگے۔ ہوسکتا ہے کہ براہمن اور کھتری بعد میں ان علاقوں کی طرف گئے ہوں، لیکن پرانوں سے اتنا ظاہر ہے کہ قدیم زمانے میں ہی ہندستان کے لوگوں اور میرو پربت کی طرف کے باشندوں کے ایک دوسرے سے روابط تھے، یہی وجہ تھی کہ وشوامتر میرو پربت سے آیا تھا، اور اتہاس (تاریخ) والے زمانے میں پانڈون کا بھائی ارجن میرو پربت کی طرف گیا تھا۔

قطب شمالی کی طرف ہندوؤں کی حکومت: آریوں کی تہذیب کی شروعات سے متعلق کئی اشارے رگ وید سے ملتے ہیں؛ لیکن پرانوں میں ایسی کوئی بھی بات نہیں ہے، جس

(1) The Scandinavians are the descendants of Hindu Kshatriyas. The term Scandinavian and the Hindu "Kshatria" or the warrior caste, are identical, 'the former being a Sanskrit equivalent for the latter.' "Scanda Nabhi" (Scanda Navi) signifies Scanda Chiefs (Warrior Chiefs). Har Bilas Sarda: Hindu Superiority, p. 134.

(2) We can scarcely question derivation of the Edda (the religious books of Ancient Scandinavia) from the Vedas." Count Bjornst Jerna: Theogony of the Hindus, p. 108.

(3) "The Samoyedes and Tchoudes of Siberia and Finland are really Samayadus and Joudes of India. The languages of the two former races are said to have a strong affinity and are classed as Hindu--Germanic by Klaproth, the author of "Asia Polyglotta," Tod's Rajasthana: Vol. I. p. 68.

سے یہ سمجھ میں آئے کہ ان کی تہذیب کی شروعات تب ہوئی تھی، جب وہ میرو پربت پر رہتے تھے۔ قدیم آریوں کے وہ احوال جو پرانوں میں درج ہیں، ان سے ظاہر ہے کہ جس وقت وہ میرو (سمیر) پربت پر رہتے تھے، اسی وقت ہی وہ نہایت کھلے ذہن کے لوگ تھے۔ اور اتنے زورآور تھے، کہ وہاں انہوں نے اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ ان کی بادشاہت کے حدود سے یوں لگتا ہے کہ اس وقت بھی وہ سلطنت شاہی (Imperialism) کے دلدادہ تھے۔ اور دوسروں کو اپنے تابع کر کے خود دوسروں کے اوپر حاکم بن کر بیٹھ گئے تھے۔

اوپر پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ پرانوں کے مطابق پوری دنیا سات دویپوں (جزائر یا برِ اعظم) میں بٹی ہوئی ہے اور ان کا مرکز جموں دویپ ہے، جن کے درمیان میں میرو پربت تھا۔ اس جموں دویپ سے متعلق پرانوں سے یہ حقیقت ملتی ہے کہ کسی قدیم زمانے میں وہاں راجا پریہ ورت راج کرتا تھا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے راجا اگنی دھر نے جموں دویپ کو نو ورشنوں (حصوں) میں تقسیم کر کے، وہ حصے اپنے نو بیٹوں کو دے دیے۔ اسی طرح اس کے ہر ایک بیٹے کو ایک حصہ ملا، جن میں سے ایک بھارت ورش (ہندستان) تھا، جو ہمالیہ جبل کی جنوب میں ہے، اور سب سے جنوبی ورش یہی ہے۔ ''بھارت ورش، اُتر کرو، بھدراشو اور کیتومال -- یہ چاروں ورش (حصے) سلسلۂ کوہ کے باہر کی طرف ہیں'' (وشنو پران)۔ (1)

یہ حقائق جو وشنو پران سے دی گئی ہیں، خالصتاً تاریخ اور جغرافیہ کی باتیں ہیں۔ ان میں نہ کوئی تمثیل رکھی ہوئی ہے، نہ ہی اس میں کسی دیومالائی قصے کی آمیزش ہے۔ ان حقائق پر تھوڑی سی توجہ دینے سے مندرجہ ذیل باتیں آشکار ہونے لگتی ہیں:

۱- پرانوں کے مطابق تمام قدیم راجاؤں کی اصل نسل منو بھگوان سے جا کر ملتی ہے، جس سے متعلق کہا گیا ہے کہ اسے نو بیٹے تھے۔ تاریخ کی رُو سے ان نو بیٹوں میں سے ایک اہم بیٹا راجا پریہ ورت تھا، جو پورے جموں دویپ کا حاکم تھا، اور بھارت ورش (ہندستان) بھی اسی کے زیرِ حکومت تھا۔

رگ وید میں کئی مقامات پر آریوں اور غیر آریوں کے بیچ جنگوں کا تذکرہ ہے۔ یہ جنگوں کا احوال شاید اُسی قدیم زمانے کا ہے، جس زمانے میں راجا پریہ ورت بھارت ورش (ہندستان) اپنے قبضے میں کرنا چاہتا تھا؛ لیکن غیر آریہ لوگ اسے اپنا ملک آسانی سے ہتھیانے نہیں دے رہے تھے۔ آریوں کا ہندستان میں پہلی مرتبہ آنا ان جنگوں کے وقت ہوا تھا۔

(1) Wilson's Translation of the Vishnu Puran, Vol. II, PP. 101, 110, 114, 116--123.

۲- راجا پریہ ورت کے بعد اس کا بیٹا راجا اگنی دھر سارے جموں دویپ کو نو ورشنوں میں تقسیم کر کے، ہر ایک ورش اپنے بیٹے کو دیا، تو اس کے بیٹوں کے ساتھ لازماً دوسرے بھی آریہ لوگ میرو پربت یا جموں دویپ کے کسی اور حصے سے بھارت ورش میں آئے ہونگے، وہ تن تنہا تو نہیں آیا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آریوں کا ایک اور بڑا گروہ راجا اگنی دھر کے بیٹے کے وقت میں ہندستان میں آیا تھا۔

۳- منو بھگوان کا دوسرا اہم بیٹا راجا اکشواکو تھا، جس متعلق اتہاسوں اور پرانوں میں درج ہے کہ اس نے ایودھیا (موجودہ اوَدھ) میں آ کر راج کیا، اور سورجونسی گھرانے کی بنیاد رکھی، جس سے بعد میں سری رامچند ر پیدا ہوا۔

جیسا کہ سارا بھارت ورش پہلے ہی راجا پریہ ورت اور اس کے بعد اس کے بیٹے راجا اگنی دھر کے تابع تھا، تو اس کا مطلب ہوا کہ ان آریوں نے راجا اکشواکو کو ایودھیا میں آسانی سے پاؤں جمانے نہیں دیا ہوگا۔ رگ وید میں نہ صرف آریوں اور غیر آریوں کے بیچ، لیکن ایک آریہ لوگوں کی دوسرے آریہ لوگوں سے بھی جنگوں کا تذکرہ ہے۔ اس سے یہ قیاس آرائی کی جاسکتی ہے کہ آریوں کا یہ تیسرا گروہ راجا اکشواکو کے وقت میں ہندستان میں آیا تھا، اور اس وقت بھی شاید جنگیں لگی تھیں۔

۴- منو بھگوان کے تیسرے اہم بیٹے کا نام "اِلا" (Illa) تھا، جس سے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ بعد میں مرد سے تبدیل ہو کر عورت بنا تھا۔ اِلا کا معروف بیٹا راجا پرورس تھا، جس نے پرتیستھان (موجودہ اللہ آباد) میں آ کر راج کیا، اور چندرونسی گھرانے کی بنیاد رکھی۔ اِسی گھرانے والے "اِلا" کی اولاد تھے، اس لئے "اَئل" (اِلا کی اولاد) کہے جاتے تھے۔ یہی "اَئل" آریہ لوگ تھے، جنہوں نے وادئ سندھ کو آ کر آباد کیا۔ یہ "اَئل" کہاں سے آئے؟ پرانوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نہ اصل ہندستان کے باشندے تھے، اور نہ ہی وسطی ایشیا میں سکونت رکھتے تھے؛ لیکن ان کے گھرانے کی بنیاد ڈالنے والا راجا پرورس میرو پربت سے کوہ ہمالیہ والے دُروں سے گذر کر ہندستان میں آیا تھا۔ مسٹر پارجیٹر کلکتہ ہائی کورٹ کے جج نے، ہندوں کے پرانوں سے جو تاریخی احوال نکالے ہیں، ان میں اسی طرح ہی اس نے درج کیا ہے۔ (1)

حاصل مطلب یہ کہ اس بات میں کوئی شک شبہ ہے ہی نہیں کہ تمام قدیم آریہ لوگ نہیں، تو بھی ان میں سے اکثریت ان کی تھی جو قطب شمالی کی طرف رہتے تھے، جہاں کی سخت

(1) "What does tradition say about the origin of the 'Ailas' or Aryans? It makes the Aila power begin at Allahabad, and yet distinctly suggests that they came from outside India. The legends and fables about the progenitor pruravas Aila all connect him with the middle Himalayan region." F.E. Pargiter: Ancient Indian Historical Tradition. p. 297.

سردی کا ذکر ہندوؤں، پارسیوں اور کیلٹک قوموں کی مذہبی کتب اور کہانیوں سے ملتا ہے۔ ہماری سندھی زبان سے بھی یہی ثبوت ملتا ہے کہ ''اُتر'' اور ''ڈکڻ'' الفاظ اسی ہی وقت کے بنے ہوئے ہیں، جس وقت آریہ لوگ قطب شمالی کی طرف میرو پربت پر رہتے تھے (صفحہ ۹۲ سے ۹۶)۔ ''سنسکرت'' اور ''دیوناگری'' الفاظ سے متعلق قابلِ غور باتیں، جو اس کتاب میں دوسرے مقامات پر درج کی گئی ہیں، ان میں سے بھی قارئین سمجھ سکیں گے کہ سنسکرت زبان اصل میں قطب شمالی کی طرف بولی جاتی تھی، اور دیوناگری رسم الخط جو پہلے ''براہمی'' رسم الخط کہلاتا تھا، وہ اصل میں بنا ہی میرو پربت پر تھا۔ اتنا ضرور کہینگے کہ ممکن ہے کہ قطب شمالی سے لے کر قطب جنوبی تک، کوہ ہمالیہ کے نشیبی علاقوں، بلکہ موجودہ ہندستان کی حدود تک، کئی آریہ لوگ پھیلے ہوئے تھے، اور وہ سارا ملک (علاقہ) پرانوں کے مطابق ''جموں دویپ'' کہلاتا تھا۔ اتنی ساری بڑی اراضی میں زبان کا ضرور کچھ نہ کچھ فرق تو ہوگا۔ رگ وید میں درج ہے کہ قدیم آریوں کی زبان بلکہ مذہبی طور طریقوں اور رسم و رواج میں فرق تھا۔ ان سب باتوں کو شمار میں لاتے ہوئے یہ سمجھا جائیگا کہ ڈاکٹر ابناش چندرداس جیسے لوگ، جو کہہ رہے ہیں کہ آریہ اصل میں ''سپت سندھو'' (وادئ سندھ کے سات دریاؤں کے کناروں) پر بسنے والے، یا جو کہہ رہے ہیں کہ قدیم آریا لوگ اصل میں تھبیٹ یا کشمیر کے رہنے والے تھے۔ ان کی یہ بات سراسر غلط قرار نہیں دی جاسکتی۔ قدیم آریوں سے کچھ جموں دویپ میں ان حدود تک پھیلے ہوئے تھے، تو یہ کونسی عجیب بات ہے؛ لیکن ان کا ''اصل وطن'' (Original Home) جسے کہا جائے، وہ جموں دویپ کا قطب شمالی والا علاقہ تھا، جہاں سے علحدہ علحدہ اوقات میں جتھوں کی صورت میں ہندستان میں آئے تھے۔

زبانوں کی تحقیقات سے بھی یورپی علماء کو یوں سمجھ میں آیا ہے کہ تمام آریہ لوگ اکٹھے نہیں آئے تھے، لیکن علحدہ علحدہ وقتوں پر جتھوں کی صورت میں آئے تھے، جس وجہ سے ان کی زبانوں میں فرق تھا۔ یہ حقیقت جیمس صاحب اپنی تصنیف کردہ ملکی آریہ زبانوں کی گرامر کی پہلی جلد میں، اور سر گریئرسن اپنی تصنیف کردہ کتاب ''لنگوسٹک سروے آف انڈیا'' کی پہلی جلد میں درج کی ہے۔

آریوں کے علحدہ ہونے کی وجہ: قدیم ہندوؤں، ایرانیوں، یونانیوں وغیرہ کے آباء و اجداد میرو پربت کی طرف ایک ساتھ یا ایک دوسرے کے نزدیک رہتے تھے، تو پھر ایک دوسرے سے علحدہ کیوں ہوئے، یہ بات کسی بھی کتاب میں درج نہیں ہے۔ عیسائیوں اور مسلمانوں کی کتابوں میں صرف اتنا لکھا ہوا ہے کہ کسی قدیم زمانے میں طوفان لگے تھے اور سیلاب ہوئے تھے، اور بعد میں حضرت نوحؑ نے دوبارہ دنیا کو آباد کیا تھا۔ یہ اوگاہ یا بڑے سیلاب والی بات مہا

بھارت اور پرانوں میں، خواہ یجر وید کی آخر میں جو شتپتھ براہمن گرنتھ ہے، اُسی میں لکھی ہوئی ہے، اور یوں کہا گیا ہے کہ ''منو بھگوان نے دنیا کو دوبارہ آباد کیا تھا۔'' کئی علماء کی یہ رائے ہے کہ یہ بڑے سیلاب والی بات ایک دوسرے کی مذہبی پستکوں پر سے نقل کر کے نہیں لکھی گئی؛ لیکن تمام قوموں کو اسی بڑے سیلاب کا پتہ تھا۔ یہ الاھی آفت دنیا پر کب نازل ہوئی، اُس کا سن کسی بھی مذہبی کتاب میں درج نہیں ہے۔

رگ وید میں اس سیلاب کا ذرہ برابر بھی ذکر نہیں ہے؛ لیکن یجر وید کے آخر میں شامل شتپتھ براہمن گرنتھ میں خواہ مہا بھارت اور پرانوں میں موجود ہے۔ یہ اگرچہ رگ وید کے بعد کے لکھے ہوئے ہیں، تو بھی نہایت قدیم دینی کتب ہیں۔ جیالاجیکل محکمہ والوں کو تحقیقات کرنے سے معلوم ہوا ہے کہ تقریباً آٹھ دس ہزار برس ق۔م، برفانی تودوں والے دور (Glacial Period) میں نہایت ہی بہت برف گری تھی، جس کے پگھلنے کی وجہ سے نہایت ہی بڑا سیلاب ہوا تھا۔ ہندوؤں کے دھرمی پستکوں میں برف پگھلنے والی بات ہے ہی نہیں۔ ان میں یوں درج ہے کہ سمندر کی مہابھاری (Overflow) کی وجہ سے ایسا سیلاب آیا تھا۔ یہودیوں کی کتاب توریت جو بہت ہی بعد کی لکھی ہوئی ہے، اس میں پیدائش کی کتاب کے ساتویں باب کی ۱۱ اور ۱۲ آیات (Genesis 7:11,12) میں لکھا ہے کہ حضرت نوحؑ جب چھ سو برس کا تھا، تب چالیس راتیں اور چالیس دن بے روک برسات پڑی تھی، جس وجہ سے سیلاب ہوا تھا۔ بئبلونیا اور مصر ملک کی اتہاسوں کے مطابق بھی برسات کی وجہ سے سیلاب ہوا تھا اور وہ برسات صرف تین دن جاری رہی تھی۔ ان اختلافات سے یوں سمجھنے میں آ رہا ہے کہ سیلاب ایک دفعہ نہیں لیکن بہت ہی دفعہ ہوا تھا، یہی وجہ ہے کہ مذہبی کتب میں سے کسی میں ایک طرح سے تو کسی میں دوسری طرح سے لکھا ہوا ہے۔ بہرحال یوں لگتا ہے کہ اسی قسم کی ایک نہ ایک سیلاب کی وجہ سے کئی قوموں کو اپنا اصل وطن چھوڑنا پڑا تھا اور لوگ دربدر ہوئے تھے۔ ممکن ہے کہ اسی الاھی آفت کے وقت قطب شمالی کی طرف رہنے والے آریہ لوگ بھی ایک دوسرے سے علحدہ ہوئے ہوں۔ ان میں سے کچھ یورپ، کچھ ایران اور کچھ ہندستان کی طرف چلے گئے اور علحدہ علحدہ مقامات پر اپنا وطن بنا کر بیٹھ گئے، تو ان مقامات پر ان کی اپنی زبان نے اپنے اپنے نمونے سے ترقی کی، یہ وجہ ہے کہ آج سنسکرت، ایرانی اور یورپی زبانیں اس وقت ایک دوسرے سے بہت علحدہ نظر آ رہی ہیں، ورنہ ان کی اصل بنیاد ایک ہی ہے۔

مہا بھارت کی شانتی پرو اور دوسرے مذہبی پستکوں سے حوالے دے کر، لوکمانیہ تلک نے لکھا ہے کہ اس بڑے سیلاب کے برپا ہونے کے وقت ہندوؤں کے وید اور اتہاس گم ہو گئے۔

پھر رشیوں کو جس قدر ویدوں اور اتہاسوں کے مضامین تپسیا کے زور پر یاد پڑے، اُسی قدر انہوں نے دوبارہ لکھے۔[1] پروفیسر رپٹسن، پروفیسر منکس ملر اور دیگر کئی یورپی علماء نے لکھا ہے کہ قدیم آریوں کا حافظہ حیرت انگیز تھا، اور آج بھی ہزارون ایسے پنڈت ہیں، جو اگر تمام وید اور اتہاس غائب ہو جائیں، تو وہ حرف بحرف انہیں دوبارہ لکھ سکتے ہیں۔[2] اس کے باوجود ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت وہ تمام قدیم منتر ہمارے پاس نہیں ہیں۔

پہلا عالم ڈاکٹر مارٹن ہاگ تھا، جس نے لکھا کہ رگ وید کے موجودہ منتروں سے بھی کچھ پہلے کے منتر تھے، جو ''نِوِدْ'' (Nivid) ''نِگَد'' (Nigada) کہلاتے تھے۔ یہ بات لوکمانیہ تلک، ڈاکٹر اناش چندرداس اور دوسرے ملکی علماء نے تسلیم کی ہے۔

خود رگ وید میں ''نِوِدْ'' لفظ کئی مقامات پر استعمال ہوا ہے، اور نوِدوں سے متعلق کہا گیا ہے کہ قدیم منتر یہی تھے (رگ وید منڈل پہلا، سوکت ۸۹ منتر ۳، اور منڈل دوسرا ۳۶، ۶)۔ رگ وید کے آخر میں جو اتر یہ براہمن گرنتھ ہے، اس میں بھی نوِدوں کا تذکرہ ملتا ہے (اتر ییہ براہمن کانڈ دوسرا، پرپاٹھک ۳۳۔۳۴)۔ یہ قدیم نوِد اور نگد آجکل گم ہیں، لیکن ان میں سے کچھ اب بھی یجر وید، براہمن گرنتھ اور سوترنوں میں موجود ہیں اور ان کی زبان رگ وید کی زبان سے بہت قدیم ہے۔[3] یہ نوِد اور نگد طوفانِ نوح کے وقت گم شدہ کہنے میں آتے ہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس وقت قطب شمالی والا علاقہ آباد تھا تب بھی ہندوؤں کے پاس وید تھے، جس وجہ سے ہندو یہ کہنے پر حق بجانب ہیں کہ وید انادی ہیں۔

آریوں کا پھیل جانا: جیالاجیکل محکمہ والون کے مطابق، آٹھ دس ہزار برس ق۔م قطب شمالی کی طرف بڑی مقدار میں برف گرنے کی وجہ سے بڑا سیلاب ہوا تھا۔ اُس قدیم زمانے کی کئی کتب اب موجود نہیں ہیں، اس لئے یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ میرو پربت (سئیریا کی شمال میں) والے

---

(1) "The great Rishis, empowered by Swayanbhu (the self-born), formerly obtained, through tapas (religious austerity) the Vedas and the itihasa, which had disappeared at the end of the (preceding) Yuga," Mahabharata, Shanti Parvan, Chapter 210, Vol. 19.

(2) "There are thousands of Brahmans even now, who know the whole of the Rig Veda by heart and can repeat it, and what applies to the Rig Vedas applies to many other books" Prof, Ma. Muller: What can India Teach Us? p. 81.

(3) "The Reg Vedic hymns are not the oldest, but there were still older Verses called Nivids and Nigadas: the proto-type of the Reg Vedic hymns, whose language was more archaic than that of the hymns themselves. Though most of the Nivids are now lost, having been either amplified or absorbed in the Reg Vedic hymns, even those that remain and are found in the Brahamanas and Sutras bear in them the unmistakable impress of vast antiquity," Dr. A.C. Das: Reg Vedic Culture, P. 42.

آریوں کے لئے جب وہاں رہنا ناممکن ہو گیا، تب کس کس طرف پھیل گئے۔ اس کے باوجود جو حقائق اس وقت تک معلوم ہو سکے ہیں، ان کے ذریعے اس بات پر بہت روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔

ہندوؤں کے پرانوں سے اتنا ظاہر ہے کہ کچھ آریا لوگ میرو پربت سے کوہ ہمالیہ کے دُروں سے گذر کر ہندستان میں آئے تھے۔[1] رگ وید سے معلوم ہوتا ہے کہ یدو (جادوَ ونسی) اور ترسو آریہ لوگ سمندر کے راستے آئے تھے (رگ وید منڈل چھٹا، سوکت ۲۰، رچنا ۱۲) یدو اور ترسو آریوں سے متعلق کئی یورپی علماء نے لکھا ہے کہ وہ بئبلونیا (بابل) سے آئے تھے۔ رگوزن نے اپنی تصنیف کردہ کتاب ''ویدک انڈیا'' میں لکھا ہے کہ ترسو آریوں میں سے کئی بئبلونیا کی طرف ہمیشہ کے لئے رہائش پذیر ہوئے، اور وہ بعد میں تورانی لوک کہے جانے لگے۔ پرانوں میں انہیں پلید شمار کیا گیا ہے۔ یدو اور ترسو آریہ لوک میرو پربت سے سیدھا بئبلونیا کی طرف گئے، یا ہندستان میں آنے کے بعد اُس طرف گئے، اس بات سے متعلق کوئی بھی ثبوت نہیں ہے۔

سنیریا کی شمال میں میرو پربت سے، یورپ کی طرف جانے کے کئے آسان راستہ اسکنڈینیویا سے ہے، اس لئے یوں لگتا ہے کہ کچھ آریہ لوک اس راستے سے، یورپ کے اطراف میں پھیل گئے؛ لیکن ان میں سے کچھ نیچے کی طرف، وسطی ایشیا اور مغربی ایشیا کی طرف میسوپوٹیمیا اور بئبلونیا کی طرف چلے گئے۔ یہ قیاس آرائی اس بات میں سے کی جا رہی ہے کہ سن ۱۹۰۵۔۱۹۰۶ع میں ایشیا مائنر کے کئپڈوشیا کی طرف بوگھزکئی سے، دوسری چیزوں کے ساتھ، نارس قوم سے متعلق ایک کتاب آرکیالاجیکل محکمہ والوں کو ہاتھ لگی تھی۔ اسکنڈینیویا کے قدیم باشندے ''نارس'' (Norse race) یعنی ''اترادھی'' یا شمال کی طرف کے باشندے کہلاتے تھے، کیونکہ اسکنڈینیا یورپ بلکل شمال میں مغرب کی طرف ہے۔ وہاں کے رہنے والوں کی کتاب اِدھر مغربی ایشیا کی طرف کئپڈوشیا سے ملی، اس سے یوں لگتا ہے کہ میرو پربت چھوڑنے کے بعد جو لوگ اسکنڈینیویا کی طرف گئے ان میں سے بعض آریوں کے ساتھ کئپڈوشیا کو بھی آئے اور وہ کتاب انہوں نے لائی تھی۔ اُس طرف وادیٔ سندھ کے آریہ لوگ بعد میں بھی جاتے رہے، جس بات کا تذکرہ ''تجارت'' کے احوال میں دیا جائیگا۔ یہاں صرف اتنا درج کیا جاتا ہے کہ وادیٔ سندھ کے کچھ تاجر لوگ (بیوپاری) مغربی ایشیا میں بیٹھکیں بنا کر رہائش پذیر ہوئے تھے، اور بعد میں سیمیٹک قوموں کے ساتھ رشتیداری کرنے کے بعد ''فنیشن'' (Phoenicions) کہلانے لگے۔ یہ فنیشن لوگ اسکنڈینیویا کی طرف بھی تجارت کے لئے جاتے تھے، اور انہوں نے یہ کتاب مغربی ایشیا سے لائی تھی، تو بھی عجیب بات نہیں۔

(1) F.E. Pargiter: Ancient Indian Historical Tradition, P. 297.

گذشتہ انیسویں صدی میں آرکیالاجیکل محکمہ والوں نے ایران کی مغرب میں ''میدیا'' سے آریوں کی بیٹھکوں کے آثار دریافت کیے، اور یہ بھی ان کو معلوم ہوا کہ آریوں کی بیٹھکیں میدیا سے لے کر میسوپوٹیمیا اور بئبلونیا تک تھیں، اور شمالی آفریقا والوں کے ساتھ بھی ان کی رشتیداری تھی، مطلب یہ کہ آریہ لوگ صرف ہندستان میں نہیں تھے، بلکہ کافی پھیلے ہوئے تھے۔ جو آریہ لوگ بعد میں ہمیشہ کے لئے ایران میں رہائش پذیر ہوئے، ان میں سے کچھ لوگ کافی وقت آرمینیا اور میدیا میں رہے تھے، اور بعض نے اپنی بیٹھکیں ترکستان کی طرف بھی قائم کی تھیں، جیسا کہ لئسن صاحب نے کہا ہے۔ (1)

زبانوں کی تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ وسطی ایشیا سے آرمینیا سے جیسے جیسے یورپ کی طرف جایا جاتا ہے، ویسے ویسے اسی راستے پر جو زبانیں اس وقت رائج ہیں، ان کی نسبت یورپی زبانوں سے زیادہ اور ایرانی زبانوں اور سنسکرت سے کم ہے۔ پھر جیسے آرمینیا سے ایران اور ہندستان کی طرف جایا جائے، تو اسی راستے پر جو زبانیں رائج ہیں، ان کی نسبت ایرانی زبانوں اور سنسکرت سے زیادہ، اور یورپی زبانوں سے کم ہے، یوں گویا اُس طرف کی زبانیں یہ پتہ دیتی ہیں کہ کچھ عرصہ کئی آریوں کی تہذیب کا مرکز آرمینیا والا طرف تھا، جہاں سے کچھ آریہ لوگ یورپ کی طرف تو دوسرے ایران اور ہندستان کی طرف آئے۔ آرمینیا کی طرف کانیں ہیں، اس لئے قیاس آرائی کی گئی کہ شاید دھاتوں سے برتن اور ہتھیار بنانے کا فن آریہ لوگوں نے وہیں سیکھا۔ وہاں کافی عرصہ اکٹھے رہنے کے بعد کئی آریہ لوگ بختر اور ایران کے اطراف میں پھیل گئے۔ اس سے متعلق ایک تحریری ثبوت بھی ہے، جو اچھا خاصا توجہ طلب ہے۔

سر ولیم جونس جس نے سنسکرت زبان کا ناتہ یورپی اور قدیم پارسی زبان سے لکھا ہے، اُسے ''دابستان'' نامی ایک کتاب کشمیر سے ہاتھ لگی تھی، جو بعد میں وہ اپنے ساتھ یورپ لے گیا تھا۔ اس میں بختر کے بادشاہوں کا نسل درنسل احوال درج ہے۔ ''دابستان'' موجب راجا مہابدرنس کی نسل سے پہلی شاخ والے، سکندر اعظم کے حملہ سے پانچ ہزار چھ سو برس پہلے بختر (باختر Bactria) میں راج کر رہے تھے۔ (2) سکندر اعظم ۳۱۵ برس ق۔م ہندستان پر حملہ آور ہوا تھا، تب تو کہا جا سکتا ہے کہ تقریباً چھ ہزار برس ق۔م بختر میں آریوں نے اپنی حکومت کی بنیاد

(1) "It appears very probable that at the dawn of history, East Turkestan was inhabited by an Aryan population, the ancestors of the present Slavonic and Teutonic races, and a civilization, not inferior to that of Bactrians, had already developed at that time in the region of the Tarim." Lassen's Indische alterthums-Kundda, quoted by Dr. A. C. Das: Reg Vedic India P. 31.

(2) "The Bactrian document, called Dabistan (found in Kashmir and brought to Europe by Sir W. Jones) gives an entire register of kings, namely, of the Mahabadernes whose first link reigned in Bactria, 5,600 years before Alexander's expedtion to India" Count Bjornst Jerna: Theogony of the Hindus. P. 134.

ڈالی تھی، اُسی قدیم زمانے میں ابھی بہت ساری اقوام کو اپنا جسم ڈھانپنے کی بھی سوجھ بوجھ نہیں تھی، تب یہ آریہ لوگ یہاں حکمرانی کر رہے تھے۔ دابستان میں درج بختر کے راجاؤں سے متعلق اب ہر عالم تسلیم کرتا ہے کہ یہ ہندو تھے، جس طرح ''مل'' صاحب کی مرتب کردہ ہندستان کی تاریخ میں درج ہے۔[1] اس طرح کے تحریری ثبوت دیکھ کر اہل یورپ تسلیم کرنے لگے کہ ہندوؤں کی جس طرح تہذیب قدیم ہے، اُسی طرح ان کا دھرم بھی قدیم ہے اور اس بات میں دنیا کی کوئی بھی قوم ہندوؤں سے مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ان حقائق سے یوں بھی سمجھ میں آتا ہے کہ دابستان میں درج ہندو راجا جس وقت بختر میں راج کر رہا تھا، اُس وقت تک ایران والے پارسی اور ہندستان والے آریہ لوگ ابھی ایک ہی ہندو قوم تھے۔ ایرانی آریوں سے متعلق کچھ حقائق ان کے مذہبی کتب سے ملتے ہیں۔

ڈاکٹر مارٹن ہاگ پارسیوں کے زنداوستا کا گہرا مطالعہ کر کے، اس میں سے کچھ اندرونی ثبوت فراہم کئے ہیں۔ ان اندرونی ثبوتوں سے واضح ہوتا ہے کہ پارسیوں کے آباء و اجداد اصل میں ٹھنڈے ملک کے رہنے والے تھے اور وہاں اکثر مویشیوں پر ان کا گذارا ہوتا تھا۔ جب آکسس یا آمو دریاء اور جکسارٹس دریاؤں کے بیچ والے ملک اور بختر (باختر) کے بالائی علاقوں کی طرف آئے، تب انہوں نے کھیتی باڑی کی، اور ایک ہی جگہ رہائش اختیار کر لی۔ ان میں سے جو ہنوز مویشیوں پر گذارا کر رہے تھے، اُن سے اِن کے گذران کا نمونہ یوں نرالہ ہو گیا۔[2] اس بات سے یہ نظر آئے گا کہ اصل ٹھنڈے ملک (میرو پربت) کو خیر باد کہنے کے بعد جب بھی آریہ لوگ اس ایران کی طرف آئے، تب اُس طرف کی دوسری اقوام سے تعلقات ہونے کی وجہ سے ان کا رہن سہن اور مذہبی تصورات میں تبدیلی آئی۔ اسی لئے ہندو قوم سے پارسی قوم علحدہ ہوتی گئی، ورنہ یہ دونوں قومیں اصل میں آریہ اور ہندو براہمن تھیں۔ اس امر کا مزید تذکرہ الگ سے کیا جاتا ہے تا کہ ہندوؤں کا پارسیوں کے ساتھ قریبی رشتہ سمجھنے میں آسانی ہو۔

ہندوؤں اور پارسیوں کے قریبی مراسم: پارسیوں کی مذہبی کتاب ''زنداوستا''[3] ہے، جو پہلوی زبان میں لکھی ہوئی ہے۔ یہ زبان ایران کے ''پہلو'' (پرتھین Parthians) لوگوں کی زبان تھی۔ رگ وید کے منڈل چھ، سوکت ٢٧، رچنا ٨ میں ''پارتھو'' (Parthava) نام استعمال

(1) Mill's History of India. Voll. II PP. 237 - 238.

(2) Dr. Martin Haug: Essays on the Sacred Langauge, Writings and Religion of the Parsis, PP 292-293.

(3) ''اوستا'' کے معنی ہیں ''مول'' (Text)، اور ''زند'' اس کے شرح (Comentary) ہے۔ اسی وجہ سے پارسی لوگ اصل میں کہا کرتے تھے ''اوستا و زند''۔ جن یورپی علماء نے اس مذہبی کتاب کا مطالعہ کیا، انہوں نے اس کا نام تبدیل کر کے ''زنداوستا'' کہا۔ اب خود پارسی لوگ بھی یوں ہی کہتے ہیں، اس لئے ہم نے بھی یہی نام استعمال کیا ہے۔ (مصنف)

ہوا ہے۔ یہ لوگ شاید ''پرتھین'' تھے، اور ''پرتھین'' نام کا تلفظ بعد میں تبدیل ہو کر ''پہلو'' (Pahlava) ہوا۔

رگ وید کے منڈل دسویں، سوکت ۳۳، رچنا ۲ مین ''پرشو'' (Parciava) نام بھی استعمال ہوا ہے۔ یہ لوگ شاید ''پرشن'' (Persian) تھے، جن کا نام ''پرشیا'' (ایران) پر پڑا ہوا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ''پرشرام'' جس نے اکیس دفعہ کھتریوں کی نسل کشی کی تھی، اسی کا نام ''پرشیا'' پر پڑا ہوا ہے؛ لیکن یہ بات معتبر نہیں ہے۔ پرشرام بہت بعد میں پیدا ہوا تھا۔

مذکورہ بالا حقائق سے ظاہر ہوتا ہے کہ رگ وید والے زمانے میں ہی ہندستان والے آریوں کو اِن ایرانی اقوام کے ناموں کا پتہ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رکھنے والی بات ہے کہ ہندوؤں کے رگ وید کی زبان پارسیوں کے زنداوستا کی زبان سے بہت مشابہت رکھتی ہے۔ دونوں مذہبی کتابوں میں کئی دیوتاؤں کے نام بھی ویسے کے ویسے ہیں۔ کئی کہانیوں اور دیگر مذہبی تصورات بھی جیسے رگ وید میں ویسے پارسیوں کی کتاب زنداوستا میں، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ یورپ والے آریوں سے علحدہ ہونے کے بعد ایران اور ہندستان والے آریہ لوگ کسی جگہ بڑے عرصے تک اکٹھے رہائش پذیر تھے۔ جس وجہ سے ایک دوسرے سے ایک ہی قسم کے مذہبی تصورات سیکھے۔ سنسکرت اور ایرانی زبانوں میں کچھ ایسے الفاظ بھی ہیں، جو یورپی زبانوں میں نہیں ہیں۔ مثلاً، سنسکرت میں ''باہو'' (بازو) اور ''اشتر'' (اونٹ) الفاظ کا تلفظ پارسی میں ''بازو'' اور ''شتر'' (اونٹ) ہیں۔ ان باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ہندستان اور ایران والے آریوں کا ایک دوسرے کے ساتھ قریبی ناطہ تھا۔ آرکیالاجیکل محکمہ والوں کی تحقیقات سے واضح ہوا ہے کہ ایران اور ہندستان والے آریوں کی بیٹھکیں ''میدیا'' سے لے کر ''بئبلونیا'' تک تھیں۔ اگرچہ یہ بیٹھکیں رگ وید والے زمانے سے بہت ہی بعد کی سمجھی جاتی ہیں، تب بھی مندرجہ ذیل حقائق سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان بیٹھکوں کے قائم کرنے سے پہلے ہی ان کا آپس میں میل جول تھا، اور ان کے پروہت یا مہا براہمن بھی ایک ہی قسم کے تھے۔

بزرگوں کے نام: آج کل کی سنسکرت میں ''کوی'' معنی شاعر، اس لئے آج کل جو بھی آدمی شعر و شاعری کرتا ہے، اسے ''کوی'' کہا جاتا ہے۔ سچ پچ شاعر وہ ہے جسے ادراک ہوتا ہو اور باطنی نگاہ کا ورثہ اسے عطا کیا ہوا ہے۔ قدیم سنسکرت والے زمانے میں ''کوی'' اس اعلیٰ شخص کو کہا جاتا تھا، جس سے جب سرسوتی بات کرتی تھی یا جب الہام ہوتا تھا، تب عجیب و غریب باتیں اور گیانی علمی گفتے بے اختیار اس کے منہ سے نکلتے تھے، جن کا سننے والوں پر جادو

کا سا اثر ہوتا تھا۔ اس طرح کے ''کویوں'' کو قدیم آریہ لوگ ''رشی'' کہتے تھے۔ رشیون کے ناموں سے پہلے ''مہراج'' وغیرہ کی بجائے ''کوی'' لفظ استعمال کرتے تھے۔ پارسیوں میں بھی یہی دستور تھا۔ وہ بھی اپنے پروہتوں کو (نسلی براہمنوں یا پنڈتوں) کو ''کوی'' اور ''کرپن'' کلپ کروانے والا یا سنکلپ لینے والا کہتے تھے۔ زنداوستا کے گاتھا گاہیں (Songs) انہوں ہی نے بنائے ہیں۔ بڑی بات یہ کہ ان کویوں کے نام بھی ایک جیسے ہیں۔ مثلاً، کوی ہسرو (Kavi Husravaa) کا تلفظ ایرانیوں نے تبدیل کر کے کہا ہے ''کیخسرو''، ''کوی کواٹ'' کی بجائے ایرانی کہتے ہیں ''کیقباد''؛ ''کوی اُش'' کی بجائے ''کیکاؤس'' اور ''کوی وشتاسپ'' (Kavi Vishtaspa) کی بجائے کہتے ہیں ''کی گشتاسپ'' (Kai Gushtasp)۔ یہ نام ''شاہنامہ'' میں درج ہیں۔ ایران کی تاریخ کے مطابق دارا بادشاہ کے باپ کا نام ''ہیئتپس'' (Hystaspas) تھا۔ یہ یونانی تلفظ ہے، ورنہ صحیح تلفظ ہے ''وشتاسپ'' (Vishtaspa)۔ تاریخ کے مطابق قدیم بختر (Bactria) کے حاکم ''کیانی'' بادشاہ کہلاتے تھے، جنہیں انگریزی میں مرتب کی ہوئی تاریخوں میں ''ایکمینین'' (Achaemenian Kings) کہا گیا ہے۔ در حقیقت یہ انگریزی لفظ اصل میں ایرانی لفظ ''ہنمانش'' (Achaemenians) ہے؛ اور ''کیانی'' لفظ ''کوی'' سے ماخوذ ہے۔ ایران کے بادشاہ قدیم کویوں (رشیوں) کی اولاد ہیں، اس لئے ان پر یہ نام پڑا ہے۔[1] رسم و رواج میں یکسانیت۔ اتھرون رشی اور انگیرس رشی قدیم ہندوؤں سے اگنی اور سوم کی پرستش کرواتے تھے۔ زنداوستا میں بھی ان ہی پرستشوں بلکہ ان ہی رشیوں کے نام درج ہیں۔ ہندوؤں میں جو رشی رگ وید کا منتر پڑھتا ہے، اسے ''ہوتر'' کہتے ہیں۔ ''ہوتر'' کا سندھی میں تلفظ ہے ''ہوت''، جس سے ''ہوتچند اور ہوت پنہوں'' نام بنے ہیں۔ زنداوستا میں ''ہوت'' کا تلفظ ''زوَت'' (Zaot) ہے اور اس کے معنی ہیں پروہت یا پنڈت۔ جس طرح ہندوؤں میں براہمن، کھتری اور وَیش ہیں، اسی طرح پارسیوں میں بھی اتھرون، رتھیشت (Rathaesthas) اور واستریہ فشیوشن (Vastrya Fshuyans) تھے، یہ بات ڈاکٹر مارٹن ہاگ نے لکھی ہے۔ آج بھی جس طرح براہمن کے علاوہ کسی اور کو پوجا پاٹھ کروانے کا حق نہیں ہے، اسی طرح پارسیوں اور موبیدوں (پروہتوں) کے علاوہ کسی بھی دوسرے کو یہ حق حاصل نہیں ہے۔

کوئی بھی ہندو جب تک جنیئو نہیں پہنتا تب تک شودروں کے زمرہ میں شمار ہوتا ہے، اس لئے پہلے ہندو اپنے بچوں کو بچپن ہی میں جنیئو پہناتے تھے، اسی طرح پارسیوں میں اگر ان کا

(1) Dr. Martin haug: Essays on the Sacred Language, Writings and Religion of the Parsis, PP 289-90.

کوئی بچہ جنیؤ نہیں پہنتا تب تک وہ پکا پارسی نہیں سمجھا جاتا۔ اسی وجہ سے پارسی لوگ اکثر سات برس کی عمر میں ''کستی'' (Kusti۔۔جنیئو) پہنتے ہیں۔

ہندو لوگ کن کاموں میں ''گؤنت'' کام میں لاتے ہیں۔ یہ ''گؤنت'' اصل میں ہے سنسکرت لفظ ''گومتر'' یعنی گائے کا پیشاب، جبکہ پارسی کہتے ہیں ''گومز'' (Gomez) اور یہ بعض پارسیوں کا نام بھی ہے۔ قدیم آریوں نے گائے کے گوبر اور پیشاب میں کئی خصوصیات دیکھیں، اس لئے ان کے استعمال کا رواج پڑ گیا، ڈاکٹر مارٹن ہاگ کہتا ہے کہ یورپ میں دیہاتیوں کے معالج گائے کا پیشاب اور گوبر عام طور پر دوا کے طور پر استعمال میں لاتے ہیں۔(1)

ہندوؤں میں جب کوئی مر جاتا ہے تو بارہویں دن اس کا ''اوتھارو'' کرتے ہیں۔ یہ دستور پارسیوں میں بھی ہے۔ پارسی لوگ ''اوتھارو'' کی بجائے کہتے ہیں ''اُتھمان'' (Day of resurrrection) ۔ یہ دونوں الفاظ ''اُتِھ''..... (اُٹھنا)'' سے ماخوذ ہیں۔ بال بچوں، گھر اور مال ملکیت میں چاہت ہونے کے باعث پہلے چند ایک دن روح کی موجودگی دنیوی چیزوں میں ہوتی ہے؛ اور اوتھارے کے دن اُٹھ کر وہ موت کے سفر پر روانہ ہوتا ہے۔ یہ ہیں ہندوؤں اور پارسیوں کے عقائد۔ ہندوؤں کی طرح پارسی بھی دسویں کی رسم کرتے ہیں، اور چاول کے آٹے کا پیڑا بنا کر کوؤں کو دیتے ہیں۔ اِن اور بعض دیگر امور سے کئی یورپی علماء یوں سمجھتے ہیں کہ ہندو اور پارسی ایک دوسرے کے قریبی رشتیدار ہیں، اور ان کا مذہب بلکل ایک ہی تھا۔ وہ اُن ہی دیوتاؤں کو اُن ہی ہندی ناموں سے پکارتے تھے۔ یہ بات مندرجہ ذیل حقائق سے مزید واضح ہو جائے گی۔

دیوتاؤں کے نام: ہندوؤں اور پارسیوں کا ایک اہم دیوتا ''سورج'' ہے، جو دراصل سنسکرت لفظ ''سؤریہ'' ہے؛ لیکن ہندی میں ''سؤر'' بھی کہتے ہیں۔ اسی ''سؤر'' لفظ کا تلفظ ایرانی میں تبدیل ہو کر ہوا ''خور''، جس کے آخر میں ''شید'' لفظ ملا کر کہتے ہیں ''خورشید'' معنیٰ ''سورج''۔(2)

---

(1) Dr. Martin Haug's Essays on the Religion of the Parsis, P. 286.

(2) حروف کو تبدیل کرکے حلقی تلفظ والا بنانے (Gluturalisation) کی عادت ایرانی لوگوں میں بہت ہے۔ ''سؤریہ۔۔سور'' کو پہلے تبدیل کر کے انہوں نے ''ہور'' اور پھر ''خور'' کیا ہے۔ اسی طرح سنسکرت میں ''سوسری''۔۔ ''سوسر'' معنی بہن۔ لٹن میں کہتے ہیں ''سورر'' (Soror)؛ ایرانی زبان میں ''سوسر'' کا تلفظ تبدیل کرکے ''ہہر'' بنایا گیا اور اب فارسی میں کہتے ہیں ''خواہر'' معنی بہن۔ ایسی اور بھی کئی ایک مثالیں موجود ہیں۔ (مصنف)

رگ وید میں سورج دیوتا کا دوسرا نام ہے ''متر'' (Mitra)، جس کا تلفظ زنداوستا میں ''متھر'' اور آج کل بولی جانے والی فارسی زبان میں ہے ''مہر'' معنیٰ ''سورج''۔[1] یہ نہایت قدیم نام ہے۔ قدیم رومی لوگ بھی سورج دیوتا کو پوجتے تھے، اور اُسے ''متھرس'' کہتے تھے۔ انگریزی لفظ (Mithraic, Mithraicism) وغیرہ اِسی سنسکرت لفظ ''متر'' (ایرانی ''متھر'') سے ماخوذ ہیں۔ اس سے یوں سمجھا جاتا ہے کہ متر دیوتا (سورج) کی پرستش کا رواج اُسی قدیم زمانے میں جاری ہوا، جس زمانے میں تمام آریہ لوگ میرو پربت کی طرف اکٹھے رہتے تھے، اور چھ مہینوں کی رات گذرنے کے بعد سورج ان کو دیکھنے کو ملتا تھا تو اُسے دیوتا سمجھ کر پوجتے تھے۔

ہندو لوگ برسات کے دیوتا کو ''اندر'' کہتے ہیں۔ اندر دیوتا کی پوجا شروع ہونے کو پہلے قدیم آریہ لوگ ''ترت'' (Trita) یا ''ترتن'' (Traitana) کو برسات کا دیوتا مان کر پوجتے تھے۔ زنداوستا میں ''ترتن'' کا تلفظ ''تھریتون'' (Thraetona) ہے، جس کا تلفظ مزید بگڑ کر ''فریدون'' ہوا ہے۔ مثلاً، ''فریدون بیگ'' (نام ہے)۔ رگ وید میں کہا گیا ہے کہ ''ورتر'' (Vritra) نامی ایک دیت برسات کو روک رہا تھا، تو اِس برسات کے دیوتا نے اُسے مار کر برساتیں برسائی تھیں، اسی وجہ سے اُس پر ''ورترگھن'' یعنی ''ورتر دیت'' کو مارنے والا'' نام پڑ گیا۔ اِسی ''ورترگھن'' کا تلفظ زنداوستا میں ''ورتھریگھن'' (Verthrreghana) ہے۔ جیسے ہندوؤں کے پرانوں میں لکھا ہے کہ وشنو بھگوان نے دس اوتار لیے تھے، اِسی طرح زنداوستا میں ورتھریگھن سے متعلق کہا گیا ہے کہ اس نے دس اوتار لیے تھے۔ ان دس اوتاروں میں سے کلکی، وراہ، وامن اور رام اوتار جس طرح ہندوؤں کے مذہبی کتب میں درج ہیں اِسی طرح پارسیوں کی کتاب زنداوستا میں درج ہیں، (ملاحظہ ہو، یشت ۱۴)۔[2]

ہندو لوگ موت کے دیوتا کو کہتے ہیں ''یم''، جس کا تلفظ زنداوستا میں ''ییم'' (Yima) ہے۔ سندھی میں عام طور پر ''یم'' کی بجائے ''جم'' کہتے ہیں۔ پارسی میں بھی اسی طرح کہتے ہیں۔ اسی ''جم'' لفظ سے پارسی نام ''جمشید'' بنا ہے، یعنی ''شید'' لفظ آخر میں شامل کیا گیا ہے، جیسے ''خورشید'' نام میں بھی آخر میں شامل ہے۔

(1) زنداوستا کی زبان خواہ قدیم پارسی میں ''تھ''، ''د'' اور اس طرح کے دوسرے دبرگ حروف (Aspirates) تھے، جو آج کل کی فارسی میں نہیں ہیں؛ جس طرح سندھی میں ''کھن'' سے ''کہن''، ''لکھن'' سے ''لہن'' اور ''ڈھن'' سے ''ڈہن'' لفظ بنے ہیں، اسی طرح ''متھر'' کا تلفظ موجودہ فارسی میں تبدیل ہو کر ''مہر'' ہوا ہے۔ (مصنف)

(2) "The ten incarnations in the Avesta (Yasht, XIV) are wind, a bull, a horse, a camel, a boar; a youth, a raven, a ram, a buck, and a men; and four seem to correspond with Kalki, Varaha, Vaman and Rama amongst the ten Avatars mentioned in the Puranic literature." Sjt. B. G. Tilak: The Arctic Home in the Vedas, p. 350.

قدیم آریہ لوگ ''سوم'' نامی ایک سفید رس کو دیوتا کرکے پوجتے تھے۔ زنداوستا میں ''سوم'' کا تلفظ ''ہوم۔۔ہوم'' (Haom) ہے۔ یہاں بھی ''س'' کو تبدیل کرکے ''ھ'' کیا گیا ہے۔ اسی طرح دیگر کئی دیوتاؤں کے نام جیسے رگ وید میں درج ہیں ویسے ہی پارسیوں کی کتاب زنداوستا میں ہیں۔ ان دیوتاؤں سے متعلق کتھائیں بھی دونوں مذہبی کتب میں ایک جیسی ہیں۔ جیسا کہ اوپر پہلے ہی کہا جا چکا ہے۔

پارسیوں کے مذہب کی بنیاد: ہندوؤں اور پارسیوں کے جو دیوتا ہیں، ان میں سے اہم سورج اور اگنی ہیں۔ اِن اور دیگر دیوتاؤں کو قدیم آریہ لوگ ''اسر'' کہتے تھے، جس کے معنی موجودہ سنسکرت میں ہیں ''دیت''، لیکن قدیم سنسکرت میں اس کے معنی تھے ''دیوتا، اُسر دیوتا''۔ اس ''اُسر'' لفظ کا تلفظ پارسیوں کے زنداوستا میں ''اہر'' ہے یعنی ''س'' تبدیل ہوکر ''ھ'' ہوگیا ہے،(1) ورنہ لفظ وہی ہے۔ پارسیوں کا مذہب ''اہر مذہب'' یعنی ''دیوتاؤں کا مذہب'' یا ''دیوتاؤں کا جاری کردہ مذہب'' کہلاتا ہے۔ یہ مذہب کن دیوتاؤں کا جاری کردہ ہے؟

ہندستان کے قدیم آریہ لوک سورج، اندر اور دیگر کئی دیوتاؤں کو عام طور پر، لیکن اندر دیوتا کو خاص طور پر ''مگھوا'' (Maghva) اور ''مگھون'' (Maghavan) کہتے ہیں۔ پارسی لوگوں کے آباء واجداد خاص طور پر سورج دیوتا کو ''اسر مگھوا'' (مگھوا دیوتا) کہتے تھے، جس کا تلفظ بعد میں تبدیل ہوکر ''اہر مزد'' (Ahura Mazda) اور ''ہور مزد'' ہوا۔ پارسی لوگ بھگوان کو ''آہر مزد'' کہتے ہیں۔ جس طرح ہندو اپنے بچوں پر بھگوان، ایسر (ایشور) وغیرہ نام رکھتے ہیں، اسی طرح پارسی لوگ بھی اپنے بچوں پر ''ہورمزد'' اور ''ہور مسجی'' نام رکھتے ہیں۔

پارسی لوگ جس خیال سے بھگوان کو ''ہورمزد'' کہنے لگے، وہ خیال قابلِ تحسین ہے۔ بھگوان جوتی سروپ ہے، اوز اُس کی جوت کا روپ سورج دیوتا ہے، پرتھوی پر سورج کا روپ ''اگنی'' (آگ) ہے۔ اسی لئے ہندو اور پارسی لوگ قدیم زمانے سے لے کر سورج اور اگنی کو بھگوان کی جوت کا روپ سمجھ کر، ان کی پرستش آج تک کرتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر مارٹن ہاگ اور دیگر علماء کی راءِ کے مطابق سنسکرت لفظ ''مگھوا'' کا تلفظ تبدیل ہوکر ''ماجی'' (Magi) ہوا۔ قدیم ایرانیوں کے موبید یا پروہت (Priests) اِسی نام سے پکارے جاتے تھے، کیونکہ وہ اگنی پرستش کرواتے تھے۔ ایرانیوں کو عربوں نے ''مجوسی'' یعنی آتش پرست کہا، یہ نام بھی اسی مادہ ''مگھوا'' (Magi) میں سے ہے۔

(1) یہ عادت ہم سندھی لوگوں میں بھی بہت ہے، جس وجہ سے ''پھاسی'' کی بجاءِ ''پھاہی''، ''ساس'' کی بجاءِ ''ساہ'' اور پارسیوں کی طرح ''ماس'' کی بجاءِ ''ماہ'' (چاند، مہنہ) کہتے ہیں۔ (مصنف)

اگن دیوتا کو ہندو اور پارسی بھگوان کا روپ سمجھتے تھے، وہ بھی محض اس وجہ سے کہ اگنی جوتی سروپ ہے؛ لیکن خود خالق یا خلق کرنے والے کی طرح روپ یا صورت پیدا کرنے کی اس میں قوت بھی ہے، اسی سبب قدیم آریوں نے اگنی کو کہا ''توشتر''، جس کے معنی ہیں ''کاریگر''۔ بچہ ماں کے شکم میں پل پوس کر بڑا ہوتا ہے، وہ اِسی آتش کے زور پر (رگ وید؛ منڈل پہلا ۱۸۸، ۹، اور منڈل دسواں ۱۰،۵)۔ سب جانداروں کی علحدہ علحدہ صورتیں بھی اسی آتش کے زور پر ہوتی ہیں۔ دھرتی، آکاش اور دوسری ہر چیز کو صورت بھی یہی اگنی یا آگ دیتی ہے، جس وجہ سے اگنی گویا برہما یا خالق ہے۔ جس دیوتا کو چہرے کے علحدہ علحدہ خد و خال بنانے کا طریقہ آتا ہے، وہ بن پوچھے قابل کاریگر ہے، اس لئے قدیم آریہ یوں کہتے رہتے تھے کہ ''توشتر'' جیسا کوئی قابل کاریگر ہے ہی نہیں۔ یہ باتیں رگ وید، سشکل یجر ویدٗ (واجینی سنہتا) اور شتپتھ براہمن میں درج ہیں۔ ارکنڈیہ پران کے ادھیاء ۷۷ میں توشتر دیوتا کو ''وشوکرما'' اور ''پرجاپتی'' (برہما) کہا گیا ہے۔ اسی دیوتا کو قدیم یونانی اور رومن لوگ[1] ''ہیفسٹوس'' (Hephaestus) اور ''ولکن'' (Vulcan) کہتے تھے، اور اُسے ایک بڑا دیوتا سمجھ کر پوجتے تھے۔

ایرانی آریوں کے ہاں یہی رگ وید والا نام عام تھا۔ ''توشتر'' کی بجائے اکثر کہتے تھے ''جرت توشتر'' (Jarat Tuashtri) یعنی کہنہ اگن دیوتا، کیونکہ ان کے دیوتاؤں کے درمیان سب سے کہنہ اور قدیم دیوتا یہی تھا۔ اِسی ''جرت توشتر'' کا تلفظ بعد میں پارسیوں نے تبدیل کر کے ''زورئسٹر'' (Zoraster) کیا، اور اس کی بجائے اب عام طور پر ''زردشت'' کہتے ہیں۔ جس طرح ہندوؤں کا خیال ہے کہ اگنی دیوتا برہم روپ اختیار کر کے وید ظاہر کیا، اسی طرح پارسیوں کی زنداوستا کے مطابق مذہب اول ''جرت توشتر'' (کہنہ اگن دیوتا) نے ظاہر کیا۔ پارسی لوگوں کا نبی زردشت ہے، لیکن وہ بہت بعد میں پیدا ہوا۔ عام طور پر کہتے ہیں کہ زردشت کم از کم ۶۶۰ برس ق۔م گذر چکا ہے، لیکن کیمبرج ہسٹری آف انڈیا مطابق اس سے بھی پہلے گذر چکا ہو تو کوئی عجیب بات نہیں۔ یہ زردشت یا زورئسٹر قدیم زورئسٹر ''جرت توشتر'' یعنی (کہنہ اگن دیوتا) کا اوتار شمار ہونے لگا، اسی لئے اس پر یہی نام پڑ گیا۔ اسی نبی نے پارسی مذہب کو بنا کر علحدہ کیا، اسی لئے اب وہ پارسیوں کے مذہب کا بانی کہلاتا ہے۔ مطلب یہ کہ ہندوؤں اور پارسیوں کی در اصل ایک مسلسل برادری تھی؛ اور پھر بعد میں دو علحدہ قومیں ہو گئیں۔ ان کے درمیان میں کچھ اختلافات پیدا ہو گئے، جس کا مختصر تذکرہ الگ کیا جائے گا۔

---

(1) ہیفسٹوس (ولکن) دیوتا (Hephaestus (Vulcan) ہیرا دیوی کا بیٹا، افروڈایٹ دیوی کا شوہر، آگ کا دیوتا، مختلف دھاتوں سے دیوتاؤں کے لئے ہتھیار اور سامان بنانے کا ہنرمند، لوہروں کا دیوتا اور جلتے پہاڑوں کی آگ کا دیوتا۔

یہاں صرف اتنا لکھا جاتا ہے کہ پروفیسر میکس ملر کو ویدوں اور پارسیوں کے زنداوستا سے یوں سمجھ میں آیا کہ پارسیوں کے آباء و اجداد پہلے ہندستان والے آریوں کے ساتھ کافی عرصہ اکٹھے رہے، اور بعد میں جب ان کے درمیان ناسازی ہوئی تو پارسیوں کے آباء و اجداد شمالی ہندستان سے ہجرت کر کے ارکوشیا (قندھار) اور ایران میں بیٹھکیں بنا کر رہائش اختیار کی۔[1] مصنف کو بھی رگ وید اور زنداوستا کے مطالعہ سے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ پروفیسر میکس ملر کی قیاس آرائی صحیح ہے۔ لگتا ہے کہ جو آریہ لوگ کوہ ہمالیہ والے لکوں سے گذر کر ہندستان میں آئے، ان میں سے بعض موجودہ پارسیوں کے آباء و اجداد تھے، اور بعد میں ان کے درمیاں کچھ باتیں پیدا ہوئیں، جس کی وجہ سے ایران کی طرف جا کر آباد ہوئے، اور ہندوؤں سے ہمیشہ کے لئے علحدہ ہو گئے۔ ڈاکٹر اناش چندرداس نے بھی اِسی رائے کا اظہار کیا ہے کہ پارسیوں کے آباء و اجداد دراصل وادیٔ سندھ میں رہتے تھے۔[2]

ہندوؤں اور پارسیوں میں انبنت: ہندوؤں اور پارسیوں کی مذکورہ بالا باتوں (دیوتاؤں اور بزرگوں کے نام، رسم و رواج وغیرہ) سے ان کے درمیاں اتفاق ظاہر ہوتا ہے؛ لیکن بعض ایسی بھی باتیں ہیں جن سے ان میں نفاق کے آثار نظر آتے ہیں۔ ایسے آثار خود کچھ الفاظ سے آج بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ مثلاً، سنسکرت میں ''دیوی'' معنیٰ ''دیوتا''، لیکن پارسی میں ''دیو'' معنیٰ ''جن یا بھوت''! معنیٰ ہی الٹی۔ آج کل کی سنسکرت میں ''سر'' معنیٰ ''دیوتا'' اور ''اَسر'' معنیٰ ''دیت''؛ لیکن زنداوستا میں ''اَسر'' کا تلفظ ''اہر'' ہے۔ پارسی لوگ بھگوان کو ''اہرمزد'' یا بڑا دیوتا کہتے ہیں، جیسا کہ اوپر پہلے ہی کہا جا چکا ہے۔

قدیم سنسکرت میں ''اَسر'' کے اصل اچھے معنیٰ تھے؛ اور اس کے بنیادی معنیٰ بھی عمدہ ہیں۔ کئی یورپی علماء کا کہنا ہے کہ ''اَسر'' لفظ کا مادہ ہے ''اَس'' معنیٰ ''ہونا''، یعنی یہ لفظ ہستی یا زندہ رہنے کے معنیٰ ظاہر کرتا ہے؛ اِس لئے ''اَسر'' لفظ کے اصل معنیٰ تھے ''دیوتا''۔ دیوتا کبھی بھی مرنے والے نہیں ہوتے۔ اس لئے اَسر لفظ اَمر دیوتاؤں کے لئے استعمال میں لاتے تھے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ رگ وید کے منڈل پہلے، چوتھے، پانچویں اور ساتویں میں اندر دیوتا، ورن دیوتا، متر، سوتر (Savit -- سورج)، مروت، ردر (شو بھگوان)، اگن دیوتا اور دیگر دیوتاؤں کو ''اَسر'' کہا گیا ہے۔

(1) "The Zorastrians were a colony from northern India. They had been together for a time with the people whose sacred songs have been preserved to us in the Vedas. A schism took place and the Zorastrians migrated west-ward to Arachosia and Persia." Prof. Max Muller: Science of Language, Vol. II, P. 170, (5th Edition). Sea also Prof. Max Muller's Chips from a German Workshop, Vol. I. P.83.

(2) The Iranians the ancestors of the Parsis, were pure Aryans and originally inhabited Sapta Sindhu." Dr. A. C. Das: Reg Vedic India, P. 588.

رگ وید کے منتروں میں ''اَسر'' لفظ اُمر دیوتاؤں کے لئے استعمال ہوا ہے؛ یہ کسی نہایت قدیم زمانے کے معلوم ہوتے ہیں۔ اسی ''اَسر'' لفظ کے بعد میں معنی ہوئے ''دیت''۔ یہ الٹے معنی کیسے ہوئے؟ ہندوؤں کے مذہبی کتب اور پارسیوں کے زنداوستا میں کچھ ایسی باتیں درج ہیں، جن سے واضح طور پر سمجھا جا سکتا ہے کہ اندر دیوتا کی پوجا جس وقت قدیم آریوں نے جاری کی، اس وقت اختلاف پیدا ہوا، اور موجودہ پارسیوں کے آباء و اجداد اُسی اختلاف کے باعث ان سے علحدگی اختیار کر لی تھی۔ اِسی نفاق کے پیدا ہونے کے بعد ''اَسر'' کو خراب معنی پہنائے گئے۔

ہندوؤں اور پارسیوں میں اختلاف کے باعث نفاق پیدا ہوا، اس کے بعد بھی پارسی لوگ بھگوان پر اپنے قدیم دستور موجب ''اَسر'' (اہر) کہہ کر پکارتے تھے، جس وجہ سے آج تک پارسیوں کا مذہب ''اَہر مذہب'' کہلاتا ہے۔ اختلاف پیدا ہو جانے کے بعد ہندوؤں کو پارسیوں کی شکل بھی اچھی نہیں لگتی تھی، اور ان کے اہر مذہب سے نفرت کرتے تھے۔ لگتا ہے کہ اِسی نفرت کے اظہار کے سبب خود ''اَسر'' (اہر) کے لئے ان میں نفرت پیدا ہوئی۔ ہندوؤں نے بعد میں ''اَسر'' سے نیا لفظ ''سر'' بنایا جسے ''دیوتا'' کے معنی پہنائے گئے اور ''اَسر'' کے معنی ہوئے ''دیت''۔ اس طرح لفظ کی بنیاد ہی تبدیل ہوگئی، اسی لئے اب ''سر'' (دیوتا) کی ضد ''اَسر'' (دیت) ہے۔ ''اسر'' لفظ کو جب ایسے خراب معنی پہنائے گئے تو ہندو ''دیوٗ'' (دیوتا) لفظ زیادہ استعمال کرنے لگے، پارسیوں نے بھی ہندوؤں اور ان کے مذہب، خصوصاً دیو پوجا یعنی اندر دیوتا کی پوجا کے خلاف نفرت کے اظہار کی خاطر ''دیوٗ'' (دیوتا) لفظ کے معنی تبدیل کر کے ''جن یا بھوت'' کر دیے! ورنہ درحقیقت ''دیوٗ'' لفظ کا مادہ ہے ''دو۔۔div'' معنیٰ چمکنا، اس لئے دیوتا کے بنیادی معنی ہیں چمکنے والی ہستی (A shining being)۔ ''اگنی'' دیوتا ہے اور دائمی طور پر چمکتی رہتی ہے۔ سورج اور دوسرے سیارے جنہیں ہندو دیوتا کہتے ہیں، وہ بھی ہمیشہ چمکتے ہی رہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ''اَسر'' اور ''دیوٗ'' الفاظ کے اصل معنی نہایت اچھے تھے، لیکن بعد میں ہندوؤں اور پارسیوں میں ناسازی کے باعث ان الفاظ کے معنی بھی تبدیل ہو گئے، اور پارسیوں کا مذہب ہندو مذہب سے الگ ہو گیا۔[1]

اندر دیوتا کی پوجا پر جھگڑا: قدیم ہندو اور پارسی ایک ہی دیوتاؤں کو پوجتے تھے، اور اُن کے دیوتاؤں کے نام بھی ایک جیسے تھے، اس بات کا تذکرہ کرتے ہوئے اوپر کہا جا چکا ہے کہ اندر دیوتا کی پوجا جاری ہونے سے قبل ''ترت'' یا ''ترتن'' برسات کا دیوتا شمار ہوتا تھا۔

(1) In the Vedas as well as in the older portion of the Zand-Avesta (sea the Gathas), there are sufficient traces to be discovered that the Zorastrian religion arose out of a vital struggle against a form which the Brahmanical religion had assumed at a certain early period." Dr. Martin Haug: Essays on the Parsis, P. 287.

اور پارسی لوگوں کے آباء و اجداد ''ترتن'' کو ''تھریتون'' کہتے تھے، جس کا بگڑا ہوا تلفظ آج کل ''فریدون'' ہے۔ اس سابق دیوتا کی بجاءِ بعض رشیوں نے اندر مہراج کی پوجا کا رواج جاری کیا، اور اندر کو دوسرے دیوتاؤں سے بالا سمجھنے لگے، تو بعض دوسرے رشیوں نے اس پر اعتراض کیا۔ پھر یہ جھگڑا اتنا بڑھتا چلا گیا جو آریوں کے دو گروہ بن گئے: ایک وہ جو جرت توشتر (زورئسٹر) یعنی کہنہ اگن دیوتا کو پہلے کی طرح پوجتے رہے، اور دوسرے اندر دیوتا کی پرستش کرنے لگے۔ پارسیوں کے مذہب کی بنیاد رکھنے والا زورئسٹر (زردشت) پیدا ہوا، یہ اختلافات اس سے پہلے پیدا ہو چکے تھے، کیونکہ خود رگ وید میں توشتر (جرت توشتر یا زورئسٹر۔ کہنہ اگن دیوتا) اور اندر دیوتا کے درمیاں ناسازی ہونے کا تذکرہ ملتا ہے۔[1] اسی ناسازی کے باعث ہندوؤں اور پارسیوں کی قطعی طور پر برادری ٹوٹ گئی۔ خود ہندوؤں میں سے بعض لوگ اندر دیوتا کی پوجا کرنے کی بجاءِ پارسیوں سے جا ملے، اور اگن دیوتا کے پوجاری ہو گئے۔ یہ بات زنداوستا میں صاف طور پر لکھی ہوئی ہے: ''میں دیو پوجا کرنا بند کرتا ہوں اور زورئسٹر (زردشت) مزدیسنین (اہرمزد دیوتا) کا دین اختیار کرتا ہوں اور اس کا پوجاری بنتا ہوں، جو دیووں کا دشمن ہے۔[2]

زنداوستا میں درج اس حقیقت سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض ہندوؤں نے جا کر پارسیوں کا مذہب اختیار کیا تھا۔ جس طرح آج کل کوئی ہندو اپنا مذہب تبدیل کرتا ہے تو دوسرے ہندوؤں کو آگ لگ جاتی ہے، اِسی طرح اُس وقت کے ہندوؤں میں بھی بڑا جوش پیدا ہوا، اور وہ پارسیوں کے جانی دشمن بن گئے، کیونکہ وہ اندر دیوتا کی پوجا کے خلاف تھے؛ جس وجہ سے یہ اختلاف پیدا ہوا تھا۔ یہ حقیقات رگ وید سے معلوم ہوتی ہے، جس میں ایک رشی کہتا ہے کہ: ''جو لوگ اندر کو بڑا دیوتا نہیں مانتے، اور اندر دیوتا کی پوجا کے خلاف ہیں، ان کو میں جلا کر ختم کر دوں گا۔ ہمارے دشمن جہاں آ کر جمع ہوئے تھے وہاں آ کر اکٹھے ہوئے تھے، وہاں ہم نے انہیں جان سے مار ڈالا ہے۔ وہ بلکل نابود ہو گئے ہیں اور ان کی لاشیں شمشان (مسان) یعنی جنگ کے میدان میں پڑی ہیں۔ (رگ وید منڈل ۱،۱۳۳)۔[3] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اِسی اختلاف کی وجہ سے بڑی خونریزی ہوئی تھی۔

(1) Dr. J. Muir: Original Sanskrit Texts, Vol. V, PP. 229--30.

(2) "I cease to be a Deva (worshiper). I profess to be a Zorastrian Mazda - Yasnin (worshiper of Ahurmazda) an enemy of the Devas and a devotee of Ahura."! Dr. Martin Haug: Essays on the Sacred Language. Writings and Religion of the Parsis, PP. 173 and 292-93.

(3) "I burn down the world that does not acknowledge the supremacy of Indra, and revolts against Indra-worship. The enemies have been killed in the place where they were assembled. They have been completely destroyed and are lying on the Samasana (lit. cremation ground) i.e. the battle-field." (Reg Veda 1, 133,1) Quoted by Dr. A.C. Das: Reg Vedic India, P. 158.

ہندوؤں اور پارسیوں کے درمیان یہ نفاق بڑے عرصے تک جاری رہا۔ ہندو اندر دیوتا کے پجاری تھے، وہ ویدوں کے منتر پڑھ کر اگنی کے پوجاریوں (پارسیوں) کے پیچھے پڑتے تھے، تو اگنی پوجاری (پارسی) کہتے تھے کہ یہ جادوگر اور ساحر ہیں، اور اُن کی طرف نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اس نفرت کے باعث مزید بغض بڑھ گیا اور پارسیوں کے ساتھ ہندوؤں نے بڑی عقوبتیں کیں؛ ہندو ان کے گاؤں پر حملہ آور ہوتے تھے، اور ان کی فصلیں برباد کر دیتے تھے، اور ان کے مال ملکیت لوٹ جاتے تھے۔ پارسی بھی کسی سے کم نہیں تھے، کچھ عرصے کے لئے انہوں نے بھی ہندوؤں کے ناک میں دم کر دیا تھا، جس وجہ سے ہندستان کے آریوں (ہندوؤں) نے تسلیم کیا ہے کہ یہ ''اسر'' یعنی اہرمزد کے پوجاری (پارسی) ہم سے زور ہیں اور ہر جگہ ہمیں شکست دیتے ہیں۔ رگ وید کے آخر میں جو ائتریہ براہمن شامل ہے، اُس میں لکھا ہے کہ ''دیوتاؤں'' یعنی دیوتاؤں کے پجاریوں (ہندوؤں) اور ''اُسرن'' یعنی اہرمزد کے پجاریوں (پارسیوں) کے درمیان پہلے مشرق، مغرب، جنوب اور شمال میں (مطلب یہ کہ چاروں اطراف میں) لڑائیاں لگیں، اُن سب میں دیوتاؤں (دیوتاؤں کے پجاریوں یعنی ہندوؤں) کو اسروں (اہرمزد کے پجاریوں یعنی پارسیوں) نے شکست دی، لیکن بعد میں جب شمال مشرق میں (شاید کشمیر کی طرف) لڑائی لگی، تب دیوتا (دیوتاؤں کے پوجاری یعنی ہندو) فتحیاب ہوئے، اور اُس وقت سے لے کر وہ طرف ''اجیت'' (Invincible) شمار ہونے لگا۔

اندر دیوتا کے پجاری (ہندو) جنگ کے میدان میں داخل ہونے سے پہلے سوم رس کی تھوڑی سی مقدار پی لیتے تھے تو خمار میں آ جاتے تھے اور پھر نہایت ہمت سے لڑتے تھے۔ شمال مشرق والی لڑائی میں فتحیاب ہوئے تو اُس وقت سے لے کر یہ دستور ہو گیا کہ جب یگیہ کے لئے سوم جڑی بوٹی گاڑیوں میں منگواتے تھے، تب گاڑیوں کے شمال مشرق میں کھڑے ہو کر، سوم بوٹی گاڑیوں میں سے اتارتے تھے۔[1] ائتریہ براہمن میں یوں بھی لکھا ہے کہ دیو (دیوتاؤں کے پجاری یعنی ہندو) یوں سمجھتے تھے کہ اتنا عرصہ ہم شکست کھاتے رہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہمارا کوئی راجا نہیں ہے، اسی سبب سوم کو انہوں نے اپنا راجا بنا لیا۔ سوم دیوتا کی پوجا کر کے اور سوم جڑی بوٹی کی تھوڑی سی مقدار پی کر لڑنے لگے تو ہر طرح کی ان کی جیت ہوئی۔ پارسیوں نے پھر سوم جڑی بوٹی کے لئے بھی نفرت کا اظہار کیا اور اس وقت سے لے کر پوجا میں دوسری بوٹی استعمال کرنے لگے۔

(1) Aitreya Brahmana, 1, 3, 3.

پارسیوں کی کتب میں جو "گاتھے" (گاہیں) ہیں، اُن سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو جب پارسیوں پر زیادہ غالب آ گئے، تب خود ان کا رہنما اس طرح پکارنے لگا تھا:

"کس ملک کو جاؤں؟ کہاں جا کر پناہ لوں؟ میرے خاوند (زورئسٹر) اور اس کے ساتھیوں کو کیسے ملک میں رہنے کی جگہ ملی ہے؟ نوکروں میں سے کوئی بھی میری عزت نہیں کرتا، نہ ہی ملک کے بدکار حکمرانوں سے مجھے عزت مل رہی ہے۔"

"میں جانتا ہوں کہ میں لاچار ہوں۔ میری طرف دیکھ، میں چند لوگوں کے درمیان بچ گیا ہوں، کیونکہ میرے پاس تھوڑے سے لوگ ہیں۔ اے زندہ ـــ قائم بھگوان، میں رو کر، تم (اہر مزد) سے فریاد کرتا ہوں۔"(1)

گاتھا میں لکھے ہوئے مندرجہ بالا الفاظ کہ "ملک کے بدکار حکمرانوں سے مجھے عزت مل رہی ہے۔" اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ ملک کے والی اندر دیوتا کے پجاری تھے، اور پارسیوں کے رہنما اسی سبب سے انہیں "بدکار حکمران" کہا ہے۔ اس سے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ پروفیسر منکس ملر کی قیاس آرائی صحیح تھی کہ پارسی اصل میں شمالی ہندستان میں تھے، جہاں سے بعد میں ایران اور ارکشیا (قندھار) میں آباد ہو گئے۔

پارسی ہندستان میں واپس کیسے آئے؟: پارسی لوگ ایران کو چھوڑ کر، واپس ہندستان کے آریوں کے پاس کیوں کر آئے، یہ تاریخی بات دور کی نہیں۔ سنہ ۶۳۴ـــ۶۳۵ع میں عربوں نے ایران کو اپنے تابع بنایا، تو وہاں بھاگ دوڑ ہونے لگی۔ اس وقت بعض آریہ لوگ ہراس کے سبب وہاں سے بھاگ نکلے؛ لیکن کچھ وہیں ہی رہ گئے۔ جو آریہ لوگ ہمیشہ کے لئے ایران میں رہ گئے، انہوں نے بعد مین دین اسلام قبول کیا۔ ان میں سے کچھ مغل، پٹھان یا افغان، بلوچ اور دوسرے ناموں سے پکارے جاتے ہیں۔ اُس وقت ایران کے پارسی (فارس) ملک کے باشندے، وہاں سے ہجرت کر کے ہندستان میں آئے، اور پہلے کھنبھات کے نار کی طرف "سنجان" نامی شہر میں آ کر سکونت اختیار کی۔ وہاں ہندوؤں کا راج تھا، اور وہ "مہادیو" (شو بھگوان) کے پوجاری تھے، لیکن ان غیروں کو انہوں نے رہنے کی اجازت دے دی۔ یہ لوگ

(1) "To what country shall I go? Where shall I take my refuge? What country is sheltering the master (Zorathustra) and his companions? None of the servants pay reverance to me, nor the wicked rulers of the country [Gatha ustanvaiti 4 (46) 1]. "I know that I am helpless. Look at me, being amongst few men. For I have few men. I implore thee (Ahur Mazd, the wise) weeping, thou living God. [Gatha Ustanvaiti 4 (46) II]. Dr. Martin Haug: Religion of the Parsis, PP. 152, 155 and 166-Ed. 1862.

ایران کے ''پارس'' ملک سے آئے تھے، اس لئے اپنے آپ کو پارسی کہلانے لگے۔ وہاں آنے کے بعد اتنا زور پکڑ گیے، جو ہندوؤں سے وہ کھنبھات کا علاقہ چھین کر، خود وہاں کے والی بن کر بیٹھ گیئے۔ یہ معاملہ اس کہاوت کے مصداق ہوا کہ ''آئی آگ لینے بن گئی باورچی''۔ ہندوؤں پھر ہمت کر کے ان سے وہ ملک واپس لے لیا، اور انہیں وہاں سے نکال دیا۔ پارسی پھر دربدر رہے۔ ان میں سے بعض سورت، بھروچ، احمد آباد اور گجرات کے دیگر شہروں کی طرف دانہ دانہ ہو گئے۔ ان تمام مقامات پر گجراتی زبان مروج تھی۔ وہاں پارسیوں کو جو اولاد ہوئی، ان کی مادری زبان بھی گجراتی ہو گئی۔ عیسوی ساتویں صدی میں عربوں کے حملہ آور ہونے کے وقت یہ پارسی لوگ ''پرتھیا'' (Parthia) کے ''پرتھوٗ'' (Parthians) آریوں میں سے تھے۔ ''پرتھوٗ'' کی بگڑی ہوئی صورت ''پہلوٗ'' ہے، اسی لئے ان کی زبان ''پہلوی'' کہلاتی تھی۔ اس پر عربی کا اتنا اثر ہوا، جو وہ ساری زبان تبدیل ہو کر، موجودہ عربی آمیز پارسی (فارسی) زبان بن گئی۔ محمود غزنوی اور اس کے بعد پندرہویں سولہویں صدی تک جو ایران کے حاکم ہوئے، وہ سب کے سب غالباً ترک تھے، تب بھی پارسی زبان کو اتنا اوپر چڑھایا، جو وہ پھر پورے پرشیا (ایران) میں پھیل گئی؛ لیکن آج تک اس کا نام پارسی (فارسی) جاری ہے، کیونکہ یہ ایران کے پارسی (فارسی) ملک کی زبان ہے۔

اب صرف ان آریوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے، جو ہمیشہ کے لئے ہندستان میں رہے، اور جن کی اولاد موجودہ ہندو ہیں، جن میں سے اب بعض مسلمان ہیں۔

آریوں کے وادیٔ سندھ کے اصل باشندوں کے ساتھ جھگڑے:

قدیم آریہ لوگ ہندستان میں کب آئے، وہ سن ہندوؤں اور پارسیوں کی مذہبی کتب میں درج نہیں ہے۔ تلک نے، جوتش کے حساب موجب اتنا کہا ہے کہ رگ وید کی بعض کہنہ رچائیں تقریباً چھ ہزار برس ق۔م کی ہیں۔ جیسا کہ ویدک زمانے کی شروعات کا کسی کو پتہ نہیں، اس لئے سن نہیں لکھ رہا ہوں؛ باقی فقط کہیں کہیں اندازاً سن دیے جائیں گے، تاکہ سمجھ میں آ سکے کہ کون سی بات پہلے اور کون سی بات بعد میں ہوئی۔ اتنا ضرور کہا جائیگا کہ ابھی ویدک زمانہ ہی چل رہا تھا تو وہ ہندستان میں آئے تھے۔ قدیم ہندستان کی تاریخیں جو یورپی علماء نے تحقیقات کر کے مرتب کی ہیں، ان میں درج ہے کہ آریوں کی آمد سے قبل شمالی ہندستان میں دراوڑ اور دیگر غیر آریہ لوگ آباد تھے، جن سے جنگیں لڑ کر آریوں نے ملک فتح کیا۔ درحقیقت ہندستان کے اصل باشندوں یعنی قدیم غیر آریہ قوموں کی الگ سے کوئی تاریخ ہے ہی نہیں۔ ان سے متعلق جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ اول رگ وید سے، اور وہ تاریخی کتاب نہیں ہے۔ رگ وید میں صرف یگین کی باتیں، ایشور کی اُپاسنا اور اس کی پراپتی کے سادھن ہیں۔ کئی دیوتاؤں جیسا کہ: ورن دیوتا، اندر دیوتا،

اگنی دیوتا اور بعض راجاؤں اور رشیوں کا بھی ان میں تذکرہ ہے۔ ان مذہبی باتوں کے ساتھ ساتھ آریوں اور غیر آریوں کے درمیان جنگوں اور آریوں کی فتوحات کا تذکرہ ان میں ملتا ہے۔ وہ بھی صرف اس لئے ہے کیونکہ قدیم آریوں نے فتوحات کے باعث اندر دیوتا اور دوسرے دیوتاؤں کے شکرانے بجا لائے ہیں، جنہوں نے اپنے کرم سے ان کو فتحیاب کیا تھا۔ شکر بجا لاتے ہوئے جو کچھ انہوں نے کہا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ وادئ سندھ کے اصل باشندے آریہ لوگوں کو اپنے ملک میں پر جمانے نہیں دے رہے تھے اور ان کے ساتھ سخت مقابلے کئے تھے۔ ان مقابلوں میں ہزاروں کی تعداد میں غیر آریہ لوگ ہلاک ہو گئے، بعض غیر آریوں نے جنگلوں اور پہاڑوں میں جا کر پناہ لی، جہاں سے بعد میں بھی موقع پا کر حملے کرتے تھے، ان کی پوجا پاٹھ میں رخنہ ڈالتے تھے اور دیگر طریقوں سے بھی انہیں بہت ستاتے تھے، ان کی زبانیں، رہن سہن اور رسم و رواج آریوں سے علحدہ تھے، اس کے علاوہ جب وہ آریوں کو سکھ چین سے نہیں رہنے دے رہے تھے تو آریوں نے نفرت کے طور پر انہیں اَسر، دئت، دانو؛ راکاس اور دیگر ایسے تلخ نام دیے، ورنہ وہ غیر آریہ لوگ بھی رواجی انسان تھے۔ ان میں قربانی کا جذبہ بہت تھا، اور محب وطن تھے۔ اپنے دیس کو بچانے کی خاطر، اپنا سر اپنی ہتھیلی پر رکھ کر، آخری گھڑی تک آریوں سے لڑتے رہے، لیکن تاریخ نے وقت بوقت ثابت کیا ہے کہ جب بھی غیر قومیں سندھ خواہ پورے شمالی ہندستان پر حملہ آور ہوئی ہیں، تب ہمارے لوگ ان سے مقابلہ نہیں کر سکے۔ آریوں کو ان کا ملک کسی بھی صورت میں اپنے قبضے میں کرنا تھا، اور ان کو مار کر منانا تھا، اس لئے آریوں نے ان کے قلعے اور شہر آگ لگا کر جلائے، ان کی افواج کو ناس کیا، اور بعض کو اپنا غلام بنا دیا، جن میں سے بعد میں کچھ شودروں میں شمار ہونے لگے۔ غیر آریوں میں سے جو بڑے گھرانے کے لوگ تھے، آریوں نے ان کے ساتھ شادیوں کے رشتے جوڑ کر انہیں اپنا بنایا، اور پھر امن وسکوں کے ساتھ اپنی تہذیب کا پھیلاؤ کیا۔

آریوں کی تہذیب کا پھیلاؤ: قدیم آریہ لوگ دراصل ٹھنڈے ملک کا رہنے والے تھے، اس لئے شکل کے گورے تھے، اوائل میں ان میں ذات پات کی کوئی سمجھ نہیں تھی، اس لئے ان کی ذات ایک ہی تھی یعنی سارے آریہ لوگ برہمن تھے۔ برہمن ہوتے ہوئے بھی وہ مچھلی اور گوشت کھاتے تھے۔ ہندستان میں آنے کے بہت بعد میں ویشنو ہو گئے، ورنہ اصل ٹھنڈے ملک میں رہنے کی وجہ سے گوشت کھانے کے اتنی شدید ضرورت محسوس کرتے تھے، جو گھوڑے کا گوشت کھانے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے، بلکہ گائے اور بھینس کا گوشت بھی حلال سمجھتے تھے! اپنا

اصلی وطن چھوڑنے کے بعد وہ بہت در بدر ہوئے تھے، اس لئے ان کے جسم مضبوط اور گرمی سردی کے عادی تھے۔ وہ عالی دماغ اور بڑے دلیر تھے؛ تیر کمان اور دیگر ہتھیار ہمیشہ ان کے ساتھ ہوتے تھے، اور لڑنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ وادئ سندھ کے لوگوں کو ہرا کر انہیں اپنے تابع کیا۔ اس کے بعد بھی وہ ان پر اتنی حشمت کے ساتھ بیٹھے رہے، جو عام طور پر لوگ انہیں عزت دیتے تھے، جس طرح حکمران قوم کو رعایا عزت دیتی ہے۔ یہ ایک قدرتی امر ہے کہ جب کوئی غیر قوم کسی ملک پر غالب آ جاتی ہے، تب اس ملک کی رعایا فاتح حکمرانوں کی عام طور پر تقلید کرتی ہے۔ پہلے تو اس غیر قوم کی زبان کے الفاظ روز مرہ کی زبان میں آ جاتے ہیں، اور بعد میں خود بھی ان کی زبان سیکھ کر ان سے بات چیت کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ رفتہ رفتہ رعایا ان کی پوشاک، کھانے پینے کے نمونے، رہن سہن کے قوائد، رسم و رواج اور دیگر باتیں اپنا لیتے ہیں، بلکہ ان کا مذہب بھی قبول کر لیتے ہیں۔ اس حالت میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ قدیم دراوڑوں میں سے کچھ لوگ جنوبی ہندستان کی طرف چلے گئے، اور جو آریوں کے ساتھ رہے، ان پر آریوں کی سنسکرت زبان اور تہذیب کا اثر ہوا۔ لیکن زبانوں خواہ کوئی دوسرا اثر یکطرفہ نہیں ہوتا، قدیم دراوڑں کی تہذیب بھی اس وقت کے باعث اعلیٰ درجے کی تھی، اور اس کا اثر خود آریوں پر بھی ہوا تھا، وہ اثر کس قدر ہوا تھا، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل حقائق سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔

ہندوؤں کی ملی جلی تہذیب: رگ وید والے زمانے میں آریہ لوگوں نے دراوڑوں سے تعلقات استوار کر لئے، اور ان میں سے بعض کے ساتھ تو شادی کے رشتہ میں بھی جڑ گئے، تو پہلے بہت ہی دراوڑی الفاظ سنسکرت میں مروج ہو گئے۔ ایسے الفاظ کی لمبی یاداشت بشپ کالڈویل نے اپنی مرتب کردہ کتاب دراوڑی زبانوں کے گریمر (صفحہ ۵٦۷ سے ۵۷۹ تک) دی ہے، جس میں سے چند ایک مثالیں یہ ہیں: مکت (موتی)، کٹیا (جھوپڑی)، کوٹ (قلعہ)، پشپ (پھول) اور نیر معنی پانی۔

ڈاکٹر سنیتی کمار چٹر جی بھی اپنی پنجابی زبان میں تاریخ کی جلد اول میں ایسی مثالیں دی ہیں، اور کہا ہے کہ ویدوں کے براہمنوں میں بھی کئی مزید دراوڑی الفاظ سرایت کر گئے ہیں۔ اس صاحب نے یوں بھی کہا ہے کہ دراوڑ کے بعض مذہبی امور کا بھی قدیم آریوں پر اثر ہوا تھا، جس وجہ سے ہندوؤں کی موجودہ تہذیب بھی ایک ملی جلی تہذیب ہے، جس کے بانی نہ صرف آریہ لوگ بلکہ قدیم دراوڑ لوگ بھی تھے۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چٹر جی کا یہ بھی کہنا ہے کہ ہندو مانتے ہیں کہ مرنے کے بعد انسان کا دوسرا جنم (پنر جنم) بھی ہوتا ہے۔ یہ عقیدہ قدیم آریوں نے قدیم دراوڑں سے سیکھا۔ بعض علماء کا کہنا ہے کہ رگ وید میں بلاواسطہ کچھ ایسی علامات ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے

کہ اُس قدیم زمانے میں بھی آریوں کا دوسرے جنموں میں اعتقاد تھا، باقی کئی بھرم، توہمات، جنوں بھوتوں سے متعلق خیالات، اور تعویذ گنڈھوں کے رواج انہوں نے دراوڑوں سے سیکھے۔ کمار سوامی نے بھی یہی بات کہی ہے، وہ فرماتا ہے کہ ہندستان کے ہندوؤں پر دراوڑوں کا اثر ہوا ہے۔ [1] الغرض، جنگوں میں دراوڑ لوگ آریوں سے سبقت لے گئے، تو، فنون، کاریگروں وغیرہ میں دراوڑ ان سے سبقت لے گئے۔ دراوڑں سے جیت کر، آریوں نے کہاں کہاں اپنی بیٹھکیں بنائیں، اور اپنی تہذیب کو کس طرح انہوں نے ترقی دی، اس کا تذکرہ علحدہ کیا جائیگا۔ یہاں اول دراوڑوں سے متعلق پھیلی ہوئی غلط فہمی کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

دراوڑوں سے متعلق غلط فہمیاں: قدیم ہندستان کی تاریخ پہلی دفعہ انیسویں صدی میں یورپی لوگوں نے مرتب کی، جیسا کہ کتاب کے ابتدائی اوراق میں کہا گیا ہے۔ جو مضمون یورپی لوگوں نے انگریزی میں لکھا، وہ ہی مضموں سندھی میں لکھا ہوا تاریخوں میں ملتا ہے۔ اس وقت ہندستان کی جو بھی تاریخ پڑھی جاتی ہے، اُسی میں یوں ہی لکھا ہوا ہے کہ قدیم غیر آریہ لوگ غیر مہذب اور شکل کے کالے تھے، اور آریہ لوگ ان سے زیادہ مہذب اور حسین وجمیل تھے۔ ایسی باتیں قدیم کولوں اور سنتھالوں سے متعلق کوئی کہے تو یہ دوسری بات ہے، باقی دراوڑوں سے متعلق یوں خبرداری سے کہا جائے، اگر اس بات کو تسلیم کیا جائے کہ مہن جو دڑو والی تہذیب دراوڑں کی ہے، تو پھر ان سے متعلق ہم نے جو کچھ تاریخوں میں پڑھا ہے وہ سب کچھ بھلانا پڑے گا، اور قدیم ہندستان کی تاریخ پھر از سرنو تیار کرنی پڑے گی۔ یورپی لوگوں نے اس طرح کی غلطیاں کیسے کیں، وہ کھول کر بتائی جائیں، کیونکہ قدیم ہندستان کی تاریخ کی شروعات ہی وادئ سندھ سے ہوتی ہے، اس لئے ہمارا اسی بات سے بڑا واسطہ ہے۔

رگ وید میں آریوں نے نفرت سے غیر آریوں کے خلاف توہین آمیز الفاظ استعال کئے ہیں، مثلاً، غیر آریوں سے متعلق انہوں نے کہا ہے کہ ''کتوں کی طرح بھیانک بھونک کر کے ہمیں ناس کرنے کے لئے آئے ہیں!'' (منڈل پہلا ۱۸۲،۴)۔ انہیں ''کرشن'' (کالا)، ''داس'' (غلام)، ''دسیو'' (چور یا رہزن) اور ''اناس'' (بے شرم) کہا گیا ہے۔ [2] یہ ایک فطری امر ہے کہ

(1) The historian of Indian and Indonesian Art, A. Koomar Swamy says; "Indian art and culture, in any case, are joint creation of the Dravidian and Aryan genius, or weilding together of symbolic and representative, abstract and explicit, language and thought".

(2) رگ وید میں ''اناس'' صرف ایک دفعہ (منڈل ۵، ۲۹، ۱۰) میں استعال ہوا ہے، اور صرف سندھی زبان میں نظر آتا ہے۔ شاید آچاریہ کے کہنے کے مطابق ''اناس'' لفظ اصل میں ہے ''عان'' معنیٰ ''نہ'' اور ''آس'' معنیٰ ''منہ''، اس لئے اناس معنیٰ جسے منہ نہ ہو (Mouthless) یعنی جسے زبان (سنسکرت) اچھی طرح بولنے نہ آئے۔ سندھی میں ''اناس'' کا تلفظ ہے ''اناسو'' یعنی جسکی ناک نہ ہو (یعنی بے شرم)۔ یورپی علماء نے بھی ''اناس'' کے معنیٰ کیے ہیں جس کی ناک نہ ہو (Noseless)۔

جب دو گروہ آپس میں لڑتے ہیں تو ایک دوسرے کے بارے میں ہتک آمیز الفاظ بولتے ہیں۔ لیکن یورپی علماء نے رگ وید میں ''اناس'' لفظ استعمال شدہ دیکھا تو اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ اشارہ دراوڑوں کی طرف ہے، جن کی ناک اکثر کشادہ ہوتی ہے، گویا کہ ان کے چہرے پر پھیلی ہوئی ہوتی ہے، جس وجہ سے لگتا ہے کہ ان کی ناک ہے ہی نہیں۔ رگ وید میں ''کرشن'' لفظ بھی استعمال شدہ دیکھا گیا، تو مزید برآں یوں سمجھنے لگے کہ دراوڑ لوگ جو اس وقت مدراس علاقے میں رہتے ہیں، اور شکل کے اکثر کالے ہیں، ان کے لئے یہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اسی طرح صرف اپنے دل سے قیاس آرائیاں نکال کر تاریخوں میں درج کیا کہ غیر آریہ لوگ ''کرشن'' (کالے) تھے۔ قدیم آریوں سے متعلق یوں بھی سمجھا گیا کہ وہ نہایت ہی سدھرے ہوئے تھے اور غیر آریہ لوگ ان سے کمتر تھے۔ اسی لئے انہیں ''داس'' اور ''دسیو'' کہا جاتا تھا۔ اسی طرح صرف قیاس آرائیوں پر عمارت کھڑی کردی، باقی انہیں کوئی بھی پکہ پختہ ثبوت نہیں تھا۔

رگ وید میں واضح طور پر درج ہے کہ غیر آریہ لوگ مال مویشی والے تھے اور ان میں سے جو بیوپاری (تاجر) تھے، وہ تو اور بھی زورآور تھے۔ گائیں، بھینسیں اور دوسرا مال مویشی بھی ان کے پاس بہت تھا اور لڑنے میں بھی پختہ تھے۔ رگ وید میں ''پر'' (شہر) اور ''درگا'' (قلعو) لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ غیر آریہ لوگوں کے شہر اور قلعے آریہ لوگوں نے آگ لگا کر جلائے اور اندر دیوتا کو ''پریندڑ'' یعنی قلعوں کو ناس کرنے والا کہا گیا ہے، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اندر دیوتا ہی کی مدد سے وہ غیر آریوں کے قلعوں کو نابود کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ لیکن رگ وید والے زمانے میں آریہ لوگ خود گاؤں میں رہتے تھے، جو آج بھی شہر سے باہر لوگ بستیوں اور گوٹھوں میں رہتے ہیں۔ اسی سبب سے علماء نے سمجھا کہ غیر آریہ لوگ جو آریوں سے کمتر تھے، وہ پھر شہروں اور قلعوں میں کیسے رہتے ہونگے؟ رگ وید میں ''پر'' اور ''درگا'' الفاظ استعمال شدہ بھی انہوں نے دیکھے، پھر بھی علماء یوں سمجھتے رہے کہ وہ شاید مٹی اور پتھروں کے بنے ہوئے گھر تھے، جن میں غیر آریہ لوگ وقت پر پناہ لیتے تھے۔ حاصل مطلب یہ کہ علماء مذہبی، پنگتی اور دیگر سب امور میں ہندستان کے قدیم باشندوں کا مان مرتبہ آریہ لوگوں سے کمتر شمار کرتے رہے۔ ہندستان کے ہندو بھی یورپی علماء سے اس رائے میں شامل ہو گئے، کیونکہ ہندو قدیم آریوں کی نسل میں سے ہیں اور قدرتی طور پر اپنی اصل نسل پر انہیں فخر ہے۔ دراوڑ لوگ آریوں کی نسل سے نہیں ہیں، اس لئے وہ ''ان آریہ'' (Non Aryans) کہے جانے لگے۔ اِسی ''ان آریہ'' لفظ کا تلفظ بعد میں تبدیل ہو کر ہوا ''اناڑی'' اور اب اس کے معنی ہیں ''غیر مہذب یا جنگلی''۔ اس طرح صرف غلط فہمی کے باعث لوگوں کے دلوں پر اثر بیٹھا ہوا تھا، کہ آریہ لوگ مہذب اور ان آریہ لوگ غیر مہذب تھے، ورنہ درحقیقت دراوڑ لوگ اُسی قدیم زمانے میں ہی نہایت مہذب لوگ تھے۔ اب اینسئکلپیڈیا برٹنکا کے حالیہ (چودویں) شمارے میں مہن جو دڑو اور وادیٔ سندھ کی تہذیب کا

تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ، آریہ لوگوں کے پاس شاید لوہے کے ہتھیار تھے، جس وجہ سے وہ غیر آریہ لوگوں سے جیت گئے، ورنہ غیر آریہ لوگ ان سے کسی بھی طرح کم نہیں تھے۔

سر جان مارشل بھی اپنی کتاب ''موہن جو دڑو'' میں مذکورہ بالا غلط فہمی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ بات کسی کے خواب خیال میں بھی نہیں تھی کہ پانچ ہزار سال قبل غیر آریوں کی تہذیب ایسے تھی، جیسی اب موہن جو دڑو میں سے نمودار ہوئی ہے۔ یہ تہذیب اس وقت کے مصر اور ایشیا کی مغربی تہذیب جیسی ہے اور بعض امور میں وہاں کی تہذیب سے بھی سبقت لے گئی ہے۔[1] مثلاً، کپاس سے کپڑا بننے کا فن اس قدیم زمانے میں صرف پنجاب اور سندھ میں تھا اور مصر ملک اور مغربی ایشیا مین دو تین ہزار برس بعد میں جاری ہوا تھا۔[2] رگ وید سے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ آریوں نے ہندستان میں آنے سے وادیٔ سندھ میں اعلیٰ درجے کی تہذیب دیکھی تھی، جس وجہ سے رگ وید کے منڈل دسویں کے سوکت پچہتر میں انہوں نے دریائے سندھ کی بڑی تعریف کی ہے۔ لگتا ہے کہ میرو پربت چھوڑنے کے بعد کئی آریہ لوگ آرمینیا کی طرف رہتے تھے اور لوہا مارنے کا ہنر وہاں سے سیکھے، کیونکہ آرمینیا آج تک دھاتوں کی کانوں کے باعث مشہور ہے۔ دراوڑ لوگ ابھی لوہا مارنا نہیں سیکھے تھے، اس لئے آریوں نے اپنے لوہی ہتیاروں سے جیت کر، وادیٔ سندھ اپنے قبضے میں کی تھی، ورنہ دوسری طرح دراوڑوں کوئی ثانی نہیں تھا۔ آج بھی مدراس علاقے کے ائر، آینگر، نئڈو اور دوسرے خاندانوں والے اعلیٰ درجے کے انسان ہیں، اور راجگو پال آچاریہ اور ستیہ مورتی جیسے جوان ہند کے ستارے کہلاتے ہیں۔ ان کے آباء واجداد سے متعلق یورپی لوگوں کی غلط فہمیاں تاریخوں کے وسیلہ سے پھیلانا بلکل نامناسب بات ہے۔ اس بات کا خاص طور پر اس لئے تذکرہ کیا گیا ہے، کیونکہ مدراس علاقے کے رہنے والوں نے تاریخ میں لکھی ہوئی غلط باتوں پر اعتراضات کیے ہیں۔ جن یورپی علماء نے شروع میں ایسی غلط باتیں پھیلائیں، ان پر انہوں نے سخت تنقید کی ہے، کیونکہ ہندوؤں کے مذہبی کتب میں درج تھیں انہوں نے اس وقت پوری طرح سمجھی ہی نہیں تھیں۔[3]

☆

(1) Many fanciful theories started over a hundred years ago have w alterations tossuit later so called ethnological conclusions, been ar repeated by later writers; and they are now put down in ordinary te they are all proved history. The fact, however, is that no Eur correctly understood Indian Vedic Literature, nor the true origin the caste system which has played such a great part in the ' civilisation..." M. Krishnamacharya, see "Pre-Mussalman Indi Introduction, P. 17.

(2) "A marvellous culture surpassing in many respects the s Mosopetamia" Sir John Marshall.

(3) Sir John Marshall: Mohen-Jo-Daro and the Indus Civilizati

باب ٦

رگ وید والا زمانہ

دریائے سندھ کا تذکرہ: سندھ میں سندھو کی تعریفیں: سندھ کی تاریخ سندھو کی تعریفوں کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔ ہندوؤں کے رگ وید سے قدیم پستک پوری دنیا میں دوسرا کوئی بھی نہیں، اُسی ہی میں دیکھ لیں کہ سندھ سے متعلق یوں درج ہے:

> ''سندھ گھوڑوں سے مالامال، رتھوں (گاڑیوں) سے مالا مال، کپڑے بستر سے مالا مال، عمدہ بنے ہوئے زیورات سے مالا مال، کھانے پینے کی چیزوں سے مالا مال اور ہمیشہ تازہ اُونَ سے مالا مال۔ ''سلما'' پودا یعنی ''مبج'' وغیرہ، جس سے بان اور رسیاں بنتی ہیں، وہ پودے بھی سندھ میں بہت ہیں اور خوش قسمت سندھو کے کنارے شہد دینے والے پھولوں سے آراستہ ہیں!'' (رگ وید منڈل دسواں سُوکت ۷۵)۔ (1)

ان چند ایک الفاظ کے بہت بڑے معنی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ گھوڑے، گاڑیاں، عمدہ بنے ہوئے زیورات اور کپڑے، جو تہذیب کی شاہی چیزیں ہیں، وہ قدیم سندھی لوگوں کے پاس دستیاب تھیں۔ رگ وید والے زمانے میں ہی سندھ کی تہذیب ایسے اعلیٰ درجے کو پہنچی ہ[...] تھی، جو اُس وقت کے آریوں نے یوں تعریفی کلمات کہے ہیں، اور سندھ سے متعلق اس ق[...] تعریفیں اپنے اس مذہبی پستک میں کی ہیں۔

قدیم سندھ کی تہذیب اس قسم کے اعلیٰ درجے کو دریائے سندھ کی عنا[...] پہنچی تھی، اس لئے قدیم آریوں نے دریائے سندھ کی تعریف کی مذکورہ بالا الفاظ کہے ہیں۔ اس تعریف کا مضموں لمبا اور دلچسپ

[...]ich in chariots, rich in clothes, rich in gold [...]ich in wool ever fresh, abounding in Silama [...]ey-growing flowers." Reg. Veda X, 75.

کہ ''اے سندھو، جب تو میدانوں میں سے بہتی ہے، تب بے شمار کھانا اپنے ساتھ لاتی ہو، (یعنی تیرے پانی سے بڑی مقدار میں فصلیں ہوتی ہیں) تیرا پانی اُتم ہے۔ اے سندھو، اگر تیری خوبصورتی کا موازنہ کیا جائے تو تُو نو نویلی دلہن جیسی ہو۔ سندھو تم سدا جوان اور سدا خوبصورت ہو وغیرہ۔''

جس رشی نے یہ تعریف کی ہے، اس نے جو اپنے شاعرانہ خیالات اس نمونے سے ظاہر کئے ہیں، وہ اگرچہ اپنی جگہ پر بہت اچھے ہیں، تو بھی اس کی اس تعریف کی مزید قدر جغرافیہ کے لحاظ سے کرنا پڑتی ہے۔ سندھو کے ساتھ اُس وقت کون سی ندیاں آ کر ملتی تھیں، جو پانی سے اسے بھر دیتی تھیں، ان کے جو نام اس نے لکھے ہیں وہ اگرچہ اس وقت سب کے سب کی پہچان مشکل ہے، جو کئی ہزار برس بعد میں یونانی تاریخ نویسوں نے لکھے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس رشی کو اس وقت کے ندیوں کے نظام کا بلکل پوری طرح پتہ تھا، اور وہ ندیوں کا نظام اُسی طرح اس نے لکھا ہے، جو گویا کہ اس وقت اس نے ٹرگنا میٹیکل پڑتال (Trignometrical Survey) کی تھی۔ ملاحظہ ہو، وہ کہتا کیا ہے؟

''اے سندھو، پہلے تو ترشتما (Trishtama) سے مل کر بہتی ہے اور پھر سسرتو (Susartu) اور رسا اور سویتی (سوات Swat River) سے۔ تو کبھا (کابل ندی)، گومتی (گومال Gomal)، میہتنو (Mehtanu) اور کرمو (Krumn) (Kurum River) کے ساتھ مل کر بہتی ہے!''

اس سے ظاہر ہے کہ کرمو، گومتی (گومال) اور کبھا یا کابل ندی، جسے یونانی تاریخ نویسوں نے کوفن (Kophen) کہا ہے، یہ اس وقت بہتی تھیں، اور یہ دریائے سندھ کو بھرنے والی شاخیں ہوا کرتی تھیں اور جموں دویپ میں رہنے والے آریوں نے انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

دریائے سندھ اتنی ساری ندیاں آ کر ملتی تھیں، تو اس وقت دریائے سندھ میں پانی کتنا ہوا کرتا تھا، اس کا بھی آنکھوں دیکھا احوال اس رشی نے دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ''سندھو کی گرج زمین سے اٹھتی ہے، اور اس سے آسمان بھر جاتا ہے! سندھو نہایت زور سے بہتی ہے، اور وہ سندر دکھتی ہے، (نہایت خوبصورت لگتی ہے)۔''

اس کے پانی کی آواز ہوتی ہے، جو دل کو یوں لگتا ہے، جیسے گویا کہ برسات کے پرنالے گرج کر برس رہے ہیں۔ دیکھو سندھو بیل کی طرح ڈکارتی آ رہی ہے!''

''اے سندھو، جس طرح دودھ دیتی گائیں دودھ سے بھرے تھنوں کے ساتھ اپنے بچھڑوں کی طرف دوڑتی ہیں، اسی طرح دوسری ندیاں علحدہ علحدہ جگہوں سے پانی لے کر تمہاری طرف ڈکارتی ہوئی آتی ہیں!''

رگ وید میں جس رشی نے یہ الفاظ کہے ہیں، اس نے، جس وقت سندھو، کو بھرنے والی ندیوں کو سندھو کی طرف بہتے ہوئے دیکھا ہے، اس وقت تشبیہہ استعمال کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ''اے سندھو، جس طرح کوئی راجا جنگ کرنے کے لئے نکلتا ہے، اور اس کے پیچھے لشکر ہوتا ہے، اسی طرح تو بھی (شاہی شان و شوکت سے) ندیوں کے آگے پیشوا بن کر چلتی ہے، اور دوسری ندیاں بھی پلٹن بن کر تیرے پیچھے اس طرح چلتی ہیں، جو گویا کہ ایک ہی رتھ میں سوار ہو۔''

اس رشی نے پھر گنگا، جمنا، سرسوتی اور درشدوتی ندیوں کے گن گا کر پنجاب کی پانچ ندیوں کی تعریف کی ہے۔ مطلب یہ کہ شمال مغرب سرحد، آگرہ اور اوُدھ کے مشترکہ علاقوں اور پنجاب کی ندیوں کی ایک ہی سوکت (۷۵) میں جائزہ لیا ہے؛ لیکن سندھو کی تعریف کرتے ہوئے اس کا پیٹ نہیں بھرا۔ پھر اس نے کہا ہے کہ ''سندھو تو اجیت ہے، (کسی کے جیتنے والی نہیں)، وہ سیدھی بہتی ہے۔ اس کا رنگ سفید اور روشن ہے (پانی اس کا میلا سا نہیں ہے)، اور وہ بڑی ندی ہے۔ اس کے پانی میں تیزی بہت ہے اور چاروں طرف سیلاب لاتی ہے، جو بھی متحرک چیزیں ہیں، وہ اتنی تیز رفتار نہیں ہیں، جس طرح یہ سندھو ہے!'' دیکھا کس طرح کا ٹھیک ٹھیک اور دلپذیر بیان اس نے لکھا ہے!

اس وقت دریائے سندھ پنجاب کی ندیوں سے الگ ہونے کے بعد مٹھن کوٹ کے مقام پر سے ایک ہی ایک ندی ہو کر، سندھ کی طرف آتی ہے؛ لیکن رگ وید والے زمانے میں بہت ساری شاخیں بن کر آتی تھی، اس لئے رگ وید کے اُسی منڈل دسویں (سوکت ۷۵) میں یوں بھی کہا گیا ہے کہ ''اے سندھو، ورن دیوتا تیرے بہنے کے لئے بہت ہی راستے بنائے ہیں۔'' یہ الفاظ نہ صرف دریائے سندھ کے بالائی (شمال، مغرب سرحد علاقے والے حصے)، لیکن نشیبی حصے سے بھی لاگو ہیں، جس کے لئے پارسیوں کے مذہبی پستکوں میں سے بلکل پکا پختہ ثبوت ملتا ہے۔

زنداوستا میں سندھو کا تذکرہ: پارسیوں کے زنداوستا اور دوسرے مذہبی پستکوں میں سلسلہ ہمالیہ جبل کو ''البورز'' (بالائی پہاڑ) کہا گیا ہے، اور وہاں سے جو ندیاں بہتی ہیں، ان میں سے دو کو اہم بتا کر لکھا گیا ہے۔ ایک ''وہ'' (Veh) ندی اور دوسری ''ارنگ''، جس سے متعلق ڈاکٹر مارٹن ہاگ نے لکھا ہے کہ اسے ''آمی'' (Ami) بھی کہا جاتا تھا۔ اس پچھلے نام ''آمی'' سے سمجھا جاتا ہے کہ یہ ''آمو دریاء'' (Oxus) تھی، اس لئے اس بات کا تذکرہ چھوڑ کر، باقی صرف ''وہ'' کا ذکر کیا جاتا ہے۔

زنداوستا میں زردشت کو اہرمزد (بھگوان) بتاتا ہے کہ میں نے پہلے فلاں مقامات اور پھر فلاں مقامات خلق کیے۔ اسی طرح جہان کی پیدائش کا ذکر کرتے ہوئے ''وہ'' ندی کا نام

لکھا ہے۔[1] پارسیوں کی بندہش (Bundahish) نامی کتاب میں مسٹر ویسٹر گیرڈ کی شائع کردہ زنداوستا میں سے حوالے دے کر، ڈاکٹر مارٹن ہاگ (۱۸۲۷۔۱۸۷۶ع) میونچ یونیورسٹی کے سابقہ سنسکرت پروفیسر ''وہ'' ندی سے متعلق جو نوٹ لکھا تھا وہ یہاں پر ویسے کا ویسا درج کیا جاتا ہے۔[2]

اسی نوٹ سے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ زنداوستا جو ''وہ'' لفظ وہی ہے، جس کا تلفظ موجودہ فارسی زبان میں ہے ''بہہ'' معنی ''اچھا'' (''بہتر'' معنی اس سے بھی اچھا یا دوسروں سے اچھا)، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ سندھو کا صفاتی نام ہے، جو قدیم ایران میں مروج تھا۔ اسی ہی نوٹ کے مطابق ''بندہش'' میں سندھو کا دوسرا نام ''مہرا'' لکھا ہے، جس سے سمجھا جاتا ہے کہ یہ لفظ اصل میں ہے ''مہران''۔ یہ دریائے سندھ کی الگ ایک شاخ تھی، جو مشرقی نارے، نشیبی پران اور کورے کھاری سے بہہ کر کچھ کے خلیج میں جا گرتی تھی۔ ''بندہش'' میں اگر ''مہران'' کی بجائے ''مہرا'' لکھا ہوا ہے تو اسے سہو کاتب (Clerical error) کہا جائے گا۔ اسی طرح ہندوؤں کے پرانوں میں بھی کہیں کہیں غلطیاں کی گئی ہیں، اور یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قدیم ایرانی لوگ ''مہران'' کی بجائے کہتے ہی ''مہرا'' تھے یعنی آخر میں ''ن'' کا تلفظ کرتے ہی نہیں تھے۔ بہرحال اتنا یقین کر لینا چاہئے کہ ''مہرا'' وہی لفظ ہے جس کا سندھ میں اس وقت بھی صحیح تلفظ ''مہران'' ہے۔ اسی ہی نوٹ کے مطابق دریائے سندھ کا تیسرا نام ''کاسک'' تھا۔ ہندوؤں کے پرانوں سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ کاشی (بنارس) کا شہر، جن کاشی آریوں کے نام پیچھے پکارا جاتا ہے، ان کا ایک بڑا جد امجد ''کاسک'' تھا، جس وجہ سے بنارس یا کاشی کو ''کاشکا'' بھی کہتے تھے۔ لیکن ان کاشی آریوں کا نام ''سندھو'' پر کس حساب سے پڑا یہ پتہ کہیں سے بھی نہیں چل سکتا۔ اگر مہران کی طرح ''کاسک'' بھی پہلے سندھ کی طرح ایک الگ شاخ ہوتی تھی، تو

(1) The eleventh of places and Districts produced perfect by me, who am Ahurmazd, was Het-homand (Hetumand, in Sistan) the illustrious and glorious; busy and deligent in the spirit which is subdued, some say that of the Veh river, Pahlavi Vendidad 1, 14.

(2) "The Veh (or good) river is one of the two chief rivers of the world, according to Bundahish, which states (Page 49 Westergaard's edition of the Avesta text) that 'these two rivers flow forth from the north part of the eastern Alborz, one towards the West, that is the Arang, (and) one towards the east, that is the Veh 'river'. The spirits of the two rivers are also mentioned Bundahish, Page 50). and further particulars are given, thus (Bundahish, Page (51). 'The Veh river passes by on the east, goes through the land of Sind (and) flows to the sea in Hindustan and they call it there the Mehra river.' and in page 53 it is stated that the Veh river is also called the Kasak in Sindh." Dr. Marton Haug: Essay on the Sacred Language, Writings and Religion of the Parsis, P. 361.

اس میں بھی کوئی عجب نہیں۔ جیسا کہ اس بات کی تحقیقات آج تک کسی بھی عالم نے نہیں کی، لہٰذا اس سے متعلق مزید کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اتنا صرف یہاں بتایا جاتا ہے کہ مہران یا ہاکڑو، جسے کچھ پارسی مورخین نے ''واہندہ'' بھی کہا ہے، وہ اُسی قدیم زمانے سے لے کر میاں غلام شاہ کلہوڑو کے دور تک، مشرقی نارے کے شکم سے بہہ کر، تحصیل ڈیپلے کی جنوب کی طرف، کچھ کے رن کے نزدیک، موجودہ نشیبی علاقہ ''پران'' میں جا کر گرتا تھا۔ ''پران'' لفظ کے معنی ہیں پرانا دریاء''، پران میں مشرقی نارہ آ کر گرتا تھا تو وہ پھول کر بہتی تھی اور کچ کے رن کا کچھ حصہ سرسبز کر کے، کوری کھاری سے بہہ کر، لکھپت کی دوسری جانب سے گذر کر، کچ کے نار میں جا کر گرتی تھی۔ میاں غلام شاہ کلہوڑو نے پران کی اس جانب ایک پشتہ تعمیر کروایا تا کہ اس کا پانی سندھ ہی میں رہے، اور لکھپت کی طرف نہ جائے۔ لکھپت کی دھان کی فصل کا دارومدار ہی اسی پانی پر تھا، جس وجہ سے کچ کے رائے کو لاکھوں کا نقصان پہنچا۔ سن ۱۷۵۸ع سے پہلے سندھو نصرپور کے مقام پر سے بہتی تھی۔ اسی سال وہاں سے اس نے اپنا رخ تبدیل کیا، تو اس طرف پانی آنا کم ہو گیا۔ سنہ ۱۸۱۹ع میں خوفناک زلزلہ ہوا تو مہران یا ہاکڑو مزید خشک ہو گیا۔

☆

باب ۷

آریوں کے خاندان اور بیٹھکیں

رگ وید والا ہندستان: رگ وید سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم آریہ لوگ سات دریاؤں کے کنارے پانی کی سہولت کے سبب آباد کیے ہوئے بیٹھے تھے، جس وجہ سے ان کا آباد کیا ہوا ملک ''سپت سندھو'' یعنی سات دریاؤں والا کہلاتا تھا۔[1] بعض علماء کو رگ وید سے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ ان سات دریاؤں میں سے پانچ دریاء پنجاب والے تھے، چھٹا سرسوتی اور ساتواں سندھو، جس میں دریائے سندھ کو بھرنے والی دریاء (Tributaries) یعنی کابل دریاء، گومتی (گومال)، سوات اور کرم بھی شمار کیے جاتے ہیں، وہ اس وقت بہتے تھے اور دریائے سندھ میں آ کر ملتے تھے۔ دریاؤں کے سارے نام رگ وید کے منڈل دس میں درج ہیں۔ ان میں گنگا اور جمنا نام بھی درج ہیں، لیکن وہ بہت بعد میں مشہور ہوئے اور پاک شمار کیے جانے لگے۔ پہلے صرف سرسوتی دریاء پاک شمار کیا جاتا تھا اور دریائے سندھ بڑا اور اہم تھا، اس لئے رگ وید میں بڑی تعریف صرف ان ہی کی لکھی ہوئی ہے۔ ان دریاؤں کے کناروں پر آریوں کی جو بیٹھکیں تھیں، ان میں سندھ، پنجاب، کشمیر اور گندھار (قندھار) یعنی موجودہ پشاور اور اس کے اردگرد والا علاقہ (موجودہ افغانستان اور بلوچستان کی حدود تک) شامل تھے۔ آریوں کی ان بیٹھکوں سے ہی بہت پہلے، سور جونسی گرانے والے ایودھیا میں، اور جندر ونسی گھرانے والے پرتیستھان (الٰہ آباد) میں راج کرتے تھے، لیکن یہ علاقے رگ وید والے ہندستان میں شمار نہیں کیے گئے، کیونکہ اس وقت شاید اس طرف غیر آریہ لوگ زیادہ تھے۔ بنگال، بہار اور دوسرے مقامات پر بھی اکثر غیر آریہ قومیں رہتی تھیں، جو بھی بعد میں آریوں کے زمرہ میں شمار ہونے لگیں۔ سپت سندھو میں رہنے کی وجہ سے آریوں کا ملک ''سندھو'' کے نام سے مشہور ہوا۔ سندھ کا علاقہ بھی ''سندھو'' کہلاتا تھا، جس کا تلفظ بعد میں تبدیل ہو کر ''ہندو'' ہوا، اور رفتہ رفتہ سارا ملک ہندستان کہا جانے لگا۔ سرسوتی دریاء اور دریائے سندھ کے بیچ والا ملک رگ وید کے منڈل تیسرے (۴،۳۳) میں

(1) عربی جغرافیہ نویسوں نے بھی اسی سبب سے اسے ''سبع سین'' یعنی ''سات دریاء'' کہا ہے۔

(''دیوکرت یونی'' (Devkrtayoni) کہا گیا ہے، جس کے لفظی معنی ہیں ''دیو یا بھگوان کا بنایا ہوا ملک'' (God fashioned country)۔ مطلب یہ کہ یہ ملک ایسا ہرا بھرا اور خوش قسمت تھا، جو گویا کہ خدا نے اس پر خاص عنایت کی نظر کی تھی، جس کی وجہ سے آریوں نے اسے یہ نام دیا۔

سندھ میں سورج ونسی: آریوں میں ایک سورجونسی تو دوسرے چندرونسی تھے۔ سورجونسی گھرانے سے پہلا راجا اِکشوا کو تھا، جس کا دارالخلافہ ایودھیا تھا، جو نام آج کل ''اَوَدھ'' پر ہے۔ اکشو اکو کی بہن کا نام ''اِلا'' تھا، جو بدھ سے بیاہی ہوئی تھی۔ بدھ کے باپ کا نام ''سوم'' (چاند) تھا، اس لئے اس خاندان سے تعلق رکھنے والے چندرونسی کہلاتے تھے۔ چندرونسی گھرانے سے پہلا راجا پرورس تھا، جس کا دارالخلافہ ''پرتسیتھان'' (Pratisthana) تھا، جو آج کل الٰہ آباد کہلاتا ہے۔ راجا پورس اور اس کی اولاد کو ''آئل'' (Aila) یعنی ''اِلا'' کہا جاتا تھا۔ یہ میرو پربت سے ہمالیہ جبل کے بیچوں بیچ والے راستے سے شمالی ہندستان میں آئے تھے۔ یہ بات پرانوں میں درج ہے۔ یہ ایک عظیم سند ہے، جس پر مدار رکھتے ہوئے ہم نے کہا تھا کہ آریہ اصل میں ہندستان کے باشندے نہیں تھے؛ بلکہ میرو پربت سے آئے تھے۔(1)

سندھ کا واسطہ دونوں گھرانوں سے ہے۔ یہاں پہلے اتنا درج کیا جاتا ہے کہ سورجونسی گھرانے والے جن میں سے راجا اکشواکو سے بہت بعد میں راجا دسرتھ اور سری رامچندر پیدا ہوئے، وہ قدیم زمانے میں سندھ میں بھی تھے۔ اس بات کا علم یوں ہوا ہے:

نہایت قدیم زمانے میں سندھ میں ''پاتال'' نامی ایک بندرگاہ تھی، جس کا پرانوں میں تذکرہ موجود ہے۔ ۳۱۵ برس ق۔م سکندرِ اعظم کے وقت میں بھی یہ بندرگاہ اہم تھی، چنانچہ یونانی مورخین نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے، اور نام بھی وہی ''پاتال'' بندرگاہ لکھا ہے۔ اس سے متعلق جو اتے پتے انہوں نے دیے ہیں، ان سے صاف ظاہر ہے کہ یہ بندرگاہ موجودہ کراچی ضلع والے لاڑ علاقہ میں ہے، جہاں سے سندھو دریاء دو شاخیں بن کر بہتی تھی۔ یہ دو۔۔دریاہی آج تک گھوڑا

---

(1) What does tradition say about the origin of the Ailas or Aryans? It makes the Aila power begin at Allahabad, and yet dictinctly suggests that they came from outside India. The legends and fables about the progenitor Pururavas Aila, all connect him with the middle Himalayan region. He was closely associated with the Gandharvas. His wife Urvasi was a Gandharvi, as well as called an apsaras. The places he fequented were the river Manda Kini (مندا کنی) Alaka "الکا" the Caitraratha and Nandnna forests, the mountains Gandhamadana (گندھمادنا) and Meru and the land of the Uttara-Kurus regions to which the Gandharvas were assigned. From the Gandharvas he obtained sacrified fire, his sons were known in the Gandharva world, and he untimately became united with the Gandharvas." F.E.Pargiter: Ancient Indian History Tradition P. 297.

باری تحصیل میں ہے، جہاں سے دریاء کی ایک شاخ کیٹی بندر اور دوسری شاخ شاہ بندر کی طرف جاتی ہے؛ لیکن پہلے سمندر بہت اُس طرف یعنی ٹھٹہ کی طرف یا اور بھی شاہ کپور کی طرف سمجھا جائیگا، جہاں سے پہلے دریاء بہتا تھا۔ میجر جنرل ہیگ نے اپنی کتاب ''انڈس ڈیلٹا کنٹری'' (Indus Delta Country) کے صفحہ ۲۰ میں اسی پاتال بندر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ڈیلٹا سے ایک کہانی ملی ہے جس سے سمجھا جاتا ہے کہ اکشواکو نسل والے (سورجونسی) اِسی پاتال بندر میں رہتے تھے، اور آریہ لوگوں کی سب سے قدیم بیٹھکیں سمندر کے پہلو میں تھیں۔ مطلب یہ کہ سری رامچندر کے آباء و اجداد کسی وقت سندھ میں بھی تھے۔ میجر جنرل ہیگ نے یہ بتایا ہی نہیں کہ یہ ایودھیا طرف کے آریہ لوگ سندھ میں کس حساب سے آئے، لیکن پران اور اتہاس اسی بات پر کچھ روشنی ڈالتے ہیں۔

پرانوں کے مطابق راجا اکشواکو کے مربی بیٹے وکُکسی ششاد (Vikuksi Sasada) نے ایودھیا میں راج کیا۔ اس کا دوسرا بیٹا نیمی (Nimi) نامی تھا، جسے ''ودیہہ'' (Videh) بھی کہتے تھے۔ اس نے نیپال سے لے کر مگدھ (بہار کے جنوبی حصہ) کے شمال مشرق کی طرف تک اپنی حکومت قائم کی تھی، اور وہ سارا ملک اس کے نام پیچھے ''ودیہہ'' کہلاتا تھا۔ اکشواکو کا ایک بھائی نابھا نیدشت (Nabhanedishtha) تھا، جس کی اولاد سے ''وشال'' نامی ایک راجا نے موجودہ مظفر پور ضلع والا حصہ اپنے قبضے میں لے لیا، اور وہاں اس کا جو دارالخلافہ تھا، وہ اس کے نام پیچھے ''وِئشالی'' کہا جانے لگا۔ اکشواکو کا دوسرا بھائی شریاتی تھا، جس کی اولاد سے ''آنرت'' نامی ایک راجہ موجودہ گجرات والا حصہ اپنے قبضے میں لیا، اس لئے گجرات والا حصہ اس کے نام پیچھے ''آنرت'' کہلاتا تھا۔ اس سے دیکھنے میں آئے گا کہ سورجونسی گھرانے والے صرف ایودھیا میں ہی نہیں تھے، لیکن اپنی حکومت کی حد انہوں نے بہت بڑہائی تھی، پرانوں میں اگرچہ یہ نہیں لکھا کہ سندھ کا علاقہ بھی ان کے قبضے میں تھا یا نہیں، تو بھی رامائن سے اتنا ظاہر ہے کہ سری رامچندر کے باپ راجا دسرتھ کا سندھ کے ساتھ بہت ہی گہرا ناتہ تھا۔ بڑی بات یہ کہ راجا دسرتھ کے بعد سندھ کا حاکم ہی سری رامچندر کا بھائی بھرت تھا۔ بدھ دھرم والے زمانے میں سندھ کا دارالخلافہ ''وِئشالی'' تھا۔ یہ اگرچہ بعد کی باتیں ہیں، پھر بھی ان سے اتنی یقین دہانی ضرور ہوتی ہے کہ سندھ کا ناتہ کچھ عرصے کے لئے سورجونسی گھرانے والوں سے واقعی تھا۔

راجا اکشواکو خواہ اس کا بھانجہ راجا پُرورس کسی نہایت قدیم زمانے میں گذر چکے ہیں۔ رگ وید میں راجا پُرورس کے پڑپوتوں اور ترپوتوں کا ذکر ملتا ہے؛ لیکن رگ وید میں سے ہی تمام آریوں کی تہذیب اور دوسری باتوں کا بڑی حد تک پتہ چلتا ہے۔ اتہاس اور پرانوں میں سے

تاریخ کے لئے بہت ہی ذخیرہ ملتا ہے، اس لئے اب خود یورپی لوگ ان مذہبی پستکوں کا بہت قدر کرتے ہیں،[1] اور اپنی تصنیف کردہ تاریخوں میں اول رگ وید والے احوال دیتے ہیں۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا اور دیگر تاریخیں، جنہیں اسناد سمجھا جاتا ہے، وہ ساری اسی طرح بنائی گئی ہیں۔ ان کے بنائے جانے کے بعد بھی کئی مزید تحقیقات ہوئی ہیں، اس لئے وادیٔ سندھ کے احوال ان بلکل تازہ تحقیقات کے مطابق دیے جاتے ہیں۔

رگ وید میں زیادہ تر ذکر چندرونسی گھرانے کے راجاؤں کا ملتا ہے، لیکن ان کا نسل در نسل احوال اتہاسوں اور پرانوں میں درج ہے، اس لئے ہم بھی اسے ملا کر لکھیں گے تاکہ ان کی تاریخ کو سمجھنا آسان ہو۔ پرانوں میں سے یہ بھی ظاہر ہے کہ جن آریوں نے وادیٔ سندھ میں اپنی حکومتیں قائم کیں، وہ اصل میں ہمالیہ جبل کی اُس طرف، بلکل شمال کے طرف ٹھنڈے ملک میں میرو پربت پر رہتے تھے، پھر جب وادیٔ سندھ میں آ کر انہوں نے اپنی بیٹھکیں بنائیں، تب ہندستان ان کا آستھان یا وطن شمار ہونے لگا۔[2]

چندرونسی آریوں کے خاندان: رگ وید میں درج چندرونسی گھرانے والے آریہ لوگ الگ الگ خاندانوں میں بٹے ہوئے تھے، جن میں سے پانچ خاندانوں والے لوگ اہم تھے، جس وجہ سے ''پنج جن'' یعنی پانچ جنے یا پانچ قوموں والے (Five folks or five peoples) رگ وید میں بہت دفعا استعمال ہوا ہے۔ مطلب یہ کہ چندرونسی گھرانے والوں کی پانچ اہم شاخیں تھیں، اور ہر شاخ والے اپنے کسی بڑے جد امجد کے نام پیچھے پکارے جاتے تھے۔ ان پانچ شاخوں میں ایک کہلاتے تھے یدو (یادؤ یا جادؤ ونسی)، اور دوسرے تروسو، تیسرے پروٗ، چوتھے آنوٗ، اور پانچویں درہیو۔ یہ کون تھے، یہ بات رگ وید میں درج نہیں ہے؛ لیکن اتہاسوں اور پرانوں میں سے ان کا سربستہ احوال ملتا ہے۔

راجا پرورس، جس سے متعلق اوپر پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ اس نے چندرونسی گھرانے کی بنیاد ڈالی تھی، اس کا پڑپوتہ راجا ییاتی تھا، جس کی دو رانیاں تھیں: ایک کا نام ''دیویانی'' تھا، جو

(1) "The Hindu statements have almost universally been regarded as very different from the fictions of an improved and credulator people and entitled to a very serious and profound investigation." Historians History of the World, Vol. II. P. 495.

(2) "At the first dawn of the traditional history we see that these Aryan tribes, migrating across the snow of Himalyas southwards the "Seven Rivers" (the Indus, the five rivers of the Punjab and the Sarasvati), and ever since India has been called thier home. That before this time they had been living in more northers regions, within the sme precincts, with the ancestors of the Greeks the Italians, Slavonians and Celts, is a fact as firmly established as that of the Normans of William the Conqueror were the Northern Scandinavians". Prof. Max Muller: Chips from a Germa Workshop, Vol. I. p. 63.

آسروں کے گروُ شکر آچاریہ کی بیٹی تھی، اور دوسری کا نام ''سرمشٹھا'' تھا، جو دیتوں، دانوں اور اسروں کے راجا ''ورس پرون'' (Varsparuan) کی بیٹی تھی۔[1] راجا یایاتی ۔ رانی دیویانی سے دو بیٹے یدو اور تروسو، اور رانی سرمشٹھا سے تین بیٹے درہیو، انو اور برو تھے۔ ان پانچ بیٹوں کی اولاد ان ہی کے نام پیچھے پکاری جاتی تھی۔ مطلب یہ کہ یہ ''پنچ جن'' اصل میں ایک ہی دادا کی اولاد تھے؛ لیکن بعد میں بہت سارے نسل آ گئے تھے، اس لئے رگ وید میں ان کو الگ الگ خاندانوں کا کہا گیا ہے۔ ان خاندانوں کی بھی الگ الگ شاخیں تھیں۔ کچھ اپنے قریبی دادا تو کچھ اپنے دور کے دادا کے نام پیچھے کہلاتے تھے۔ اسی طرح فی الجملہ تقریباً چالیس خاندانوں کے نام رگ وید میں درج ہیں؛ لیکن ان میں سے پھر بھی اہم ''پنچ جن'' تھے۔ یہ ''پنچ جن'' والا خیال اس وقت ''پنچائت'' لفظ میں سمایہ ہوا ہے؛ جس کے اصل معنی تھے ''پانچ جنوں کا گروہ''۔

سندھ میں جادوُونسی: قدیم آریہ لوگ الگ الگ وقتوں پر جتھوں کی صورت میں ہندستان میں آئے تھے۔ زبانوں پر تحقیقات سے علماء کو یوں سمجھ میں آ رہا ہے کہ کچھ آریہ لوگ وسطی ایشیا سے آرمینیا کی طرف سے اول ایران کی طرف گئے، اور بعد میں جبل جھیل کر اور دُروں سے گذر کر ہندستان میں آئے۔ پرانون کے مطابق، راجا پروروس، جس نے چندرونسی گھرانے کی بنیاد ڈالی، وہ ہمالیہ جبل کے بیچوں بیچ والے راستے سے آیا تھا۔ اسی خاندان میں سے راجا یایاتی کے دو بیٹوں یدو اور تروسو کی اولاد سے متعلق رگ وید میں درج ہے کہ وہ سمندر کے راستے آئے تھے، اور اندر دیوتا نے ان کو اپنے کرم سے سلامتی سے پہنچایا تھا۔[2] اس سے متعلق تحقیقات کرنے سے یورپی علماء کو یقین ہو چلا ہے کہ یہ یدو اور تروسو آریہ لوگ بابل یا بئبلان (بئبلونیا) سے سمندر کے راستے پہلے سندھ میں آ کر رہائش پذیر ہوئے تھے۔ پہلے اسی طرف سے لوگ کشتیوں اور جہازوں میں چڑھ کر، ایرانی خلیج کے کنارے کنارے دریائے سندھ کے چھوڑ کرنے

(1) دیت، دانو اور اسر در اصل قوموں کے نام تھے، جیسا کہ مہا بھارت میں درج ہے، ان قوموں کے خلاف بعد میں آریوں دل میں نفرت آ گئی، جس وجہ سے ان الفاظ کو پھر برے معنی ملے۔ ابو پہاڑ کے آس پاس ''شالو'' لوگ رہتے تھے، ان کو انہوں نے دانو اور دیت کہہ کر پکارا۔ اتھرو وید میں خواہ پارسیوں کے زنداوستا میں ''دانو'' لفظ ان دشمنوں کے لئے استعمال ہوا ہے، جن کے ساتھ جنگ کرنی چاہئے۔ ''اَسر'' (اہر) نام ایرانیوں کے لئے استعمال ہوا ہے، اس لئے شکر آچاریہ ایرانی آریوں کا گرو کہا جا سکتا ہے۔ ہندستان اور ایران والے آریہ لوگ اصل ایک ہی برادری تھے، اور بعد میں وہ علحدہ دو قومیں ہوئیں۔ جیسا کہ اوپر پہلے ہی کہا جا چکا ہے؛ نیز ملاحظہ ہو پارجیٹر صاحب والی کتاب صفحہ ۲۹۰ اور ڈاکٹر مارٹن ہاگ کے پارسی مذہب سے متعلق مضمون صفحہ ۲۷۹۔

(2) The roaring Indra, dravest on the waters that make a roaring sound like rushing rivers. What time, O Hero, o'er the sea thou broughtest, in safety broughtest, Turvasu and Yadu." Reg Veda VI-20, 12. Griffith's Traslation.

کے مقام پر آ کر اترتے تھے۔ ان تحقیقات کے بڑے بڑے مضمون رایل ایشیاٹک سوسائیٹیوں کے جنرلوں میں درج ہیں۔ جس سے تھوڑا سا مضمون سنہ ۱۹۱۰ع میں کراچی کے ڈی۔ جی سندھ کالیج مسیلنی میں چھپ کر شایع ہوا ہے۔[1] اس سے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ یدو اور تروسو آریہ لوگ وسطی ایشیا سے اول مغربی ایشیا کی طرف پھیل گئے تھے، اور پھر وہاں سے سمندر کے راستے سندھ میں آئے تھے، یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہندستان میں آنے کے بعد اُدھر گئے تھے اور سمندر کے راستے لوٹے تھے۔ بہرحال اتنا یقین سے کہا جائے گا کہ رگ وید والے زمانے میں ہی آریہ لوگ سمندر میں سفر کرتے تھے اور پروفیسر میکڈونیل کا کہنا ہے کہ رگ ویدک آریوں نے سمندر دیکھا ہی نہیں تھا، یہ بلکل غلط بات ہے۔

یدو آریہ لوگ راجا یدو کی اولاد تھے، اس لئے یادوَ (جادوَ) اور یادوَ ونسی (جادوَ ونسی) یعنی راجا یدو کی اولاد کہلاتے تھے۔ سری کرشن بھی جادوَ ونسی خاندان سے تھا، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اس کے آباء و اجداد اصل میں کچھ عرصہ سندھ میں تھے۔ جیسلمیر کے بھٹی راجپوت، اور سندھ، کچھ اور کاٹھیاواڑ کے سما راجپوت بھی جادوَونسی خاندان میں سے ہیں۔[2]

رگ وید موجب یدو آریہ لوگوں کے ساتھ دوسرے تروسو آریہ لوگ سمندر کے راستے آئے تھے۔ ان سے متعلق پرانوں میں لکھا ہے کہ انہوں نے بعد میں جنوبی ہندستان میں جا کر اپنی حکومتیں قائم کیں، جو پانڈیہ، چول، کیرل وغیرہ ناموں سے مشہور ہوئیں۔[3] شمالی ہندستان کے کچھ آریوں اور جنوبی ہندستان کے چول لوگوں نے بعد میں بئبلونیا میں دوسری اطراف بیٹھکیں بنا کر، یورپ تک تجارت کرتے رہے، یہ باتیں باب بارویں میں بتائیں گے۔

دوسرے آریوں کی بیٹھکیں: یدو اور تروسو آریوں کے علاوہ دوسرے ''پروَ'' آریہ لوگ تھے۔ نہایت قدیم زمانے میں ان میں سے بھرت نامی ایک نامور راجا گذرا ہے، جو راج

---

(1) "We know from recent historical research that before the Aryan conquest, Sind was peopled by the tribes of Yadus and Turvasus." D.J. Sindh College Miscellency, monsoon term issue of 1910, p. 82.

(2) گرنارکوٹ کا حاکم رءِ ڈیاچ سندھ (ننگر ٹھٹہ) کے چوڑا سما راجپوتوں میں سے تھا، اسی لئے شاہ کے رسالے میں اُسے ''جادم'' یا جادوَونسی کہا گیا ہے۔

''پسي پات پر تيو، سندو جادم جود.''
(شاھ)

سندھ کے حاکم جام تماچی کا بھتیجہ (جام اوڈھو کا بیٹا) جکھرو تھا، اُسے بھی شاہ صاحب نے ''جادم جکھرو'' کہا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کو علم تھا کہ سما راجپوت جادوَونسی خاندان سے تھا۔ اس لئے اُس نے انہیں ''جادم'' (جادوَ) کہا ہے۔ (مصنف)

(3) F.E. Pargiter: Ancient Indian Historical Tradition, P. 108.

دشینت، اور شکنتلا کا بیٹا تھا، جس نام پیچھے سارا بھارت بر اعظم پکارا جاتا ہے۔ پرو آریوں میں سے کچھ اپنے اس دادا کے نام پیچھے خود کو ''بھرت'' آریہ لوک کہلاتے تھے۔ رگ وید والے زمانے میں ان میں سے کچھ شتدری (ستلج)، تو کچھ سرسوتی دریاء کنارے رہتے تھے۔

''پنج جنن'' میں سے چوتھے ''آنو'' آریہ لوگ تھے، جو ''انو'' یعنی راجا انو کی اولاد کہلاتے تھے۔ رگ وید والے زمانے سے یہ لوگ پرشنی دریاء کے کنارے رہتے تھے، جسے بعد میں ''اراوتی'' یعنی تازگی بخش یا فرحت کن کہا جاتا تھا، اور اب اس کا تلفظ تبدیل ہو کر ''راوی'' ہو گیا ہے۔

پنج جنن میں سے پانچویں ''درہیو'' آریہ لوگ تھے، جو آنو آریوں کے قریبی چچازاد بھائی تھے۔ ان درہیو آریوں میں سے ایک کا نام گندھار تھا، جو موجودہ پشاور اور اس کے اردگرد علاقوں پر راج کرتا تھا۔ اس کا دارالخلافہ، اسی کے نام پیچھے ''گاندھار۔۔گندھار'' کہلاتا تھا، جس کا تلفظ بعد میں تبدیل ہو کر ''قندھار'' بنا۔ یہ درہیو آریہ لوگ پشاور اور اس کے اردگرد دریاء سندھ کے معاون دریاؤں (کابل ندی وغیرہ) کے کناروں پر آباد تھے۔ مطلب یہ کہ قدیم آریہ لوگ اول صرف سندھ، پنجاب اور شمال مغرب سرحد علاقہ پر قبضہ رکھے ہوئے تھے، اور یہی رگ وید والے زمانے کا ہندستان شمار کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اوپر پہلے ہی کہا جا چکا ہے۔ اس وقت سندھ کی حدود کیا تھیں، اس کا کوئی علم نہیں، لیکن تہذیب ہر جگہ ایک ہی تھی۔

آریوں کی زبان میں تبدیلی: قدیم تمام آریوں کی مادری زبان سنسکرت تھی؛ لیکن ہندستان میں آنے کے قبل کئی جگہوں پر بھٹکتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور مختلف انواع کی قوموں سے تعلقات قائم کیے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ہندستان میں آنے کے بعد بھی ان میں سے بعض سندھ میں تو بعض پنجاب میں، تو بعض شمال مغرب علاقوں میں تو بعض کچھ دیگر مقامات پر رہتے تھے۔ ان باتوں کا پہلا اور اہم اثر ان کی زبان پر ہوا۔ اس وقت سارا ہندستان چندرو ونسی گھرانے کے راجا بھرت کے نام پیچھے باھرت بر اعظم کہلاتا ہے، اس لئے یوں سمجھنا ہی چاہئے کہ بھرت آریہ لوگ، جو پرو آریوں کی شاخ میں سے تھے، وہ پنج جنوں میں اوپر تھے؛ اور ان ہی کی زبان خالص تھی؛ لیکن رگ وید میں دوسرے آریوں نے انہیں کہا ہے ''مردھ رواچ'' (Mrdhra--Vacha) یعنی جن کی زبان پورے طور پر سمجھ میں نہ آئے (رگ وید، منڈل ساتواں ۱۸، ۱۳)۔ یہی لفظ رگ وید کے منڈل پہلے (۱۷۴، ۱۲)، منڈل پانچویں (۳۲، ۱۸) اور منڈل دسویں (۲۳، ۵) میں غیر آریہ قوموں کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ دوسرے آریوں سے پرو (بھرت) آریہ لوگوں کے غیر آریہ لوگوں سے بہت قریبی تعلقات تھے،

جس وجہ سے دوسرے آریہ لوگ اگرچہ ان کے قریبی رشتیدار تھے، پھر بھی ان سے ان کی زبان زیادہ تبدیل تھی، اس لئے انہیں "مردھ رواچ" کہا گیا ہے۔

مذہبی ریتوں رسموں میں فرق: آریوں کی نہ صرف زبان میں فرق تھا، لیکن مذہبی رسوم میں بھی فرق تھا، مثلاً: سری کرشن کے آباء واجداد، جو یدو آریہ (جادوٗ ونسی) تھے، اور ان کے قریبی رشتیدار جنہیں "ترسو" آریہ کہا جاتا تھا، ان کو رگ وید میں دوسرے آریوں نے نفرت سے "داس" کہا ہے، کیونکہ وہ کچھ وقت ویدوں کو نہیں مانتے تھے۔ (رگ وید، منڈل دسواں)۔[1]

ان کی پوجا میں بھی فرق تھا۔ جو آریہ ویدک مذہب کے تھے، وہ اندر دیوتا کی پوجا کرتے تھے۔ جو ویدک مذہب کے نہیں تھے، وہ اندر پوجا کے خلاف تھے۔ وہ پھر لنگ کے پوجاری تھے، اور "شیسنہ" اور "شیشنہ دیوا" کہلاتے تھے یعنی جن کا "اِشٹ دیوٗ" (Chosen Deity) "شیشنہ" (Phallus) ہو۔ ویدک مذہب والے لنگ کی پوجا کے بلکل خلاف تھے، اس لئے رگ وید میں لنگ کے پوجاریوں کے لئے انہوں نے نفرت کا اظہار کیا ہے، اور انہیں "اَکرمن" (بلا کریا کرم) (Riteless)، "ابراہمن" (Without devotion)، "آدیویہ" (Indefferent to Gods)، "آیجنیہ" یعنی یگیہ نہ کرنے والے (Not sacrificing) اور دیگر تلخ ناموں سے پکارا گیا ہے۔[2] الغرض لنگ کے پوجاریوں کا مذہب اندر کے پوجاریوں سے بلکل علحدہ تھا۔

لنگ کے پوجاری: کئی یورپی علماء کو تحقیقات کرنے سے معلوم ہوا ہے کہ دنیا میں ساری پوجاؤں سے لنگ کی پوجا کا رواج نہایت قدیم ہے۔[3] قدیم مصر ملک کے باشندے اور قدیم یونانی اور رومن لوگ "پریپس" (Priapus) کو پوجتے تھے۔ قدیم بت پرست یہودی "بیئل پیور" (Baal Peor) کو، اور بعض قدیم لوگ "بچوس" (Bachhus) کو پوجتے تھے۔ یہ سارے دیوتا سمجھے جاتے تھے، لیکن وہ سب لوگ لنگ کی پوجا کرتے تھے۔

یورپی علماء کا یہ بھی کہنا ہے کہ لنگ کی پوجا اس قدیم زمانے کی ہے، جس میں لوگ بلکل ناسمجھ ہوتے تھے، اور یوں سمجھتے تھے کہ قادر اور اس کی قدرت نے یہ جہان اسی طرح پیدا کیا ہے، جس طرح مرد اور عورت کے ملاپ سے بچہ پیدا ہوتا ہے۔ اسی سبب لنگ کو دیوتا سمجھ کر پوجنے لگے۔

(1) "The Yadus and the Turbases were designated as Dasas, because they had seceded from the Vedic faith for a time." (Reg. Veda X, 62, 10). Quoted by Dr. A. C. Das: Reg. Vedic Culture Page 128.

(2) "The Yadus and the Turbases were designated as Dasas, because they had seceded from the Vedic faith for a time." (Reg. Veda X, 62, 10). Quoted by Dr. A.C.Das: Reg. Vedic Culture page 157 and 164.

(3) Forlong: Rivers of Life, Vol. II. P. 38 et seq.

قدیم دراوڑ لوگ لنگ کے پوجاری ہوا کرتے تھے، جیسا کہ رگ وید سے معلوم ہوتا ہے۔ حالیہ مہن جو دڑو سے کئی لنگ ملے ہیں، یہ بات سر جان مارشل نے لکھی ہے۔ مصنف کو یوں سمجھ میں آتا ہے کہ یہ دراوڑ تھے، جو وادیٔ سندھ سے پہلے جنوبی ہندستان کی طرف گئے، اور پھر مغربی ایشیا اور یورپ کی طرف تجارت کی خاطر بیٹھکیں قائم کیں، اور اُسی طرف لنگ کی پوجا کا رواج بھی جاری کیا، یہ وجہ ہے جو ناروے اور اسکینڈ ینیویا کی طرف مہادیو کے مندروں کے آثار ملے ہیں، یہ حقیقت پرفیسر نلسن نے لکھی ہے۔

آریوں میں جو ''آنو'' آریہ تھے، انہوں نے بھی شاید قدیم دراوڑ لوگوں کے ساتھ تعلقات ہونے کے باعث لنگ کی پوجا کا رواج اختیار کیا۔ حقیقت جو بھی، لیکن یہ بات پکی ہے کہ جو انو آریہ لوگ تھے، ان کی شاخ والے خود کو ''شوی'' آریہ لوگ کہلاتے تھے، اور وہ لنگ کے پوجاری ہوا کرتے تھے، جیسا کہ رگ وید میں لکھا ہے۔ پھر جیسا کہ ڈاکٹر اناش چندرداس نے لکھا ہے، کہ ان شوی آریوں کے نام کے پیچھے لنگ کی پوجا کا نام ہی ''شو کی پوجا'' پڑ گیا۔ (1)

آریوں کی مذہبی رسوم اور پوجا میں فرق تھا، اول تو انہیں ایک دوسرے سے نفرت تھی، اور وقتی ایک دوسرے سے لڑتے بھی تھے؛ لیکن وادیٔ سندھ میں بعد میں ایک دوسرے سے بنا کر بیٹھے اور امن وسکون کے ساتھ اپنی تہذیب کا پھیلاؤ کیا۔ مہا بھارت والے زمانے دوران لنگ کی پوجا بلکل عام ہوگئی تھی، اس لئے لنگ کے پوجاریوں کی طرف پھر کوئی بھی نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا۔ (2) موجودہ ہندوؤں میں سے بھی کئی وشنو بھگوان تو کئی شو بھگوان کے پوجاری ہیں، اور لنگ کی پوجا کرتے ہیں۔ اسی طرح قدیم زمانے سے لے کر ہندو قوم مختلف انواع کی تہذیب کو جذب کرتی آئی ہے۔

☆

(1) Dr. A.C.Das: Reg. Vedic Culture, p. 166.

(2) "Phallus worship was probably of prehistoric age in India, and by the time of the Mahabharat it had won its way into the orthadox Hindu culture." The Cambridge history of India Vol. I. P.85.

باب ۸
آریوں کی تہذیب کا اوائلی احوال

تہذیب کے تین زمانے: رگ وید کے منڈل (Cycles) علحدہ علحدہ زمانوں کے مرتب کیے ہوئے ہیں۔ خود رگ وید میں تین زمانوں کا تذکرہ ہے: قدیم، وسطی اور آخرین۔ (منڈل تیسرا، ۳۲، ۱۳ اور منڈل چھٹا، ۲۱، ۵)۔[1] اِن منڈلوں میں اگرچہ مذہبی باتیں ہیں، تاہم اِن میں سے پنگتی اور ملکی باتوں کا بڑی حد تک پتہ چلتا ہے۔ ان میں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آریوں کی تہذیب کے بھی اہم تین زمانے تھے۔ قارئین کو پوری بات سمجھنے میں آسانی خاطر ہم نے تین زمانوں کو مندرجہ ذیل طریقے سے تقسیم کیا ہے:

۱۔ جس میں آریہ لوک ''ڈِت''☆ اور شکار پر گذارا کرتے تھے۔

۲۔ جس میں آریہ لوک موشیوں کے غلے رکھنا سیکھے تھے۔

۳۔ جس میں آریہ لوک کھیتی کرنا سیکھے تھے۔

درحقیقت تمام مہذب قوموں نے اِسی طرح ترقی کی ہے؛ لیکن مویشی اور کھیتی کی فکر قدیم آریوں میں کچھ ایسے خیالات پیدا کیے، جو دوسری اقوام کے ذہنوں میں نہیں آئے۔ قادر اور قدرت اور زندگی کے مسائل سے متعلق سوچ بچار بھی وہ اپنے نمونے سے کرتے تھے۔ ان تمام وجوہ کی بنا پر ہندو تہذیب ایک ہی قسم کی ہوگئی، اور ہندو مذہب ہی علحدہ ہو گیا۔ مندرجہ بالا زمانوں کا یہاں الگ الگ تذکرہ کیا جاتا ہے، تاکہ تہذیب کے ارتقائی عمل کو سمجھنے میں آسانی ہو، اور یہ بات بھی سمجھ میں آجائے کہ ہندو قوم دوسری اقوام سے کس طرح انوکھی ہوئی۔

''ڈِت'' ڈتھ اور شکار: ''قدیم تہذیب کی ابتدا'' کا تذکرہ کرتے ہوئے، باب اول میں پہلے ہی لکھا گیا ہے کہ قدیم حجری زمانہ میں ساری دنیا میں برف زیادہ گرتی تھی۔ جس وجہ سے کھیتی کرنا

(1) "There were three distinct ages-- the Ancient, the Mediaeval and the later" - during which the Reg Vedic mantras were composed (Reg Veda III, 32, 13, VI, 21, 5)". Dr. A.C.Das: Reg Vedic Culture, p. 40.

☆ ''ڈِت'' ڈتھ۔ جھنگلی اناج، میوہ وغیرہ۔

ناممکن ہوتا تھا، اور لوگ ''ڈت'' (جنگلی اناج اور میوہ وغیرہ) پر گذارا کرتے تھے۔ رگ وید والے بلکل اوائلی زمانے میں بھی قدیم آریہ لوگ ڈتھ کھا کر پیٹ بھرتے تھے، اور یہی دستور تھر، کوہستان اور دیگر مقامات کے غریب لوگ آج تک جاری رکھے ہوئے ہیں۔

قدیم زمانے میں بڑی مقدار میں برف گرنے کے سبب درخت اور پودے ختم جاتے تھے، جس وجہ سے جنگلی پیدائشیں ''ڈت'' کتنا عرصہ ہوتی ہی نہیں تھیں۔ آج کل پالا اتفاقاً پڑتا ہے، تو بھی تھر میں دیکھیں کسی سال برسات نہ ہونے کی وجہ سے درخت اور پودے ختم ہو جاتے ہیں، جس وجہ سے مال مویشی مکھیوں کی طرح مرجاتے ہیں، فاقہ کشی میں لوگوں کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ ان کے پیٹ ان کی پیٹھوں سے جا لگتے ہیں اور اتنا شدید قحط پڑ جاتا ہے کہ وہاں سے حقیقتاً خون کی بوء آتی ہے۔ اب قارئیں خود تصور کر سکیں گے کہ قدیم زمانے میں بڑی مقدار میں برف گرنے کی وجہ سے درخت اور پودے ختم ہو جاتے تھے اور جنگلی پیدائشیں کتنا عرصہ ہوتی ہی نہیں تھیں، تو لوگوں کی کیا حالت ہوتی ہوگی۔ برف پڑے یا قحط پڑے، تب بھی پیٹ تو کسی کو نہیں چھوڑتا۔ ایسے حالات میں قدیم آریوں میں مچھلی اور گوشت کھانے کا رواج پڑ گیا۔ مہا بھارت میں درج ہے کہ آج کل والی چار ذاتیں بعد میں وجود میں آئیں، ورنہ اصل میں ایک ہی ذات تھی، اور سارے آریہ لوگ برہمن تھے؛ لیکن ''پیٹ بری بلا'' ہے! ایک ضرب المثل بھی ہے کہ ''سات فاقوں بعد کتا بھی حلال'' ہے۔ دوسری قدیم اقوام کی طرح یہ براہمن (قدیم آریہ لوگ) بھی شکار کر کے اپنا پیٹ پالنے لگے۔

قدیم زمانے میں شکار کس طرح پکڑتے تھے؟ یہ طریقہ لوگوں کو قدرت نے سکھایا۔ باز اور دوسرے بڑے پرندے چھوٹے پرندوں کا شکار کرتے ہیں۔ یہ نمونہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر، پرندوں کے شکار کے لئے لوگ باز پالنے لگے۔ یہ قدیم زمانے کا دستور سندھ میں خواہ دوسرے مقامات پر آج تک جاری ہے۔

''سو پيي ڌارم شڪرو جنهن کي پک نہ پر''

(شاھ)

[وہ باز نہ پال جس کے پر نہ ہوں]

شکرہ، چیپک، سیچانو، بحری، باشو، بشین اور دوسرے کئی قسم کے باز آج تک لوگ پالتے ہیں۔ اس وقت سندھ میں اکثر مسلمان شوق کی خاطر (نہیں کہ بھوک کی خاطر) باز پالتے ہیں۔

کتے بھی شکار کو پکڑتے ہیں، اُن میں سے تازی کتہ شکار پکڑنے کا ماہر ہے۔ قدیم لوگوں نے کتوں کو شکار پکڑتے ہوئے دیکھا تو خود بھی شکار کے لئے کتے پالنے لگے۔ آج تک بعض لوگ

شکار کرنے کے لئے اپنے ساتھ کتوں کی بڑی تعداد اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ پالتو کتے قدیم لوگوں کی جان کی حفاظت بھی کرتے تھے۔ جنگلی جانور جب ان پر حملہ کرتے تھے، تو ان پر کتوں کو چھوڑتے تھے۔ الغرض پرندوں میں اول باز اور جانوروں میں سے اول کتا انسان ذات کے لئے کارآمد ہوئے، جن میں سے کتا آج تک انسان کے دروازے کا دربان ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں میں دیکھیں کہ لوگ کچی جھوپڑیوں میں بغیر کسی چٹخنی اور تالے کے رہتے ہیں، اور پولیس کا پہرہ بھی ان کے لئے نہیں ہوتا، پھر بھی رات کو بے فکر سو جاتے ہیں۔ کتے ان کے دروازوں پر کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ جب کسی اجنبی کو دیکھتے ہیں تو دور ہی سے اس پر بھونکنا شروع کردیتے ہیں اور اگر نزدیک آئے تو اس کی ٹانگ کاٹ دیں۔ رگ وید میں کتوں کا بہت ہی تذکرہ ملتا ہے۔ قدیم لوگوں کو شکار پکڑنے اور اپنی جان کی حفاظت کے لئے ہتھیاروں کی بھی ضرورت محسوس ہوئی۔ جالیاں بھی بناتے تھے، جن کے وسیلہ سے شیروں کو بھی پھنسا سکتے تھے۔ (رگ وید منڈل پانچواں)۔

ہتھیار: تمام جانداروں کو قدرت والے نے اپنی جان کی حفاظت کے لئے کوئی نہ کوئی ہتھیار فراہم کر دیا ہے۔ شیر، ریچھ، باز کو اگر کوئی نقصان پہنچانے کے لئے جائیگا تو اُسے پنجہ مارینگے، کتہ اُسے کاٹ دے گا اور بلہ اُسے خراشیں ڈال دے گا۔ آدمی آدمی کو مارے گا، تو دوسرا اُسے مکے اور لاتیں ماریگا یا دانت سے اُسے کاٹیگا۔ ایک ضرب المثل بھی ہے کہ ”کاٹنے والے سے لات مارنے والا مقابلہ کرے!“۔ یہ اوائلی ہتھیار ہیں۔ لوگوں نے بعد میں اپنے ہوش سے کام لیتے ہوئے دوسرے ہتھیار بھی استعمال کئے۔ جنگلی جانوروں اور پرندوں کو بھگانے کے لئے کچھ آسان طریقے بھی انہوں نے استعمال کئے۔ بعض اوقات انہیں منہ سے ہانک دیتے تھے، یا تالی بجا کر ڈراتے تھے، یا پتھر مار کر بھگاتے تھے۔ اگر یہ تدبیریں ناکافی ثابت ہوتی ہیں تو کسی درخت سے لاٹھی توڑ کر، یا کسی لئے درخت کی شاخ توڑ کر، ان سے جنگلی جانوروں کو مار کوٹ کر بھگا دیتے تھے۔ اسی طرح ان کے اہم ہتھیار تھے پتھر، پتلی سی چھڑی اور لئی یا بانس کی لاٹھیاں۔ لگتا ہے کہ ہاتھ میں لکن اور لاٹھی لے چلنے کا رواج اِسی طرح شروع ہوا۔[1]

جنگلی جانوروں اور پرندوں کو بھگا کر ہٹانے کے لئے درخت کی لاٹھی یا کوئی لاٹھی تب استعمال کی جائیگی جب وہ قریب آ جائے گا، تو کیوں نہ اُسے دور ہی سے بھگا لیا جائے؟ اس لئے دور ہی سے پتھر پھینک کر مارنے کا رواج تھا۔ بعد میں لوگوں نے اپنے عقل سے کام لے کر کھنبھانیاں بنائیں، تا کہ پتھر اور دور پھینکنا آسان ہو جائے، اور کسی جنگلی جانور یا دشمن کو اپنے

(1) "The broken branch became the first weapon. It was the fathe of all clubs." Prof. Henry Drummond: The Ascent of Man, Chapter VI.

نزدیک ہی نہ آنے دیا جائے۔ آج بھی پرندوں کو بھگانے کے لئے کسان لوگ کھانبھانیاں اور مٹے کے گولے عام طور پر استعمال کرتے ہیں۔ رگ وید میں پتھروں، ہڈوں، سینگوں اور بعض دھاتوں میں سے بنے ہوئے ہتھاروں کا تذکرہ ملتا ہے۔ مثلاً، گھوڑے کی پسلی کا ہڈی (''آشو پرشو'') کلہاڑا یا درانتی کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ لوگوں نے پھر اور اپنی عقل سے کام لیتے ہوئے کمانیں اور تیر بنائے، جو پہلے صرف پرندوں کے شکار کے لئے استعمال کرتے تھے۔ وادیٔ سندھ میں رہنے والے قدیم آریہ لوگ وہ ہتھیار کس طرح بناتے تھے، یہ معلومات کچھ قدیم الفاظ کی مادوں سے حاصل ہوتی ہے، جو آج تک سندھی زبان سنبھالے ہوئی ہے، اس لئے ان الفاظ کی بڑی قدر کرنا پڑتی ہے۔

سر جو سندو سڄڻين، سينگ منجهان سيلو،
تينگر تکيو کينکي، پار لنگهيو پيلو،
هٽڙ سين حيلو، جانب جيڏو ئي کيو.
(شاھ)

[کچھ ایسا کس کے تونے تیر مارا
کہ لگتے ہی جگر کے پار پہنچا
تجھے میں نے مرے بھولے شکاری
بڑا مشاق تیر انداز پایا۔]
(ایاز)

سر یمن کلیان داستان تیسرا

یہاں پہلا ہی پہلا لفظ ہے ''سر''، جو رگ وید کے منڈل پہلے (۱۰۰، ۱۸)، منڈل دوسرے (۱۲، ۱۰)، منڈل چوتھے (۳، ۷) اور دیگر منڈلوں میں استعمال کیا گیا ہے، اس لئے کہا جائے گا کہ شاہ صاحب نے اپنے شعر میں یہ نہایت قدیم زمانے کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مذکورہ بالا بیت میں ''سر'' کے معنی ہیں ''تیر''؛ لیکن اصل میں یہ سر کا کانہ ہے، جس کی گھاس کو کوٹ کر ''مج'' بنا کر، ان میں سے رسیاں بناتے ہیں، اس لئے سنسکرت خواہ سندھی میں ''سر'' لفظ کے یہ دونوں معنی ہیں۔ نہایت قدیم زمانے میں کانوں سے تیر بنانے کا رواج عام تھا، اس بات کی گواہی کچھ اور الفاظ سے بھی ملتی ہے۔

تیر کے لئے دوسرا سندھی لفظ ہے ''کان''، جو اصل میں ہے سنسکرت لفظ ''کانڈ''، جس کے دوسرے معنی ''ڪانو'' (سرکنڈا) کے ہیں۔ الغرض ''ڪان'' اور ''ڪانو''، ایک ہی مادہ کے الفاظ ہیں اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے ''ڪانو'' سے تیر بناتے تھے۔ یہ رواج

ایران میں بھی تھا۔ پارسی میں ''کلک'' معنی قلم اور دوسرے معنی ''تیر''، سندھی میں ''کلک'' معنی سرکنڈے سے بنا ہوا قلم، جس سے لکھا جاتا ہے؛ لیکن جب کہا جائے ''کرک'' تب اس کے معنی ہوئے ''تیر'': اسی طرح لفظ ایک ہی ہے، مگر اس کا تلفظ بدلا ہوا۔

«هنيم هوت ڪرڪ، لوڏيان لوهه نه نڪري.»

(شاهه)

[ہوت (محبوب) نے جو تیر کس کے مارا

باوجود کوشش کے وہ لوہا (تیر) سینے سے نکل نہ پایا۔]

سرکنڈا یا اور کوئی بھی اس طرح کی چیز کو تیر کی طرح پھینکا جائیگا تو وہ پرندے کو مار نہیں سکے گا، تو پھر کانوں سے شکار کس طرح کرتے تھے؟ اس بات کا علم ''سیلو'' لفظ سے ہوتا ہے، جو شاہ صاحب نے بھی مذکورہ بالا شعر میں استعمال کیا ہے۔ یہ اصل میں سنسکرت لفظ ''شلیہ'' ہے، جو رگ وید کے منڈل چھ (۷۵، ۱۱) میں استعمال ہوا ہے۔ سنسکرت میں اس کے ایک معنی ہیں ''تیر'' اور دوسرے معنی ہیں ''کانٹا''، یا ایسی چیز جو جسم کے اندر گھس کر ایذاء پہنچائے۔ اب ظاہر ہے کہ قلم یا سرکنڈا، جو تیر کے طور پر کام میں لاتے تھے، اس میں کانٹا یا کوئی تیز نوکدار ہڈی وغیرہ اس میں لگاتے تھے اور وہ پرندے کو ایذاء پہنچاتی تھی۔

تينگر تڪيو ڪينڪي، پار لنگهيو پيلو،

(شاهه)

''پیلو'' اصل میں ہے سنسکرت لفظ ''پیلوٗ''، جس کے معنی ہیں ''تیر''۔ اس کا مادہ یا بنیاد ہے ''پیل'' (Peel) معنیٰ روکنا، چھوڑنا یا بدحواس کرنا۔ اب اچھی طرح سمجھ میں آئیگا کہ سرکنڈے میں کانٹا یا کوئی نوکدار چیز لگا کر، وہ تیر کی طرح پھینکتے تھے تو اس کے لگنے سے پرندہ اڑنے سے رک جاتا تھا یا بدحواس ہو جاتا تھا، اور پھر اُسے آسانی سے پکڑا جا سکتا تھا۔

تیر کے لئے کمان ضروری ہے۔ ''کمان'' پارسی لفظ ہے۔ اس کے لئے خالص سندھی لفظ ہے ''سینگت''، جس کے بنیادی معنی ہیں ''سینگ سے بنا ہوا''۔[1] اس لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ کُنڈِھی بھینس، جس کا سینگ مڑا ہوا ہوتا ہے، یا ہرن وغیرہ کا مڑا ہوا سینگ، پہلے کمان کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ کمان کے لئے ہماری پاس ایک دوسرا لفظ ہے ''چاپ'' جو خالص سنسکرت

(1) سنسکرت لفظ ''شرنگ'' کا سندھی تلفظ ہے ''سنگ'' (Horn) اور اس سے ''شارنگ'' لفظ بنا ہے، جس کا سندھی تلفظ ہے ''سینگت''؛ لیکن اس کے بنیادی معنی ہیں ''سینگ سے بنا ہوا''۔ سندھی میں ''سنگ'' کا تلفظ تبدیل ہو کر ''ھنگ'' بھی ہوا ہے، اور اس کے معنی ہیں ''سوکھی ادرک''، جو ہرن کے سینگ کی طرح پیچدار ہوتی ہے۔ سنسکرت میں بھی ''شارنگ'' لفظ کے معنی ہیں ''سنگھ'' خواہ ''ھنگھ''۔ (مصنف)

لفظ ہے اور اسکے بنیادی معنی ہیں ''بانس کی مڑی ہوئی لکڑی''، جیسا کہ پروفیسر آپٹی والی سنسکرت ڈکشنری میں درج ہے۔ اسی طرح ان الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم لوگ کسی جانور کا مڑا ہوا سینگ یا بانس کی مڑی ہوئی لکڑی، کمان کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ قدیم لوگوں نے یہ آسان راستے اختیار کرکے تیر کمان بنائے تاکہ پرندوں کا شکار آسانی سے ہو سکے۔ الغرض ضرورت کے وقت یہ فن سیکھے اور پھر اس میں مزید ترقی کی۔ اگر ہاتھ لگا ہوا شکار کوئی آدمی یا جانور ان سے چھیننے آئے، یا کوئی جنگلی جانور خود انہیں کھانے کے لئے آئے، تو سرکنڈوں سے بنے ہوئے تیر کس طرح ان کا بچاؤ کر سکتے تھے؟ ایسی حالت میں مضبوط تیر بنانے کی ضرورت محسوس کی گئی۔

پنجاب اور سندھ کے قدیم آریہ لوگ بعد میں لڑائیوں میں بھی وہ مضبوط تیر استعمال کرنے لگے؛ لیکن اول تیروں کی نوک کو کسی زہر سے گیلا کر دیتے تھے، (اتھروید منڈل چوتھا ۶، ۷۷؛ منڈل پانچواں ۱۸، ۸ اور بھیٹیو رگ وید منڈل چھٹا ۷۵، ۱۵)۔ اس تیر لگنے سے کسی کو محض رگڑ آ جاتی تھی، تو بھی زہر خون میں جذب ہو کر اگلے کو مار دیتی تھی۔ یہ زہر ملانے کا رواج آفریقا میں بہت تھا، جس کی کئی ایک مثالیں مسٹر ہینری سٹنلی نے دی ہیں۔[1] لوگ نے بعد میں تانبہ، لوہا وغیرہ مارنا سیکھا، تو عام طور پر تیروں کی نوک اسٹیل میں سے بناتے تھے۔ رگ وید کے منڈل چھٹے (۷۵، ۱۱) میں ''ایومکم''، (Ayo-Mukham) لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے معنی ہیں لوہے کی نوک والا۔ اس سے ظاہر ہے کہ رگ وید والے زمانے میں ہی اسٹیل کی نوک والے تیر استعمال ہوتے تھے۔ یہ رواج پھر کلہوڑوں کی حکمرانی تک مسلسل جاری رہا، اس لئے شاہ صاحب نے بھی کہا ہے کہ:

''پنھونءَ جي پيڪان جون راسيون منجهان رڪ.''

(شاھ)

[میرے پنہوں (محبوب) کے تیر کی انی (نوکِ تیر) فولادی ہے۔]

جیسے جیسے وقت گذرتا گیا، ویسے ویسے وادئ سندھ کے باشندوں نے تیر اندازی میں حیرت انگیز ترقی کی۔ اس بات کا زیادہ تر تذکرہ مہا بھارت اور بعض پرانوں میں ملتا ہے، جو رگ وید والے زمانے سے بہت بعد میں مرتب ہوئے، اس لئے ان کا ذکر بعد میں کرینگے، یہاں صرف اتنا بتایا جاتا ہے کہ رگ وید والے زمانے میں قدیم آریوں کے پاس جو اسٹیل کی نوک والے تیر ہوا کرتے تھے، ان کے ساتھ پر بھی باندھ دیتے تھے، تاکہ اُن کی رفتار تیز ہو جائے، پکھ باندھا ہوا تیر تیزی سے چمکتا ہوا، کڑکڑ کرتا ہوا جاتا تھا۔ یہ بات رگ وید کے منڈل چھٹے کے سُوکت ۷۵ میں درج ہے۔ الغرض شکر کرنے کے لئے لوگوں نے پہلے ایسے ویسے تیر کمان

(1) Henry Stanley: Through Darkest Africa.

بنائے اور پھر بعد میں انہوں نے تیر اندازی میں حیرت انگیز ترقی کی۔ لوگ بعد میں غلے چارنا سیکھے۔ اس مال مویشی نے کسی قدر ان کا حوصلہ بڑہایا، یہ احوال نہایت ہی اہم ہے۔

غلے رکھنے کا رواج: قدیم لوگ پہلے ڈتھ اور شکار پر گذارا کرتے تھے، تو یہ گویا ایک خدائی خوراک تھی۔ کبھی کبھار پالا گرنے کے سبب پیڑ اور پودے گل سڑ جائیں، تو ''ڈتھ'' بھی نہیں مل سکتا۔ شکار بھی کسی وقت ہاتھ لگے تو کسی وقت نہیں لگے، پھر بھی پیٹ تو نہیں چھوڑیگا۔ پھر تو لوگ بھوک میں پاگل ہو کر ایک دوسرے کا گوشت نوچ لیں گے اور آدم خور ہو جائیں گے۔ آدم خوری کی بنیاد بڑی ہی بھوک سے ہے۔ اس سبب کہا جا سکتا ہے کہ مال مویشی نے انسان ذات پر بہت ہی بڑا احسان کیا ہے، جو اس نے لوگوں کو آدم خور ہونے سے بچایا اور ترقی کی راہ پر قدم بڑھوایا۔

لوگوں نے پہلے کون سے اور بعد میں کون سے مویشی پالے، یہ بات کسی بھی کتاب میں واضح طور پر درج نہیں ہے؛ لیکن یجر وید جی تیتسر یہ براہمن گرنتھ (۱۷۷، ۱، ۴۔۔۶) سے اشارہ ملتا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ ''پرجا پتی (برہما) نے لوگوں میں پہلے براہمن خلق کئے اور جانوروں میں بکریاں؛ بعد مین کھتری اور بھیڑیں، اور اس کے بعد وَیش اور گائیں پیدا کیں، اور آخر میں شودر اور گھوڑے پیدا کئے۔ اس سے کئی علماء کو یوں سمجھ میں آتا ہے کہ قدیم آریوں نے درجہ وار بتایا ہے کہ لوگوں نے پہلے بکریاں پالیں، پھر بھیڑیں اور ان کے بعد گائیں، اور ان کے بعد گھوڑے پالے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مویشی پالنے میں لوگوں نے پہلے تھوڑی سی تکلیف لی اور پھر مزید تکلیف لینے پر خود کو عادی بنایا۔

بکری طبیعتاً حلیم ہے۔ اسے پکڑنا بھی آسان تو پالنا بھی آسان۔ اس کے لئے کوئی بھی ناند نہیں بنانا پڑتا ہے۔ جو بھی گھاس اُسے ملے وہ کھا لیتی ہے۔ ایک ضرب المثل بھی ہے کہ ''اٹ واري اَکرو، بکري واري ڪاڪرو''، یعنی اونٹ اَک کا پودا نہیں کھاتا، (دوسرے تمام درخت اور پودے کھا لیتا ہے) اور بکری ککرو نہیں کھاتی، باقی جو بھی گھاس اُسے ملے وہ ہڑپ کر لیتی ہے۔ بکری سے سہولیات بھی زیادہ ہیں۔ دودھ بھی ملے تو گوشت بھی۔ بکری کی کھال سے سانداریاں (چھوٹی سی مشک) اور دوسری اشیاء بناتے ہیں، اور اُس کے بالوں سے رسیاں بناتے ہیں۔ تھر اور کوہستان میں آج تک کئی لوگ صرف بکریاں پالتے ہیں۔ جابلو لوگ دیکھیں تو کھانہ کھانے کے وقت ایک بکری اپنے سامنے کھڑی کر دیتے ہیں۔ ایک ایک نوالہ چباتے ہوئے ایک ایک گوہا اپنے منہ میں لگاتے جاتے ہیں! دیکھا اس طرح کھانا کھاتے ہیں۔

بکریوں کے بعد لوگ بھیڑیں پالنے لگے؛ لیکن ان کا اصلی وطن روہ ولایت یعنی جابلو علاقہ ہے۔ یہ کسی کو شاید آسانی سے ہاتھ نہ بھی آسکیں، اس لئے ان کو پالنے کا رواج بعد میں عام ہوا۔ قدیم آریہ لوگ دنبے کا گوشت دل لگا کر کھاتے تھے، (رگ وید منڈل دسواں ۲۷، ۱۷)۔ بھیڑوں

اور مینڈھوں کی اون سے پھر کھیس، لوئیاں، کملیاں وغیرہ بنانے لگے، اور یہ رواج آج تک جاری ہے۔ تھری لوگ آج تک کھیس اور لوئیاں اوڑھتے ہیں، اس لئے سندھی شاعروں نے انہیں ''کھتیرا'' یعنی کھیس اوڑھنے والا اور ''لوئریاڑا'' یعنی لوئی پہننے والا کہا ہے۔ بکریوں اور بھیڑوں کے بعد گائیں پالنے کا رواج جاری ہوا، گائیں جب تک جنگلی ہیں، تب تک شوخ ہیں اور انہیں پکڑنا مشکل ہے۔ ایک دفعہ انہیں پالا جاتا ہے تو ان کی طبیعت ٹھنڈی اور حلیم ہو جاتی ہے۔ اس کے باوجود بھی کچھ گائیں 'تیز طبع'' ہوتی ہیں۔ ان کو جب دوہا جاتا ہے تو دوہنے نہیں دیتی ہیں۔ اُس کے نزدیک جایا جائے گا تو گائے لات در لات مارتی رہے گی۔ کچھ غصیلی گائیں خود اپنے بچوں کو بھی مشکل سے دودھ پینے دیتی ہیں۔ گائیں کی خدمت بھی زیادہ کرنی پڑتی ہے، جنگل سے چرنے کے بعد آئینگیں تو انہیں چارہ وغیرہ چاہئے۔ ایک تو انہیں پکڑنا مشکل، دوسرے ان کا پالنا مشکل، اس لئے ان کو پالنے کا رواج بعد میں جاری ہوا، لیکن دودھ اور مکھن تو گائے کا! صبح شام گائے دودھ بھی بہت دیتی ہے، اسی چسکے کے باعث لوگوں نے تکلیف کا خیال نہیں کیا اور گائیں بڑی تعداد میں ہاتھ کرتے گئے۔ اسی مال نے اتنی ان کی توجہ مبذول کروائی کہ انہوں نے خود آدمیوں پر گوپال، گوند (گوبند)، گتم، گوپ، گوپی وغیرہ نام رکھے۔ ''گسائین یا گوسائین'' لفظ اصل میں ہے ''گوسامن'' (گوسوامی) یعنی گایوں کا مالک، اور بعد میں تبدیل ہو کر ہوا ''سائیں، دھنی مالک''۔ ایک سادھوؤں کا فرقہ اسی نام سے پکارا جانے لگا۔ جیسا کہ ''گوسائیں سواجگر''۔

گائیں پالنے کا رواج اُس نہایت قدیم زمانے کا ہے، جس زمانے میں ہندستان، ایران اور یورپ والے آریہ لوگ میرو پربت کی طرف اکٹھے رہتے تھے۔ اس کے لئے یہ ثبوت ہے کہ گئو، گان ءِ کے لئے ان کے ہاں ایک ہی لفظ ہے۔ سنسکرت میں ''گو'' معنی گائے، اور اس کا انگریزی میں تلفظ ہے ''کو'' (Cow) اور پارسی میں ''گاؤ'' جیسا کہ ''گوسائیں'' لفظ کے اصل معنی ہیں ''گایوں کا مالک'' اور بعد میں اس کے معنی ہوئے ''سائیں، یا حاکم'' اسی طرح رشیا کی زبان میں ''گوسپودھار'' (Gospodar) اور ''گوسپودین'' (Gospodin) کے معنی ہیں، ان الفاظ میں سنسکرت لفظ ''گو'' بجنسی استعمال ہوا ہے۔(1)

(1) "The Sanskrit name of the cow is Go, plural Gavas, and this short radical we find running, with the modifications consequent on the character of each, through most of our languages; old German chuo, modern German kuh, English cow. The Slavic branch has preserved it, like a great many others, in the form most resembling the original. Thus Old Slavic has govyado, a herd; modern Servian gove-dar, a cow-herd; Russian govyadina, -beef, the flesh of cows and oxen, then gospodin master; gospod (i), the Lord; gospodar, the title given to South Slavic rulers all meaning originally "master of cows," and corresponding to the old Sanskrit gopy, which first means a herdsman, and later a chieftain, a king." Z.A. Rogzin: Vedic India, PP. 63-64.

گائیوں سے گھوڑے پکڑنا زیادہ مشکل کام ہے، کیونکہ وہ دوڑنے میں تیز ہیں۔ گھوڑے کے لئے جو الفاظ سنسکرت میں موجود ہیں، ان میں سے عام لفظ ہے ''آشو''، جس کا تلفظ پارسی زبان میں ہے ''اسپ''۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم ایران اور ہندستان کے آریہ لوگ جب اکٹھے رہتے تھے، تب ان کو گھوڑے کا پتہ تھا، اس لئے ان کے پاس گھوڑے کے لئے لفظ ہی ایک ہے۔ سندھی لفظ ''گھوڑو'' جا تلفظ سنسکرت میں ہے ''گھوٹک'' (گھوٹ + ک)؛ لیکن یہ اصل میں دراوڑی لفظ ہے، جو بعد میں سنسکرت اور سندھی میں عام ہوا۔ آریوں سے قبل وادیٔ سندھ کے اصل باشندے دراوڑ لوگ تھے، اور وادیٔ سندھ گھوڑوں کی وجہ سے مشہور تھی، اسی لئے ''گھوڑو'' لفظ سندھی میں عام ہوا۔ جن دنوں لوگوں کا گذران زیادہ تر شکار پر ہوا کرتا تھا، ان ہی دنوں میں گھوڑے پالنے کا رواج تھا، کیونکہ ہرن، بارہ سنگھا، سرہ وغیرہ جن کی ''چوکڑیوں والی چال'' ہے، ان کا شکار تب ہی کیا جا سکتا ہے جب گھوڑے پر چڑھ کر اس کے پیچھے پڑینگے۔ تیتتر یہ سنہتا میں گھوڑوں کا جنم شودروں کے ساتھ درج ہے، اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ لوگ اول شکار میں آسانی کے لئے گھوڑے پالنے لگے تھے اور تیتتر یہ سنہتا والے زمانے میں یعنی یجر وید والے زمانے میں شکار کرنا شودروں کا کام سمجھا جاتا تھا، لیکن وہ ہی گھوڑے دشمنوں کا پیچھا کرنے اور دوسرے اسی قسم کے وقتوں پر نہایت ہی کارآمد ہوتے ہیں، اس لئے ان مفید جانوروں کی بعد مین اتنی قدر ہوئی، جو خود راجا بھی اپنی سواری کے لئے گھوڑے استعمال کرنے لگے۔ راجاؤں بلکہ دیوتاؤں پر بھی ''آشو'' (پارسی اسپ) یعنی گھوڑے کے نام رکھنے لگے، جیسا کہ: اشوپتی ور اشونی کمار، اونٹ، گدھے، بھینسیں، بھینسے اور ہاتھی وغیرہ پالنے کا رواج بہت ہی بعد میں نظر آتا ہے۔

اوپر جو مذکور ہو چکا اس سے معلوم ہوگا کہ قدیم لوگ ریوڑ پالنا سیکھے تو دودھ، لسی، مکھن اور گوشت ملنے میں آسانی ہوئی، اس لئے بھوک کا مسئلہ بڑی حد تک حل ہو گیا اور لوگ آدم خور ہونے سے بچ گئے، مال مویشی پالنے کے بعد لوگوں کا حوصلہ بڑھتا ہی گیا۔ مویشیوں کی کھال سے تنبو، چھوٹی مشکیں اور دیگر چیزیں بنانے لگے، جس وجہ سے برسات اور ٹھنڈ سے ان کا بچاؤ ہو گیا۔ آج تک کئی لوگ پوستین پہنتے ہیں۔ ہرنوں کا شکار کرتے تھے، تو ان کی خوبصورت کھال بھی پہنتے تھے۔ مرگ چھالا یعنی ہرن کی کھال استعمال کرنے کا رواج دن بدن بڑھتا ہی گیا۔ اون، بکری کے بالوں، ماس وغیرہ سے کھیس، لوئیاں، خرزینیں، بورے اور دیگر سامان بنانے لگے اور اس طرح فن میں اضافہ ہوتا گیا۔

نہایت قدیم زمانے میں لوگ پتھروں اور درختوں کی شاخیں ہتھیار کے طور پر کام میں لاتے تھے (صفحہ ۱۵۸)؛ لیکن بعد میں ریوڑ پالنے سیکھے، تو جانوروں کی ہڈیاں بھی ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے لگے۔ رگ وید کے منڈل ساتویں (۱،۸۳) میں ''پرشو'' لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے اب معنی ہیں ''کلہاڑا''، [1] لیکن اس کے اصل معنی تھے ''پسلی کا کانٹا''۔ ویدوں کے براہمنوں

(1) ''پرسرام'' (پرشورام) معنیٰ وہ رام جس کے ہاتھ کا ہتھیار کلہاڑا ہو۔

میں ''آشو پرشو'' لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے معنی ہیں ''گھوڑے کی پسلی کا کانٹا'' اور اسے گھاس کاٹنے کے لئے درانتی کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ رگ وید کے منڈل ساتویں (۱،۸۳) میں ''پرتھو پرشوھ'' لفظ استعمال ہوا ہے، یہ ایک کشادہ کلہاڑا تھا، جس سے جنگ کے وقت دشمن کی سری کاٹ دیتے تھے۔ شیر پھنسانے کے لئے جالی کام میں لاتے تھے۔ اور کبھی کبھار بہت لوگ مل کر شیروں پر تیروں کی بوچھاڑ کر کے، انہیں مار کر ختم کر دیتے تھے۔

قدیم سندھیوں کی دولت (مال مویشی): قدیم لوگ جب ریوڑ پالنے سیکھے تو اس مال مویشی نے ان کا دوسری طرح بھی حوصلہ بڑھایا۔ ''فلانا جانور میرا ہے''۔ یہ مالکی کا خیال لوگوں میں پیدا ہوا۔ اس قدیم زمانے میں لوگوں کے پاس اور کوئی ملکیت تھی نہیں؛ مزید برآں مال مویشی کے دودھ، لسی، مکھن اور گوشت پر ان کا گذارا تھا، اس لئے مال مویشی سے زیادہ کوئی دوسری قیمتی ملکیت ان کی نظر میں نہیں تھی۔ آج بھی کئی لوگوں کی اہم دولت ہے مال مویشی، اس لئے کہتے ہیں کہ ''سون کی رتی سے رت (خون) کی رتی بہتر'' یعنی تھوڑی سی نقدی سے تھوڑا سا مال مویشی بہتر ہے۔

''دھن'' لفظ کے اب معنی ہیں ''دولت''؛ لیکن اصل اس کے معنی تھے ''ڌڻ'' (ریوڑ)۔ پھر جب لوگوں کو دوسری ملکیت جمع کرنے کی چوش آئی اور سونا چاندی وغیرہ کے سکے بنے، تب ''دھن'' اور ''ڌڻ'' لفظوں کے معنوں میں فرق آیا۔

''ڌڻ ته ڌڻي؛ نه ته وڪڻ ڪڻي'' (ضرب المثل)

[ریوڑ کی رکھوالی نہیں ہوسکتی تو اسے بیچ ڈالنا بہتر ہے]

''ڌڻي'' (دھنی) لفظ کے اصل معنی تھے ''ریوڑ والا'' اور بعد میں ''ڌڻي'' کے معنی ہوئے دھن والا یا شاہوکار، ''ڌڻي'' معنی مالک (کسی بھی ملکیت کا) اور ''ڌنار'' (دھنار = گوالا) کے معنی ہوئی ریوڑ والا، الغرض کئی انواع کی ملکیت میں لوگوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس قسم کی معنوں میں تبدیل آئی۔ لوگوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ زبان کی ترقی اسی طرح ہوتی ہے۔

ہر کسی شخص کی غریبی خواہ شاہوکاری کا پتہ اس کے مال مویشی سے چلتا تھا۔ پہلے لوگ خوش قسمت اُسی کو سمجھتے تھے، جس کے پاس گائیں، بھینسیں وغیرہ کے ریوڑ ہوتے تھے۔ آج بھی جب کہا جاتا ہے کہ فلاں ''بھاگیو'' ہے، تو اس کے معنی ہوئے کہ وہ ''شاہوکار'' ہے، اگر کہتے ہیں کہ ''فلاں بھاگئے سے دودھ لے آ''، تو یہاں ''بھاگیو'' کے معنی ''مالدار'' کے ہونگے یعنی جس کے پاس گائیں اور بھینسیں ہوں۔

رگ وید والے زمانے میں وادیٔ سندھ میں مال مویشی نہایت ہی معیاری ہوتا تھا۔ آج بھی کوہستان، خصوصاً تھانہ بولا خان اور ملیر کی، خواہ سارے تھر ڈویزن کی گائیں اتنی معیاری ہیں، جو کئی ایک وقت پر دس دس سیر دودھ دیتی ہیں، اس لئے شمال میں جموں اور کشمیر میں، جنوب میں مدراس علاقے میں، اور مشرق بعید میں فلپائین جزائر میں سندھ کی گایوں کی فروخت اچھے داموں ہوتی ہے۔ سرحد سندھ کے بیل بھی معروف ہیں اور باہر کے لوگ ان کے لئے اچھی خاصی رقم دیتے ہیں۔ حال ہی میں ''پرتاپ'' نامی ایک بیل سندھ کے گورنر سر لانسیٹ گرہام نے خود نیلام کیا، تو لوگوں نے ایک ہزار روپیوں سے اونچی بولی لگائی۔ ایسی قیمتی مالی میں آج بھی ہمارے لوگوں کا ساس پران اس قدر ہے، کہ اپنے سر پر کوئی بھی سختی سہہ لینگے، لیکن اپنے مویشی پر تنکہ بھی برداشت نہیں کرینگے۔ اس مال مویشی نے لوگوں کی زندگی میں بڑی تبدیلی لائی۔ پہلے ڈتھ اور شکار کی تلاش میں دربدر ہوتے تھے اور مشکل زندگی گذارنی پڑتی تھی، لیکن بعد میں مال مویشی کو چارنے کی انہیں بڑی فکر ہوئی تو چراگاہوں کے نزد گاؤں قائم کرنے لگے۔

گوٹھ اور چراگاہ: رگ وید والے زمانے میں آریہ لوگ اکثر گاؤں میں رہتے تھے۔ جیسا کہ آج بھی ہندستان کے لوگوں کی بڑی تعداد گاؤں میں گذارتی ہے۔ سچ مچ والا ہندستان ہے ہی ''گاؤں کی زندگی والا ہندستان''۔ گوٹھ دراصل سنسکرت لفظ ''گوشٹ'' (گوستھا) ہے اور اس کے بنیادی معنی ہیں ''وہ جگہ جہاں گائیں کھڑی ہوں''۔ گائیں وہاں کھڑی ہونگی جہاں ان کے لئے چارہ موجود ہو، اس لئے ''گوٹھ'' لفظ میں چراگاہ کے معنی سمائے ہوئے ہیں۔ اسی سبب رگ وید میں کسی کسی مقام پر ''گوشٹ'' (گوٹھ) کی بجاءِ ''ورج'' (برج) (Varaji) لفظ بھی استعمال ہوا ہے، جس کے معنی ہیں ''وہ جگہ جہاں گائیں چاری جائیں''۔[1] آج بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ چند ایک بھائی یا سنگتی، جہاں کہیں مال مویشی کے لئے چارہ دیکھتے ہیں، وہاں اپنی جھونپڑیاں بنا کر مال مویشی سمیت سکونت اختیار کر لیتے ہیں؛ اور وہ ان کا گوٹھ کہلاتا ہے۔ اس سے دیکھنے میں آئے گا کہ قدیم لوگ گاؤں قائم کرنے سے پہلے فکر اپنے مال مویشی کی کرتے تھے۔ مال مویشی میں سے بھی اہم مال وہ گائیں سمجھتے تھے، اسی لئے ''گو'' (گان ءِ) لفظ سے ''گوٹھ'' لفظ بنایا گیا، جو دراصل گایوں کے چارے کے لئے تھا، پھر بھلے گایوں کے ساتھ دوسرا مال بھی پیٹ بھرا کرے۔ گوٹھوں کی حدود مقرر کرنے کر لئے، گوٹھ کے اردگرد درخت لگاتے تھے۔ آج بھی ایسا ہی ہے، اس لئے ہر کوئی اپنے دیس کے درخت دور ہی سے پہچان لیتا ہے۔ مال مویشی کے چارے

(1) متھرا کے آس پاس والا ملک ''برج'' کہلاتا تھا، کیونکہ وہاں مال مویشی والے (مالدار) رہتے تھے۔ شری کرشن وہاں رہتا تھا، اسی لئے ''برجباسی'' یعنی برج کا رہنے والا کہا جاتا تھا۔ ملاحظہ ہو: شریمد بھاگوت۔

کے لئے چراگاہ گوٹھ کے اندر یا ان کی پسکردائی میں ہوا کرتے تھے۔ چراگاہوں میں سب مالداروں کا مال اکٹھے چرتا تھا۔ اس لئے موشیوں کے کانوں پر کوئی نشان کر دیتے تھے، تا کہ پہچاننے میں آسانی ہو کہ اس کا مالک کون ہے، رگ وید منڈل چھٹا (۳،۲۸)۔ بیلوں کی سینگوں کی نوکیں تیز کر دیتے تھے (منڈل ۶، ۱۶، ۱۳۹)، اور ان میں خوبصورتی کی کوئی چیز باندھ دیتے تھے، (منڈل ۸،۵۴،۱۰)۔

گلے رکھنے کی وجہ سے لوگوں کی ذمیداریوں میں بھی اضافہ ہوا۔ صبح سویرے اٹھ کر تیاری کر کے مال کے ساتھ جاتے تھے، اور مال کی ہر طرح سے سنبھال کرتے تھے۔ انستر یہ براہمنہ میں درج ہے کہ لوگ دن میں تین دفعہ مال کے ساتھ جایا کرتے تھے: صبح، دوپہر اور شام۔ دودھ بھی تین دفعہ دوہتے تھے: پہلے دفعہ انہیں دودھ بڑی مقدار میں میسر آتا تھا اور باقی دو دفعوں میں کم۔ جب مال کے ساتھ جاتے تھے تو کتے ان کے ساتھ ہوتے تھے، اور رات کو بھی کتے ان کے دروں کے دربان ہوتے تھے۔ رگ وید میں جن کتوں کا ذکر ہے، وہ نہایت ہی قدآور ہوتے تھے، اور لوگ کبھی کبھار ان پر بوجھ بھی رکھتے تھے۔ (منڈل آٹھواں ۴۶، ۲۸)۔ کتے بھی اتنے زبردست ہوتے تھے کہ شیروں سے بھی لڑ پڑتے تھے، سکندر اعظم کے حملہ آور ہونے کے وقت یونانیوں نے ایسے کتے ہندستان میں دیکھے تھے؛ اس لئے یونانی مورخوں نے بھی ان کا تذکرہ کیا ہے۔ قدیم لوگ یہ زورآور اور قدآور کتے واردستان (کشمیر، گلگت، چترال وغیرہ) سے لاتے تھے۔ ایران اور بابلان کے باشندے یہ کتے ہندستان سے منگواتے تھے اور ان کے لئے اچھی خاصی رقم دیتے تھے۔ (1)

مال کی حفاظت کے لئے کتے اپنے ساتھ لیتے تھے، اس کے باوجود بھی آسانی سنبھال کی ضرورت کو محسوس کرتے تھے، دن کا دیوتا ''سورج'' ہے، جسے ''پُوسن'' کہتے تھے۔ سورج کی روشنی سے گھاس وغیرہ اُگتی ہے اور دنیا کی پالنا کرنے ولا یہی دیوتا ہے، اسی لئے اس کا یہی نام رکھا گیا۔ سورج کی روشنی سے سیدھے راستے کا پتہ چلتا ہے۔ اگر کوئی جنگلی جانور یا کوئی چور آئے گا تو سورج کی روشنی میں دور ہی سے اس کا پتہ لگ جائے گا۔ ان اسباب کی بنا پر وہ لمحہ بہ لمحہ سورج دیوتا کو التماس کیا کرتے تھے کہ ''اے پُوشن دیوتا، تو ہمارے لیے راہ آسان کر۔ ہماری راہ میں جو رکاوٹیں ہیں تو ان کو دور کر۔ ای ٹکروں سے پیدا شدہ دیوتا! تو ہمارا رہنما بن۔ جو بدبخت بھیڑئے ہماری راہ دیکھ رہے ہیں، اور ہمیں نقصان پہنچانا چاہتے ہیں، ان کو تو ہم سے دور کر۔ جس رہزن کے دل میں ہمارے لئے بدخواہی ہے، اُسے تو دور کر، تو ہمارا راہ میں رہبر بن، ہمیں وہ مقامات دکھا جہاں مال مویشی کے لئے چارہ ہو۔ تو اپنی ایسی قوت رکھ، جو ہمارے اوپر جلد ہی دن کی تپش

(1) Hist: History of the World, Vol. I. P. 488.

چھانہ جائے، تو ہمیں مالا مال کر، ہمیں کھانا پہنچا اور ہماری قوت بڑھا" وغیرہ، (رگ وید منڈل چھٹا ۵۳)۔ اس سے دیکھنے میں آئے گا کہ مال کی فکر نے لوگوں میں بندگی کرنے کی خوبی پیدا کی اور اسی طرح مالک مہربان میں ان کا بھروسہ بڑھتا گیا۔

مال مویشی کی چوری: پہلے لوگوں کی دولت مال مویشی تھا، تو چوری بھی مویشیوں کی ہوتی تھی، (رگ وید منڈل چھ ۲۸)۔ آج بھی دیہاتوں میں مویشیوں کی چوری عام سی بات ہے۔ چوروں اور جنگلی جانوروں کے خوف سے قدیم لوگ نہ صرف خدا کے دعائیں کرتے تھے؛ لیکن اپنی طرف سے بھی ممکنہ کوششیں کیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں قدیم آریوں نے جو تدابیر اختیار کیں، ان میں سے بعض تدابیر کا یہاں اختصار کے ساتھ تذکرہ کیا جاتا ہے، کیونکہ ان سے ہندوؤں کی زندگی کا بڑا واسطہ ہے، اور ان میں سے پختگی حالت کا پتہ چلتا ہے۔

ایک، ہانڈیہ یا مشترکہ خاندان کے رواج کی بنیاد: رگ وید والے اوائلی زمانے میں نہ کوئی حکومت تھی اور نہ ہی کوئی فوج اور پولیس تھی؛ اس لئے لوگ اپنی اور اپنے مال مویشی کی حفاظت خود کرتے تھے۔ مال کی حفاظت کی فکر نے ان میں جنگی سوچ پیدا کی۔ صبح سے لے کر رات تک تیر کمان ان کے ساتھ ہوا کرتے تھے۔ کوئی جنگلی جانور یا رہزن دیکھتے تھے تو دور ہی سے تیروں کی بوچھاڑ کر دیتے تھے؛ اس لئے کوئی بھی ان کے نزدیک نہیں آتا تھا۔ لیکن کبھی کبھار اکیلا آدمی اپنا خواہ اپنے مال کی حفاظت نہ بھی کر سکتا تھا؛ تو اسی سبب سے مشترکہ خاندان کا رواج جاری ہوا۔ ہر کوئی یہی چاہتا تھا کہ بیٹے، پوتے اور دوسرے خاندان کے افراد گھر میں زیادہ ہوں، تاکہ وقت پر مدد کریں اور خاندان کا نام بھی قائم رکھتے آئیں۔ ایسی ضروریات نے عورتوں میں بھی مردانگی پیدا کی، اور وہ بہادری کی بڑی قدر کرنے لگیں۔ جوان لڑکیاں بھی ان سے شادی کرنے کو تیار ہوتی تھیں، جو جنگی جوان ہوتے تھے۔ مردوں کی طرح عورتیں بھی تیراندازی اور رتھ چلانا سیکھتی تھیں، تاکہ چوروں اور ڈاکوؤں کا فوری پیچھا کیا جا سکے۔ مثلاً: نل اور دمینتی کی بیٹی اندر سینا، مدگل نامی ایک رشی کے ساتھ بیاہی ہوئی تھی۔[1] اسی لئے "مدگلائی" بھی کہلاتی تھی۔ ایک دفعہ کوئی چور اس کے مویشی لے گئے، تو مدگل رشی اور اس کی بیوی ان کے پیچھے پڑے۔ جب چوروں نے رشی کو تنگ گھیرے میں لے لیا، تو مدگلائی اپنے شوہر کے تیر لے کر، جلدی جلدی سے رتھ چلا کر، چوروں کو شدید زخم پہنچائے اور ان کو ہرا کر اپنے سارے مویشی واپس لے لئے، (رگ وید منڈل دسواں ۱۰۲)۔ الغرض انہیں مویشی کی حفاظت کی ایک جیسی فکر ہوتی تھی اور بچپن ہی سے تیراندازی اور رتھ چلانا سیکھ لیتے تھے۔

(1) Dr. Sita Nath Pradhan: Chronology of Ancient India, PP. 4-6.

کبھی کبھار ماں باپ کے زندہ ہوتے ہوئے خود بھائی آپس میں لڑ کر نڈھال ہو جاتے تھے، تو باپ اپنی ملکیت میں سے اپنے لئے اور اپنی بیوی کے لئے حصہ نکال کر، باقی ماندہ اپنی ملکیت ان میں تقسیم کر لیتا تھا، (رگ وید منڈل تیسرا ۴۵، ۴)۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ جب کبھی کسی کا بیٹا شادی کرتا تھا، تب اُسے اور اس کی بیوی کو علحدہ گھر یا کمرہ رہنے کے لئے دیتے تھے؛ لیکن کھاتے پیتے اکٹھے تھے۔ اسی طرح ایک ہنڈیہ یا مشترکہ خاندان کا رواج اِس قدر عام ہوا، جو آج بھی اگر کوئی ہندو کہے گا کہ میں کھانے پینے خواہ ملکیت داری میں اپنے عزیزوں سے جدا ہوں تو اُسے یہ بات ثابت کرنی ہوگی، ورنہ ہندوؤں کے قاعدے موجب کورٹ یوں فرض کر لیگی کہ وہ مشترکہ خاندان کا فرد ہے اور ان کی ملکیت بھی اکٹھی ہے۔ یہ رگ وید والے زمانے کا رواج ہمارے دنوں میں بھی زوروں پر تھا۔ کسی گھر میں چار پانچ بھائی ہوتے تھے اور ان میں سے کوئی بیروزگار ہوتا تھا، تو مشترکہ ہنڈیہ سے کھا لیتا تھا، اور دوسرے بھائی یوں نہیں سمجھتے تھے کہ یہ ہم پر بوجھ ہے، بیروزگار بھائی کو پالنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ حال ہی میں ایک نئی ہوا چلی ہے۔ کئی جوان لڑکیاں اب چاہنے لگی ہیں کہ صرف شوہر اور گھر ہو۔ اس سے ایک کہاوت بھی عام ہوگئی ہے کہ ''بھگوان آپ کی مہربانی، اگر یتیم شوہر ملے تو''۔ مطلب یہ کہ ساس اور سسر نہیں چاہئے۔ اب اکثر ہر کوئی خودمختیار ہے، اور ہر کسی کا ڈیڑھ چاول دور پک رہا ہے، پھر بھی کورٹوں میں قاعدہ وہ ہی قدیم زمانے والا مروج ہے۔

گوتر اور گھرانے: قدیم لوگوں نے اپنی جان اور مال کی حفاظت کی خاطر مشترکہ خاندان کا رواج متعارف کیا، پھر بھی یہ ناکافی نکلا۔ پھر انہوں نے ایک ایسی چالاکی کی، جو کسی دوسری قوم کے ذہن میں نہیں آئی، انہوں نے اپنے گھروں اور مال کے باڑوں کے چاروں طرف بڑی بڑی دیواریں کھڑی کیں، تاکہ کوئی جنگلی جانور یا کوئی چور آسانی سے اندر داخل نہیں ہو سکے۔ یہ عالم پناہ والی جگہ ''گوتر'' کہلاتی تھی۔ رشی اکثر متعدد شادیاں کرتے تھے، اس لئے ان کا خاندان بڑا ہوا کرتا تھا۔ ہر ایک رشی کے پاس مویشی بھی بڑی تعداد میں ہوتے تھے، اس لئے ہر رشی اپنا گوتر علحدہ تعمیر کرتا تھا، جس میں خاندان کے تمام افراد مویشی سمیت رہتے تھے۔ جن لوگوں کا خاندان چھوٹا ہوتا تھا اور مویشی بھی کم ہوتے تھے وہ آپس میں مل کر ایک بڑا گوتر بناتے تھے، کیونکہ گوتر بنانا بڑا کٹھن کام ہوتا تھا۔

جرمنی کے نامور پروفیسر منکس ملر کے خیال موجب ''گوتر'' لفظ میں ''گو'' معنیٰ گائے اور ''تر'' وہ لفظ ہے، جس کا تلفظ اینگلو سکسن زبان میں ''ٹن'' (Tun)، اور انگریزی میں ''ٹاؤن''

(Town) (شہر) ہے۔ ہر ایک گوتر کے اندر جیسا کہ شہر تعمیر شدہ ہوتا تھا، جس میں لوگ مویشی سمیت بڑے آرام سے زندگی گذارتے تھے۔

گوتروں میں جو رہتے تھے وہ محض ایک ہی خاندان کے نہیں ہوتے تھے۔ ہر کسی کا خاندان اپنا ہوتا تھا؛ لیکن گوتر وہی ایک ہوتا تھا، اس لئے وہ گویا کہ ایک بڑے خاندان کے اراکین ہوتے تھے، اور ہر کسی کو اپنا عزیز یا برادری والا سمجھتے تھے۔[1] اسی سبب ''گوتر'' لفظ کے معنیٰ ہوئے ''خاندان یا برادری''۔ آج بھی سندھی میں ''گوٹی'' گوتری معنیٰ ''برادری والا''۔ برادریوں کی بنیاد اسی طرح پڑی۔ دیکھیں انہوں نے گوتروں میں سے کس طرح بھائپی (بھائی بندی) کے لفظ کا اضافہ کیا۔

ہر ایک گوتر کا جو مکھی یا چودھری ہوتا تھا، وہ ''گوتر پتی'' یعنی گوتر کا مالک کہلاتا تھا، اور سارا گوتر اس کے نام پیچھے پہچانا جاتا تھا۔ گوتروں کی بنیاد پہلے رشیوں نے ڈالی تھی، اور ہر ایک رشی کا گوتر اکثر علحدہ ہوتا تھا۔ موجودہ برہمن ان رشیوں کی اولاد ہیں، اس لئے براہمنوں کے جو بھی گوتر (خاندان) ہیں، ان سب پر رشیوں کے نام پڑے ہوئے ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کس رشی کی اولاد ہیں۔ وسشٹ، کیشٹ، آتری، جمدگنی، گوتم، وشوامتر اور بھردواج، یہ سات (سپت) رشی وشنو پران کے مطابق اہم ہیں۔ پرانوں اور منوسمرتی میں دوسرے کئی رشیوں کے نام بھی درج ہیں۔ گوتروں میں جیسے جیسے خاندان بڑھتے گئے، ویسے ویسے ان کو چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اسی طرح گوتروں کو ''گھرانوں'' میں تقسیم کیا گیا۔ مثلاً، کیشپ رشی کے گوتر والوں کے گھرانے کنییا، کانجا اور کاکونا ہیں۔ گوتم رشی کے گوتر میں سے اُویر، اُدیچہ اور آئن گھرانوں والے براہمن ہیں۔ ہر ایک گھرانہ کئی ایک خاندانوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ کھتریوں اور دوسروں نے بھی بعد میں اپنے گوتر بنائے اور وہ بھی مختلف قسم کی گھرانوں میں تقسیم ہو گئے۔ مثلاً، حیدرآباد کے آڈوانی خاندان کا گھرانہ ''مگھو کھتری'' ہے۔ تھدھانی خاندان والوں کا گھرانہ ''بھاگیا''، راچندانیوں کا گھرانہ ''دلڑی'' اور سیاہیملانی خاندان والے ''ناگ دیو'' کے گھرانے کے ہیں۔ آہوجا اور ماکھیجا بھی نکھوں کے نام ہیں۔ گوتر بنانے کا رواج پہلے پہلے وادیٔ سندھ میں جاری ہوا اور یہ رواج اصل میں وہیں کے ہیں۔

سگوتر اور سپنڈ: بعض گوتروں کے اندر اگرچہ الگ الگ خاندانوں والے رہتے تھے؛ لیکن ان کا گوتر ایک ہی ہوتا تھا، اس لئے وہ ''سگوتر'' یعنی ایک ہی گوتر والے کہلاتے تھے۔ وہ گوتر پتی کو اپنے باپ کی جگہ سمجھتے تھے اور اس کی بڑی عزت کرتے تھے، وہ ایک دوسرے کی

(1) Dr. A. C. Das Reg. Vedic, Culture, P. 124.

بیویوں اور بیٹیوں کو اپنی ماں بہن سمجھتے تھے، اسی لئے ہندوؤں کے قدیم قاعدے کے مطابق آج تک ''سگوتر'' یعنی ایک ہی گوتر والے آپس میں شادی نہیں کر سکتے۔ یہ بھائی بندی کو بڑھانے کی راہیں ہیں۔ اسی طرح ''سپنڈ'' شادی کی بھی منع کی گئی۔ ''پنڈ'' معنی سریر یا جسم اور ''سپنڈ'' معنی وہ جو ایک ہی سریر سے پیدا ہوئے ہوں، اور ایک ہی پنڈ بھراتے ہوں، اولاد اپنے ماں باپ کی تخم ہے اور ماں باپ میں خود اپنے عزیزوں کا خون ہے۔ وہی خون اچھا خون نہیں پھیلے گا، اس لئے منوسمرتی کے مطابق باپ کی طرف ساتویں نسل اور ماں کی طرف پانچویں نسل سے باہر شادی کرنی چاہئے۔ ان وجوہات کی بنا پر براہمنوں کے لئے خصوصاً حکم جاری ہوا کہ روزانہ ہر کوئی براہمن اپنی گوتر؛ نکھ اور پرور (خاندان) کے نام زبان سے کہتا رہے، کہ اس کی اصل نسل کیا ہے۔ ان ناموں کو زبان سے کہنے کا اہم مقصد یہ تھا کہ ایک ہی گوتر سے کوئی بھی شادی نہ کرے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم لوگوں میں غیرت قدرے زیادہ تھی، اس لئے جو لڑکیاں ان کی قریبی رشتیدار و عزیز ہوتی تھیں، ان کو اپنی بیٹی یا بہن جیسا سمجھ کر، ان سے شادی نہیں کرتے تھے؛ لیکن آج کل بعض ہندو اپنی دادانی سے بھی شادی رچا لیتے ہیں، مطلب یہ کہ جو غیرت کا انگ قدیم ہندوؤں میں تھا، وہ دور حاضرہ کے ہندوؤں میں کم ہوتا جا رہا ہے۔

رگ وید کے اوائلی زمانے میں تمام لوگ گوتروں کے اندر نہیں رہتے تھے۔ بعض لوگ خانہ بدوش بھی ہوتے تھے۔ ان کے پاس صرف مویشی ہوا کرتے تھے، دوسرا انہیں نہ کوئی کام ہوتا تھا اور نہ کارج۔ اسی سبب برسات میں ایک جگہ ٹک ہو کر مال مویشی چراتے تھے۔ اگر برسات نہیں پڑتی تھی تو پھر مال مویشی کے چارے کی خاطر کبھی یہاں تو کبھی وہاں ہوتے تھے۔ یہ صورت حال آج بھی تھر اور کوہستان میں دکھائی دیتی ہے۔ یہ مالدار آج تک ''سانگیڑا'' کہلاتے ہیں۔

''جهڙ ڦڙ جت ٿيان، اُت اَڏيائون پکڙا.''

(شاھ)

[جہاں پر برکھا برسے، وہیں پر جھونپڑے بنائے]

رگ وید میں ان گھروں کا ذکر بھی ہے، جو لوگ ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ لے جاتے تھے۔ اتھرو وید کے منڈل نویں (۲۴،۳) میں کہا گیا ہے کہ ''گھر کو بھی ہم بیوی کی طرح لے جاتے ہیں!'' اس سے پتہ چلتا ہے کہ مال مویشی کے چارے کی خاطر اگر انہیں کہیں جانا پڑتا تھا، تب گھر کے پتاور، گھاس سے بنی ہوئی بڑی چٹائیاں اور لکڑے بھی اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ اور جہاں کہیں انہیں رہنا ہوتا تھا وہاں جا کر وہی پتاور لگاتے تھے۔ آج بھی مالدار اسی طرح کرتے ہیں۔ ہجرت کے وقت گائیں، بھینسیں وغیرہ نکال کر راستے پر لگاتے ہیں، تا کہ سیدھا راستہ لے کر چلیں،

اور خود پتاور، گھاس سے بنی ہوئی بڑی چٹائیاں، چکی، رلیاں اور دیگر سامان، کچھ باربردار جانوروں پر، اور کچھ اپنے سر پر رکھ کر مال کے پیچھے جاتے تھے۔ پکے گھر بنا کر ایک جگہ ٹک کر رہنا، اور گوتر بنانے کا رواج ہی اس وقت بڑھا، جب کھیتی اور دوسرے دھندھے کرنے لگے۔ جن لوگوں کا جہاں روزگار ہوتا تھا، وہ وہیں پر اپنے مکان بنا کر بیٹھ جاتے تھے، اس لئے آج تک یہ کہاوت ہے کہ "جہاں ہل وہاں گھر اور جہاں روٹی وہاں ٹھکانہ"۔ جہاں ہل وہاں گھر جہاں مانی وہاں مارگ۔

کھیتی: قدیم زمانے سے لے کر کھیتی ایک اُتم دھندھا شمار ہوتا ہے۔ آج بھی ایک کہاوت ہے کہ "نیچ نوکری، اُتم کھیتی، بڑھے بیوپار"۔ پروفیسر مَیکس ملر کے مطابق "آریہ" لفظ کا مادہ ہے "آر" معنیٰ "ہل چلانا"۔ جو لوگ زمین میں ہل چلا کر کھیتی کرتے تھے، وہ لوگ ڈوتھیوں اور خانہ بدوش مالداروں سے زیادہ مہذب سمجھے جاتے تھے اور وہ ہی خاندانی یا بڑے گھرانے والے سمجھے جاتے تھے۔ اسی سبب سے "آریہ" لفظ کے معنی ہی تھے شریف یا بڑا گھرانہ۔ (1)

رگ وید کے منڈل پہلے (۱۲، ٦) میں درج ہے کہ "بیج ڈالنے کا ہنر اشونی کمار دیوتاؤں نے منو بھگوان کو سکھایا"۔ اس سے یوں لگتا ہے کہ قدیم رشیوں کو شاید الہام ہوا کہ بیج ڈالنے سے فصل اُگ سکے گی۔ اُسی منڈل پہلے (۱۲۲، ۵) میں درج ہے کہ زمین میں ہل چلانے کا طریقہ جس رشی نے سدھارا اس کا نام "پرتھو!" تھا، جسے پرتھی بھی کہا جاتا تھا۔ یہ پرتھو رشی "وئنیہ" Vainya یعنی وین Vena رشی کی اولاد بھی کہا گیا ہے۔ (منڈل آٹھواں ۹، ۱۰)۔ ہل کی چونی کو "پھال" کہتے تھے۔ (منڈل چوتھا ۵۷، ۸)، آج بھی وہی ویدک لفظ استعمال کر رہے ہیں؛ لیکن عام طور پر کہتے ہیں "پھار" یعنی "ل" کو مٹا کر "ر" کیا گیا ہے اور یہ ہم سندھیوں کی اصل عادت ہے (جل ۔۔ جر اور تھل ۔۔ تھر)۔

پہلے پوری وادئ سندھ میں کئی مقامات پر "بن" یا گھنے جنگلات ہوا کرتے تھے، لوگ درخت کاٹ کر فصل کے لئے زمین صاف کیا کرتے تھے۔ یہ جنگل شگافی کافی ایریا میں کرتے تھے۔ وہ "اُروا" یعنی کشادہ میدان چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں (نمبروں) میں تقسیم کر کے، ہر ایک "کھیٹ" علحدہ کرتے تھے، (منڈل دسواں ۱۰۱، ۴)۔ اس سے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ ہر ایک "اُٹھاس" (آٹھ جریب زمین) یا "سورہاس" (سولہ جریب زمین) کو "کھیٹ" کہتے تھے، رگ وید میں یہ بھی درج ہے کہ ہر ایک کھیٹ نہایت ہی خبرداری سے ناپ لیتے تھے، (منڈل پہلا ۱۱۰، ۵)۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہر کسی کو اپنی زمین الگ ہوا کرتی تھی۔ (2) یہ زمینیں ان کے گاؤں کے آس پاس ہوا کرتی تھیں۔ آج بھی کتنے کسان لوگ اپنے اپنے زمین کے ٹکڑوں کے آس پاس

(1) I have noticed instances, even in the Reg. Veda, in which the word "Arya" seems to be used in the sense of "high, or respectable." John Wilson: India Three Thousand Years Ago, P. 17, footnote.

(2) "It is a fair conclusion from the evidence that the system of separate holdings already existed in early Vedic times" Prof. Macdonell Keith: Vedic

اپنے گھر بنا کر، چھوٹے چھوٹے گاؤں قائم کیے ہوئے بیٹھے ہیں۔ جو بڑے زمیندار ہیں وہ بھی اپنا بنگلہ یا اوطاق زمین کے نزدیک بناتے ہیں، اور اس کے کسان اس اوطاق کے آسپاس جھونپڑیوں میں رہتے ہیں، اور وہ اس زمیندار کا گوٹھ کہلاتا ہے۔ پہلے بھی صاحب ثروت لوگوں کے پاس نوکر اور غلام مشقت کیا کرتے تھے، اور خود صرف ان پر نظرداری کیا کرتے تھے۔

ہل چلانے اور نار چلانے کے لئے اس وقت اونٹ اور بیل کام میں لائے جاتے ہیں، لیکن پہلے گھوڑے بھی کام میں لاتے تھے، کیونکہ وادئ سندھ میں گھوڑے بڑی تعداد میں ہوا کرتے تھے۔ زمین میں ہر چلانے کے وقت کسی رشی کو لے آتے تھے، جو ہل جوتتا تھا اور اُسی وقت ویدوں کے منتروں کا زبان سے ورد بھی کرتا جاتا تھا۔ اسی طرح پوجا کر کے کام شروع کیا کرتے تھے۔ برساتی موسم میں براہمنوں کو بُلا کر، ایک عظیم یگیہ کرتے تھے، جسے ''ستر'' (Satta) کہا جاتا تھا۔ یہ یگیہ دو تین مہینے مسلسل بلکہ اس سے بھی زیادہ وقت تک جاری رہتا تھا۔ یگیہ سے یہ مراد تھی کہ اندر دیوتا اور دوسرے دیوتا خوش ہوں، تو موسمی برساتیں برسیں اور فصلیں اچھی ہوں، اور مال مویشی کے لئے چارہ فراوانی سے ہو۔ اسی مراد سے رشی بھی دریائے سندھ اور دوسرے دریاؤں کے کناروں پر بیٹھ کر، میٹھی آواز میں ویدوں کے منتر وں کا ورد کرتے تھے۔ جولاءِ۔۔اگست کا مہینہ 'ساون'' کہلاتا ہے، جو در اصل سنسکرت لفظ ''شراون'' ہے، اور اس کا مادہ ہے ''شرون'' معنیٰ سننا۔ ساون میں ہر طرف سے ویدوں کے منتروں کے میٹھے آلاپ سننے میں آتے تھے، اس لئے یہ نام رکھا گیا۔ اس سے نظر آئے گا کہ جیسے جیسے آریہ لوگ دنیوی باتوں میں ترقی کرتے گئے، ویسے ویسے انکے دل کی رغبت خدا کی طرف بڑہتی گئی، اس لئے کہ وہ سمجھ رہے تھے کہ فصلیں اچھی تب ہونگی جب خدا کا فضل ہوگا، رشیوں کو بھی اپنی زمیں ہوا کرتی تھیں، اور مال مویشی بھی ان کے پاس بہت ہوا کرتا تھا اس لئے ایشور کو منت سماجت کرتے تھے کہ وہ اپنا کرم کرے! یہی وجہ ہے کہ ''انکے ہاتھ کام میں ہوتے تھے، اور دل ہوتا تھا اپنے خدا سے!''

پہلے لوگ فصل اکثر دریاھ کے نزدیک (کچہ میں) اُگاتے تھے۔ جن گوٹھوں کو دریاء نزدیک نہیں ہوتا تھا، ان میں کنویں کھودتے تھے۔ رگ وید کے منڈل پہلے (۱۰۵، ۱۷) میں ''کوپ'' لفظ استعمال ہوا ہے، جس کی بگڑی ہوئی صورت سندھی میں 'کوھ'' ہے۔ اس وقت بھی کوئی فصل ''موکی''، کوئی ''چرخی'' تو کوئی ''چرخی مدد موکی'' ہوتی ہے۔

رگ وید کے منڈل پہلے (سُوکت ۱۶۶، ۷) میں ''کنبھ'' (برتن)، اور سُوکت ۱۷۷ (۱۲) میں ''کلس'' (مٹی کا بنا ہوا چھوٹا لوٹا) لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ بڑی بات یہ کہ ''گھٹو چکر'' بھی لفظ استعمال ہوا ہے، جس سے اور بھی وضاحت ہو جاتی ہے کہ کنوؤں سے پانی نکالنے کے لئے رسا

اور مٹی سے بنے ہوئے چھوٹے لوٹے باندھتے تھے، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ رواج رگ وید والے زمانے سے لے کر جاری ہے۔

رگ وید کے منڈل دسویں (۲۵،۴؛ ۵۔۷) میں ''آشمچکر'' لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے لفظی معنی ہیں ''پتھر کا چکرا''۔ اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ جہاں نار نہیں ہوتا تھا، وہاں کنویں کے اوپر سلائی میں پتھر کی بنی ہوئی گھرنی (یا چرخی) (Pulley) ہوا کرتی تھی، تھر میں اور دوسری کئی جگہوں پر یہ دستور ہے کہ چمڑے کا بوکا رسی سے باندھ کر، وہ رسی لکڑی کی بنی ہوئی چرخی پر رکھ کر، ڈھیل دیتے جائیں گے تو چرخی پھرتی جائیگی اور رسی خود بخود جا کر نیچے کنویں میں گرے گی۔ جب کوس پانی سے بھر جاتا ہے تب رسی کو کھینچتے ہیں، تو کوس کھینچا ہوا اوپر چلا آتا ہے۔ اسی طرح پانی نکالنے کے لئے جو رسیاں استعمال کرتے ہیں، انہیں سندھی میں ''ورت'' کہتے ہیں۔ جو در اصل ہے سنسکرت لفظ ''ورترا'' اور یہ رگ وید میں استعمال ہوا ہے۔ مطلب یہ کہ کنووں سے پانی نکالنے کا یہ دوسرا نمونہ بھی رگ وید والے زمانے سے رواں ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پتھر کی بجاءِ اکثر لکڑی کی چرخی اب عام طور پر استعمال ہوتی ہے۔

بعض مقامات پر کنویں بہت گہرے ہوتے ہیں۔ اتفاق سے اگر کوئی شخص اس میں گر جاتا ہے تو دوسروں کی مدد کے بغیر نہیں نکل سکتا۔ ایسے گہرے کنویں آج بھی سندھ میں کئی مقامات پر، خصوصاً تھر ڈویژن میں موجود ہیں۔ گڈڑی تعلقہ چھاچھرہ میں ''ساٹھیکا'' یعنی ساٹھ پرہ یعنی ساٹھ مردوں کی لمبائی جتنے گہرے کنویں ہیں۔ ہر ایک ''پرہ'' میں پانچ فوٹ اگر شمار کیے جائیں تو ایک ''ساٹھیکو'' ہوگا تین سو فوٹ گہرا کنواں!

''سنجن سانيڪن تي وڏيءَ وير وهون.''

(شاھ)

[وہاں عورتیں گہرے کنووں سے صبح کاذب کو آ کر پانی بھرتی ہیں]

اس وقت سندھ میں عام طور پر ہر ایک کنویں کے سامنے ''آہ'' یا ''آنہں'' (گڑھا یا حوض) بنا ہوا ہے۔ کنویں کا پانی پرنالے سے نکل کر، آہ میں جا کر گرتا ہے، اور وہ پانی جانور پیتے ہیں۔ اس سے ایک کہاوت بھی ہے کہ ''جو کنویں ہوگا وہ آہ میں گریگا''۔ یہ آہ بنانے کا رواج ویدک زمانے کا ہے۔ خود ''آہ'' لفظ رگ ویدک سنسکرت کا ہے، اور اس کا اصل تلفظ ہے ''آہاؤ''۔ گذشتہ آہ اور موجودہ آہ میں فرق ہے۔ رگ وید والے زمانے میں لکڑی کا پیپ کنویں کے سامنے رکھتے تھے، یا کنویں کے سامنے گڑہا کھود کر اس میں لکڑی کا ڈبہ ڈالتے تھے، تاکہ قابو کھڑا رہے۔ اُسی ڈبے کو ''آھاؤ'' کہتے تھے۔ یہ گذشتہ نمونہ زیادہ پسندیدہ تھا۔ آج کل کے آہوں میں پانی

ہمیشہ میلا ہوتا ہے۔ مال مویشی کو میلا پانی پلایا جائیگا تو ممکن ہے کہ اس کی طبیعت بگڑ جائے۔ بگڑی ہوئی طبیعت والے جانور کا دودھ صحت کو خراب کر رکھ دیگا۔ ان باتوں کو شمار میں لا کر یوں کہا جا سکتا ہے کہ رگ وید والے زمانے کے لوگ یہ عقل والا کام کرتے تھے کہ لکڑی کے ڈبہ ''آڑ'' کے طور پر کام میں لاتے تھے۔ اسی طرح جانوروں کو پینے کے لئے پانی صاف ملتا تھا۔ ڈبہ اگر کسی وقت خراب ہو جاتا تھا تو پھر دھو کر صاف کیا جا سکتا تھا۔ یہ سابقہ رواج پھر جاری کرنا چاہئے، کیونکہ اس میں مال مویشی خواہ لوگون کا بھلا ہے۔

رگ وید کے منڈل پہلے (۴، ۸ اور ۱۰) میں ''اَوٹ'' (Avata) لفظ استعمال ہوا ہے، جس کا تلفظ سندھی میں ہے ''اَڈ''۔ کنویں کا پانی آڈ سے بہہ کر، زمین کے کیاروں میں جا کر گرتا ہے۔ مطلب یہ کہ ہزارہا برس پہلے جو رواج وادئ سندھ میں جاری تھا، وہی رواج آج تک ہمارے لوگ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ بلکہ لفظ بھی وہی استعمال کرتے ہیں، جس وجہ سے یہ محاوروں میں بھی آ گیا ہے۔ مثلاً ''تیرنا چاہے تو دریاء تیر جائے، نہیں تو آڈ پر ٹھہرے''۔

زمین کے اوپر طرح طرح کی آفتیں آ کر کڑکتی ہیں۔ پالا گرا یا ٹڈی آ پہنچی تو فصل ہی تباہ! گندم وغیرہ کو ''رتی'' (فصل کی ایک بیماری) لگی یا کوئی اور مرض نے گھیر لیا تو بھی فصل گئی!

کن کیون پوکون، تیون پرپور، پي پاٽي جڏهن،
پوءِ پکي هنيون هتي، اي دل کيئن آيا ويا.
(ديوان گل)

''ھتیو'' (ہتھیو) ہے شمال مشرق کی ہوا، وہ اگر موسم خزاں میں لگتی ہے تو خریف کی فصلوں (جوار، باجرہ وغیرہ) کو ناس کر دیتی ہے۔ اور بچارے زمینداروں اور کاشتکاروں کی ساری محنت رائیگاں ہو جاتی ہے۔ ایسی آسمانی آفتوں کا خدا خود مقابلہ کرے، باقی بندے کے بس کی بات نہیں۔ اس کے باوجود وادئ سندھ کے باشندوں نے دماغ سوزی کی کہ آخر کون سے تدابیر کرنی چاہئیں، جو فصلوں کو نہ برسات بہا کر لے جائے، نہ پالا، ''ھتیو'' (مشرق کی ہوا) یا کوئی دوسری آسمانی آفت انہیں ناس کرے۔ اس سلسلے میں تحقیقات کرنے سے انہیں یقین ہو گیا کہ تارے، نکھٹ (نکھتر)، گرھ وغیرہ عناصر سے بنے ہوئے ہیں۔ اس لئے فصل تب بوئی جائے جب زمین کے اوپر اگنی عنصر زور ہوگا تو گوشہ بھی نہیں ابھرے گا، یا ابھرنے کے فوراً بعد گوشے اور سرکنڈے گل سڑ جائیں گے۔ نکھتر جملے اٹھائیس ہیں۔ ہر ایک نکھتر کا اثر معلوم کر کے، اپنی آنے والی اولاد کے لئے یہ ہدایت چھوڑ گئے کہ روہنی، مول، اُتراشاڈھا، ریوتی، پنروسو وغیرہ کئی فصلوں کے لئے اچھے ہیں۔ جس زمانے میں یہ تجربہ ہو رہے تھے؛ اس زمانے میں پوری دنیا میں دوسری

کوئی بھی ایسی قوم نہیں تھی، جو جوتش کی اس طرح کی باتوں پر توجہ دے رہی ہو، اس لئے یورپی علماء نے ہندستان کے قدیم آریوں کی عقل پر تعجب کا اظہار کیا ہے۔ یہ سب کھیتی کا پرتاب کہا جائے گا، جس کی فکر میں وادیٔ سندھ کے قدیم باشندوں نے اس طرح کی حیرت انگیز تحقیقات کیں۔

قدیم لوگوں نے اگرچہ اپنی فصلوں کی حفاظت کے لئے ہر طرح کے حیلے چلائے تو بھی ان کا ایمان تھا کہ فصل کے لئے خدا کے فضل کی ضرورت ہے۔ وہ یوں سمجھتے تھے کہ ہر ایک کھیت یا زمین کا رکھوالا، دعا گو کوئی دیوتا ہے، جس کی عنایت سے آسمانی آفتیں ٹل جاتی ہیں، فصلیں اچھی ہوتی ہیں، اور کھانے کے لئے بے انداز اناج ملتا ہے۔ اسی دیوتا کو ''کھیتر پتی'' (Lord of the Field) کہتے تھے۔ جس طرح آج کل ہمارے کسان لوگ گادھی پر بیٹھ کر نار چلاتے ہیں اور کسی وقت کان پر ہاتھ رکھ کر کوئی گیت آلاپتے ہیں، تو جنگل میں منگل ہو جاتا ہے، اسی طرح وادیٔ سندھ کے قدیم آریہ لوگ بھی نار چلانے کے وقت کچھ راگوں کے بھجن گاتے تھے؛ اور خدا تعالیٰ کو اس طرح التجا کرتے تھے:

مالک کی مہر ہو! فراوانی سے برسات ہو!
میدانوں میں پاھہ اُگے، موَج سے لوگ ہر چلائیں!
بے انداز گھاس اور اناج اُگائیں، گھوڑے، گائیں گھاس کھائیں!
ہماری التجا قبول فرما، مالک! میٹھی میٹھی برساتیں برسا!
(رگ وید منڈل چوتھا ۵۷، ۱ سے ۴ تک)

رگ وید والے زمانے میں لوگ گندم اور چاول اُگاتے تھے یا نہیں، یہ بات واضح طور پر درج نہیں ہے، البتہ ''دھانیہ'' لفظ استعمال ہوا ہے، جس کا تلفظ سندھی میں ہے ''دھاج''، اور اس کے معنیٰ ہیں ''اَناج'' (ہر قسم کا)۔[1]

اس سے اتنا ظاہر ہوتا ہے کہ اناج کی فصلیں ہوتی تھیں۔ یہ بھی درج ہے کہ جوَ اور تل کی فصل اچھی ہوتی تھی۔ (منڈل دوسرا ۵، ٦ اور تیسرا ۸۵، ۳)، لوگ یہ دو اناج نہ صرف کھاتے تھے؛ لیکن پوجا پاٹھ میں بھی استعمال کرتے تھے۔ اسی قدیم رواج کے مطابق آج بھی سارے ہندستان کے ہندو ہر کسی پوجا میں جوَ اور تل استعمال کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دو اناجوں کا استعمال بہت زیادہ ہوا کرتا تھا۔

''تڑ'' اصل میں سنسکرت لفظ ''تل'' ہے اور اس کے بنیادی معنیٰ ہیں ''جو چکنائی والا ہے''۔ قدیم لوگوں نے دیکھا کہ تل چکنائی والے ہوتے ہیں، تو کسی وقت ان سے تیل نکالنے کا فن

(1) سنسکرت لفظ ''دھانیہ'' کا تلفظ پارسی میں تبدیل ہو کر ہوا ''دانہ'' اور جس کا سندھی میں تلفظ ہے ''دانو'' (اناج کا)۔ مصنف

انہوں نے تلاش کر لیا۔ ''تیل'' لفظ ''تل'' میں سے ماخوذ ہے اور اس کے بنیادی معنی ہیں ''تلوں کی پیداوار''۔ لوگ پھر دوسرے بیجوں سے تیل نکالنا سیکھ گئے تو وہ بھی ''تیل'' ہی کہا جانے لگا، اس وقت وضاحت کے لئے کہتے ہیں کہ سرسوں کا تیل، کڑوا تیل وغیرہ۔ اب تو باداميوں، ناریل بلکہ مچھلی سے بھی تیل نکالتے ہیں اور وہ بھی ''تیل'' ہی کہلاتا ہے، ورنہ پہلے صرف تلوں کے تیل کو ''تیل'' کہتے تھے۔

ہندو لوگ ''تلک'' لگاتے ہیں۔ سندھور وغیرہ میں پتلی سی لکڑی، تنکہ یا تیلی ڈبو کر، پیشانی پر لگائی جائے گی، تو تل کی سائز کا نشان پڑ جائیگا۔ ''تلک'' در اصل اسے کہتے تھے اور اس کے لفظی معنیٰ ہیں ''چھوٹا سا تل''، (تل + ک، ک اسم تصغیر - Diminutive کی علامت ہے)۔ بڑے تلک بنانا، ایک دو یا تین سطور (تل پنڈ) نکالنے کا رواج بعد میں جاری ہوا۔ مطلب یہ کہ قدیم لوگوں کی توجہ جتنی تل نے مبذول کروائی، اتنی کسی اور جنس نے نہیں کروائی۔

رگ وید کے منڈل آٹھویں (۷۸، ۱۰) میں ''داتر'' Datra (درانتی) لفظ استعمال ہوا ہے، اس سے سمجھا جاتا ہے کہ اناج پک کر تیار ہوتا ہے، تو درانتی سے کاٹتے تھے۔ ساری بالیاں کاٹ کر، باقی تین بالیاں گندھرون (Good Goblins) کے لئے چھوڑ دیتے تھے، (اتھرو وید، منڈل تیسرا ۲۴، ۶)۔ جرمنی کے کسان لوگ آج تک اخیر والے دو تین بالیاں ''ووڈن'' (Woden) دیوتا کی منت چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ وہی دیوتا ہے جسے ہندو ''شو'' مہراج کہتے ہیں، (صفحہ ۹)۔ وادئ سندھ کے آبادگار فصل گاہ کر، سوپ (چھاج) میں اناج صاف کرتے ہیں۔ کچھ گوٹھ زمینوں سے دور تو کچھ نزدیک ہوتے تھے، لیکن راستے بنے ہوئے ہوتے تھے۔[1] یہ راستے کوئی رواجی پگڈنڈی نہیں تھے، لیکن اتنے کشادہ تھے، جو ان پر گاڑیاں چلتی تھیں۔ گاڑیوں کو کھینچنے کے لئے گھوڑے جوتتے تھے۔ زمینوں سے اناج لے آ کر اپنے گھروں میں رکھتے تھے، اور وہاں پر اناج کی تول کر کے مٹی کی گُندیوں (اناج جمع کرنے کا مٹی کا ڈرم) اور بھانڈوں میں رکھتے تھے۔ جن گاڑیوں میں اناج لے آتے تھے، انہیں ''سشکٹ'' (چھکڑے) کہتے تھے، اور چلنے کے وقت چیکاٹ (بیل گاڑی کے چلنے کی آواز) کرتی تھیں، (منڈل دسواں ۱۴۶، ۳)۔ سواری کے لئے ان کے پاس رتھ الگ سے ہوتے تھے، جن کو اوپر سے کور ہوتے تھے، (رگ وید منڈل دسواں ۸۵، ۱)۔

جو لوگ کھیتی کرتے تھے، وہ مال مویشی بھی رکھتے تھے، کیونکہ کھیتی اور مال مویشی لازم و ملزوم ہیں۔ کھیتی کا دارومدار مال مویشی پر ہے۔ ہل اور نار چلانے کے لئے، اناج اور گھاس لے

(1) Vedic Indes, I, P.211.

آنے کے لئے اس وقت کئی لوگ اونٹ اور بیل کام میں لاتے ہیں، لیکن پہلے گھوڑے بھی کام میں لاتے تھے۔ اس کے باوجود کیا قدیم آریوں کی طرح دوسری اقوام کے آبادگاروں نے بیل کی نہایت قدر کر رہے تھے؟ سنسکرت میں بیل کو کہتے ہیں ''بلیورڈ'' اور ''بلدا'' یعنی طاقت دینے والا۔ یہ نار چلا کر زمین کو پانی دیتے ہیں تو زمیں اچھی ہوتی ہے، اس لئے بیل طاقت دینے والا ہے، اور خود بھی طاقتور جانور ہے۔ سندھی میں کہتے ہیں کہ ''ڦلاٽو ڏنڊين ڏاند آهي''، اس کے معنی ہوئے کہ وہ خود نمٹ سکتا ہے۔ شریمد بھاگوت گیتا میں بھیشم پتامہ کو ''نر پنگوھ'' یعنی ''نر بیل'' کہا گیا ہے۔ پہلے صرف جنگجو جوانوں کو ''نر پنگوہ'' کہتے تھے۔ ماں اپنے بیٹے کو بازوؤں میں ہلاتے ہوئے کہتی ہے کہ میرا ''پٹنگ'' بیٹا۔ یہ ''پٹنگ'' اصل میں ہے سنسکرت لفظ ''پنگوہ'' (بیل)، اور اس کے معنی ہیں پہلوان بیٹا، شیر بیٹا، پیش رو بیٹا وغیرہ۔ عربی، فارسی، یونانی وغیرہ زبانوں کے رسم الخط کا پہلا حرف ہے ''الف''، جس کی عبرانی زبان میں معنی ہیں ''بیل''۔ عبرانی زبان میں ''الف'' حرف اس طرح لکھتے تھے جو گویا کہ کسی بیل کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم یہودی لوگوں نے بھی بیل کی بڑی قدر کر کے اسے ایسا شرف بخشا، جو اپنے رسم الخط کے شروع ہی میں اس کی شکل کو جگہ دی۔ سندھی میں بیل سے متعلق کئی ایک کہاوتیں ہیں، جیسا کہ:

''ڦلي آيو، ڳانءُ جو ڄايو، جنهن سارو جڳ نپايو.''

[مرحبا! گائے کے بچھڑے کا جنم، جس سے ہے ساری دنیا کا پالن]

رگ وید والے زمانے میں ہندو گائے کا گوشت کھاتے تھے، لیکن بعد میں بیل اور گائے کے ذبح کرنے کے خلاف کن رشیوں نے آواز بلند کی، اور رفتہ رفتہ سارے ہندو یوں سمجھنے لگے کہ گائے ہلاک کرنا ایک عظیم گناہ ہے، کیونکہ ان کے خیال مطابق ایسے مفید جانوروں کو ذبح نہیں کرنا چاہئے۔ گائے اور بھینس وغیرہ کے دودھ سے لسی اور مکھن ملتا ہے، اور دودھ سے قسم قسم کی مٹھائیاں اور لذیذ طعام بنتے ہیں۔ دیہی علاقوں میں دیکھیں کہ کئی لوگوں کی اہم غذا آج بھی دودھ اور لسی ہے۔ دن کو لسی کے ساتھ، اور رات کو دودھ کے ساتھ روٹی کھا کر اٹھینگے تو کسی اور کھانے کی چیز کی تمنا نہیں رہے گی۔ کھیتی کے لئے مال مویشی کا گوبر اور پھولڑیاں وغیرہ، جو نہایت غلیظ چیز ہیں، وہ بھی کام آتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ''ڀاڻ سدا جواڻ.'' دوسری کہاوت ہی کہ ''ڀاڻ ته کيتي، نه ته ڪوري ريتي.'' اگر مال موشی نہیں ہوتے تو کھاد کہاں سے آتی؟ قدیم زمانے سے لے کر گائے کا گوبر عام طور پر دیوار وغیرہ پر پلاسٹر کرنے کے لئے اور آگ جلانے کے لئے بھی کام آتا ہے۔ مال مویشی اگر مر جائیں تو اس کے بعد بھی کارآمد۔ اس کا گوشت، کھال بلکہ ہڈیاں بھی کام آتی ہیں۔ رگ وید والے زمانے میں ہر ایک گھر کی یہ خواہش

ہوتی تھی کہ ہماری پاس مویشی بڑی مقدار میں ہوں، اور اناج اُگانے کے لئے زمین کا ٹکڑا بھی ہو، (منڈل پہلا ۱۲۷، ۶ اور منڈل چوتھا ۴۱، ۶)۔

قدیم تہذیب کے تین زمانوں کا ذکر کرتے ہوئے، جو کچھ اوپر کہا گیا، اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ وادیٔ سندھ کے باشندوں نے صرف اسی قدر ترقی کی تھی۔ وہ بعد میں بہت ہی آگے بڑھتے گئے، جس سے متعلق کوئی ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے، لیکن یہ احوال اختصار کے ساتھ الگ باب میں وضاحت کے ساتھ دیا جائے گا۔ یہاں صرف اتنا درج کیا جاتا ہے کہ رواجی سکھ اور دکھ کا خیال قدیم آریوں کو اول کھیتی سے آیا۔ اگر برسات پڑتی تو زمین گیلی ہو جاتی، جس کی وجہ سے بھل صفائی کرنا اور کنویں کھودنا آسان ہو جاتا۔ اسی کو کہتے تھے ''سکھ''، جس میں ''س'' معنیٰ ''اچھا'' اور ''کھ۔۔کھن'' معنیٰ ''کھودنا''۔ اگر برسات نہیں پڑتی، تو زمیں انتہائی خشک ہو جاتی اور اُسے کھودنا مشکل ہو جاتا۔ اسی کو کہتے تھے ''دکھ''، جس میں ''د ۔۔ در، دش'' معنیٰ ''مشکل''، اور ''کھ ۔۔ کھن'' معنیٰ ''کھودنا''۔ برسات نہ پڑنے کی وجہ سے پیداوار نہیں ہوگی، تو اس سے بڑھ کر برا وقت کون سا ہو سکتا ہے؟ اسی کو کہتے تھے ''ڈکال'' یعنی خراب وقت، جس کی ضد ہے ''سکال'' معنیٰ اچھا وقت۔

☆

باب ۹

سماجی ڈھانچہ اور بادشاہتیں

دیہی پنچائتیں: قدیم سندھ اور پنجاب کے لوگوں نے اپنی جان اور مال کی حفاظت کے لئے پہلے مشترکہ خاندان کا رواج جاری کیا، اور بعد میں اپنے گھروں اور باڑوں کے اطرف اونچی دیواریں کھڑی کر کے کوتر بنائے، پھر بھی چوری بند نہیں ہوئی۔ جنگلی قومیں وقت بوقت ان پر حملہ آور ہو جاتی تھیں، اور ان کو لوٹ کر مار ڈالتی تھیں۔ ایسے حالات میں پڑوس کے پاس اور اتحاد کی ضرورت میں مزید اضافہ ہوا۔ کسی پر چور یا ڈاکو حملہ آور ہوتے تھے، تو دوسرے پڑوسی چھپ کر نہیں بیٹھتے تھے، لیکن تیر کمان لے کر، دیدہ دلیری سے چوروں کا مقابلہ کرتے تھے، کیونکہ سمجھتے تھے کہ "آج ان پر ہے تو کل ہم پر ہوگی"۔ اسی طرح ان مین اتحاد کی ضرورت میں مزید اضافہ ہوا، اور دکھ سکھ میں ایک دوسرے کی خبر گیری کو اپنا فرض سمجھنے لگے۔ لیکن جو عادی چور تھے، اور جن کا پیشہ ہی یہ تھا، کہ دوسروں کو لوٹ کر اپنا پیٹ پالتے تھے، انہوں نے سکھ کے ساتھ انہیں سونے نہیں دیا۔ کبھی کبھار متعدد ڈاکو آپس میں مل کر ایک ہی گوٹھ پر حملہ آور ہوتے تھے۔ اسی صورت حال میں ہر ایک گاؤں کے لوگوں کے لئے اپنی حفاظت خود کرنا مشکل ہو گیا۔ انہوں نے پھر قریبی گاؤں والوں کو بھی اپنے ساتھ کر لیا۔ اسی طرح کئی گوٹھوں کی ایک ہی پنچائت بنائی گئی، اور اپنی برادری کا دائرہ بڑھا کر وسیع کیا۔ ایکتا بڑھانے کے لئے یہ ایک بہت ہی عمدہ قدم انہوں نے لیا۔

بہت گوٹھون کے مجمعے کو "گرام" کہتے تھے، جس کا تلفظ اب عام طور پر ہوا ہے "گام" یا "گانءِ" اور اس کے معنیٰ ہیں "گاؤں، گوٹھ" یا "بستی"؛ لیکن اس کے بنیادی معنیٰ ہیں "اجتماع"، "جماعت، گروہ"۔ رواجی طرح "گرام" یا "گام" کے معنیٰ ہیں وہ گوٹھ جس میں بڑی تعداد میں لوگ رہتے ہوں، پروفیسر زمر کے خیال موجب "گرام" کے اصل معنیٰ ہیں "مسلح افراد کا گروہ، جو جنگ میں لڑے"۔(1) سچ مچ تو "گرام" کے یہی معنی ہیں، کیونکہ اسی (گرام) لفظ کے شروع میں اگر "س"

(1) "Zimmer has derived the word 'gram', village originally from the sense 'horde' as described the armed force of the tribe which in war fought," Cambridge History of India, Vol. I. p. 90.

سابقہ (Prefix) لگا دیا جائے، تو لفظ بنے گا ''سنگرام''، جس کے معنیٰ ہیں ''لڑائی''، (جس میں جنگی جوانوں کے جتھے آ کر اکٹھے ہوتے ہیں)۔ اسی سبب کہینگے کہ رگ وید والے زمانے میں ''گرام'' ایک بڑی بستی ہوتی تھی، جس میں جنگی جوانوں کے جتھے ہوا کرتے تھے، جو دشمن کے ساتھ لڑنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ گرام کے مکھی یا وڈیرے کو ''گرام منی'' یعنی گام کا مکھی کہتے تھے، (رگ وید منڈل ساتواں ا، ۵، اور منڈل دسواں ۶۲، ۱۱)۔ مطلب یہ کہ گوٹھوں میں گوتر ہوتے تھے، اور ہر ایک گوتر کا مالک یا مکھی ''گوتر پتی'' کہلاتا تھا، لیکن متعدد گوٹھوں کے اوپر ''گرام منی'' ہوتا تھا، اور ہر ایک گوتر کے باشندے گویا اس کی فوج کے سپاہی ہوتے تھے۔

اس وقت کئی گوٹھوں اور شہروں میں رواج ہے کہ ایک ہی گھرانے سے نسل در نسل کوئی مکھی مقرر ہوتا چلا آ رہا ہے۔ رگ والے زمانے میں موروثی مکھی پن تھا ہی نہیں۔ اکثر اوقات انتخاب کا سرشتہ رائج تھا۔ اگر کسی مکھی کا بیٹا اپنے باپ کی طرح برجستہ آدمی ہوتا تھا تو عام خلق میں اس کی بڑی عزت ہوتی تھی، تو پھر مکھی کرنے میں کسی کو کوئی اعتراض ہی نہیں ہوتا تھا، ورنہ عام طور پر الگ الگ برادریوں یا گوتروں والے ایک دوسرے سے صلاح مصلحت سے اپنے مکھی کا چناؤ خود کرتے تھے۔ گرام منی یا مکھی اسکو چنتے تھے، جو برجستہ اور حشمت والا ہوتا تھا، اور جس سے بدمعاش لوگ کتراتے تھے۔ گوٹھ کے سارے افراد اس کا کہا مانتے تھے اور وقت پر اسے مدد دینا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ گوٹھ کا ہر ایک فرد اپنے مکھی کو اپنے باپ کی طرح سمجھتا تھا۔ جس طرح ماں باپ کو پیروں پر ہاتھ رکھ کر عزت دی جاتی ہے، اسی طرح مکھی کے بھی پاؤں پڑتے تھے۔ یہ دستور آج بھی عام ہے۔ چاند کی پہلی تاریخ اور دوسرے بڑے دنوں پر کئی شہروں اور گوٹھوں کے لوگ اپنے مکھی کی قدم بوسی کرنے جاتے ہیں۔ یہ نہایت ہی قدیم زمانے کا رواج ہے، جو آج تک جاری ہے۔

گوٹھ والوں کی جان و مال کی سلامتی اور عزت کے تحفظ کے لئے گرام منی ذمیدار ہوتا تھا۔ اسی سبب ہر ایک گھر کا فرد بر وقت اسے مدد دینے کا ذمیدار ہوتا تھا۔ مثلاً، کسی کا مال مویشی چور چرا کر لے جاتے تھے تو گرام منی کی آواز پر گاؤں کے سارے لوگ اکٹھے ہو جاتے تھے اور چوروں کے ساتھ لڑنے اور مویشی چھڑوانے میں اس کی مدد کرتے تھے۔ ایسے وقتوں پر برجستہ عورتیں بھی مردوں کے ساتھ شانہ بشانہ ہوتی تھیں۔ اسی طرح ضرورت کے وقت گاؤں کے تمام لوگ، مرد خواہ عورتیں، مل کر اپنی جان و مال اور عورتوں کی عزت کا تحفظ کیا کرتے تھے۔

سندھ کے جن شہروں اور گوٹھوں کو دریاء اور کنال نزدیک ہیں، وہاں کے باشندے اپنے بچوں کو بچپن ہی میں تیرنا سکھاتے ہیں، تاکہ ایسا نہ ہو کہ کسی وقت کوئی بچہ ڈوب جائے۔ میر بحروں کے بچے تو لدھڑوں کی طرح پانی میں ڈبکتے رہتے ہیں۔ قدیم آریہ لوگ رہتے ہی دریائے سندھ

اور دیگر ندیوں کے کناروں پر تھے، اس لئے بچپن ہی سے تیرنے کا فن جاننا ان کے لئے ضروری تھا۔ بعض دفعہ چور مال مویشی چوری کر کے دریاء میں سے تیر کر دوسرے کنارے چلے جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں کسی تیرنے والے بندے کے علاوہ کوئی بھی ان کا پیچھا نہیں کر سکتا۔ یہ بھی ایک بڑا سبب تھا، جس وجہ ہر کوئی تیرنا سیکھتا تھا۔ اپنی جان و مال کے تحفظ کے لئے، چوروں اور جنگلی جانوروں کو دور ہی سے بھگا کر نکالنے کے لئے تیر اندازی پر بھی مزید زور دیا گیا، جس میں انہوں نے رفتہ رفتہ حیرت انگیز ترقی کی۔ قدیم رشی ہتھیاروں کے استعمال میں بڑے ماہر تھے، اور دوسروں کو بھی یہ ہنر خود سکھاتے تھے۔ مویشیوں کی چوری عام ہونے کے سبب گھوڑے سواری کرنے کی بھی انہیں ضرورت محسوس ہوئی، تا کہ فوری طور پر چوروں اور ڈاکوؤں کا پیچھا کیا جا سکے۔ یہ چیزیں بعد میں بھی سندھ میں اس قدر عام تھیں، کہ ایک کہاوت بن گئی کہ:

پڙهڻ، ترڻ، تير هٽڻ، چوٽين سواري،
ننڍي هوندي جو نه سکي، وڏي خواري.
[پڑھنا، تیرنا، تیر اندازی اور گھوڑ سواری،
بچپن میں جو نہ سیکھے! جوانی میں خواری]

جرگے: لوگ پہلے مال مویشی پالتے تھے اور پھر کھیتی کرنے لگے، اور کئی ہنروں اور کاریگریوں کو انہوں نے زور پکڑوایا، تو کاروبار وغیرہ کرنا اور دوسری لین دین کی وجہ سے دوسری قسم کے مسائل پیدا ہو گئے۔ ان معاملات سے نمٹنے کے لئے انہوں نے ایک نہایت ہی عمدہ اور آسان سی راہ نکال لی۔

رگ وید والے زمانے میں دیوانی اور دیگر معاملات اکثر گرام منی یعنی گام کا مکھی حل کرتا تھا۔ پانچ افراد کے مشورہ سے وہ جو بھی فیصلہ سناتا تھا، وہ قطعی فیصلہ سمجھا جاتا تھا۔ دونوں داعی مدعی اس فیصلے کو قبول کرنے کے پابند ہوتے تھے۔

ان پانچ آدمیوں کی جماعت پر نام ہی ''پنچات'' پڑ گیا۔ پنچات (پنج + آت As for extending as five) جس کے بنیادی معنی ہیں ''وہ جماعت جس میں فیصلہ کرنے والوں کی تعداد بڑھ کر پانچ تک ہو جائے''۔ پانچوں کے پاس اگر کوئی معاملہ گیا تو سمجھ لیں کہ حقدار کو اپنا حق مل گیا! فیصلہ ایسا کرتے تھے کہ واہ واہ ہو جاتی تھی! ایسے بے ریا ہوا کرتے تھے کہ اگر اپنے بیٹے یا حقیقی بھائی سے متعلق بھی سمجھتے تھے کہ وہ مجرم ہے، تو اُسے سزا دینے میں دیر نہیں کرتے تھے! مطلب یہ کہ ان کے جرگہ منصفانہ اور بے ریائی والے ہوتے تھے۔ یہ رگ وید والے زمانے

کا دستور بعد میں بھی جاری رہا، جس وجہ سے یونانی مورخین نے، بلکہ بعد والے مسلمان مورخین نے بھی مکھیوں اور پانچوں کے عدل و انصاف کی تعریف کی ہے۔ ''آئینہ اکبری'' میں دیکھیں کہ ابوالفضل نے بھی اپنے وقت کے ہندوؤں کی بہت بڑی تعریف کی ہے۔[1] مکھی اور پانچوں کے فیصلے میں لوگوں کا اتنا اعتماد ہوتا تھا، کہ آج تک یہ کہاوت بن گئی ہے کہ ''پانچوں میں پرمیشر''۔ ان تمام باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ مکھیوں اور پانچوں میں سچائی ہوا کرتی تھی اور خدا خوف دل میں رکھ کر جرگے کرتے تھے۔ جس وجہ سے لوگ انہیں پرمیشر کا روپ سمجھتے تھے۔ آج کل جو پانچ پنچاتوں میں جا کر، صرف روڑے اٹکاتے ہیں اور الٹی باتیں کرتے ہیں، ان کو اِس سے سبق سیکھنا چاہیئے۔

قدیم آریوں کے قریبی رشتیدار ایران والے آریہ لوگ تھے، ان کے ہاں بھی یہی دستور ہوا کرتا تھا۔ بلوچستان کے کئی لوگ اگرچہ اکثریت ان پڑھ لوگوں کی ہے، تو بھی رگ وید والے زمانے کے ہندوؤں کی طرح جرگے کرتے ہیں۔ فیصلے کے لئے ''جرگہ'' یعنی چند ایک معزز لوگوں کی جماعت (Council of Elders) اکٹھے ہوتے تھے، جو دائی مدعی کی باتیں سن کر، حق سچ کا فیصلہ سناتے تھے۔ جرگے اسی طرح کی بے ریائی سے ہی ہونے چاہئیں۔

رگ وید سے یوں بھی سمجھا جاتا ہے کہ کچھ لوگ مکھی اور پانچوں تک بھی شکایت لے کر نہیں جاتے تھے۔ معاملے کو شروع میں ہی ختم کرنے کے لئے کوئی ایک معزز شخص ان کے بیچ میں آ کر معاملہ حل کر دیتا تھا۔ منڈل دسویں ۱۲،۹۷ میں ''مدھیماشی'' (Madhyama-si) لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے لفظی معنیٰ ہیں ''ثالثی کرنے والا'' یعنی امین، جو بیچ میں آ کر معاملہ حل کرے۔ آج بھی ہمارے کئی لوگوں کا یہی خیال ہے کہ گھاٹا سہا جائے، مگر کورٹوں کے چکر نہ لگائے جائیں۔ قدیم لوگوں کے بھی یہی خیالات ہوتے تھے، اس لئے پنچاتوں تک فریادی بن کر جانے سے حتی المقدور گریز کرتے تھے۔ لیکن رگ وید والے اوائلی زمانے میں صرف دیوانی معاملے نہیں ہوتے تھے۔ زمینوں اور چراگاہوں کی حدود پر، کنالوں کے پانی،[2] اور دوسری اس طرح کی باتوں پر ایک بستی والوں کا دوسری بستی والوں کے ساتھ بڑا جھگڑا ہو جاتا تھا۔ رگ وید کے منڈل چھٹے (۴،۲۵) میں مخالف گروہوں اور ایک بانکے کا دوسرے بانکے کو قتل کرنے کا تذکرہ ملتا ہے۔ لگتا ہے کہ اس طرح کے فوجداری جرائم کو روکنے اور خونریزی کو ٹالنے کے لئے اور نزدیکی گاؤں کے ساتھ پُر امن رہنے اور ان کے ساتھ برادرانہ تعلقات بڑہانے کے لئے، پھر ایک نیا نمونہ انہوں نے اختیار کیا، اور یہ ترقی کی راہ میں اور بھی نہایت عمدہ قدم تھا۔

(1) "The Hindus are religious, affable, cheerful, lovers of Justice, given to retirement, able in business, admires of truth, grateful and of unbounded fidelity; and their soldiers know not what it is to fly from the field of battle." Samuel Johnson: India, p. 294.

(2) انگریزی لفظ ''رائیول'' (Rival) دراصل ''رور'' (River) یعنی ندی لفظ سے ماخوذ ہے۔ ندیوں کے پانی پر جھگڑے کے سبب ایک گروہ دوسرے گروہ کے خلاف ہو جاتا ہے، اور اسی طرح ان میں رقابت (پہاج پن) پیدا ہو جاتی ہے۔ (مصنف)

صوبوں کی پنچائتیں: قدیم لوگوں نے پھر اپنی پنچات کا دائرہ اور بھی وسیع کیا، پرگنوں کی پنچایتیں بنائیں۔ ایسی پنچاتوں کی مثالیں آج بھی پنجاب، سندھ اور دیگر کئی مقامات پر ملتی ہیں۔ پنجاب کے روہتک ضلع میں چوراسی گوٹھوں کی ایک ہی پنچات تھی، جسے ''چوراسی کھیرا'' کہتے ہیں۔ آپ صرف وسطی سندھ میں نظر کر کے دیکھیں تو وہاں آپ کو سماجی صوبون کی پنچائت آج تک ملے گی، جس میں نوشہرو فیروز، پڈ عیدن، بھریا، ٹھارو شاہ، ٹھٹ، مٹھیانی، چنیجا اور پرن (تحصیل مورو) اور دیگر کئی مقامات شامل ہیں۔ ان تمام مقامات کا ایک ہی پنچاتی آئین ہے، جس پر سب چلنے کے پابند ہیں۔ دل پنچات کا اجتماع کبھی کہاں تو کبھی کہاں ہوتا ہے، اور ہر ایک گاؤں سے چند ایک عیوضی اس میں جا کر حاضر ہوتے ہیں۔ یہ ویدوں والے زمانے کا رواج ہے جو آج تک جاری ہے۔

مکانی حکومتیں (Local Governements): قدیم زمانے کی پنچایتیں مکانی حکومتیں ہوا کرتی تھیں، جن کا ویدوں میں کم، لیکن مہا بھارت میں زیادہ تذکرہ ہے۔ کسی جگہ دس، کسی جگہ بیس، کسی جگہ سؤ بلکہ ایک ہزار گوٹھوں پر مشتمل پنچات ہوتی تھی! اس وقت کی پنچات کو کوئی اختیارات نہیں ہیں۔ اگر کوئی پنچاتی بندی پر نہیں چلتا، یا دوسری طرح کوئی پنچاتی بات نہیں مانتا، تو پنچ صرف اس پر اپنا اخلاقی دباؤ بڑھاتے ہیں؛ لیکن پہلے مکھیوں کو بڑے اختیارات ہوا کرتے تھے۔ متریانی سنہتا (یجر وید) میں ''شتپتی'' لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے معنی ہیں ''سؤ کا مالک'' یعنی ایک سؤ گوٹھوں کا مکھی یا حاکم، اُسے ان تمام گوٹھوں کے فوجداری، دیوانی اور دیگر عام ملکی معاملات بنسبت اختیارات ہوتے تھے۔[1] اس وقت بھی اگر گلیوں اور برادریوں کی پنچائتیں، دل پنچائت سے اور گوٹھوں کی پنچائتیں شہروں کی پنچائتوں سے ملا کر کام کیا جائے اور ہل چل چلا کر پنچائتیوں کو کچھ اختیارات دلوائے جائیں، تو پورے وطن کا بڑی حد تک بھلا کیا جا سکتا ہے۔

سیاسی تنظیم سازی (Political Organization): ویدوں اور اتہاسوں میں درج اس قسم کی حقائق سے قدیم آریوں کی سیاسی تنظیم سازی اچھی طرح سمجھی جا سکتی ہے۔ سیاسی تنظیم سازی کا مرکز گھر تھا، جس میں ایک ہی خاندان کے لوگ اکٹھے رہتے تھے، اور خاندان بزرگ شخص پورے گھر کا حاکم ہوتا تھا۔ گھر میں گویا کہ باپ راجا تھا، ماں رانی تھی، اور بچے ان کی رعایا تھی۔ بہت سارے خاندانوں کا گروہ، جو ایک ہی دادا کی اولاد ہوتے تھے، اُسے ''کل'' یا خاندان کہتے تھے۔ ہر ایک کل کا بزرگ ''کلپا'' یعنی کل کا سنبھالنے والا کہلاتا تھا۔ ''کل'' کو

(1) Maitrayani Sanhita IV. 14, 12. Macdonell and Kesh: Vedic Index II, p. 51.

''کٹنب'' بھی کہتے ہیں، جس کا تلفظ تبدیل ہوکر ''کڑم'' ہوا ہے۔ سب کڑموں کو اکٹھے بھی ''کڑم'' ہی کہا جاتا ہے۔ پہلے سب لوگ اکثر کڑمی (کسان) تھے۔ اس لئے ''کڑم'' لفظ ان دونوں معنوں میں آج تک زیر استعمال ہے۔

کل یا کٹنب کو ''پرور'' بھی کہتے ہیں۔ بہت پروروں کا گروہ ''نکھ'' اور بہت نکھوں کا گروہ ''گوتر'' کہلاتا تھا۔ ہر ایک گوتر کا بڑا ''گوتر پتی'' کہلاتا تھا۔ یہ گویا ان کا بڑا دادا تھا اور ان کا حاکم بھی وہی تھا۔ بہت سارے گوتروں کے گروہ کو ''گوٹھ'' اور بہت سارے گوٹھوں کو ملا کر ''گرام'' (گام۔گانء) کہتے تھے۔ ہر ایک گرم کا مکھی ''گرام منی'' کہلاتا تھا، جو گوٹھ والوں کے مال و عزت کی حفاظت کا ذمیدار ہوتا تھا، اور ان کے دیوانی خواہ فوجداری معاملات نبٹاتا تھا۔ جو شخص ایک سؤ گوٹھوں کے اوپر ہوتا تھا اُسے ''شتپتی'' یعنی ''سؤ کا مالک'' (ایک سو گوٹھوں کا مالک) کہتے تھے۔ بہت سارے گرام مل کر، جس میں ایک ہزار بلکہ اس سے بھی زیادہ گوٹھ شامل ہوتے تھے، اُسے ''وس'' (Canton or District) کہتے تھے۔خود وہاں کے باشندے بھی ''وسہ'' Visah (Commoners) کہلاتے تھے، جس کے بنیادی معنیٰ ہیں ''واسو یا بیٹھک کرنے والا بیٹھکی''۔ ''وس'' میں سارے آبادگار، کاسبی اور بیاری شامل تھے، جس سے ''وش'' کے معنی ہوئے ''عام خلق''۔ اسی ''وس'' لفظ سے بعد میں ''وَیش'' لفظ بنا؛ اور آج تک آبادگار، کاسبی اور بیاری وَیش کے زمرے میں آتے ہیں۔ بہت وسوں کے گروہ کو ''جن'' یعنی قبیلہ (Tribe) کہتے ہیں۔[1] اور ہر ایک جن کا اپنا اپنا راجا ہوتا تھا اور وہ جن اس کی رعایا ہوتے تھے۔ مطلب یہ کہ جس طرح اس وقت سندھ میں خیرپور ریاست ہے، اور اس کا والی میر صاحب ہے، اسی طرح رگ وید والے زمانے میں بھی دیسی ریاستیں ہوا کرتی تھیں، اور ہر ایک ریاست کا والی یا حاکم اپنا اپنا ہوتا تھا۔ سیاسی تنظیم سازی کا یہی نمونہ ایران، اٹلی، گریس (یونان)، رشیا (روس) اور جرمنی میں ہوتا تھا۔[2]

راجائی کی بنیاد: رگ وید کے منڈل پہلے (سوکت ۳۶، منتر ۱۰) کے مطابق لوگوں کا پہلا راجا منو بھگوان تھا، لیکن راجا مقرر کرنے کا رواج کیونکر ہوا، یہ احوال اس میں درج نہیں ہے۔ مہابھارت سے معلوم ہوتا ہے کہ پانڈون اور کورون کا بڑا کاکا بھیشم پتامھ جب جنگ کے

(1) ''جن'' لفظ کے اصل معنی ہیں ''آدمی''، اور اسی سے سندھی لفظ ''جنو'' بنا ہے؛ جس طرح کہتے ہیں ھک جنو، بہ جنا۔ یہی ''جن'' لفظ جمع کا صیغہ بھی ہے۔ مثلاً ''ہریجن'' معنیٰ ''ہری یا بھگوان کے لوگ'' (People of God)۔ اسی طرح ''جن'' لفظ قوم کے معنی بھی دیتا ہے۔ سنسکرت لفظ ''جن'' (Jana) کا تلفظ لاطینی میں Gens اور یونانی میں Geons ہے۔

(2) "This scheme can be supported by apparent analogies not only from Greece, Italy Germany and Russia, but also from the Iranian State with the graduated heirarchy of family or house holds, viz, Zantu and Dahyu." Cambridge History of India, Vol. I. P.91.

میدان میں تیروں کی سیج پر سویا ہوا تھا، تب پانڈون کے بڑے بھائی راجا یدھشٹر کو بہت ساری باتوں سے متعلق اس نے نصیحت کی تھی۔ راج دھرم سے متعلق نصیحت کرتے ہوئے اُسے راجائی (اصولوں) کی بنیاد بھی بتائی۔ یہ مختصر طور پر یہاں درج کیا جاتا ہے، کیونکہ اس سے موجودہ دیگر رواجوں سے متعلق بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

قدیم دور میں زمین پر نہ کوئی حکومت تھی نہ کوئی راجا تھا۔ لوگ اپنی حفاظت خود کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے دیکھا کہ اپنی حفاظت آپ کرنا مشکل کام ہے۔۔ کچھ لوگوں کی پرائے مال میں آنکھیں تھیں، تو کچھ اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکتے تھے، جس وجہ سے لوگ ایک دوسرے کا گوشت نوچ لیتے تھے۔ اس وقت کچھ سمجھدار اور اشراف لوگوں نے آپس میں مل کر یہ عہد کیا کہ جو تلخ زبان والے ہیں، طبعًا شوخ ہیں، زناکار اور عیاش ہیں اور جن کو چوری کرنے اور دوسروں کے حقوق غصب کرنے کی عادت ہے، ان کو ہم اپنی برادری سے نکال دیں گے۔ اس سے دیکھنے میں آئیگا کہ ''حقہ پانی بند کرنا'' یا کوفے سے نکال دینے کا رواج نہایت قدیم زمانے کا ہے۔ ایسے عہد کرنے کے بعد لوگوں میں ایک دوسرے پر اعتماد بحال ہوا، تو کچھ وقت آرام و سکوں سے انہوں نے گذارا، بعد میں انہیں یقین ہوگیا کہ کوئی راجا مقرر کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں، کیونکہ دین اور بے دینی کا فرق تو لوگ رکھ ہی نہیں رہے، اور خدا سے بھی کنارا کش ہوتے جا رہے ہیں۔ انہوں نے پھر دلبرداشتہ ہوکر دنیا کے پیدا کرنے والے (برہما) سے التجا کی کہ ''راجا کے بغیر ہم ناس ہو جائیں گے، اس لئے ہمارے لئے کوئی راجا مقرر کیا جائے۔ وہ ہمارا بچاؤ کریگا، تو ہم اسے اپنا بزرگ (پوج) کے طور پر شمار کرینگے۔'' ان کی یہ التجا سنی۔ برہما نے پھر منو بھگوان سے کہا کہ تو زندگی کی حفاظت کے لئے ان کا راجا بن۔ اُس نے کہا کہ ''حکومت کرنا اور لوگوں کو سچائی اور مذہب پر چلانا آسان کام نہیں''، اس پر لوگوں نے منو بھگوان سے کہا کہ ''آپ کوئی بھی خیال نہ کریں، آپ کو کوئی بھی گناہ نہیں چھو سکے گا۔ شاہی خزانے کو بھرپور کرنے کے لئے ہم اس کی پیداوار کا دسواں حصہ اور اپنے سون کا پچاسواں حصہ دینگے۔ اور گائیں، بھینسیں اور دوسرا مال مویشی بھی دینگے۔ ہم میں سے جو ہتھیار چلا سکتے ہیں، اور سواری کرنا جانتے ہیں، وہ تیرے پیچھے اس طرح چلیں گے، جس طرح دوسرے دیوتا راجا اندر کے پیچھے چلتے ہیں۔ اس طرح آپ کبیر دیوتا (بھگوان کے خزانچی) سے بھی زیادہ زورآور ہونگے اور آسانی سے ہمارا بچاؤ کر سکوگے۔ تیرے پناہ میں رہ کر بھگوان کی بھگتی کریں گے اور اس سے ہمیں جو روحانی فاعدہ ہوگا، اس کے بھی چوتھے حصے پر تمہارا حق ہوگا۔ اے سوامی، اندر دیوتا کی طرح آپ ہمارا تحفظ کریں اور تجلیدار سورج کی طرح باہر نکل کر، ہمارے دشمنوں کو شکست دیں۔ آپ ہمارے دشمنوں کو

ہرا کر ان کا سر نیچا کرو گے، تو مذہب ہمیشہ ہماری حفاظت کرتا رہے گا''۔ منو بھگوان پھر زندگی کی حفاظت کرنے کے لئے بڑے شان وشوکت اور دبدبے کو ساتھ اپنے قلعے سے باہر آیا اور بے شمار لوگ مسلح ہو کر، اس کے پیچھے چلے، (مہا بھارت شانتی پرو، ۶۷)۔

مذکورہ بالا مضموں سے ظاہر ہے کہ نہایت قدیم زمانے میں ہی لوگوں نے محسوس کیا کہ اپنی جان و مال کی حفاظت کے لئے، اور امن و امان میں رہ کر خوش زندگی گذارنے کے لئے، کسی قوی شخص کو اپنا راجا مقرر کیا جائے۔ اور اپنی پیداوار سے اُسے حصہ دیا جائے، تاکہ رعایا کو پرسکون ماحول فراہم کرنے میں اُسے آسانی ہو۔ حکومت کو محصول دینے کا رواج اسی طرح جاری ہوا، جو لوگوں نے اپنے سکون کے لئے خود ہی اپنے پر مڑھا ہے۔ فوجی محکمہ کی تشکیل، اور لشکر میں بھرتی کرنے کا رواج بھی لوگوں نے اپنی خوشی سے جاری کیا، تاکہ اپنے وطن کی حفاظت کرنا آسان ہو۔ اس طرح رعایا اپنے راجا کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کر رہی تھی، جس میں اہم بات یہ تھی کہ راجا ان کی مرضی سے مقرر ہوتا تھا۔ لوگوں کو دلپسند راجا ملے گا تو ان میں وفاداری بھی خود بخود پیدا ہوگی۔ آج بھی کہتے ہیں کہ'' جنهن جي ويلا، تنهن جي رکيا '' یعنی جس کی صاحبی ہو اس کی ہمیشہ خیر ہو۔ دوسری اقوام کی تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی بہت وفادار ہوا کرتی تھیں، اور حاکموں کے فیصلوں پر چلنے کے لئے خود کو پابند سمجھتی تھیں۔ حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب کرنے کا حکم ہوا تو کوئی جھگڑا یا ضد نہیں کیا؛ لیکن خدا کی رضا خاطر بلا تکرار اپنا سر دے دیا۔ منصور بھی مسکراتا ہوا سولی پر سوار ہوا۔ مسلمانوں کے قرآن شریف میں بھی راجائی حکم کو ماننے کی ہدایت اور وفاداری کی تاکید ہے۔

راجا کے فرائض اور اس کی خود مختیاری میں رکاوٹیں: ویدوں والے زمانے میں لوگوں میں جمہوریت کا رجحان زیادہ ہوتا تھا۔ اپنے لئے راجا خود مقرر کرتے تھے۔ وہ یوں سمجھتے تھے کہ ملک ہمارا ہے، راجا کو ہم نے اپنی خوشی سے اپنی حفاظت کے لئے مقرر کیا ہے، اس لئے اُسے اپنے فرائض پورے کرنے ہیں، اور اِسی فرض ادائی میں ہم نے اُسے پیسہ اور افرادی مدد دینا ہے۔ اسی سبب وہ اپنے آپ کو رعایا نہیں سمجھتے تھے۔ ان پر ہتیار وغیرہ رکھنے پر کوئی پابندی نہیں ہوتی تھی، سو جب دیکھتے تھے کہ راجا لوگوں پر بھاری محصول کا بوجھ ڈال رہا ہے، اس وقت اس سے جنگ جوتنے کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔ ایسی حالت میں کسی بھی راجا کو یہ جرئت نہیں ہوتی تھی کہ وہ خودمختیار بن کر جو چاہے وہ کرے۔ دوسری بات کہ اگر راجا کے کسی قریبی رشتہ دار کو حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لینے کی نیت ہوتی تھی تو رعایا کو مزید سہولیات اور

آسائشیں دینے کے دلاسوں سے اپنا طرفدار بنا لیتا تھا؛ جس وجہ سے راجا ایسے لوگوں کو کالی ضرب لگاتا تھا۔ تیسری بات کہ جس طرح اس وقت سندھ میں ''کچھ چور'' ہیں، اسی طرح رگ وید والے زمانے میں بھی کچھ اسی طرح کے چور ہوا کرتے تھے۔ غیر آریہ لوگوں میں سے کئی پہاڑوں اور سرحدی علاقوں سے نقل مکانی کر کے، آریوں کے دیس کی ریاستوں میں آ کر رہنے لگے تھے۔ وہ موقع پا کر آریوں کا مال مویشی چوری کر کے لے جاتے تھے، اسی وجہ سے وہ ''اسر'' اور ''دیت'' کہے گئے ہیں۔ وہ وقت بوقت مصیبت کھڑی کر دیتے تھے، اسی لئے راجا مقرر کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ وہ جب خود یا کسی کے اشارہ پر امن و امان کا مسئلہ پیدا کرتے تھے تو راجا کے دشمنوں کو بھی یہ کہنے کا موقع مل جاتا تھا کہ راجا کو راجائی چلانے نہیں آتی۔ ان تمام اسباب کی وجہ سے راجائی بھی ہر وقت خطرے میں رہتی تھی۔ اُسے ہر طرح کا خیال رکھنا پڑتا تھا، اور آپیشاہی (Autocracy) والا نمونہ نہیں چل سکتا تھا۔ یہ گویا کہ اس کے مطلق خود مختیار بن کر رہنے میں رکاوٹیں تھیں، اس لئے ہر طرح رعایا کے دل اُسے جیتنے پڑتے تھے۔ اس کے باوجود بھی اتنا رعب تاب رکھتا تھا کہ ہر کوئی اس سے ڈرتا تھا، کہ ایسا نہ ہو کہ راجا مجھ پر غضب ناک ہو جائے، (اتھرو وید منڈل چھٹا،۴)۔ راجا کو اس طرح کا رعب ضرور رکھنا ہے تا کہ رعایا سمجھے کہ کوئی بھی لفنگا آدمی ہمارہ بال بھی ٹیڑھا نہیں کر سکتا، اور اگر کوئی بے قاعدہ سلوک کرے گا تو فوری طور پر اسے سزا دلوائی جا سکیگی۔ اس طرح کی تسلی جب لوگوں کے دلوں میں ہوگی، تب وہ کسی بھی قسم کے خوف و ہراس کے وقت بے وقت باہر نکل سکیں گے، اور سکھ سے اپنے دھندھوں کی طرف توجہ دینگے، جس وجہ سے ہنر اور کاریگروں میں اضافہ ہوگا اور ملک ترقی کرے گا۔

براہمن کا زور: راجا اپنا راج، مذہب اور راجائی فرض پوری طرح نبھائیں، اس لئے ویدوں والے زمانے میں ہی لوگوں نے ضروری سمجھا کہ راجکماروں کو بچپن ہی میں راج، مذہب اور سیاسی باتوں کی تربیت دی جائے، تا کہ بڑے ہو کر حکومت کا کاروبار اچھی طرح چلا سکیں۔ اس وقت براہمن اور رشی، مذہب اور نیتی کے قوائد کو اچھی طرح جانتے تھے، اور وہ ہی راجکماروں کے اتالیق بنے۔ خود راجا بھی براہمنوں اور رشیوں کے علاوہ نہیں رہ سکتے تھے۔ ہر جگہ راجا کے لئے ضروری تھا کہ پہلے اپنے لئے کوئی پروہت مقرر کرے، اور پھر اپنی تاجپوشی کا بندوبست کرے، (مہا بھارت، شانتی پرو،۳ اور ۲۹)۔ راج کی سلامتی اور ترقی کا دارومدار راجا پر ہے؛ لیکن خود راجا کی ترقی کا دارومدار اس کی پروہت پر ہے، (شانتی پرو ۴۷، ۱۔۲)۔ عام طور پر لوگ یوں سمجھتے تھے کہ براہمنوں میں کوئی ایسی قوت ہے، جو جب وہ صحیح طریقے سے ویدوں کے منتر پڑھتے ہیں،

تب ہر ایک یگیہ ٹھیک ہو جاتا ہے، اور دیوتا لوگوں کے دل کی مرادیں پوری کرتے ہیں۔ یوں بھی سمجھتے تھے کہ یگین اور پوجا کے علاوہ نجات ہونی ہی نہیں، اس لئے عام لوگوں کو، خواہ راجاؤں کو کوئی بڑا یگیہ کروانا ہوتا تھا تو ہمیشہ براہمنوں اور رشیوں سے کرواتے تھے۔ یگین اور پوجا کے وقت براہمنوں اور رشیوں کے راجا بھی پاؤں پڑتے تھے اور ان کے پاؤں دھوتے تھے، یہ تابعداری کی علامت ہے۔ عام لوگ بھی براہمن اور رشیوں کے سامنے جھکتے تھے، اور راجا خود عام خلق کی مدد کا محتاج ہوتا تھا۔ ایسی حالت میں براہمن اور رشی راجاؤں سے بھی زیادہ زور ہوتے تھے، وہ بھی اتنی قدر کہ ہر ایک ملکی ریاست کا راجا ''وِسپتی'' یعنی ''وِس'' یا عام خلق کا راجا کہلاتا تھا، نہیں کہ ''برہمپتی''، براہمن، گویا اپنے حاکم آپ ہوتے تھے۔ اتنے مان مرتبے اور بڑی رسائی کے باوجود بھی براہمنوں نے اکثر راجا بننے کی کوشش نہیں کی، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وزیری کے عہدے پر رہ کر؛ راجا کو مذہب اور نیتی کے مطابق چلائینگے، تو اس طرح وطن کی خدمت زیادہ اچھی طرح سے ہو سکے گی۔ براہمنوں نے علحدہ اپنی کوئی کلیسیا (Church) وغیرہ بھی نہیں بنائی، جیسا کہ قدیم زمانے میں یورپ میں یہ رواج تھا۔ یورپ میں پہلے ایک ہی کیتھولک مذہب تھا، اور پاپا (Pope) ''دھرم رکھپال'' (Defender of Faith) کہلاتا تھا۔ ویدک زمانے میں خواہ اس کے بعد کسی بھی براہمن یا رشی کو ایسا لقب نہیں ملا تھا، پھر بھی سارے لوگ اُسے مذہب کا رکھوالا سمجھتے تھے۔ خود راجا بھی ان کے وضع کردہ قوائد پر چلنے کے پابند ہوتے تھے۔ آج بھی ان ہی کے بنائے ہوئے قوائد اور ان ہی کے جاری کردہ رواجوں کے مطابق کورٹوں میں ہندوؤں کے معاملات نبٹائے جاتے ہیں۔ ساری کورٹیں اس قدیم ''ہندو لا'' (Hindu Law) پر چلنے کی پابند ہیں، اور جو بھی فیصلہ ان قوائد کے مطابق نہیں ہوتا، وہ رد اور باطل سمجھا جاتا ہے۔

براہمنوں اور رشیوں کا مان مرتبہ اگرچہ یورپ کے پوپوں (Popes) جیسا ہوتا تھا، تاہم دونوں کی چلن سلن میں بڑا فرق ہوتا تھا۔ یورپ کے پوپ شاہی شان وشوکت رکھتے تھے، اور بڑے تزک واحتشام سے دیول (چرچ) میں آتے تھے۔ وادیٔ سندھ کے براہمنوں کی چال چلن ہی نرالی ہوتی تھی۔ وہ بچپن ہی سے سر منڈوا کر، جنیئو پہن کر، اپنے گرو سے علم سیکھنے جاتے تھے، اور وہ سارا وقت کوئی دھندھہ کر کے یا بھیکھ مانگ کر خود بھی کھاتے تھے اور اپنے گرو کو بھی کھلاتے تھے۔ جب ہر قسم کا علم سیکھ کر قابل ہو جاتے تھے، تب دوسروں کو علم سکھانے، یگیوں اور پوجا کرنے کا کام اپنے ذمے لیتے تھے۔ یگیوں اور پوجا کرنے کے وقت کسی بھی مسند پر چڑھ کر نہیں بیٹھتے تھے؛ لیکن چوگا پہن کر نیچے زمین پر بیٹھتے تھے۔ مطلب یہ کہ ٹھاٹھ یا آڈمبر ان کے ہاں نہیں تھا۔ انکساری اور حلیمی سے اپنے مذہب پر پورے طور پر چل کر، اپنے آپ کو اتنے حد تک

لائق بناتے تھے؛ جو راجا ان کے پیروں پر ہاتھ کر ان سے دعائیں مانگتے تھے۔ خود رگ وید میں کہا گیا ہے کہ ''جو راجا براہمنوں سے بھلائی کرتا ہے، اُس پر دیوتا خوش ہو کر اس کی حفاظت کرتے ہیں''، (منڈل چوتھا، سُوکت ۵، ۸۔۹)۔ اس کے باوجود بھی براہمنوں اور راجاؤں کے مابین وقتی جھگڑے ہوتے تھے، جس طرح یورپ میں بادشاہوں اور پوپوں کے مابین ہوتے ہیں۔ مثلاً، انگلینڈ کے بادشاہ ہینری آٹھویں کی مرضی ہوئی کہ اپنی رانی کتھرین کو نکال کر، ائن بلین سے شادی کرے۔ اس کام کے لئے اس نے پوپ سے اجازت چاہی تو اس نے زندہ بیوی کے ہوتے، اُسے دوسری شادی کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اس پر بادشاہ کو ایسی آگ لگ گئی، کہ اس نے پوپ سے کلیسیا (Church) کے سارے اختیارات چھین لئے، اور آئندہ کے لئے مذہب کا رکھوالا خود بنا۔ وادیٔ سندھ میں براہمنوں اور کھتریوں (راجاؤں اور دیگر کھتریوں) کے مابین جھگڑے اکثر تین باتوں پر ہوتے تھے:

۱- براہمنوں میں عزت نفس (Self Respect) بہت زیادہ ہوتی تھی، اس لئے جب کوئی راجا کسی براہمن کی بے عزتی کرتا تھا، یا غصے سے کوئی تکلیف پہنچاتا تھا، یا مار ڈالتا تھا، تب براہمن اس کا مقابلہ کرتے تھے اور بڑا تنازعہ اٹھ کھڑا ہوتا تھا۔

۲- جب کوئی راجا براہمنوں کو نظر انداز کر کے، یگین اور پوجا کرنے کا خود کو حقدار سمجھتا تھا، تب براہمن اعتراض اٹھاتے تھے، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ راجا ہمارے کاموں اور حقوق میں دست اندازی کر رہا ہے، لیکن اس طرح کے جھگڑے بہت بعد میں ہونے لگے۔

۳- اگر کوئی بھی کھتری، راجاؤں اور دوسروں کو یگیہ کرواتا تھا، تو اس پر بھی براہمنوں کا اس کھتری سے جھگڑا ہو جاتا تھا۔ مثلاً، وشوامتر کھتری ہوتے ہوئے راجا سوداس کو یگیہ کروا رہا تھا، تو وشٹ منی نے سخت اعتراض کیا۔ راجاؤں اور براہمنوں کے مابین جھگڑے ہونے کے پہلے دو اہم سبب ہوتے تھے، ان میں سے پہلا سبب زیادہ اہم ہوتا تھا، جو کوئی بھی براہمن اپنا اپمان برداشت نہیں کر سکتا تھا، اس لئے ہر کسی راجا کو بڑی خبرداری سے چلنا پڑتا تھا۔ (1)

رگ وید والے زمانے میں براہمن رشی اتنی طاقت رکھتے ہوئے بھی حتی المقدور اس کا ناجائز فائدہ نہیں اُٹھاتے تھے۔ عام لوگ ان کی اطاعت کرتے تھے، اس لئے کسی بھی راجا کو حکومتی کرسی پر بٹھانا یا اُس کو اتارنا ان کے بس میں ہوتا تھا۔ پھر بھی نہ کبھی خود راجا بننے کی کوشش

(1) "The vast majority of contests mentioned were of the first kind. Very few of the second kind are recorded. These two kinds were the analogues of disputes and contests in Europe between the temporal and spiritual powers." F.E. Pargiter: Ancient Indian Historical Tradition, P.P. 243 ..44.

کرتے تھے اور نہ ہی کسی راجا کو تخت چھوڑنے پر مجبور کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر روز بروز راجا تبدیل ہوتا رہیگا تو اس میں دیس کے لئے اچھائی نہیں ہے۔ اس لئے بنا کر رہنے کی ضرورت کو محسوس کرتے تھے، اس بات کا مہا بھارت کے شانتی پرو میں کافی تذکرہ ہے۔ راجا کو شاید کوئی دشمن ہٹانے کی کوشش کرے، اور ملک میں بد امنی پیدا ہو، تو ان کو روکنے کے لئے انہوں نے مناسب اقدامات کئے، جن کا تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے۔

راجاؤں کا انتخاب: وادئ سندھ میں کسی بھی جگہ کے لئے انہیں اگر کوئی راجا مقرر کرنا ہوتا تھا، تو دوسرے مقامات کے راجاؤں کو دعوت دے کر بلاتے تھے، یہ آس پاس کے راجاؤں سے برادری جوڑنے کا ایک طریقہ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی قبولیت سے راجا کی مقرری سبب، کسی جنگ فساد کا امکان نہیں ہوتا تھا۔ جسے راجا کے طور وہ مقرر کرنا چاہتے تھے، ہوسکتا ہے اس کے عزیزوں میں سے کوئی حسد کرے اور تخت حاصل کرنے کے لئے کوئی سازشیں کرے اور امن و امان کا مسئلہ پیدا کرے، اس لئے انہوں نے ضروری سمجھا کہ راجا کے انتخاب میں خود اس کے عزیزوں کا بھی ہاتھ ہو۔ اور وہ بعد میں بھی اس کے مشیر بن کر رہیں۔ راجا انکے صلاح مشورے سے کاروبار چلائے گا، تو پھر کسی کو عیب جوئی کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ یہ دستور اختیار کر کے، دشمنی، عداوت، حسد اور حرص کو گویا کہ انہوں نے روک دیا۔ یہ حقائق اتھرو وید میں درج ہیں۔ اتھرو وید کے منڈل تیسرے (سکت ۴) میں راجا کو تخت ملنے کی ٹیکیہ کے وقت ایک رشی اُسے کہتا ہے کہ: ''الگ الگ قوم کے لوگ آپ کو راجا منتخب کریں گے، آپ کے عزیز و اقارب آپ سے ملنے کے لئے آئینگے اور آپ کے ساتھ اگن دیوتا بھی آپ کے آنے کی پیشگی اطلاع دینے کے لئے آئیگا''۔ اس میں دیکھنے میں آئیگا کہ راجا کے انتخاب کے وقت الگ الگ قوموں کے لوگوں، رشیوں، براہمنوں اور راجا کے عزیزوں کا ہاتھ ہوتا تھا۔ ان سب کو ''راجکرتھ'' (King Makers) کہا گیا ہے۔ راجا کے انتخاب کے وقت الگ الگ گاؤں کے لوگ اپنے اپنے گرام منی کو اپنا عیوضی کر کے بھیجتے تھے، اور وہ عام خلق کی طرف سے اپنی رائے کا اظہار کرتا تھا۔ راجا کی مقرری میں اور ہاتھ ہوتا تھا ''رتھکاروں'' کا، یعنی رتھ اور گاڑیاں بنانے والوں کا۔ جس طرح آج کل جپانی خواہ یورپی لوگ جہازوں میں چڑھ کر جنگ کرتے ہیں، اور ہوائی جہاز بنانے والوں کو بڑی عزت دیتے ہیں، اسی طرح پہلے راجا اور دوسرے جنگی عملدار رتھوں میں چڑھ کر جنگ کے میدان میں جاتے تھے، جس وجہ سے رتھکاروں کی عزت ہوتی تھی۔ وہ بھی راجا کے انتخاب مین حصہ لیتے تھے۔ راجاؤں کے انتخاب میں ''سوتوں'' کا

بھی ہاتھ ہوتا تھا۔ ''برہمنی ماں'' اور ''کھتری باپ'' سے پیدا شدہ بیٹے کو ''سُوت'' کہا جاتا تھا۔ سُوت اکثر ''سارتھی'' یعنی رتھ چلاتے تھے۔ یہ رواجی گاڑی چلانے والے نہیں ہوتے تھے، لیکن بڑے جنگجو اور تیر اندازی میں ماہر ہوتے تھے۔ جنگ کے وقت جو راجا یا جنگی عملدار رتھ میں بیٹھ کر، جنگ کے میدان میں جاتا تھا، وہ سارتھی (رتھ چلانے والا) کے پیچھے بیٹھ کر دشمنوں کو تیر مارتا تھا۔ دشمنوں کی طرف سے جو تیر آتے تھے وہ سیدھے سارتھی کی طرف آتے تھے! لیکن وہ چالاکی کر کے خود کو تیر سے بچا لیتا تھا، اور اُسی وقت اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے سوار کو بھی اس تیر سے بچا لیتا تھا۔ مطلب یہ کہ جو شخص زبردست جنگی جوان اور لڑائی کے فن میں ماہر ہوتا تھا، اُسے اپنا سارتھی بناتے تھے۔ یہی سبب تھا جو مہا بھارت والی لڑائی میں شری کرشن اپنی مہربانی سے آرجن کا رتھ چلا رہا تھا، اور اپنی جان خطرے میں ڈال کر آرجن کا بچاؤ کر رہا تھا۔ ویدوں والے زمانے میں راجا کی مقرری کے وقت یہ سُوت جنگی فوج کے عیوضی بن کر آتے تھے۔ اسی طرح صرف رشیوں اور براہمنوں؛ لیکن جنگی محکمہ اور عام خلق کے عیوضیوں کی رضامندی سے راجا مقرر ہوتے تھے، اور لوگ سچ مچ کا راج پاتے تھے۔ یہ باتیں اتھرو وید کے منڈل تیسرے، سُوکت ۵ میں درج ہیں۔

راجا کی تاجپوشی: رعایا اپنے لئے جس راجا کا انتخاب کرتے تھے، اس کی تاجپوشی کا ذکر رگ وید کے منڈل دسویں (سُوکت ۱۷۳)، اور اتھرو وید کے منڈل چھٹے (۸۷، ۸۸) میں ہے۔ راجا کو تخت پر بٹھانے کے وقت ایک رشی کہتا ہے کہ ''ہمارے درمیاں میں آؤ اور پختا بن کر بیٹھو۔ کاش سب کو آپ پسند آئیں۔ آپ خدا کرے اپنے تخت پر سے نہ ہلیں۔ یہاں مضبوطی سے بیٹھو، اور کاش یہاں سے اتر کر نیچے نہ آؤ۔ یہاں اندر دیوتا کی طرح پختہ بن کر بیٹھو اور ریاست کی باگیں اپنے ہاتھوں میں پکڑو۔ جس طرح آکاس استھر ہے، پرتھوی استھر ہے، پہاڑ استھر ہیں، اِسی طرح کاش ''وِس'' یا عام خلق کا راجا بھی استھر ہو! کاش ورن دیوتا، برہسپت دیوتا، اندر اور اگنی دیوتا کی کرپا سے حکومت کی باگیں آپ کے ہاتوں میں پختہ ہوں! جو آپ کے دشمن ہوں، یا آپ سے دشمنوں کا سا سلوک کریں، ان کو آپ اپنے پیروں تلے کچل دیں، لیکن آپ کو کوئی ٹھوکر نہ آئے۔ تمام لوگ یکرائے ہو کر آپ کی عزت کرتے ہیں، اور سمتی آپ کو مقرر کرتی ہے کہ آپ محکم ہوں''۔ اس سے ظاہر ہے کہ قدیم زمانے میں ہی رشیوں کو علم تھا کہ حکومت کا چرخہ اچھی طرح تب چلے گا، جب راجا کی راجائی پکے پائے پر کھڑی ہوگی۔ اِسی سبب سے اس طرح کی دعائیں کر رہے تھے کہ راجا کا راج قائم ہو!

سبھا اور سمتی: رگ وید والے زمانے میں راج دربار کے اجتماع دو ناموں سے پکاری جاتے تھے: ''سبھا'' اور ''سمتی''، دونوں کے درمیان کا فرق تھا، یہ رگ وید میں درج نہیں ہے، لیکن جو حقائق رگ وید میں الگ الگ مقامات پر درج ہیں، ان سے ہماری علماء کو یوں سمجھ میں آتا ہے کہ ''سمتی'' ایک بڑی کانگریس ہوا کرتی تھی، جس میں تمام کُلون کے لوگ آ کر اکٹھے ہوتے تھے۔ سمتی میں راجا بھی جاتے تھے (رگ وید منڈل نواں ۹۲، ٦)، ''راجنہ سمتویۂ'' یعنی امیر امراء بھی وہاں آ کر اکٹھے ہوتے تھے، (منڈل دسواں، ۹۷، ٦)۔ رگ وید کے منڈل دسویں (۱۷۳، ۱) میں واضح طور پر درج ہے کہ ''سارے یکرائے ہو کر آپ کی عزت کر رہے ہیں اور سمتی آپ کو مقرر کرتی ہے''۔ یہ وہی سطر جو تاجپوشی کا تذکرہ کرتے ہوئے دی گئی ہے، اس سے اور دیگر اس طرح کے احوالوں سے علماء کو یوں سمجھ میں آیا ہے کہ سمتیوں میں لوگوں کا اجتماع راجا کے انتخاب، تاجپوشی کے جلسوں اور دیگر اس طرح کے خاص مواقع پر اکٹھا ہوتا تھا، باقی دوسرا ملکی کاروبار راج سبھاؤں میں چلتا تھا۔

''سمتی'' لفظ کے بنیادی معنی ہیں ''جہاں لوگ جا کر اکٹھے ہوں''۔[1] اس لئے آج تک ''سمتی'' لفظ ''سبھا منڈل یا اجتماع'' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، لیکن شاین آچاریہ، جس نے ویدوں کی شرح کی ہے، اس نے ''سمتی'' لفظ کے معنی کیے ہیں ''سنگرام یا لڑائی''، یاسک منی نے بھی یہی معنی کیے ہیں۔ بڑی بات یہ کہ اتھرو وید کے منڈل بارہویں سُکت پہلے میں ''سمتی'' اور ''سنگرام'' لفظ اس طرح اکٹھے استعمال ہوئے ہیں، جو گویا کہ ایک ہی معنی والے الفاظ ہیں۔ ''سمتی'' لفظ کے پہلے یہ معنی کس حساب سے تھے، یہ بات سمجھنا تب آسان ہوتی ہے، جب یورپ کے قدیم سمتیوں کی باتیں دھیان میں رکھی جاتی ہیں۔ یونان کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں وہاں اگر کوئی بڑی ملکی بات ہوتی تھی تو آزاد خیال لوگ پلٹون کی طرح صفیں باندھ کر راج دربار میں جا کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ ٹیوٹانک قوم میں یہ دستور تھا کہ جب صلح یا جنگ کرنے کا فیصلہ ہونا ہوتا تھا، تب بھی آزاد خیال لوگ صفیں باندھ کر وہاں جا کر کھڑے ہو جاتے تھے کہ دیکھیں کہ کیا فیصلہ ہوتا ہے۔ اگر فیصلہ ان کی دلپسند کا نہیں ہوتا تھا تو ناراضگی کا اظہار کرنے کے لئے آپس میں چمگوئیاں کرتے تھے؛ اور اگر فیصلہ ان کی دلپسند کا ہوتا تھا تو رضامندی کے اظہار کے لئے اپنے نیزے اور بھالے کھڑکاتے تھے! یہ باتیں ذہن میں رکھنے سے سمجھ میں آتا ہے کہ وادئ سندھ میں بھی جو ''سینا نانی'' یا لشکری سربراہ (Leaders of the

(1) سنسکرت میں ''اِ'' کے معنی ہیں آنا یا جانا، ''اِت'' معنی آیا یا گیا اور ''سم'' معنی اکٹھے، اس لئے ''سمتی'' (سم + اِت + ای) معنی ''جہاں سب آ کر یا جا کر اکٹھے ہوں''۔

(Army گرام منی اور دیگر جنگی جوان رعایا کے عیوضی بن کر سمتی میں آتے تھے، وہ صفیں باندھ کر کھڑے ہو جاتے تھے، اس لئے ''سمتی'' لفظ کے اصل معنی تھے ''جہاں جتھے آکر اکٹھے ہوں''۔ مطلب یہ کہ سمتی میں لوگ اس طرح آکر اکٹھے ہوتے تھے جس طرح جنگ میں جتھے آکر اکٹھے ہوتے ہیں، اس لئے ''سمتی'' اور ''سنگرام'' اصل میں ایک ہی معنی والے الفاظ ہوتے تھے۔ یہ سب دیہاتی جنگی جوان ہوتے تھے، اور یہ بات پہلے ہی درج کی جا چکی ہے۔

''سبھا'' لفظ کے معنی ہیں ''منڈلی، اجتماع یا دربار''۔ مثلاً ''اندر سبھا'' معنیٰ راجا اندر کی دربار۔ سبھا میں راجا چمکدار پوشاک پہن کر اور سنہری جبہ پہن کر آتا تھا، تو بھانڈ دور ہی سے اس کی آمد کی اطلاع دیتے تھے (رگ وید منڈل دسواں، ۴۰، ۳)، درباری اس کی تعریف اور ساراہ کرتے تھے (منڈل پہلا ۱۷۳، ۱۰)، اور راجا کا حکم احکام دوُت (Messengers) دوسروں تک پہنچاتے تھے، (منڈل پانچواں، ٦۲، ٦)۔ راجا کی گدی سونے سے سجائی ہوئی ہوتی تھی (منڈل پانچواں، ٦۲، ۷)، اور نیچے سے فراشیاں بچھی ہوئی ہوتی تھیں، (رگ وید منڈل پہلا، ۱۷۱)، امیر وزیر بلکہ راجا کے مقرر کردہ جاسوس بھی اس کے اردگرد اکٹھے بیٹھے ہوتے تھے، (منڈل پہلا، ۲۵، ۱۰)۔

رگ وید والے زمانے میں ''سبھا'' ایک ملکی کاؤنسل (Political council) ہوتی تھی، جس میں راجا حاضر ہوکر، ملکی کاروبار چلاتا تھا۔ بڑے بڑے معاملات بھی وہیں بنائے جاتے تھے، اس لئے یہ جُڈیشل اسمبلی (Judicial Assembly) بھی ہوتی تھی، جس میں راجا کے مشیر بھی اکٹھے ہو جاتے تھے۔ راجا خود صدر کی حیثیت میں ہوتا تھا، اور درباریوں میں سے بعض ''اَسیسر'' (Assessor) یا ''مشیر'' کی حیثیت سے بیٹھتے تھے۔ البتہ راجا کی رائے کو بڑا وزن دیا جاتا تھا، اور سارے فیصلے اس کی دلپسند ہوتے تھے (رگ وید منڈل چوتھا، ۲۱، ۲)، پھر بھی سب کی یہی دلی مراد ہوا کرتی تھی کہ دھرم پر چلا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ''شُر یتوں'' اور ''سُمر یتوں'' میں ملکی خواہ پنگتی باتیں مذہبی باتوں سے جڑی ہوئی ہیں۔(1) ''جو راجا مذہب پر چلتا ہے، اسی کو سکھ نصیب ہوتے ہیں، اور جو مذہب پر نہیں چلتا، وہ نرک گامی ہو جاتا ہے، (مہا بھارت، شانتی پرو ۱۵، ۴۔۔٦ اور ۱۷، ٦۔۔۹)''۔ یہ تھے قدیم آریوں کے عقائد، اس لئے مذہب پر چلنا اولین اور اہم معاملہ تھا۔ اگر اتفاقاً کوئی معاملہ پورے طور پر فیصل نہیں ہوتا تھا تو، اور بعد میں پتہ چلتا تھا کہ بے انصافی ہوئی ہے، تو راجا سمیت سارے درباری خود کو قصوروار سمجھتے تھے، اور پراچت

(1) "The intimate contact of religion witht the rest of life explains, why Hindu social and political theory is often presented in the same books with law and domestic ritual." Dr. Beni Parsad. Theory of Government in Ancient India, P. 3.

کرتے تھے! مطلب یہ کہ ہر طرح سے یہ کوشش کرتے تھے کہ کوئی ظلم نہ ہو، اور حقداروں کو اپنا حق ملے۔ پوری دنیا کی تاریخ ملاحظہ کریں تو پتہ چلے گا کہ اس قدیم زمانے میں دوسرے کسی بھی ملک کے لوگوں میں اتنی بیداری نہیں تھی، جتنی وادیٔ سندھ میں تھی۔ اُس وقت کی ایک اہم بات ہے، جو آج بھی نہیں ہے۔

اس وقت پارلیامینٹوں، اسیمبلیوں، میانسپالٹیوں، پنچاتوں، اور دیگر جماعتوں اور سبھاؤں میں کئی امور اکثریتی رائے سے بحال ہوتے ہیں، یعنی اگر چند ایک لوگ اس تجویز کے خلاف ہونگے تو ان کی رائے کو وزن نہیں دیا جاتا۔ پہلے یوں ہونے نہیں دیتے تھے۔ جو ان کے ساتھ شاملِ رائے نہیں ہوتے تھے، ان کے ساتھ بھی ٹھنڈے دل سے بحث مباحثہ کر کے، ان کو اپنی طرف لانے کی کوشش کی جاتی تھی، تاکہ ہر ایک معاملہ یکرائے فیصل ہو جائے۔ اس سلسلے میں رگ وید کے آخری سُوکت میں جو کچھ لکھا ہوا ہے، اس مطلب یہ ہے کہ:

''مڑ کر آؤ، مل کر باتیں کریں، ہو سکتا ہے آپ کے دلوں میں اتفاقِ رائے پیدا ہو جائے!۔۔۔ یہ جگہ سب کے لئے عام ہے۔ یہ سبھا سب کی ہے، سب کے دل بھی عام کے لئے ہیں۔ کاش خیالوں میں بھی مل کر ایک ہو جائیں! میں آپ لوگوں کے سامنے جو بات پیش کرنے والا ہوں، وہ عام کے لئے ہے، فیصلہ بھی ایک ہی کریں۔ کاش آپ کے دلوں میں اتفاق پیدا ہو! سب کے خیالات بھی ایک جیسے ہوں، تو سب ایک دوسرے سے شاملِ رائے ہوں!''

دیکھیں کہ رگ وید والے قدیم زمانے میں ہی حق پر چلنا، اور دیس کی خاطر سب کو یکراءِ کرنے کے لئے ملک کے مدبر کس طرح ذہن سوزی کر رہے تھے!

سبھا برخواست ہونے کے بعد کئی درباری وہیں بیٹھ کر کھاتے پیتے تھے، اور چھکہ کھیلتے تھے۔ اس دوران سبھا کو ''کلب'' (Club) میں تبدیل کر دیتے تھے۔ راجا بھی چھکہ کھیلنے میں حصہ لیتے تھے، کیونکہ یہ کھیل اس وقت کے لوگوں کے لئے بڑا تفریحی سامان تھا۔

شہر اور عالم پناہ: ملک میں نیا کاری راجا ہوگا اور لوگوں کی جان، مال عزت کے تحفظ کے لئے پورا پورا بندوبس ہوگا، تو لوگ بالا پوتے اپنی توجہ علم اور فنون پر دینگیں اور اس طرح تہذیب کی ترقی ہوگی۔ تہذیب میں ترقی ہمیشہ امن و امان کے وقت اچھے طریقے سے ہوتی ہے۔ اس ترقی کے آثار رگ وید میں سے بھی ملتے ہیں، جس میں ''درگا'' اور ''پُر'' الفاظ کئی مرتبہ استعمال ہوئے ہیں۔ ''درگا'' لفظ میں ''دُر'' معنیٰ ''مشکل'' اور ''گ'' (گَم) معنیٰ جانا، اس لئے ''درگا'' معنیٰ ''قلعہ'' (جس میں کوئی اجنبی شخص مشکل جا سکے)۔ دیوی کو بھی ''درگا'' کہتے ہیں،

کیونکہ وہ اپنے پوجاریوں کے لئے ایک قلعہ یا پناہ ہے، یعنی ان کے لئے ایک پناہ گاہ اور آڑ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قلعے نہایت مضبوط بناتے تھے، جن میں کوئی اجنبی شخص آسانی سے داخل نہیں ہو سکتا تھا۔

اس وقت ''پُر'' (پور) لفظ کے عام طور پر معنی ہیں ''شہر'' جیسا کہ: خیر پور، میر پور اور نصر پور۔ رگ وید کے منڈل پہلے (۵۳، ۵۸۷، ۸)، منڈل تیسرے (۱۵، ۴: اور دیگر منڈلوں میں ''پُر'' لفظ عالم پناہ یا قلعہ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ موجودہ سنسکرت میں بھی ''پُر'' (پور) لفظ کے معنی ''شہر'' بھی ہیں اور ''قلعہ'' بھی۔ ایک ہی لفظ کے دو معنی اس لئے ہوئے ہیں کہ پہلے جو شہر ہوتے تھے، ان کو عالم پناہ ہوتی تھی۔ اس وقت بھی جیسلمیر اور دیگر کچھ شہر قلعوں یا عالم پناہ کے اندر ہیں۔ یہ رواج سندھ میں بھی عام تھا۔ مثلاً شکار پور کا شہر، تھوڑا عرصہ پہلے قائم ہوا ہے، وہ سارے کا سارا قلعے کے اندر ہوتا تھا۔ شہر میں آمدرفت کے لئے الگ الگ طرفوں سے دروازے ہوتے تھے، جو آج تک لکھی در، ہاتھی در، ہزاری در، سوی در اور دیگر ناموں سے پکاری جاتے ہیں۔ شکار پور سے بہت بعد کراچی کے شہر کی بنیاد رکھی گئی۔ اصل کراچی کا شہر بھی قلعے کے اندر ہوتا تھا، جسے دو دروازے ہوتے تھے، ایک دروازہ سمندر کی طرف ہوتا تھا، اس لئے وہ ''کھارہ در'' کہلاتا تھا اور دوسرا دروازہ لیاری ندی کے میٹھے پانی کی طرف ہوتا تھا، اس لئے وہ ''میٹھا در'' کہلاتا تھا۔ شکار پور اور کراچی کے قلعے بڑی مدت سے مٹ گئے ہیں، تو بھی دروازوں کے وہی نام آج تک چلتے آ رہے ہیں، یہ دونوں شہر قلعوں کے اندر قائم شدہ تھے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ شہروں کے چاروں طرف عالم پناہ یا قلعہ تعمیر کرنے کا رواج، جو رگ وید والے زمانے میں تھا، وہ بعد میں بھی سندھ میں لگاتار جاری ہے۔ پروفیسر پٹی والی سنسکرت ڈکشنری میں درج ہے کہ ''پُر'' اُس عالم پناہ والے شہر کو کہا جاتا ہے، ''جس میں بڑی بڑی عمارتیں ہوں، اس کے چاروں طرف سے خندق ہو اور جس کا رقبہ دو میل سے کم نہ ہو''۔

کوئی بھی شہر جب قلعے کر اندر قائم کیا جائیگا، تو لوگوں کی جان و مال ملکیت کے تحفظ کے لئے عالم پناہ ضرور اُونچی تعمیر کرنی پڑے گی۔ رگ وید میں ہر ایک عالم پناہ ''پرتھوی'' یعنی چوڑی، اور ''اُروی'' یعنی کشادہ کہی گئی ہے،)منڈل پہلا ۱۸۹، ۲)۔ اس عالم پناہ کو ''شت بھجی'' یعنی ''ایک سؤ بازوؤں والی'' بھی کہا گیا ہے، (منڈل پہلا ۱۶۶، ۸ اور منڈل ساتواں ۱۵، ۴)۔ رگ وید کے منڈل دوسرے (۳۰، ۲۰) میں یہ عالم پناہیں یا قلعے ''اشمیی'' (Asmamayi) یعنی پتھر کے بنے ہوئے کہے گئے ہیں، اور منڈل آٹھواں (۳، ۷، ۱۵، ۴) میں ''آیسویۂ پُروھ'' (Ayasivih Purvih) یعنی ''لوھے کے قلعے'' کہا گیا ہے۔ یہ باتیں تب پوری طرح سمجھی جا

سکتی ہیں، جب یونانی مورخین کے بئبلان سے متعلق فراہم کردہ احوال ذہن میں رکھے جاتے ہیں۔ ''یدوٗ'' اور ''تروسوٗ'' آریوں سے متعلق پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ یہ بئبلان سے سمندر کے راستے آئے تھے، اور آریوں کی بیٹھکیں بعد میں بھی کئی صدیاں مسلسل بئبلان میں تھیں، یہ شہر بھی عالم پناہوں کے اندر قائم تھا، اور یہ عالم پناہیں بعد میں بھی کئی سال مسلسل کھڑی تھیں، جو ہیرو ڈوٹس اور دیگر یونانی مورخین نے دیکھی تھیں۔ ان آنکھوں دیکھے احوالوں کے مطابق بئبلان کا شہر فرات (یوفریٹس) ندی کے دونوں کناروں پر چورس نمونے قائم تھا۔ پورے شہر کو دیواروں کی دو تین قطاریں تھیں۔ باہر والی دیوار ۳۶۰ سے ۴۸۰ ''سٹیڈ'' (Stades) یعنی بیالیس سے لے کر چھپن میلوں تک تھی، اور اس کی اُونچائی تین سو یا ساڑھے تین سو فوٹ اور چوڑائی پچاسی فوٹ تھی! سارے شہر کا رقبہ تقریباً دوسوٗ چورس میل تھا!!! لوگوں کی آمدرفت کے لئے باہر والی دیوار کو ایک سوٗ دروازے تھے، جو سارے کے سارے ''برانز'' (Bronze) سے بنے ہوئے تھے، کنبھے اور سردل (Lintels) بھی برانز کے تھے۔ شہر کے اندر کچھ دیواروں کو پچیس دروازے تھے، جن میں سے گذر کر الگ الگ گلیوں میں لوگ جاتے تھے۔ مطلب یہ کہ گلیاں بھی پچیس تھیں، اور ہر ایک گلی کو باہر سے دروازہ تھا۔ انسئکلو پیڈیا برٹینکیا میں بئبلان کے ان احوالوں کو درج کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ ہیروڈوٹس اور دیگر یونانی مورخین مبالغے سے کام لیا ہے؛ لیکن یہاں تو مبالغے کی کوئی بات نظر نہیں آ رہی۔ رگ وید میں عالم پناہ کو ''شَت بھجی'' یعنی ایک سو بازوؤں والی کہا گیا ہے، اور یونانی مورخین نے بھی یوں ہی درج کیا ہے کہ بئبلان کی باہر والی دیوار کو ایک سوٗ دروازے تھے۔ ظاہر ہے کہ رگ وید والے زمانے میں بھی وادیٔ سندھ کی ہر ایک عالم پناہ کو ایک سوٗ دروازے ہوا کرتے تھے، اور وہ دروازے والے مقامات عالم پناہ کے بازو کہلاتے تھے۔ بئبلان کی طرح وادیٔ سندھ کے شہروں کی عالم پناہیں بھی نہایت زیادہ رقبہ پر پھیلی ہوئی تھیں، جس وجہ سے رگ وید میں ہر ایک عالم پناہ ''پرتھوی'' (چوڑی) اور ''اُروی'' (کشادہ) کہی گئی ہے۔ رگ وید والے زمانے سے ہزار ہا برس بعد میں ہیروڈوٹس اور دیگر یونانی مورخین پیدا ہوئے۔ انہوں نے بھی جب بئبلان کے یہی احوال دیے ہیں، تب تو یقین آ جانا چاہئے کہ بئبلان کی تہذیب کے بانیکار یہی آریہ لوگ تھے، اور دونوں جگہوں کی تہذیب میں فرق تھا ہی نہیں۔ یوں سمجھنے کے لئے مزید یہ وجہ ہے کہ جس اعلیٰ درجے کی تہذیب سے متعلق حیرت انگیز حقائق مہن جو دڑو میں سے معلوم ہوئی ہیں، وہی میسوپوٹیمیا سے بھی معلوم ہوئی ہیں۔ یہی باتیں وادیٔ سندھ اور میسوپوٹیمیا کے باشندوں کے آپس میں بڑے تعلقات کی علامت دکھائی دے رہی ہیں۔ بئبلان آباد ہی وادیٔ سندھ کے لوگوں نے تھا، جس طرح ہم نے باب بارہویں میں درج کیا ہے۔

رگ وید کے منڈل چھٹے (۴۷،۲)، اور منڈل ساتویں (۶، ۵) میں ''دیہی'' (Dehi) لفظ استعمال ہوا ہے۔ لگتا ہے کہ جس طرح حیدرآباد کے قلعے کے اردگرد خندق کھودی ہوئی ہے۔ اسی طرح قلعوں یا عالم پناہوں کے چاروں طرف ''دیہیاں'' (خندقیں) ہوا کرتی تھیں، اور جنگ کے دوران ان میں چھپ کر، دشمنوں کو دور سے تیر مارتے تھے۔

مذکورہ بالا عالم پناہوں اور خندقوں کے علاوہ دوسرے کچھ قلعے ہوتے تھے، جنہیں رگ وید میں ''شر دی'' یعنی موسم خزاں کے قلعے کہا گیا ہے۔ ان قلعوں سے متعلق علماء کی علحدہ علحدہ آرائیں ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ سیلاب سے بچاؤ کے لئے ہوتے تھے (ویدک انڈیکس ا، ۳۸۵)، بعض کہتے ہیں کہ رنگین زبانی میں برساتی بادلوں کو اس نام سے پکارا گیا ہے، جو موسم خزاں میں ادھر ادھر پھیل جاتے ہیں۔ چونکہ ان قلعوں سے متعلق علماء کی ایک رائے نہیں ہے، اس لئے ان سے متعلق مزید کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔

راجاؤں کے محلات: رگ وید میں درج ہے کہ راجاؤں کے محلات قلعوں کے اندر ہوا کرتے تھے، جن پر لکڑی کا دیدہ زیب کام کیا ہوتا تھا۔ وہ محلات اتنے لمبے اور چوڑے ہوا کرتے تھے، کہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ایک ستون دینا پڑتا تھا، جس وجہ سے انہیں ''سہسر ستھون'' یعنی ہزار ستونوں والے کہا گیا ہے، (منڈل دوسرا ۴۱، ۵) اور (منڈل پانچواں ۶۲، ۶)۔ ستونوں پر برہنہ لڑکیوں کی شکلیں کندہ ہوتی تھیں، جس سے سمجھا جاتا ہے کہ راجا عیاش مزاج تھے۔ ہوا اور روشنی کے لئے ہر ایک محلات میں بے شمار دریاں اور دروازے ہوتے تھے، (منڈل دسواں ۹۹، ۳)۔ اس سے یہ یقین دہانی ہوتی ہے کہ وادئ سندھ (پنجاب اور سندھ) میں اس وقت جتنے قابل تھے بڑھئی اور معمار، اتنے ہی قابل تھے سرویر یا انجنیئر، جو ایسی عظیم اور عالیشان عمارتیں بناتے تھے۔

رگ وید میں یہ بھی درج ہے کہ محلاتوں میں اندر مال ملکیت بہت ہوتا تھا، (منڈل دوسرا ۴۱، ۵)۔ راجا بڑے دل سے خیرات کرتے تھے۔ رشیوں نے ان کے مخیّر ہونے کی تعریفیں گائی ہیں، اس بات سے بھی پتہ چلتا ہے کہ راجاؤں کے پاس مال ملکیت بہت ہوتا تھا۔ وہ محلات لکڑی کے بنے ہوتے تھے، اس لئے کبھی کبھار ان کو آگ لگ جاتی تھی (منڈل ساتواں ۵، ۳)، اور ملکیت جل جاتی تھی۔

سلطنت شاہی (Imperialism): قدیم راجاؤں، جن کے آباء واجداد اصل میں دیہاتی زندگی گذارتے تھے، وہ اب قلعوں کے اندر عالیشان محلات میں رہنے لگے، اور رعایا سے محصول

ملنے کی وجہ سے مالا مال ہو گئے، تو اور بھی ان میں چاہت بڑھتی گئی، یہ انسانی فطرت ہے۔ ''انسان الٹی کھوپڑی ہے''۔ کبھی بھی اس کا پیٹ بھرنے کا نہیں۔ ''زیادہ سے زیادہ چاہئے''۔ ''طمع کا طس بھر کر بھی نہیں بھرتا''۔ وہ پھر مہاراجا اور چکروتی راجا (پوری دنیا کا راجا) بننے کے لئے اپنی حکومت کی حدود بڑھانے لگے۔ اس سے ایک اور بات بھی ان کے ذہن میں تھی۔ چھوٹی سی ریاست میں اگر کوئی راجا سیدھی طرح نہیں چلے گا، تو وہاں کے باشندے آسانی سے یکمشت ہو کر، خود راجا کو سیدھا کر سکتے تھے۔ حکومت کی حدود بڑی ہونگی تو صرف ملک کے مدبر اور خادم الوطن ملکی معاملات میں حصہ لے سکیں گے۔ باقی دوسرے ٹھنڈے ہو کر بیٹھے رہیں گے، جس وجہ سے راجا کو آپیشاہی نمونہ اختیار کرنے، بلکہ عام خلق کی رائے کو یکسر نظر انداز کرنا آسان ہوگا۔ ایسے مقاصد دل میں رکھ کر اپنی حکومت کی حدود کو وسعت دینے کی غرض سے راجاؤں کو بعض اوقات اپنے ہمسایہ راجاؤں سے جنگیں جوتنا پڑتی تھیں۔

قدیم زمانے سے ہندستان کے راجاؤں کے جنگ سے متعلق دو علحدہ اصول ہوتے تھے: ایک اس اصول کے تھے کہ اپنا ملک سنبھال کر بیٹھ لیا جائے، اور کسی بیرونی قوت کو اپنی سرزمین پر قدم نہ رکھنے دیا جائے، لھٰذا جنگ صرف اس وقت کی جائے جب کوئی غنیم حملہ آور ہو۔ دوسروں کا اصول یہ تھا کہ خواہ مخواہ بھی دوسروں پر حملہ آور ہو کر اسے اپنا خراج دہندہ بنایا جائے۔ اسی سلطنت شاہی کے خیال سے جس طرح آج کل جرمنی اور جاپان ظلم کر رہے ہیں، اور انگلینڈ، امریکا، رشیا اور چائنا آپس میں اتحاد کر کے ان کے مظالم کو روکنے کی کوشش کر رہے ہیں، اس طرح رگ وید والے زمانے میں بھی راجا یہی کچھ کرتے تھے۔

رگ وید کے پہلے ہی پہلے منڈل (۵۳،۹) میں درج ہے کہ ایک دفعہ بیس مقامات کے راجاؤں نے آپس میں اتحاد بنا کر، ششروا (Shushrava) نامی ایک زورآور راجا پر دھاوا بول دیا۔ ان کے لشکر میں نوے ہزار ساٹھ آدمی تھے، تو بھی اندر دیوتا کے مہربانی سے اُلٹا وہ ان سے جیت گیا (۵۳،۱)۔ رگ وید میں اسی جنگ کا ذکر صرف اتنا ہے، اس لئے پتہ نہیں چلتا کہ، اس جنگ لگنے کے کیا اسباب تھے اور کس طرح ایک حاکم بیس حاکموں سے جیت گیا تھا۔

دش راجن (War of Ten Kings): رگ وید میں ایک دوسری مہا بھاری جنگ کا ذکر ہے، جسے ''دش راجن'' یعنی دس راجاؤں کی جنگ کہا گیا ہے۔ اس کے احوال رگ وید میں جابجا موجود ہیں، جنہیں علماء نے جوڑ کر ترتیب دیا ہے، اس لئے پوری بات بڑی حد تک سمجھی جا سکتی ہے۔

نہایت قدیم زمانے میں وشوامتر نامی ایک رشی گذر چکا ہے، وہ اصل میں کھتری تھا؛ لیکن اپنی ریاضت کی وجہ سے راج رشی بلکہ برہم رشی کہلانے میں آیا۔ الہٰی اس نے تپشیا کی کہ خود اندر دیوتا کو خوف ہوا کہ یہ کسی وقت میرا اندر آسن (راجا اندر کا آسن) چھین لے گا۔ راجا اِندر نے پھر ''مینکا'' نامی ایک اَپسرا (پری) کو بھیجا، جس کی خوبصورتی نے وشوامتر کو اتنا موہ لیا، جو اس نے جوگ آسن لپیٹ دیا اور اس کی صحبت میں گذارنے لگا۔ بعد میں اُسے اس اپسرا سے ایک بیٹی ہوئی، مینکا وہ بچہ کسی جنگل میں پھینک کر، آکاس کی طرف اڑ گئی۔ اس بچی پر ''شکنت'' یعنی پرندے اکٹھے ہو گئے۔ کنو نامی ایک رشی نے وہ بچی دیکھ لی، تو اس نے پرندوں کو بھگا کر، اس بچی کو اپنی بیٹی بنا کر پالا اور اس نام رکھا ''شکنتلا'' (شکنت + لا) یعنی ''پرندوں سے حاصل کی ہوئی''، وہ شکنتلا پھر راجا دشینت سے بیاہی گئی اور اسے ''بھرت'' نامی ایک بیٹا ہوا، جس کے نام پیچھے سارا ہندستان اب ''بھارت ورش'' اور ''بھارت براعظم'' کہلاتا ہے، اسی بھرت کی اولاد ''بھرت آریہ'' لوگ کہلاتے تھے؛ جو پُرو آریوں کی ایک شاخ میں سے تھے۔ رگ وید والے زمانے میں ان میں سے کچھ سرسوتی تو کچھ شتدری (ستلج) ندی کے کنارے پر رہتے تھے۔

وشوامتر کے گوتر والے اسی کے نام پیچھے کہلاتے ہیں۔ ان میں سے ایک وشوامتر راجا سُوداس کی نسل کا پروہت تھا۔ راجا سُوداس کے باپ کا نام راجا پجون (Pijavana) تھا اور اس کے دادا کا نام راجا دِووداس تھا۔ یہ ترتسو آریوں میں سے تھے، جو پرو اور بھرت آریوں کے دور کے رشتیدار تھے، اور بعد میں پنچالوں کے زمرے میں شمار ہونے لگے، جن میں سے پنچالی (دروپدی) تھی۔ راجا سُوداس کے دادا راجا دِووداس نے اپنے وقت میں یدو اور تروسو آریوں سے جنگیں جوتی تھیں (رگ وید منڈل نواں ٦١، ٢)، اور دیگر کئی آریوں کو بھی اپنا خراج دہندہ بنا دیا تھا۔ جس وجہ سے اس کے پوتے راجا سُوداس کے ساتھ بہتوں کا اس کے ساتھ حسد ہوتا تھا۔ بہت دنوں سے ہمسایہ راجاؤں کی مرضی تھی کہ راجا سُوداس کا زور توڑنا چاہئے، لیکن کسی نے بھی اکیلے سر اس کے ساتھ جنگ کرنے کی ہمت نہیں کی۔ ان کو اپنے سے کمزور سمجھ کر راجا سُوداس نے ارادہ کیا، کہ ان کو اپنا تابع بنا دیا جائے، اور اپنی حکومت کی حد اور بھی بڑھائی جائے۔ اس نے پھر ''اَشومیدھیگیہ'' یعنی گھوڑے کی قربانی کے یگیہ کی تیاری کی۔

قدیم زمانے میں دستور ہوتا تھا کہ راجا کو دوسرے راجا اپنے تابع کرنے ہوتے تھے تو اپنی سواری کے لئے مخصوص گھوڑے کو کھول دیتے تھے کہ بھلے کسی دوسرے راجا کی ریاست میں چلا جائے۔ گھوڑے کے پیچھے ایک بڑا فوجی دستہ بھیجتا تھا۔ وہ گھوڑا خود بخود جس بھی ریاست

میں گھس جاتا تھا، اس ریاست کا راجا یا تو گھوڑے کے مالک کے سامنے چپ چاپ میں پیش پڑتا تھا یا پھر بھیجے ہوئے فوجی دستہ کا سامنا کرتا تھا، پھر ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس''۔ اگر گھوڑا بہت ریاستوں میں جاتا تھا، اور ان سب ریاستوں کے راجا گھوڑے کے مالک کے تابع ہو جاتے تھے، تو گھوڑے کے واپس آنے پر، فاتح راجا یگیہ کرتا تھا، جس میں اسی گھوڑے کی قربانی کی جاتی تھی۔ یہ تھا ''آشومیدھیگیہ'' (Horse Sacrifice)۔ فاتح راجا ''راجسُو یہ یگیہ'' بھی کرتا تھا۔ یہ اس کی تاجپوشی کا یگیہ ہوتا تھا، جس میں محصول دینے والے راجا بھی آ کر شامل ہوتے تھے، اور اُسے اپنا شہنشاہ کر کے مانتے تھے۔ اس طرح کے یگیہ عام طور پر ہوتے تھے، اس سے ظاہر ہے کہ سلطنت شاہی کا خیال عام ہوتا تھا۔ راجا سُوداس جس وقت آشومیدھیگیہ کرنے کا ارادہ کیا، اس وقت وشوامتر رشی کو اسی یگیہ کی تیاری کرنے کے لئے کہا۔ ان دنوں رشیوں کو بہت مانا جاتا تھا، اور اس کی ایک آواز پر ہزاروں جنگی جوان آ کر اس کے حضور میں حاضر ہوتے تھے۔ وشوامتر رشی نے اپنی کل والوں سے کہا کہ راجا سُوداس کے گھوڑے کو کھول دو، اور آپ گھوڑے کے پیچھے مشرق، مغرب اور شمال کی طرف جائیں، تو راجا شترو (دشمن) ناس ہو جائیں، (منڈل تیسرا ۵۳، ۱۱)۔ اس وقت جنوب میں شاید (راجپوتانا اور تھر ڈویژن والا) سمندر تھا، اس لئے لشکر کو صرف تین طرف جانے کا حکم ملا۔ اب دیکھیں کے بیچوں بیچ دوسرا معاملہ کیسے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

راجا سُوداس کی دربار میں اس وقت ایک وشٹ منی تھا، جو نہایت قدیم زمانے والے وشٹ منی کی گوتر میں سے تھا، اس لئے اس کے نام پیچھے کہلاتا تھا۔ اسی وشٹ منی اور وشوامتر رشی کی آپس میں نااتفاقی تھی۔ شتپتھ براہمن (بارہواں ۶، ۱، ۴۱) سے معلوم ہوتا ہے کہ وشٹ منی براہمن کی کل سے تھا، اور اوائل میں صرف ان کی کل والے براہمن راجاؤں کے پروہت ہو کر ان کی یگیہ کرواتے تھے، لیکن بعد میں کوئی بھی رشی (براہمن خواہ کھتری) پروہت ہو کر یگیہ کرواتا تھا۔ وشٹ منی ترتسو آریوں میں سے تھا، (رگ وید منڈل ساتواں ۸۳، ۸)۔ قدیم زمانے والا وشوامتر اصل کھتری تھا، اور بعد میں اپنی ریاضت کی وجہ سے برہم رشی شمار کیا جاتا تھا۔ اس کی گوتر سے جو وشوامتر راجا سُوداس کی دربار میں تھا، وہ اصل میں کھتری تھا، لیکن راج رشی ہو کر یگیہ کرواتا تھا۔ لگتا ہے کہ وشٹ منی نے یہ اعتراض اُٹھایا تھا کہ وشوامتر کھتری ہوتے ہوئے آشومیدھ جیسا بڑا یگیہ نہیں کرائے۔ اس پر وشوامتر کو اتنا غصہ آیا کہ وہ راجا سُوداس کی دربار ہی چھوڑ کر چلا گیا، اور جا کر بھرت آریوں سے ملا، کیونکہ خود بھی ان میں سے تھا۔ بھرت آریوں اور دور کے رشتیداروں ترتسو آریوں کی آپس نہیں بنتی تھی، اس لئے اپنے لشکر کی ساری مدد ان کو دی۔ اسی

طرح لشکر کی جو مدد راجا سُوداس کو ملنا تھی، وہ الٹا مخالف پارٹی کو ملی۔ لیکن شاید اس مدد ملنے کے بعد بھی بھرت آریہ لوگ راجا سُوداس کا مقابلہ نہ کر سکے، اس لئے وشوامتر جملے دس راجاؤں کو بھڑکا کر، ان کو جنگ کے لئے تیار کیا۔ ان دس ریاستوں کے راجا پھر آپس میں اتحاد کر کے راجا سُوداس کا زور توڑنے کی تیاری کرنے لگے، اور وشوامتر کو اپنا لیڈر بنایا۔ یہ دس راجا، جو ایک دوسرے کے طرفدار بنے وہ کون تھے؟ یہ پتہ رگ وید سے پوری طرح نہیں پڑتا، لیکن کئی علماء رگ وید میں سے یوں سمجھنے لگے ہیں کہ ان میں سے ایک تھے ''پنج جن'' یعنی یدو، تروسو، پرو، آنو اور داہیو، اور دیگر پانچ تھے اَجہ، یکشو، بھیڑ، شگرو اور بھرت آریہ لوگ۔ سب میں سے بھرت آریہ لوگ زیادہ زورآور تھے، اور وشوامتر بھی ان ہی کی نسل میں سے تھا۔ اس لئے اسے اب یہ دیکھنا تھا کہ راجا سُوداس کو وشٹ منی کیسے فتحیاب کرتا ہے۔

راجا سُوداس کو جس وقت پتہ چلا، کہ وشوامتر رشی نے دس راجاؤں کو اس کے خلاف کھڑا کیا ہے اور بڑی جنگ کی تیاریاں ہو رہی ہیں، اس وقت اس نے بھی شمال مغرب سرحد علاقوں کے آریوں کو اپنا طرفدار بنا لیا، جن میں سے ایک پکتھ، دوسرے بھلان اور دیگر برادریوں میں سے تھے۔ اس طرح اس وقت سارا ہندستان جنگ میں شامل ہو گیا اور مہا بھاری جنگ کی تیاری ہو گئی۔ دس راجاؤں کے ساتھ کئی غیر آریہ لوگ بھی شامل ہو گئے، جس وجہ سے ان کا لشکر مزید بڑھ گیا۔

راجا سُوداس اپنا لشکر پرشنی (راوی) ندی کے شمالی کنارے پر جا کر اکٹھا کیا۔ مخالف پارٹیوں کی مرضی تھی کہ شتدری (ستلج) اور ویاس (بیاس) ندیاں پار کر کے، راوی ندی کی طرف جایا جائے، ان دنوں موسم خزاں تھی اور ان کو امید تھی کہ ندیوں میں پانی کم ہوگا، اس لئے ان کا ارادہ تھا کہ اپنا لشکر، رتھ اور گھوڑے وغیرہ سب کشتیوں کے ذریعے روانا کیے جائیں؛ لیکن شاید کوئی تازہ برسات ہوئی تھی اور جبلوں پر سے برسات کا پانی بہہ کر ندیوں میں آکر گرا تھا، جس وجہ سے ندیاں کناروں تک پھول کر بہہ رہی تھیں۔ اس پر وشوامتر رشی نے ندیوں سے التجا کی کہ تم اپنا پانی کم کرو، تاکہ ہمارا لشکر آسانی سے اُس پار چلا جائے، (رگ وید منڈل تیسرا ۳۳، ۹)۔ ندیوں نے اس کی التجا قبول کی، (منڈل تیسرا ۳۳، ۱۰)۔ بھرت آریہ لوگ اور ان کے طرفدار ستلج ندی پار کر کے، بیاس اور راوی ندی کے بیچ والے ملک میں جا کر پہنچے، اور راوی ندی کے جنوبی کنارے پر اپنا پڑاؤ ڈالا۔ وہاں پر انہوں نے ایک منصوبہ بندی کی۔ راجا سُوداس کی کل والوں (ترتسو آریوں) کی زمینوں، گوٹھوں اور شہروں کی حفاظت کے لئے ایک بڑا پشتہ (بند) پرشنی (راوی) ندی کے شمالی کنارے پر بنا ہوا تھا۔ مخالف ٹولے کی مرضی ہوئی کہ اسی بند میں شگاف ڈالا جائے، تاکہ ترتسو آریوں کی زمینیں اور شہر ڈوب جائیں، تاکہ وہ بھلے الجھن میں پڑ جائیں، اور اسی

الجھن کے وقت ان کے اوپر دھاوا بول دیا جائے، تاکہ فتح حاصل کرنا آسان ہو جائے،'' لیکن بندے کے من میں ایک تو صاحب کے من میں دوسری''۔ انہوں نے بند کو توڑا؛ لیکن اس دوران ندی کے پانی کا زور ٹوٹ رہا تھا، اس لئے کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا اور ندی ویسے کی ویسی بہتی رہی۔ (منڈل ساتواں، ۱۸، ۸۔۹)۔ اتحادیوں کا لشکر پہلے ہی بڑا تھا الٹا اس طرح کی منصوبہ بندی نے راجا سُوداس کے لوگوں میں خوف بھر دیا، اور فتح حاصل کرنے کی کوئی بھی امید انہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ راجا سُوداس کے لشکر کا سالار وشٹ منی تھا، وہ یہی التجائیں کر رہا تھا کہ مخالف ٹولے کو کسی بھی طرح سے ہرا کر، وشوامتر کا سر نیچا کیا جائے؛ لیکن لڑنے کے لئے اُسے کوئی راستہ ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ راجا سُوداس خود بھی سمجھ رہا تھا کہ راوی کی جنوب میں اُس پار جا کر، دشمنوں کے سامنے ہونا، یہ ہوگا ہاتھ سے لے کر خود کو مصیبت میں ڈالنا۔ اس طرح کے الٹے قدم لینے کی بجائے اس نے ایک اور حرفت چلائی، جو اُسے اچانک ذہن میں آ گئی۔ راوی ندی کی جنوب میں اتحادیوں کا لشکر جمع شدہ تھا، اس لئے اس نے وہ طرف ہی چھوڑ دیا۔ وہ شمال کی طرف جنگی جوانوں کو اپنے ساتھ رات کے اندھیرے میں لے گیا (منڈل ساتواں ۳۳،۳)، اور وہاں سے ندی پار کر کے، دشمنوں پر پیچھے سے حملہ کر دیا۔ یہ بات دشمنوں کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھی۔ اب انہوں نے دیکھا کہ دو آگوں کے بیچ میں ہیں۔ اگر آگے کو بڑھیں گے تو ندی میں ڈوب مرینگے، اور اگر پیچھے کر طرف ہٹیں گے تو راجا سُوداس کے لشکر کے ہاتھوں مر جائیں گے۔ اسی الجھن کے سبب ان میں پھوٹ پڑ گئی۔ راجا سُوداس کا لشکر تین اطراف سے انہیں گھیر لیا، اور چوتھی طرف ندی ان کے سامنے تھی، اس لئے مقابلہ کرنے کا کوئی راستہ ان کے پاس نہیں تھا۔ پھر اپنی جان بچانے کی خاطر کچھ اپنی مرضی سے پانی میں اتر گئے، تو ان میں سے کچھ پانی کی رو میں ڈوب گئے (منڈل ساتواں ۱۸، ۱۱)۔ کچھ آسانی سے گرفتار ہو گئے۔ کچھ نے ہمت کر کے راجا سُوداس کا سامنا کیا، لیکن جلد ہی اس کے لشکر کے ہاتھوں قتل ہو گئے، مرنے والوں میں ایک سردار ''بھیڑ'' بھی تھا۔ اسی لڑائی میں صرف اَنو اور درہیو آریوں کے چھاسٹھ ہزار چھ سَو ساٹھ لوگ مر کھپ گئے (منڈل ساتواں ۱۸،۱۴)۔ کئی ایک بھاگ بھی گئے (منڈل ساتواں ۱۸، ۱۵، ۱۶)۔ اسی طرح راجا سُوداس کی فتح ہوئی۔ وشوامتر، جو دس راجاؤں کو بھڑکا کر جنگ کے لئے کھڑا کیا تھا، اس کا سر نیچا ہوا، تو وشٹ منی بڑا خوش ہوا، اور اس نے اندر دیوتا اور ورن دیوتا کی بڑی تعریف کی، جنہوں نے اپنی مہربانی سے اُسے فتحیاب کیا تھا۔ اسی آستتی (تعریف) کرتے ہوئے، اس نے جس مہا بھاری جنگ کا ذکر کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ''پرتھو پرشوھ'' یعنی کشادہ کلہاڑوں سے ایک دوسرے پر حملے کر رہے تھے۔ دوسری ایک بات جو زیادہ توجہ طلب ہے، وہ یہ کہ اس

قدیم زمانے مین ان کے پاس اصل اپنے قومی جھنڈے تھے، جنہیں انہوں نے جنگ کے دوران کھڑا کیا تھا۔ (1)

قومی جھنڈے میں بڑی کرامت ہے۔ جب تک جھنڈا بلند رہتا ہے تب تک وہ جنگی جوانوں میں جذبہ بیدار کرتا رہتا ہے اور وہ بڑے جذبے کے ساتھ لڑتے ہیں؛ لیکن جب دشمنوں کے ہاتھوں جھنڈا نیچے گرایا جاتا ہے، اس وقت سارے دلگیر ہو جاتے ہیں اور فتح حاصل کرنے کی امید کھو بیٹھتے ہیں۔ جھنڈے کے لئے اپنا سر بھی دے دینگے، لیکن جھنڈا اپنے ہاتھوں سے نہیں چھوڑیں گے۔

رگ وید والے زمانے کے سن درج کرنا ایک مشکل کام ہے۔ ایسی صورت حال میں کہا نہیں جا سکتا کہ یہ دس راجاؤں والی جنگ کب لڑی گئی تھی۔ تاہم ڈاکٹر سیتاناتھ پردھان کی حوالے دے کر تخمیناً درج کیا ہے کہ یہ دس راجاؤں والی جنگ ۱۴۷۰ برس ق۔م لڑی گئی تھی، اور بیس برس بعد یعنی ۱۴۵۰ برس ق۔م شری رامچندر اور راون کے مابین لنکا والی لڑائی لگی تھی، اور اس کے تین سؤ برس بعد مہا بھارت والی جنگ لڑی گئی تھی۔ (2) حقیقتاً شری رامچندر ترتیا دور میں گذر چکا ہے اور مہا بھارت والی لڑائی دواپور دور کے اواخر میں لڑی گئی تھی، اس لئے ڈاکٹر پردھان کے ان اعداد و شمار پر کئی ہندو علماء یقین نہیں کر رہے اور ہم بھی یقین نہیں کر رہے۔

سندھ میں پنچالوں کی حکومت: رگ وید میں بہت سارے زمانوں کی تہذیب کا تذکرہ ہے۔ ہر ایک زمانے میں کون کون راجا سندھ میں تھے، ان کا کوئی خاص تذکرہ ہے ہی نہیں، لیکن جن راجاؤں نے بڑی سخاوتیں کی تھیں، ان کی ''دان آستیاں'' یعنی سخاوتوں کی تعریفیں کن رشیوں نے کی ہیں، جو رگ وید میں درج ہیں۔ ان تعریفوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی قدیم زمانے میں سندھ کا راجا سونیہ بھاویہ (Svanya Bhavya) تھا، جس کی رانی کا نام روماسا تھا۔ یہ راجا ''کروی'' (Krivi) آریوں میں سے تھا، جو بعد میں پنچال کہلائے، جیسا کہ شتپتھ براہمنہ (۱۳، ۵، ۴، ۷۷) میں درج ہے۔ ان میں سے کچھ دریائے سندھ کے کنارے پر رہتے

(1) "Looking to you, ye strong Gods! They marched east-wards, armed with broad axes and thirsting for spoil. Ye helped Sudas, and smote his Dasa and Arya enemies, "O Indra and Varuna!" "Where strong men came together with their banners raised, where in the encounter there was nought favourable to us, where all looked up to the sky in terror, there ye spoke to us, words of comfort, O Indra and Varuna! Both sides invoked you. O Indra and Varuna! in the fight for victory and wealth. Ye protected Sudas and the Tritsua assailed by the ten kings." Reg. Veda VII, 83, 1, 2, and 6 R.C. Dutt's Translation.

(2) Dr. Sita Nath Pradhan: Chronology of Ancient India, P. 175.

تھے، تو کچھ ''اَسکنی'' (Healing) ندی کے کنارے رہتے تھے، جو سکندر اعظم کے زمانے میں ''چندر بھاگ'' (Moon-portion) کہلاتی تھی، اور اب اسے ''چناب'' (The gathered waters) کہا جاتا ہے۔ ان کے دور کے رشتیدار پرو اور بھرت آریہ لوگ ہیں، جن کے ساتھ راجا سُوداس نے لڑائی کی تھی۔ مسٹر پارجیٹر اندازاً بتاتے ہیں کہ راجا سُوداس اور اس کے دادا راجا دووداس کے وسطی زمانے کے دوران سندھ کا راجا سونیہ بھاویہ گذرا ہے۔[1] اس کے مطابق یوں کہا جائیگا کہ دس راجاؤں والی لڑائی سندھ کے اس راجا کے دور کے بعد لگی تھی۔ راجا سُوداس ترستو آریوں میں سے تھا، جو پرانوں کے مطابق بعد میں پنچالوں کی ذمرے میں شمار ہونے لگے، اور سندھ کا راجا سونیہ بھاویہ بھی پنچالوں میں سے تھا، اس وجہ سے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ سندھ اور پنجاب کے کچھ حصوں میں اس وقت پنچالوں کی مشترکہ حکومت تھی۔

سندھ کا راجہ سونیہ، راجا بھاویہ کا بیٹا، بڑا دھرماتما تھا۔ اس کی تعریف ایک کاکشون نامی رشی نے کی ہے۔ یہ رشی پیدائشی سورداس یعنی آنکھوں سے اندھا تھا؛ لیکن بعد میں اگنی دیوتا کی پوجا کرنے سے اُسے نور ملا۔ اس کے بعد اس نے کئی حمدیہ گیت کہے ہیں، جو رگ وید میں درج ہیں۔ نیتی منجری میں لکھا ہے[2] کہ کاکشوں اپنے گرُو سے ہرطرح کا علم سیکھ کر، گھر لوٹ رہا تھا تو اسے راستے میں رات پڑ گئی، جس وجہ سے راستے ہی میں سو گیا۔ صبح کو سندھ کا راجا، راجا سونیہ بھاویہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں سے گذرا۔ اُسے رشی کی شکل شبیہ اور حسن و جمال پسند آ گیا۔ سو اُسے نیند سے جگا کر اپنے محل میں لے گیا۔ اس سے حال احوال لیتے ہوئے اور اس کی چال چلکت کو جانچتے ہوئے، جب راجا کو خاطری ہوئی کہ یہ ہرطرح سے لائق انسان ہے، تب اُسے اپنا داماد بنا دیا۔ راجا کی دس بیٹیاں تھیں، وہ دس ہی اُسے بیاہ دیں، اور بڑی مقدار میں مال ملکیت بھی دی۔ وہ بعد میں اپنے باپ کے پاس گیا، جس کا نام ''درگھ تمس'' (لمبا اندھیرا) تھا۔ راجا سے اس کے ساتھ بڑی سخا ہوئی تھی، اس لئے اس نے اس کی سخاوت کی تعریف گائی ہے، جو رگ وید کے منڈل پہلے (۲۶، ا۔۵) میں درج ہے۔ اسی تعریف میں راجا سونیہ بھاویہ کے نام جو کچھ اس نے کہا ہے، اس کا مختصر مطلب یہ ہے:

''سندھ کے راجا نے مجھے ایک سؤ نِشک (سونے کے سکے)، ایک سؤ گھوڑے، ایک سؤ بیل، ایک ہزار اور ساٹھ گائیں، اور گیارہ رتھ دیے، (دس بیویوں کے لئے دس رتھ اور گیارواں رتھ کاکشون رشی کے لئے)۔ ہرایک رتھ میں چار چار سندھی گھوڑے جوتے ہوتے تھے، جن پر موتیوں سے جڑی ہوئی زین ہوتی تھی۔ سندھ کے راجا سونیہ بھاویہ اتنی ساری سخاوت کر کے خود کو اَمر کر دیا ہے''۔ کاکشون رشی کے اس تھوڑے سے احوال سے بہت ساری باتیں ظاہر ہوتی ہیں:

(1) F.E.Pargite: Ancient Indian Historical Tradition, P. 223.
(2) John Wilson: India Three Thousand Years Ago, p. 50.

۱- پہلی اور اہم بات یہ ہے کہ رگ وید والے زمانے میں ذات پات کا بڑا مسئلہ ہوتا ہی نہیں تھا، اس لئے جسے جہاں سے اچھا لگتا تھا وہاں سے شادی کر لیتا تھا۔ قدیم رشی کھتریوں سے بھی شادیاں کرتے تھے، جیسا کہ کاکشون رشی نے سندھ کے راجا کی بیٹیوں سے شادی کی۔ کاکشون رشی کی ماں کا نام ''اُشج'' تھا، جا راجا اَنگ کے ایک غلام (شودر) کی بیٹی تھی، اس لئے کہا جائیگا کہ رشی شودروں سے بھی شادیاں کرتے تھے۔

۲- ایک مرد بہت ساری شادیاں کرتا تھا، اس لئے کاکشون رشی نے دس راجکماریوں کے ساتھ بیک وقت شادی کر لی تھی۔

۳- بہت ساری بیویوں رکھنے کے رواج کی وجہ سے، ہر ایک سے پیداشدہ بچہ اپنی ماں کے نام پیچھے پہچانا جاتا تھا، تاکہ پتہ چلے کہ باپ کی کس بیوی سے پیدا ہوا ہے، رگ وید میں کاکشون رشی ''اوَشج'' یعنی اُشج کا بیٹا کہا گیا ہے۔

۴- لڑکیوں کی شادیاں ان کے اپنے رشتیداروں کے ہاتھوں میں ہوتی تھیں۔

۵- قدیم لوگ جب اپنی بیٹی کی شادی کرواتے تھے، تو اُسے ''کنیادان'' کہتے تھے۔ شادی کے وقت بیٹی کو جہیز دیتے تھے، تو وہ بھی ''دان'' شمار ہوتا تھا۔ مطلب یہ کہ رگ وید والے زمانے میں ہی لین دین کا رواج عام تھا۔ رگ وید کے منڈل دسویں (سوکت ۸۵) میں درج ہے کہ سورج دیوتا کی بیٹی ''سُوریا'' کی شادی سوم (چاند) سے ہوئی تھی، تو لڑکی والوں نے بہت کچھ دیا تھا۔ دیوتاؤں بنسبت لین دین اور جہیز کی باتیں رشیوں نے کی ہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود لوگوں میں لین دین کا رواج تھا، جس وجہ سے دیوتاؤں بنسبت ہی یوں ہی کہا گیا ہے۔ مطلب یہ کہ لین دین کا رواج جو اس وقت ہمارے پاس ہے، وہ رگ وید والے زمانے سے لے کر جاری ہے۔

۶- رگ وید والے زمانے میں لوگوں نے سونا مارنا سیکھا تھا اور ان کے پاس سونے کے سکے بھی تھے، جنہیں ''نِشک'' (Niska) کہتے تھے۔

۷- سندھ ملک بڑا مالدار تھا، جس میں مال مویشی بہت تھے، سندھ کے گھوڑے مشہور تھے اور انہیں رتھوں میں جوتا جاتا تھا۔

۸- گھوڑوں پر راجا موتیوں سے جڑی ہوئی زین ڈالتے تھے، اس لئے کہا جائیگا کہ رگ وید والے زمانے میں ہی راجا اپنا شاہی شان رکھتے تھے۔ اس وقت غواص ہوا کرتے تھے، جو مہران میں سپیں تلاش کر کے وہاں سے چمکدار موتی لاتے تھے۔

رگ وید کے اسی منڈل پہلے میں سندھ کے راجا سونیہ بھاویہ کی تعریف کے بعد کچھ

مصرائیں اس کی رانی ''روماسا'' سے متعلق ہیں، جس کے باپ کا نام ''برہسپتی'' تھا، (رگ وید، منڈل پہلا، ۱۲۶، ۶۔۔۷)۔ اس رانی کا مذکورہ بالا دان اُستتی سے کوئی بھی تعلق نظر نہیں آتا۔ اسی سبب مسٹر گرفتھ، جس نے رگ وید کے کچھ منتر انگریزی میں ترجمہ کئے ہیں، اس کا کہنا ہے کہ سندھ کی رانی روماسا سے متعلق شاید کوئی گیت عام ہو، جس کی کچھ مصراعیں رگ وید میں آ گئی ہیں۔ ان مصراعوں صرف اتنا کہا گیا ہے کہ ایک دفعہ رانی روماسا ایک نئی قسم کا لباس پہن کر کہنے لگی کہ ''اس لباس میں میں گندھارن (قندھار دیس کی عورت) لگ رہی ہوں۔'' رگ وید والے زمانے میں درہیو آریوں کا ملک ان کے جد امجد ''گاندھار'' کے نام پیچھے ''گندھار'' (قندھار) کہلاتا تھا۔ رانی روماسا کے مذکورہ بالا الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ اسی قدیم زمانے میں ہی سندھ کے لوگوں کی قندھار کی طرف کے باشندوں سے بڑے تعلقات تھے، اور رنی روماسا کو پتہ تھا کہ وہاں کی عورتیں کس قسم کا لباس پہنتی ہیں، اس لئے اس نے یوں کہا کہ ''اس لباس میں میں گندھارن لگ رہی ہوں''۔ اگر اُسے گندھار کی عورتوں کے لباس کا پتہ نہیں ہوتا تو اس قسم کا خیال اس کے دل میں نہیں آتا۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس وقت سندھ کی عورتوں کے لباس کا نمونہ اور، گندھار کی عورتوں کے لباد کا نمونہ اور تھا۔ یہ نمونے کس طرح کے تھے اس کا رگ میں کوئی تذکرہ نہیں۔ تاہم رگ وید میں اس وقت کی تہذیب کا اور بہت ہی تذکرہ ملتا ہے۔

کسی بھی ملک میں اگر کوئی حاکم نہیں ہوگا اور اندھیر نگری ہوگی، تو زورآور لوگ کمزوروں کو لوٹ کر مار ڈالیں گے، بلکہ ان کی بیویاں اور ملکیت بھی اُٹھا کر لے جائیں گے، اور کسی وقت انہیں قتل کر کے ختم کر دیں گے۔ اسی سبب مہا بھارت کے شانتی پروَ میں کہا گیا ہے کہ ''اول کوئی راجا مقرر کریں، اور پھر شادی کریں اور مال ملکیت اکٹھی کریں''۔ ہم نے بھی اسی خیال سے پہلے سیاسی ساخت، ملکی انتظام اور بادشاہتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اب لوگوں کی گھریلو زندگی کا ذکر کیا جاتا ہے، تاکہ یہ سمجھنا آسان ہو کہ کھیتی کا ہنر جاری ہونے کے بعد، جب لوگ خانہ بدوشی والی زندگی چھوڑ کر ایک جگہ ٹک کر رہنے لگے، اور اپنی جانو مال کی حفاظت کی خاطر گوتر بنانے کا رواج ڈالا گیا، تب گوٹھوں اور گوتروں میں اپنی زندگی کس طرح گذارتے تھے۔ حقیقی تاریخ تو یہی ہے، اس لئے اس کا ذکر کرنا از حد ضروری ہے۔

☆

باب ۱۰

آریوں کی گھریلو زندگی اور عقائد

گھر کی بنیاد: گھر انسان کا پہلا مکتب ہے اور یہی تہذیب کا اوائلی مقام اور سماجی ڈھانچے کا بنیادی مرکز ہے۔ اگر لوگ اپنی زندگی جانوروں کی طرح گذارتے، تو نہ گھر گھاٹ ہوتے، نہ رشتیداریاں؛ خود ماں باپ سے بھی ناتہ نہیں ہوتا، جس طرح جانوروں اور کتوں بلوں کا نہیں ہے۔ گھر ہے ہی عورت سے، جس پر گھر کو قائم رکھنے کا بوجھ ہے، اس لئے گھر والی کے معنی ہیں ''بیوی''۔ خود ''گھر'' لفظ کے بھی اصطلاحی معنی ہیں ''بیوی''۔ مثلاً ''فلاں شخص نے پہلا گھر کیا ہے یا دوسرا''۔ یہاں ''گھر'' کے معنی ہیں ''بیوی''۔ بیوی بھی وہ جس سے نکاح ہو۔ مطلب یہ کہ گھر کی بنیاد شادی کی رسم پر ہے۔ گھر وہ جس میں میاں بیوی سالن پلاؤ، یا روکھی سوکھی روٹی کھا کر، اکٹھے گذارتے ہیں، اور دکھ سکھ میں ایک دوسرے کے حال بھائی رہتے ہیں۔ اس طرح ایک دوسرے سے ان کی اتنی محبت ہو جاتی ہے، کہ ایک دوسرے پر قربان جاتے ہیں۔ اس میں بھی بیوی، جو پیار کا مجسمہ ہے، وہ اپنے شوہر کو اتنا پیار کرتی ہے، جسے پوری طرح کوئی بھی بیان نہیں کرسکتا، اس لئے سب مہذب قوموں نے نکاح کی ضرورت کو محسوس کیا۔ اپنی نکاحی بیوی سے جائز بچے پیدا ہوتے ہیں، اور ان کی بھی آپس میں بڑی محبت رہتی ہے۔ بعض اوقات بھائی آپس میں لڑیں گی بھی، یا ایک دوسرے سے تلخ کلامی بھی کریں گے، پھر بھی کبھی نہ کبھی ایک دوسرے کے لئے ان کا دل ضرور دکھے گا، اس لئے کہاوت ہے کہ ''رت ونگو به وري''۔ دوسری کہاوت ہے کہ ''رتي جي رتي، صحبت جو خرار.'' اولاد اور رشتیداروں سے محبت ہونے کی باعث خود گھر کے لئے آرزو بیدار ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی بیروں ملک جائیگا، وہاں بھلے سینکڑوں مزے اُسے ملیں، پھر بھی جب اُسے اپنے گھر کی یاد آئے گی، اس وقت سمندر پار کر کے بھی اپنے وطن لوٹ کر آئے گا۔ دور سے اگر اپنے وطن کے درخت دیکھے گا تو خوش ہونے لگے گا، علاوہ ازیں اپنی جنم بھومی دیکھ کر خوشی میں پھولا نہیں سمائے گا! مطلب یہ کہ گھر گویا کہ ایک محبت کا مندر ہے، اور اس کی بنیاد شادی پر رکھی ہے۔

ساری مہذب قوموں نے گھر کی بنیاد اگرچہ نکاح یا شادی پر رکھی، تاہم قدیم آریوں نے اس سلسلے میں دوسروں سے ایک قدم آگے کی طرف گئے۔ دنیا میں ہر ناتہ ٹوٹ سکتا ہے، لیکن قدیم ہندوؤں نے یہی مناسب سمجھا کہ میاں بیوی کا ناتہ ایک دوسرے سے ہرگز ٹوٹنے نہ پائے۔ اس طرح کے خیالات نہ صرف عورتوں کے تھے بلکہ مردوں کے بھی تھے۔ مثلاً ''وشو وارا'' (Visva-Vara) نامی ایک بیوی گذر چکی ہے، جسے رشیوں کے زمرے میں شمار کیا گیا ہے۔ رگ وید کے منڈل پانچویں (۳،۲۸) میں اگنی دیوتا کو اس نے التجا کی ہے کہ ''شادی کا ناتہ کبھی بھی نہ ٹوٹے، اور ہمیشہ پختہ پائے پر ہو''! اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مردوں کی طرح خود عورتوں کو بھی اپنی گھریلو زندگی کو پختہ پائے پر کھڑا کرنے کی فکر لاحق رہتی تھی۔ اسی فکر کے سبب ہندوؤں میں شادی ایک مذہبی نظام شمار ہوتی ہے، اور بیوی کو اپنے شوہر کی ''اردھانگنی'' یا ''آدھا جسم'' کہا گیا ہے۔ مرد اور عورت اصل میں الگ الگ دوسریہ ہیں، لیکن وواہ سنسکار کی وجہ سے دونوں مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ ہندوؤں میں آج تک دستور ہے کہ اگر کوئی پوجا کرواتے ہیں تو دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کے دامنوں کو گرہ لگا کر بیٹھتے ہیں، کیونکہ اپنا خواہ ساری دنیا کا نیتارہ بھی ان کو مل کر کرنا ہے۔ شادی کی اس رسم کو یہ مذہب کا دھاگہ قدیم آریوں نے ایسا باندھا، کہ ایک دفعہ شادی ہوئی سو ہوئی، اس لئے ہندوؤں میں آج تک طلاق کا رواج ہے ہی نہیں۔ ہندو قوم کی یہ ایک نہایت اہم بات ہے جو دیگر کئی اقوام میں نہیں ہے۔

رواجی لوگوں کے گھر: رگ وید میں یہ درج نہیں ہے کہ لوگ اپنے گھر کس طرح بناتے تھے؛ لیکن اتھرو وید کے منڈل نویں سے اس بات کا پتہ چلتا ہے۔ گھر کے لئے کوئی اچھا سا میدان چن کر، اس کے چاروں کونوں پر چار ستون لگا دیتے تھے، اور اس کے اوپر شہتیر رکھتے تھے۔ اس دوران کچھ منتر پڑھتے جاتے تھے (اتھرو وید، منڈل نو، ۳)۔ اسی سبب آج تک شہتیر چڑھانے کے وقت پوجا کروائی جاتی ہے، اور مٹھائی تقسیم کی جاتی ہے۔ چھت کے لئے بانس کی لڑھیاں استعمال کرتے ہیں، اور اس کے اوپر پکھے پھیلاتے تھے تو چھت میں باریک باریک سوراخ جالی کی طرح نظر آتے تھے، جو بعد میں لپائی کرنے کے بعد بند ہو جاتے تھے۔ نیچے سے سہارے کے لئے بھی بانس کے لکڑے لگاتے تھے۔ لکڑوں اور بندوں کے بیچ میں جو خال رہ جاتے تھے، ان میں گھاس کے مچے ڈال کر، پھر اس پر لپائی کر دیتے تھے۔ چھت کو منڈھیر رکھتے تھے۔ یہ منڈھیر آج تک رکھا جاتا ہے، تاکہ چھت پر کھڑا ہوا آدمی گر نہ جائے۔ مطلب یہ کہ گھر بنانے کا نمونہ وہی تھا، جو آج بھی دیہاتوں میں عام ہے۔ ہر ایک گھر کو چار دیواریں ہوا کرتی

تھیں (اتھروید، منڈل تیسرا، ۷۷۔۳)، لیکن کچھ گول جھوپڑیاں بھی بناتے تھے، جنہیں ''چوَنرا'' کہا جاتا ہے (اتھروید، منڈل تیسرا ۱۲، ۵)۔ گھر میں زمین پر چٹائیاں بچھاتے تھے اور بعض لوگ گھاس پھیلا دیتے تھے، (رگ وید، منڈل نواں ۵۹،۳)۔

ہر ایک گھر میں اکثر چار کمرے ہوا کرتے تھے:

۱- ایک ''سَدَس'' (Sadas) یعنی بیٹھنے کے لئے کمرہ ہوتا تھا۔ یہ ایک عام صفہ ہوتا تھا، جس میں سب گھر کے لوگ اکٹھے ہو کر بیٹھتے تھے، اور محو گفتگو ہو جاتے تھے۔

۲- دوسرا کمرہ ''پتنی نام سدن'' کہلاتا تھا، جس کے معنی ہیں بیویوں کے بیٹھنے کا کمرہ۔ یہ کمرہ اس لئے تھا کہ بیویاں اس میں پوشیدہ بیٹھی رہیں۔

۳- تیسرا ''اگنی شالا'' یعنی ''آگ کا کمرہ'' تھا۔ یہ تھا باورچی خانہ جس میں یگیہ کے لئے بھی آگ جلاتے تھے۔ یہ پوجا والا ٹکڑا پہلے بنا ہوا ہوتا تھا، جس وجہ سے باورچی خانہ سے الگ ہوتا تھا؛ لیکن کمرہ وہی ہوتا تھا، اسی وجہ سے باورچی خانہ پاک جگہ سمجھا جاتا تھا۔ ہندو لوگ آج تک باورچی خانہ میں جوتا پہن کر نہیں جاتے۔

۴- چوتھا کمرہ تھا ''ہویردھان'' (Havirdhana)۔ یہ راشن وغیرہ رکھنے کا کمرہ ہوتا تھا۔ ہون ہوم کی چیزیں بھی اسی میں رکھتے تھے۔

ان صفوں اور کمروں کے علاوہ ایک ''آوستھ'' یعنی بیٹھک یا اوطاق بھی ہوتی تھی، جس سے متعلق علماء کا کہنا ہے کہ یہ مہمانوں کے لئے جگہ تھی، خصوصاً براہمنوں کے لئے، جو کسی کام سے منگل پر آ کر اکٹھے ہوتے تھے (ویدک انڈیکس، ۱،۱،۶)۔ اس سے دیکھنے میں آئیگا کہ اوطاقوں کا دستور ویدون والے زمانے سے جاری ہے۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ اوطاقوں کا رواج مسلمانوں کے حکمرانی کے دوران جاری ہوا، یہ غلط بات ہے۔

اگر کسی گھر میں دو تین بھائی غیر شادی شدہ ہوتے تھے، تو ان کے لئے لازماً الگ الگ کمرے ہونگے، لیکن ایسا تذکرہ اتھروید میں نہیں ہے۔

ہر ایک گھر کے دو ''پکھ'' (Wings) ہوتے تھے، جس سے سمجھا جاتا ہے کہ گھر کے اگلے حصے میں ایک دالان یا ورانڈہ ہوتا تھا، اسے ''پروشتھ'' کہا گیا ہے۔ دالان کے کھنبھے لکڑی کے ہوتے تھے، جن پر شکلیں کندہ ہوتی تھیں۔۔ بعض کنبھوں پر دو بھوریوں (پرندہ کی قسم) کی شکل کندہ ہوتی تھی۔۔ یہ بات رگ وید کے منڈل چوتھے (۳۲،۳۳) میں درج ہے۔ مطلب یہ کہ گھر کے سامنے والا یعنی ورانڈے کا سامنے والا حصہ خوبصورت بناتے تھے، تاکہ جگہ دور ہی سے دیدہ زیب نظر آئے۔

آج کل گھروں کے سامنے ''اگنؒ (آنگن)'' رکھا جاتا ہے۔ یہ دراصل ویدک لفظ ''اگنؒ'' ہے۔ جو آدمی باہر سے آتا تھا وہ صحن سے گذر کر، پہلے دالان میں جاتا تھا اور پھر صفوں میں داخل ہوتا تھا۔ ''اگنؒ'' لفظ کا مادہ ہے سنسکرت لفظ ''گم'' معنی جانا یا چلنا۔ ''اگنؒ'' لفظ کے اس لئے بنیادی معنی ہیں ''جس میں چلا جائے یا گھوما جائے''۔ اس سے سمجھا جاتا ہے کہ صبح یا شام کو، یا رات کا کھانا کھانے کے بعد انگن میں چہل قدمی کرتے تھے اور آنگن رکھنے کا اصل مقصد بھی یہی تھا۔ ہر ایک گھر کے باہر سے کانٹوں کی دیوار بناتے تھے (رگ وید، ۵۹، ۶)۔ پوری جگہ کو کہتے تھے ''شالا'' یا ''گھر''، جو اصل میں سنسکرت لفظ ''گرھ'' ہے اور اس کے بنیادی معنی ہیں ''جو قبضے میں ہو''۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گھر کی ساری زمین لوگوں کی ذاتی ملکیت ہوتی تھی، اور انہیں پچاس ساٹھ یا نوانوے سالوں کے مقاطعہ پر زمیں ملی ہوئی نہیں ہوتی تھی، جس طرح آج ہے!

رگ وید کے منڈل چھٹے (۴۶، ۹) میں بھار دواج رشی اندر دیوتا کو التجا کی ہے کہ مجھے ایک ایسا گھر دے، جو ''تر دھاتو'' (Tri - Dhatu) اور ''تر وروتھ'' (Trivarutha) ہو۔ ان الفاظ کی بعض علما نے ایک طرح سے معنی لی ہے تو بعض نے دوسری طرح سے۔ بعض کہتے ہیں کہ ''تر دھاتو'' کے معنی ہیں وہ جگہ جس میں تین چیزیں استعمال شدہ ہوں: لکڑی، اینٹیں اور کچا (گھڑا ہوا پتھر)۔ شاین آچاریہ نے، جن ویدوں کی شرح لکھی ہے، اس کا کہنا ہے کہ ''تر دھاتو'' معنی ''تر بھوٗمیک''، یعنی ''تین منزلہ''۔ ممکن ہے بہت پہلے بھی گھروں کی منزلیں ہوا کرتی ہوں۔

قدیم زمانے سے لے کر ہندوؤں میں یہ رواج رہا ہے کہ نئی بنی ہوئی جگہ میں بیٹھنے سے پہلے ہون ہوم کرتے ہیں اور براہمن اور سادھ فقیروں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ اسے ''تھان شدھ'' کہتے ہیں، جس کے لفظی معنی ہیں ''تھان شدھ کرانا'' (جگہ پاک کرانا)۔ اس وقت بڑی رقم خرچ کرتے تھے، اس لئے ''تھان شدھ کرنا'' اب ایک اصطلاح بن گیا ہے اور اس کے معنی بن گئے ہیں اپنی ملکیت دوسروں کو دے دینا یا خیرات کر دینا۔ اسی قسم کا رواج یورپ میں بھی تھا۔ انگریزی میں اسے House warming کہتے ہیں۔ اس لفظ میں یہ خیال رکھا ہوا ہے کہ نئی بنی ہوئی جگہ ٹھنڈی ہوتی ہے، اس میں محفل کرتے تھے، اس لئے کہ بہت مہمان اس میں آ کر اکٹھے ہوں تا کہ جگہ گرم ہو جائے۔

رگ وید کے منڈل ساتویں میں دو رچائیں (۵۴ اور ۵۵) ''وستو پتی'' (Vastos - Pati) یعنی ''واستو'' یعنی گھر کے دیوتا سے متعلق کہے گئے ہیں، جن میں درج ہے کہ ''اے گھر کے رکھوالے دعا گو، تو رحم کر، تا کہ یہ گھر ہمارے لئے خوش قسمتی والا ثابت ہو، کوئی بیماری گھر میں نہ ہو، ہماری مرغیاں، ہمارے مال مویشی اور ہم سب آرام سے زندگی گذاریں، اور کوئی چور ہمیں

نہ لوٹے، وغیرہ''۔ اسی طرح نئی جگہ میں بیٹھنے کے وقت منت باندھتے تھے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے ہندو بھی گھروں میں مرغیاں پالتے تھے۔ گھر کی صفائی کے لیے بہت سارا گھاس پھوس ہاتھ میں لے کر، اس سے جھاڑو لگاتے تھے، ان لکھ کانوں کو کہتے تھے ''بہواری'' یعنی بہت سارے سرکنڈے، اور اس کا تلفظ آج ہے ''ٻهاري''۔

گھر و انتظام: سماجی ڈھانچے کا مرکز ہے گھر۔ رگ وید والے زمانے میں مشترکہ خاندان کا رواج عام تھا (صفحہ ۹۸)، اس لئے باپ یا کوئی اور بزرگ گھر کا بڑا ہوتا تھا، اور گھر کے سارے افراد پر اسے پورا اختیار ہوتا تھا۔ ''پِتا'' (باپ) لفظ کے بنیادی معنی ہیں ''سنبھالنے والا''، اس لفظ سے خود یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ گھر کو سنبھالنا اور گھر کے دیگر افراد کی خبرگیری کرنے کا بوجھ باپ کے کندھوں پر ہوتا تھا۔ ایک کہاوت بھی ہے کہ ''ٻاري ڪٽن ٻار، ڪونهي ڪم ڪچن جو.'' گھر گھر میں یہ بڑے ہی تھے جو سارے گھر کا بوجھ اپنے کندھوں پر لئے ہوتے تھے، کمی بیشی کو خود نپٹاتے تھے، جس وجہ سے تمام چھوٹے افراد فکرمندی سے بری رہتے تھے۔

گھر کا پروہت بھی باپ ہوتا تھا۔ روزانہ یگیہ کی اگنی جلانا، اگنی میں چھاہوتی ڈالنا، ویدوں کے منتر پڑھنا اور دیگر اس طرح کے کام جو آج کل براہمن کرتے ہیں، وہ سارے گھر کا بڑا کرتا تھا۔ اس وقت بھی براہمن تھے، جو اکثر برہم علم کے جاننے والے تھے، اسی لئے انہیں براہمن کہا جاتا تھا۔ وہ راجاؤں کی نسل کے پروہت ہوتے تھے۔ دوسرے گھر بار والوں کو بھی اگر کوئی پوجا کروانی ہوتی تھی یا کوئی بڑا یگیہ کروانا ہوتا تھا، تو کسی رشی یا براہمن کو بلاتے تھے، ورنہ رواجی روزمرہ کی پوجا خود کرتے تھے۔

ہر ایک خاندان کا بڑا یگیہ کی اگنی جلا کر روزمرہ کی پوجا کتنے صدق و سچائی سے کرتا تھا، اس سے متعلق ''شتپتھ براہمن'' میں ایک نہایت عمدہ بات لکھی ہوئی ہے۔ ''ارن یوپیسی'' (Aruna Aupavesi) کو کسی رشتیدار نے کہا کہ ''اب (گھر کے) بڑے مقرر ہوئے ہو، اب یگیہ کی اگنیاں جلاتے رہو''۔ اس نے جواباً کہا کہ ''آپ گویا مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ میں بولنا بند کر دوں، یعنی یگیہ کی اگنی جلانے کے معنی ہیں جھوٹ نہ بولنا، اور یہ تب ہو سکتا ہے جب بات ہی نہ کی جائے''۔ یگیہ کی اگنی جلانے کے لئے اس قدر سچائی کی ضرورت ہے۔[1] یہ ایک ہی منڈل اچھی طرح سے ہماری کھوپڑی کو کھول دیتا ہے، جس وجہ سے سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ گھر کے بڑے بھی بڑی خوبیوں والے ہوتے تھے۔ انہیں آج تک ''پُوج'' کہا جاتا ہے، اور یہ سچ پچ پوجنے کے لائق تھے، جو دیگر خوبیوں کے ساتھ ساتھ ان میں اس قدر صدق و سچائی بھی تھی۔

(1) Satapatha Brahmans, Sacred Books of the East, Vol. XII, P. 313, 20.

رگ وید سے معلوم ہوتا ہے کہ باپ جب تک زندہ ہوتا تھا تب تک پورے گھر کے انتظام کا بوجھ اس کے سر ہوتا تھا۔ اگر مر جاتا تھا یا بلکل ضعیف ہو جاتا تھا، تو پھر اس کا بڑا بیٹا اس کی بجائے گھر کی سنبھال کرتا تھا (رگ وید، منڈل پہلا، ۷۰، ۵)، اور اپنے بیرن رشتیداروں کو ہر طرح کے سکھ کے ساتھ رکھنے کی فکر میں رہتا تھا۔ (منڈل ساتواں، ۱۸، ۲۳)۔

''بھراتر'' (بھائی) لفظ کا مادہ ہے ''بھر'' معنی ''سہارا دینا''، بھائی گھر کا سہارا ہوتے ہیں، اور بڑا بھائی آج تک باپ کی جگہ سمجھا جاتا ہے، اس لئے چھوٹے بھائی اس سے جھک کر ملتے ہیں۔ بھائیوں کی محبت کی نہایت عمدہ مثالیں رامائن اور مہا بھارت میں سے ملتی ہیں۔ ایسے آدرش بھائیوں کا پرتو پوری ہندو برادری پر وقت بوقت پڑتا رہا ہے۔ مشترکہ خاندان کا رواج اتنی صدیاں مسلسل اسی لئے تو جاری رہا، کیونکہ بھائیوں کی آپس میں محبت بڑی حد تک ہوتی تھی، اور گھر کے تمام افراد کی ایک دوسرے میں جان ہوتی تھی۔ اسی سبب سندھ میں یہ کہاوت بھی عام ہوئی کہ:

''پائر ڪوٽ جا ڪنگرا، پٽ گھر جي سونھن،
وينا ڪن ورونھن، ڏجڻ ڏوران ئي ڏري''

[بیٹے گھر کی رونق اور بھائیوں کی پریت قلعے کی مانند مضبوط ہوتی ہے جس کے باعث دشمن ڈر کر دور ہی سے بھاگ جاتے ہیں۔]

گھر کے انتظام کا بوجھ جب بڑے بھائی پر آن پڑتا تھا، تو اپنی فرض ادائی کرنے کی ہر طرح کوشش کرتا تھا۔ اس کی بہنیں جب تک غیر شادی شدہ ہوتی تھیں، تب تک ان کو پالتا تھا اور ان کی پوری طرح خبر گیری کرتا تھا۔ جب بڑی ہوتی تھیں تب جہیز دیکر ان کی شادی کروا دیتا تھا، کیونکہ لین دین کا رواج اسی قدیم زمانے میں بھی تھا (منڈل پہلا ۱۰۱، ۲)۔

رشتیدار اور اولاد: بچے گھر کی رونق ہوتے ہیں۔ جس گھر میں بچوں کا شور نہیں ہوتا تھا وہ گھر لوگوں کو کھانے کے لئے آتا تھا۔ اس لئے قدیم لوگ خدا کو یہ التجا کرتے تھے کہ بچے عطا فرمانا! (رگ وید، منڈل ساتواں، ۱، ۱۱، اور ۱۲، منڈل آٹھواں، ۱، ۱۳)۔ اکثر یوں چاہتے تھے کہ بیٹے پیدا ہوں، جو بڑوں کا نام قائم رکھیں اور آباء واجداد کا نام بھی روشن رکھیں (منڈل پہلا، ۱۰۵، ۳)۔

قدیم لوگ یوں سمجھتے تھے کہ جو شخص بے اولاد مر جاتا ہے اور اس کا نام قائم اور روشن رکھنے کے لئے کوئی بھی اس کا بیٹا نہیں ہے، وہ ''پُو'' نامی نرک یعنی دوزخ میں جا کر گرتا ہے۔ اسی وجہ سے بیٹے کو کہا گیا ''پُوتر'' یعنی دوزخ سے نکالنے والا۔ لوگ بیٹے مانگتے ہی اس لئے تھے کہ زندگی میں تو مددگار بنے لیکن مرنے کے بعد بھی ماں باپ کی کریا کرم اور سرادھ کر کے ان کا نیتارا

کریں۔ جس کو اپنے تخم سے بیٹا نہیں ہوتا تھا تو وہ کسی اور کا بیٹا (خصوصاً نواسہ) گود لیتا تھا۔ ''گود میں لینا'' کے معنی ہیں دین کا بیٹا بنانا۔ اس اصطلاح سے خود پتہ چلتا ہے کہ پرایا بچہ ابھی بچپنے میں ہی ہوتا تھا اور گویا گود میں بٹھانے جتنا ہوتا تھا، تب اسے دین کا بیٹا بناتے تھے، نہیں کہ بڑی عمر میں۔ اسی طرح پرائے بیٹے کو دین کا بیٹا مان کر پالتے تھے، پھر بھی ان کے دل کو آرام نہیں ملتا تھا، جس طرح اپنے تخم سے پیدا ہونے والے بیٹے سے ملتا ہے۔ وقت آنے پر یہ دینی بیٹے اپنے اصلی ماں باپ کے پاس لوٹ جاتے تھے۔ (منڈل ساتواں، ۴، ۷۔۸)۔

آدرش بیٹا وہ سمجھا جاتا تھا جو شکل میں خوبصورت، قدآوار، باہمت، برجستہ اور گھر سنبھالنے جیسا، سمجھدار، عقلمند، شاستروں کا عالم، اور بھگوان کی بھگتی کرنے والا ہوتا تھا (منڈل دسواں، ۴۷، ۳)۔ رگ وید میں ایک رشی نے دعا کی ہے کہ ''اے بھگوان، وہ بیٹا دینا جو مہا پہلوان ہو، زبردست گھوڑے پر چڑھے، جنگ میں دشمنوں سے فتح حاصل کرے، اور بڑے یگیہ اور دان کرے'' (منڈل چھٹا ۳۳، ۱)۔ مطلب یہ کہ مہا پہلوان اور دھرماتما بیٹے لوگوں کو اچھے لگتے تھے۔ اگر اتفاقاً کسی کا بیٹا ناخلف ہوکر ابھرتا تھا، تو ماں باپ اُسے سزا دے کر، سیدھی راہ پر لاتے تھے۔ (منڈل دوسرا، ۲۹، ۵)۔ کبھی کبھار ماں باپ غصے میں بھر کر اپنی اولاد کو نہایت نامناسب سزائیں دیتے تھے۔ ایسی ایک مثال رگ وید میں ملتی ہے، جس میں درج ہے کہ رَجراشوَ (Rjrasv) نامی ایک جوان دیہاتیوں کی ایک سَو بھیڑیں جنگل میں چرواتے ہوئے، بھیڑیوں سے مروا آیا، تو اس کا باپ ''ورشاگری'' (Vrasa-giri) اس پر اتنا غصے ہوا، جو اس کی دونوں آنکھیں نکال لیں، اور بعد میں اَشونی کمار دیوتاؤں نے اپنی مہربانی سے اسے پھر آنکھیں لوٹا دیں (منڈل پہلا، ۱۱۶، ۱۶، ۱۱۷، ۱۷)۔ عام طور پر باپ اپنے بیٹے یا بیٹی کو کم نہیں چاہتا تھا، اور ہمیشہ اُسے اپنی اولاد کی بہبودی کی فکر لاحق رہتی تھی (منڈل آٹھواں، ۴۸، ۴)۔ بیٹا بھی ہمیشہ اپنے باپ کی آگیا میں ہوتا تھا، اور اس کے لئے اُسے بڑی محبت اور عزت ہوتی تھی۔[1] ماں باپ کے پاؤں پر ہاتھ رکھنا نہایت ہی قدیم رواج ہے۔ رگ وید کے منڈل دوسرے میں (۳۳، ۱۲) میں درج ہے کہ بیٹا اپنے باپ کے پاؤں پر ہاتھ رکھتا تھا تو باپ اسے ہاتھوں سے روگ کر اس کا سر اونچا کرتا تھا۔ مریادا پرشوتم شری رامچند ربھی ماں باپ کے پاؤں پڑتا تھا، اور یہ رواج آج تک جاری ہے۔ آج بھی اگر کوئی شخص کسی اچھے منصب پر پہنچ جاتا ہے تو یوں سمجھتا ہے کہ مجھے اپنے ماں باپ ہی کی دعا نے نوازا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ماں باپ دیوتاؤں کے روپ سمجھے جاتے ہیں۔

(1) "The relation of child and parent was clearly, as a rule, one of close affection; for a father is regarded as the type of all that is good and kind." Cambridge History of India, Vol. 1, P. 89.

بیٹی کو پیار سے "پُتری" (پتڑی) کہا جاتا ہے، ورنہ عام طور پر "پٹ" (بیٹا) کا مؤنث ہے "دھی" (بیٹی) (پراکرت "دھیئا")، جو اصل میں سنسکرت لفظ ہے "دُھتا" "دھتر" (پارسی "دختر"، اور انگریزی "ڈاٹر" (Daughter)۔ اسی لفظ کا مادہ ہے "دُھ" (Duh) معنی دوہنا۔ پہلے بیٹیوں پر بکریاں، گائیں وغیرہ دوہنے کا کام رکھا ہوا ہوتا تھا، اس لئے ان پر یہ نام پڑا۔ مطلب یہ کہ "پٹ" (بیٹا) لفظ میں ایک خیال اور "دھی" (بیٹی) لفظ میں دوسرا خیال پنہاں ہے، اس لئے انہیں یہ دو علحدہ الفاظ ملے ہیں۔

بیٹا خواہ بیٹی ایک ہی ماں باپ کی اولاد، پھر بھی دونوں میں فرق جو اس وقت کے لوگ سمجھتے ہیں، یہی فرق قدیم لوگ بھی سمجھتے تھے۔ بیٹا ہمیشہ اپنے ماں باپ کے پاس زندگی گذارتا ہے، اور اپنے خاندان کا نام قائم رکھے ہوئے ہوتا ہے۔ ماں باپ بوڑھے ہو جاتے ہیں تو بیٹا ان کی خدمت کرتا ہے اور ان کو ہر طرح سے سکھ سے رکھتا ہے۔ درحقیقت بیٹی کے دل میں ماں باپ کے لئے زیادہ احساس ہوتا ہے، اس لئے ایک کہاوت ہے کہ "پيئُ ليئُ ذيئُ ڪم اچي"، یعنی ناچاقی میں جب ماں یا باپ بستر داخل ہو جاتا ہے تو بیٹی زیادہ کام آتی ہے۔ اس کے باوجود بھی بیٹی کی حالت نرالی ہے۔ بیٹی بالآخر کسی اور کا گھر آباد کرے گی۔ بیٹی کو لے دے کر رخصت کیا جاتا ہے، لیکن پھر بھی اس کی سکھی زندگی کا دارومدار اس کے شوہر پر ہے، جو کوئی اور ہوتا ہے۔ معلوم نہیں ہوتا کہ آگے چل کر وہ لائق انسان ثابت ہوگا بھی یا نہیں، اور بیٹی اپنے سسرال میں سکھ سے زندگی گذارے گی یا نہیں، اگر بیٹی ہر طرح سے سکھی ہے اور کسی قسم کا کوئی مسئلہ نہیں ہے، تو ماں باپ بھی خوش ہونگے؛ اور اگر بیٹی دکھی ہے تو ماں باپ بھی دکھی رہیں گے۔ جن کو سسرال میں ملے خون کی روٹی اور دکھوں کی دال، انہوں نے کئی ایک کہاوتیں اپنے حال کو دیکھ کر بنائی ہیں، جیسا کہ:

"ساهرا آهرا ٻاٻرا ڪندا،
جو پاسو وراءِ، سو چُڀ چُڀ ڪندا"

عورتوں کی کہاوت۔

[ساسو سُسرا، ببولی کانٹے ہیں،
جو کروٹ لو تو چُبھ جاتے ہیں۔]

بیٹیوں کے مستقبل کی فکر قدیم لوگوں کو اس قدر گھیر لیتی تھی، کہ رگ وید کے آخر میں جو ائتر یہ براہمن گرنتھ ہے، اس میں درج ہے کہ "بیٹیاں دکھوں کا سامان ہیں"۔
(ساتواں، ۳۱، ۱)۔

بیٹیوں کی فکر اور رخصتی: قدیم ہندوؤں میں تحریری وصیت (Will) کا رواج تھا ہی نہیں۔ ساری ملکیت کا مالک باپ ہوتا تھا۔ باپ کے بعد اس کی ساری ملکیت اس کے بیٹوں کی ہوتی تھی۔ اگر کسی کو بیٹا نہیں ہوتا تھا تو اس کی ساری ملکیت اس کے نواسوں کو ملتی تھی، نہیں کہ بیٹیوں کو۔ آج بھی یہی قاعدہ ہے۔ عام طور پر بھائی اپنی بہن کو اپنی ملکیت سے حصہ دینے کا پابند نہیں ہوتا تھا (رگ وید، منڈل تیسرا، ۳۱، ۲)۔ تاہم، اگر کسی لڑکی کو اس کی اپنی پسند کا شوہر نہیں ملتا تھا، یا کنوارہ رہنا پسند کرتی تھی یا کسی مرض میں مبتلا ہونے کی صورت میں ساری زندگی کنواری رہتی تھی اور ایسی صورت حال میں باپ کی ملکیت سے حصہ مانگتی تھی تو وہ اسے ملتا تھا (منڈل دوسرا، ۷، ۱۷)۔ اسی طرح بھائی اپنا تعاون نبھاتے تھے، تو بہن عزت آبرو سے سکھی زندگی گذارتی تھی اور اُسے کسی اور کی محتاجی دیکھنی نہیں پڑتی تھی۔ اگر باپ کی ملکیت ہوتی ہی نہیں تھی، تو لڑکی مجبوراً، کوئی کام کاج کرتی تھی، اور کبھی کبھی لالچوں میں جا کر پھنستی تھی۔ جس لڑکی کا کوئی آگے پیچھے نہیں ہوتا تھا، اس کے پیچھے لفنگے پڑ جاتے تھے، اور کئی تو کھلم کھلا بد پیشہ اختیار کر لیتی تھیں (رگ وید، منڈل پہلا، ۱۲۴، ۷، چوتھا، ۵، ۵)۔

کچھ لڑکیاں شادی سے پہلے ہی بچے پیدا کر کے پھینک دیتی تھیں (منڈل دوسرا، ۲۹، ۱، منڈل پانچواں، ۵، ۵ اور منڈل نواں ۳۲، ۵)۔ یجر وید کے تنتر یہ براہمنہ (تیسرا، ۴، ۲، ۱) میں ''کماری پتر'' لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے معنی ہیں ''کنواری کا بیٹا''۔ یہی اسباب ہیں جو کئی لوگ بیٹیوں کی پیدائش پر خوش نہیں ہوتے تھے۔ جس کنواری لڑکی کو نہ باپ نہ بھائی ہوتا تھا، وہ بدبخت شمار کی جاتی تھی، اور اس پر تبصرے کیے جاتے تھے۔ یہ بھی خطرہ رہتا تھا کہ یہ کسی بھی وقت الٹے پاؤں چلے گی (رگ وید، منڈل پہلا، ۱۲۴، ۷۔۔منڈل چوتھا ۵، ۵)۔ اتھرو وید کے منڈل چھٹے (۱۱، ۳) میں ایشور سے دعا مانگی گئی ہے کہ ''ای بھگوان، بیٹی دوسروں کو دینا، یہاں ہمارے گھر میں بیٹا دینا!'' مطلب یہ کہ اگر بیٹی پیدا ہوئی تو ماں باپ پر گویا کہ کوئی مٹی کا تودا گرا۔ سندھی میں ایک کہاوت ہے کہ ''پھرين ذيءُ پٽ برابر''، (پہلی بیٹی بیٹے برابر)، لیکن جب بیٹی بیاہی جاتی ہے تو بیٹی کے سسرال والوں کے سامنے جھکنا پڑتا ہے، اور ان کی بہت ساری باتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں، اس لئے سندھی میں یہ بھی کہاوت عام ہے کہ ''سوءُ پٽان، هڪ گيان، تنهن پر به لڪان''۔ اگر کسی عورت کو پہلے ہی سے دو تین بیٹیاں ہوتی ہیں، اور پھر ایک اور بیٹی کا جنم ہوتا ہے تو پڑوسن اس سے اس طرح آ کر بات کرتی ہیں گویا کہ اعزاپرسی کر رہی ہوں! رگ وید زمانے سے یہ دستور آج تک جاری ہے۔

پہلے اگرچہ سب بیٹے مانگتے تھے، پھر بھی اگر ان کے ہاں لڑکی کا جنم ہوتا تھا تو اسے کم نہیں چاہتے تھے، کیونکہ بچے تو کووں کو بھی پیارے ہوتے ہیں۔ درحقیقت بیٹی کو دیوی کا روپ

سمجھتے تھے، اور آج بھی بیٹیاں دیویاں تصور کی جاتی ہیں۔ اتنا ضرور تھا کہ سب سے بڑی بیٹی کی دیر سے شادی کو پسند نہیں کرتے تھے؛ اس لئے ان کی شادی کی بڑی فکر میں رہتے تھے۔ اتنے بے صبرے ہوتے تھے، جو کہتے تھے کہ کہیں ہماری بیٹی کی شادی ہو جائے، تو ہم فکر سے بری ہو جائیں! آج بھی لوگ یہی کہتے ہیں۔ بیٹی کے لئے اچھا رشتہ ملے، اس کے لئے ویدوں کے منتر پڑھتے تھے (اتھرو وید، منڈل دوسرا، ٦)۔

رشتیداری اور شادی بیاہ: رگ وید میں ایسی کوئی سطر ہے ہی نہیں جس سے سمجھا جائے کہ اس زمانے میں بچپن میں شادی کرنے کا رواج تھا۔ جو حقائق درج ہیں ان سے یوں سمجھنے میں آتا ہے کہ لڑکیاں جب بالغ ہوتی تھیں، تب وہ بیاہی جاتی تھیں۔ منڈل دسویں سُوکت ۸۵ میں کہا گیا ہے کہ "کسی دوسری کنواری کی طرف نہیں جا، جو ابھی اپنے باپ کے گھر میں بیٹھی ہوئی ہے، اور شادی کی ساری علامات اس میں موجود ہیں"۔ اگر کوئی لڑکی کسی مرض میں مبتلا ہوتی تھی، جس کے باعث شادی سے خارج ہوتی تھی، یا ساری عمر کنوارہ رہنا چاہتی تھی، تو میکے گھر میں گذارتے ہوئے اس کے بال سفید ہو جاتے تھے۔(1) بچپن کی شادی کا رواج سوتروں کے زمانے میں، یعنی ویدوں کے بعد کے زمانے میں عال ہونے لگا، اور بچپن کی شادی سے جو تلخ نتائج حاصل ہوتے ہیں، وہ بعد میں ظاہر ہونے لگے۔(2)

رگ وید کے منڈل دسویں (۱۲،۲۷) سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لڑکیاں شادی کرتی تھیں، وہ اپنے لئے دولہے کا انتخاب خود کرتی تھیں۔ "ور" معنیٰ "دولہا"، لیکن اس کے بنیادی معنی ہیں "چنا ہوا"۔ "سویمور" معنیٰ خود انتخاب کرنا۔ لڑکیاں اپنے لئے خاص طور پر وہ دولہا منتخب کرتی تھیں، جو اس کے دل کو بھاتا تھا، یعنی اکثر پیار کی شادی ہوتی تھی (منڈل آٹھواں، ۶۲، ۴)، کیونکہ اکثر لوگ یہ سمجھتے تھے کہ شادی کی خوشی کی بنیاد ہی پیار پر ہے (منڈل دسواں ۱۲،۲۷)۔

رگ وید والے زمانے میں ذات پات کا مسئلہ ہوتا ہی نہیں تھا، اس لئے جس کی جس سے دل لگ جاتی تھی، اسکی اس سے شادی ہو جاتی تھی؛ صرف سگوتر اور سپنڈ شادی سے منع تھی (صفحہ ۱۷۵)، خود سے کمتر گھر میں شادی کرنا کسی کو پسند نہیں تھا۔ کسی کے پاس مال ملکیت کی بہتات ہوتی تھی، لیکن وہ اچھی چال چلن اور خوبصورتی سے محروم ہوتا تھا، تو ایسے کو کوئی بھی اپنی

(1) "Marriage in the early Vedic texts appears essentially as a union of two persons of full development. This is shown by the numerous references to unmarried girls who grow old in the house of their fathers." Prof. Macdonell and keith: Vedic Index.

(2) "Child-wives first occure regularly in the Sutra period, though it is still uncertain to what extent the rule of marriage before puberty there obtained." Dr. A.C. Das: Reg. Vedic Culture, Page 251.

لڑکی دینا پسند نہیں کرتا تھا۔ بعض لوگ مال ملکیت کو دیکھ کر رشتیداریاں کرتے تھے۔ عام رواج یہ تھا کہ اگر کسی کے پاس زیادہ مال ملکیت نہیں ہوتا تھا؛ لیکن علم اور اچھی چال چلن ہوتے تھے، تو وہ پسند آ جاتا تھا۔ اسی طرح اگر لڑکی غریب گھرانے کی ہوتی تھی، اور خوبصورت اور خوب سیرت ہوتی تھی، تو وہ پسند آ جاتی تھی، جس وجہ سے آج تک ایک کہاوت ہے کہ ''لذي کان لچڻ وڏيڪ''۔ اندھی، کانی، اور ترچھہ دیکھنے والی لڑکیاں مشکل سے پسند پڑتی تھیں، لیکن اگر کوئی ان سے شادی کرتا تھا، تو اس بات پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا تھا (رگ وید، منڈل ۲۳، ۱۱)۔

کسی جوان اور خوبصورت لڑکی حاصل کرنے کے لئے کئی ایک نوجوان خواہاں ہوتے ہیں، لیکن لڑکی کو بھی سوچ بچار کرنا ہوتی ہے۔ وہ قدرتی طرح وہ شوہر چننا چاہے گی، جو ہر طرح لائق ہو، دکھ سکھ میں اس کی پوری طرح خبر گیری کرے، اور بچوں کو پالنے کی جسے فکر ہو۔ لیکن شاید کوئی لڑکی پوری طرح سوچ بچار نہ کر سکے، اور شادی کے بعد پچھتائے، اس لئے محض اپنے خیال پر چلنے کی بجائے اپنے ماں باپ کے صلاح مشورے اور رضامندی سے شادی کرتی تھیں۔ مطلب یہ کہ بیٹیوں کی شادی بیاہ میں ماں باپ کا بھی ہاتھ ہوتا تھا۔(1)

میلوں اور محفلوں میں، یا دوسری جگہوں پر، جوان لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے سے ملتے تھے، اگر وہ ایک دوسرے کو پسند آ جاتے تھے، تو پہلے آپس میں بات پکی کرتے تھے، اور بعد میں کوئی دولہے کے دوستوں یا ماں باپ میں سے کوئی دلہن والوں کے گھر جا کر رشتے کی بات کرتا تھا۔ رگ وید کے منڈل دسویں، (سوکت ۸۵) میں درج ہے کہ سورج دیوتا کی بیٹی ''سوریا'' کی شادی سوم (چندرما) سے ہو رہی تھی، تو سوم کی طرف سے اشونی کمار دیوتاؤں نے بات چلائی تھی۔ اس بات سے علماء نے یہ قیاس آرائی کی ہے کہ دولہے والوں کی طرف کوئی جا کر دلہن والوں سے بات چلاتا تھا۔ بعد کی ساہت میں، خصوصاً سمرتیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دولہے والوں کی طرف سے دو سمجھدار جا کر دلہن دیکھ کر آتے تھے۔ دونوں طرف سے اگر رشتہ طے ہو جاتا تھا، یا دلہن والے محض اپنے دل میں ہی یہ فیصلہ کر لیتے تھے کہ اپنی بیٹی فلاں سے بیاہی جائے، تو اپنے دل میں اپنی لڑکی دے چکے۔ اسے کہتے تھے ''منسادت'' (Mansadata) یعنی دل میں دی ہوئی (Mentally given)۔ اس قسم کا ارادہ دل میں رکھنے کے بعد، بات پکی کرنے کے لئے بعض براہمنوں کے پاس دولہا اور دلہن والے جا کر اکٹھے ہوتے تھے، اس وقت دلہن کا باپ اپنے دل کی بات ظاہر کرنے کے لئے دولہے کے باپ سے کہتا تھا کہ ''اپنے بیٹے کے لئے میری

(1) 1- "There is another verse which also goes to prove that the parents had some control in the selection of a bridg groom for their daugher." Dr. A.C. Das: Reg. Vedic Culture, P. 252.
2- "The father probably controlled, in some measure at least, both son and daughter as regards marriage." Cambridge History of India, Vol. 1. p. 89.

کنواری بیٹی لو، جو دل میں دی گئی ہے: اب بھی دیکھ لو اور فیصلہ کر کے پرسن ہو۔" دولہے کا باپ پھر لڑکی دیکھ کر، تسلی کر کے، دلہن کے باپ سے کہتا تھا کہ "تمہاری کنواری بیٹی میں اپنے بیٹے کے لئے قبول کرتا ہوں، جو دل میں پہلے ہی دی جا چکی ہے: آپ میرا بیٹا دیکھیں اور فیصلہ کر کے پرسن ہو۔ دلہن کا باپ پھر لڑکا دیکھ کر تسلی کرتا تھا۔ اگر لڑکا اسے پسند آتا تھا تو اپنی بیٹی دینے کی بات اپنی زبان سے کھول کر کرتا تھا۔ اسے کہتے تھے "واگدان" (واکدان) یعنی وچن دان۔ دلہن کا باپ برہمنوں کے سامنے اپنی بیٹی دینے کا وچن (قول) کرتا تھا تو اسے کہتے تھے "واچادت" (Vachadatta) یعنی زبانی دی ہوئی (Verbally given)۔ مطلب یہ کہ پہلے دل میں بیٹی دی ہوئی تھی اب زبان سے قول کر کے دلہن والے اپنی بیٹی دے چکے۔ ان وقت حاضر براہمنوں میں پان تقسیم کیے جاتے تھے۔ آج کل مصری کھاتے ہیں۔ کنیادان (بیٹی دینے) کی تیسری منزل کہلاتی تھی "دھارادت" (StramDharadatta-given i.e. actually given) یعنی جس وقت پکی تاریخ طے ہو جاتی تھی تو بیٹی بیاہتے۔ یہ سب باتیں سمرتی کاروں نے درج کی ہیں۔ سمرتیاں، اگرچہ بہت بعد کی لکھی ہوئی ہیں، پھر بھی ان میں درج باتیں ویدک زمانے کی ہیں۔[1]

شادی کی بات پکی ہو جاتی تھی تو شادی کے لئے مہورت نکلواتے تھے۔ شادی کے دن دولہا قیمتی کپڑے اور جڑت جڑے ہوئے سونے زیور پہن کر (منڈل پانچواں، ۶، ۴) اور خوشبوئیں لگا کر، اپنے عزیزوں اور دوستوں سمیت بارات لے کر، دلہن کے گھر جاتا تھا۔ دلہن والے دولہے والوں کا اچھا خاصا استقبال کرتے تھے، انہیں قیمتی طعام کھلاتے تھے اور بعد میں شادی کی رسمیں ادا کرتے تھے۔

شادی کی رسم: قدیم زمانے میں شادی کی رسمیں یہی تھیں، جو آج کل ہیں۔ شادی کے وقت کو منتر براہمن پڑھتے تھے، وہ گریہہ سوتروں میں درج ہیں، جن میں سے کچھ لفظ بہ لفظ رگ وید سے لیے گئے ہیں؛ اس لئے یوں سمجھا جاتا ہے کہ آجکل کی ویڈی کا رواج رگ وید والے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ اس قدیم زمانے سے لے کر سندھ کے لوگ ہندستان کے دیگر مقامات کے ہندوؤں کی طرح شادی کی رسمیں پوری طرح ادا کرتے آ رہے ہیں۔ ایک اہم فرق یہ ہے کہ قدیم لوگوں کی مادری زبان سنسکرت ہوتی تھی، جس میں آج تک ویڈی پڑھی جاتی ہے۔ پہلے شادی کے وقت دولہا اور دلہن کچھ قول و قرار کرتے تھے۔ خود دلہن کا باپ اپنے داماد سے کچھ وعدے لیتا تھا، جیسا کہ "مذہب اور مال ملکیت کی حاصلات میں میری بیٹی کو نظر انداز نہیں کرنا، وغیرہ"۔ آج کل ہمارے لوگ اکثر سنسکرت جانتے ہی نہیں ہیں، اس لئے شادی کے وقت براہمن دولہے اور دلہن کی

(1) Brilaspati says: "The Sanriti of Manu Stands high as embodying the teachings of the Vedas." Quoted by R. Raghu Natha Rao The Aryan Marriage. P. 115

طرف سے سوال جواب خود کرتا جاتا ہے اور سمجھتا بھی فقط خود ہی ہے۔ دولہا اور دلہن خاموشی بیٹھے رہتے ہیں۔ باراتیوں میں سے کچھ اس وقت کھانے پینے میں مشغول ہوتے ہیں، اس لئے کئی جگہوں پر دیکھا گیا ہے کہ جس خاموشی میں یہ کام ہو جانا چاہئے، وہ خاموشی ہوتی نہیں، اور الٹا ہنسی مذاق ہوتا ہے۔ اس کے باوجود اتنا ضرور کہیں گے کہ رسومات وہی چلی آ رہی ہیں۔ یہ بات خود ''وھانَ'' اور ''پرنوَ'' لفظوں میں سے ظاہر ہے، جو الفاظ آج تک عام طرح استعمال ہو رہے ہیں۔

''وھانَ'' (شادی) لفظ اصل میں سنسکرت لفظ ''وواھ'' جس میں ''وِ'' معنیٰ وشیش ریت یا اچھی طرح اور ''وھ'' معنیٰ ملانا یا لے جانا۔ ''وھانَ'' (شادی) وہ ہے جس میں دولہا اپنی دلہن کو اچھے طریقے سے یعنی رسومات ادا کرتے ہوئے جاتا ہے۔ ان رسومات میں جو اہم بات ہے، وہ ''پرنوَ'' لفظ سے ظاہر ہے۔ ''پرنوَ'' (شادی) لفظ کے بنیادی معنی ہیں ''پھیرنا''۔ سنسکرت میں ''پَرَ'' معنی چاروں طرف، اور ''نیہ'' معنیٰ ''لے جانا''۔ شادی کے وقت دولہا اور دلہن ایک دوسرے کا پلو باندھ کر، پھر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر، یگیہ کی اگنی کے چاروں طرف سات چکر لگاتے تھے۔ جب تک دولہا اور دلہن چکر نہیں لگاتے، تب تک شادی جائز نہیں سمجھی جاتی۔ جب دولہا اور دلہن پلو باندھ کر، اور ''پانی گرہن'' کر کے یعنی ہاتھ پکڑ کر سات چکر لگائے، اسی وقت کہا جائیگا کہ شادی ہو چکی۔ اسی ''سپت پدھی'' یعنی سات پھیروں (چکروں) کی نہایت اہم رسم ہونے کے باعث ''پرنوَ'' کے معنی ہوئے ''وھانَ'' (شادی)۔

شادی کے وقت دولہا اور دلہن کے سر ایک دوسرے سے ملاتے ہیں۔ اسے ''لاؤں'' کہتے ہیں، جو در اصل ہے سنسکرت لفظ ''نمن'' یعنی جھکانا (سر جھکانا)۔ اسی سبب ''لاؤں لہن'' معنیٰ شادی کرنا۔ جب کہیں کے فلاں فلاں کی آپس میں ''لاؤں'' ہیں تب اس کے معنی ہوئے کہ ان کی آپس میں بہت محبت ہے (دولہے اور دہلن کی طرح)۔ اسی طرح لفظوں کے مادوں میں کئی قدیم احوال پنہاں ہیں، اس لئے زبانوں کا گہرا مطالعہ نہایت مفید ہے۔

شادی کی رسمیں ہر قوم علحدہ علحدہ طریقے سے ادا کرتی ہے: لیکن وادیٔ سندھ کے باشندوں کا نمونہ ہی نرالا تھا۔ وہ شادی کو ایک ''سنکار'' (Sacrament) شمار کرتے ہیں۔ ہندوؤں کے شاستروں کے مطابق ہر ایک سنکار کرنے کے وقت ''سرادھ'' کرنا چاہئے۔ شادی بے وقت ''سرادھ'' اور ''ترکن سدھیٔ'' (Trikarana Suddhi) یہ دو اہم باتیں ہوا کرتی تھیں۔ ''سرادھ'' ہے ''سردھا'' (سچی سردھا) اور ''ترکن سدھیٔ'' میں دل، منہ، اور ہاتھ تینوں پاک رکھنے ہیں۔ مطلب یہ کہ دل میں کوئی خراب خیال نہ آنے پائے، منہ سے کوئی نازیبا لفظ نہیں بولا جائے اور ہاتھ سے کوئی خراب کام نہیں کیا جائے۔ اس کے لئے اول ''سنکلپ'' لیتے تھے۔ ''سنکلپ'' در اصل

سنسکرت لفظ ''سنکلپ''، ہے اور اس کے اصل معنی ہیں ''دل کا ارادہ'' یا ''پکا فیصلہ''۔ سنکلپ لینے کے وقت ہاتھ میں چاول، پانی، پھول اور ڈکھنہ (تحفہ) لیتے تھے۔ اور یہ ڈکھنہ اپنی نسل کے پروہت کو دے کر، اپنا پکا عہد ظاہر کرتے تھے کہ ''ہم دل کی، قول کی اور اعمال کی پاکیزگی رکھیں گے''۔ اسی سنکلپ کی یاد دلانے کے لئے دولہا اور دلہن کے بازو میں آج تک کنگن (رکھڑی) باندھتے ہیں۔ رکھڑی باندھنے کا مطلب یہ ہے کہ دیوتائیں ان کی رکھیا (سنبھال) کریں کہ وہ دل، قول اور اعمال میں پاک رہ کر، اپنے وچن کی پالنا کریں۔ شادی کی رسمیں پوری ہونے کے بعد وہ رکھڑی چھوڑ دیتے ہیں، جس کا مطلب ہوا کہ جو سنکلپ کیا گیا تھا، وہ پورا ہوا۔ سنکلپ لینے کے وقت ہاتھ میں ''اکشت'' (چھلکوں سمیت چاول) لیتے تھے۔ ''اکشت'' کا تلفظ بعد میں تبدیل ہو کر ''اچھٹ'' ہوا، اس لئے اب ''اچھٹ'' لفظ ''سنکلپ'' (سنگلف) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

شادی کی رسومات سے شروع ہونے سے لے کر رسومات کے پورے ہونے تک دل، قول اور اعمال پاک رکھنے کی ضرورت اس لئے سمجھتے تھے، کہ شادی کے وقت تینوں لوگوں (بھُوہ Bhuh بھُوَہ Bhuvah اور سُوَہ Suvah) کے دیوتاؤں کو التجا کرتے تھے کہ ''اس نیک کام میں آ کر شامل ہوں، اور دولہا اور دلہن کو دعا دو کہ وہ بڑھیں اور سکھی زندگی گذاریں''۔ شادی میں تینوں لوگوں کے دیوتاؤں، اور ترلوکیناتھ (تینوں لوگوں کے خدا) کو حاضر ناظر سمجھتے تھے؛ اس لئے ان کی حضوری میں اپنے دل، قول اور اعمال کی پاکیزگی ضروری سمجھتے تھے۔ دل کو پوری طرح روکنے یا ضابطہ رکھنے کے لئے ''پرانایام'' (Regulated Respiration) بھی کرتے تھے۔ پرانایام کرنے کے باعث جلدی جلدی ان کی حلق خشک ہو جاتی تھی، اس لئے بار بار ''آچمان'' لیتے تھے یعنی پانی کا گھونٹ لیتے تھے تا کہ حلق گیلی ہو۔ شادی کے وقت ''نندی دیوتاؤں'' یعنی پتروں کو بھی پکارتے تھے کہ ''اس نیک کام میں آ کر شامل ہوں، اور اپنی اولاد کو دعا دیں، تا کہ بڑھتے جائیں اور آپ کا نام بھی قائم رکھتے آئیں''۔

جوتش کے مطابق سیاروں کا اثر ہوتا ہے، اس لئے سیاروں کی شانتی کے لئے ''نوگرہی'' یعنی نوگرہوں (سیاروں) (Planetary Spirits) کی پوجا بھی کرتے تھے۔ شادی اور دیگر نیک کاموں کے وقت آج تک گنپتی پوجا کی جاتی ہے۔ ''گنپتی'' معنیٰ ''گنن کا دیوتا'' گنن = خوبیاں، اسے ''گنیش'' یعنی خوبیوں کا حاکم بھی کہتے ہیں۔ کئی علماء کے خیال موجب ''گنپتی'' یا ''گنیش'' در اصل فصلوں کا دیوتا ہے، اور ''گن'' (Demigods)، کی فصلوں کی رکھوالی کرتے ہیں، ان کے اوپر یہ دیوتا ہے۔ ''گنیش'' کو ''گنبودر'' بھی کہتے ہیں، یعنی جس کا اُدر یا پیٹ لمبا ہو۔ بالفاظ دیگر سب کا پیٹ بھرنے والا یہی دیوتا ہے۔ گنیش مہراج کی سواری چُوہے پر ہے۔ چُوہا فصل کا دشمن ہوتا ہے،

لیکن یہ دیوتا چُوہے پر ہمیشہ سوار رہتا ہے، جس وجہ سے اس کے پوجاریوں کی فصل چُوہے ناس نہیں کر سکتے۔ ''گنیش'' کا دوسرا نام ہے ''وگھنیشور'' (Lord of Obstacles) یعنی جو سب مشکلاتیں دور کرے۔۔ جن کے پاس اناج کے گودام ہونگے، اور جن کو ہر کھانے پینے کی چیز پیٹ بھر کر ملے گی، ان کی ساری مشکلاتیں دور! شادی اور دیگر نیک کاموں پر گنپتی پوجا کا عام رواج جاری ہی اسی سبب سے ہوا ہے کہ رزق کی تنگی نہ ہو۔ اس طرح ہندو شادی میں نہ صرف مدعو لوگ آتے ہیں بلکہ دیوتاؤں اور پتروں کی بھی جماعت اکٹھی ہو جاتی ہے، اور وہ دولہے اور دلہن کو دعا دیتے ہیں کہ بڑھیں، رزق کی تنگی نہ دیکھیں اور آدرشی جیون کاٹیں!

ہندوؤں کی شادی کی ایک اور اہم بات ہے کہ جب رسومات ایک دفعہ شروع ہو جائیں تو سب کے سب مسلسل جاری رکھ کر پورے کیے جائیں، درمیان میں ناغہ نہیں ہونا چاہئے۔ کنگن (رکھڑی) باندھ کر، سنگلف لے کر، سات پھیرے (چکر) لگائے گئے، تو شادی ہو چکی، لیکن ان کے بعد بھی کچھ رسومات کرنے ہیں۔ وادیٔ سندھ کے باشندوں (قدیم آریوں) کا یہ دستور تھا کہ اگر سپت پدی (سات پھیروں) کے بعد دولہا اور دلہن میں سے اتفاقاً کوئی مر جاتا تھا، تو بقیہ رسومات لاش کے ساتھ بجا لاتے تھے۔(1) قدیم لوگ سمجھتے تھے کہ سات چکر لگانے کے بعد دولہا اور دلہن کی روحیں بھی آپس میں مل کر ہو جاتی ہیں، اس لئے سپت پدی کے بعد اگر کوئی ان میں سے مر جاتا تھا تو کہا جاتا تھا کہ جسم، جو ''انمیہ کوش'' یعنی اناج کا پردہ (food-Sheath) ہے، اس میں سے سانس چلی گئی، لیکن ''پران می کوش'' اور دیگر کوشوں میں دولہا اور دلہن کی روحیں پھر بھی ایک ساتھ رہتی ہیں: اس لئے مرنے کے بعد بھی دولہا اور دلہن کا ناتہ ایک دوسرے سے نہیں ٹوٹ سکتا۔ اسی سبب اور کچھ دیگر اسباب کے باعث بعض یورپی علماء کا کہنا ہے کہ ہندوؤں کی شادی کے آدرش جیسا کوئی اور آدرش ہے ہی نہیں!(2)

شادی کی رسومات ختم ہونے کے بعد، جب لڑکی والے دیکھتے تھے کہ اب ہماری بیٹی ہمارا گھر چھوڑ کر سسرال کے گھر جا رہی ہے تو اس جدائی کے باعث ان کے دل بھر آتے تھے۔ اس وقت دولہا انہیں تسلی دیتا تھا، اور کہتا تھا کہ ''رونے کی بجائے خوش ہوں، کیونکہ شادی ہونے کے باعث ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ سالہا سال محبت سے گذارنا ہے۔ آپ نے ہماری شادی اس لئے کروائی ہے کہ ہم ایک دوسرے کے دل سے جڑے رہیں!'' لڑکی کے گھر والوں کی اس طرح کی محبت اب بھی کہیں نہیں گئی۔ شادی ہو چکنے کے بعد جب لڑکی

---

(1) "After the Saptapadi (the seven steps), even if either of the two die, the remaining ceremonies must be gone through with the corpse as one of the parties." R.Raghu Natha Rao: The Aryan Marriage, PP. 17-18.

(2) "There is no ideal of Marriage like the Indian ideal." Mrs. A. Besant.

اپنے سسرال کے گھر جاتی ہے تو اس وقت لڑکی والوں کا دل آج بھی بھر آتا ہے۔ تھر کے سوڈھے راجپوت، کرار، کچ بھج کے لہانے اور دیگر تو اس سلسلے میں حد کر دیتے ہیں۔ لڑکی کو رخصت کرنے کے وقت گھر کے باہر کے دروازے پر کھڑے ہوکر اتنا روتے ہیں، کہ اگر کسی کو پتہ نہ ہو تو وہ یوں سمجھے گا کہ ان کے ہاں شاید کوئی موت ہوگئی ہے اس لئے اتنا ماتم کر رہے ہیں۔

شادی کی سپت پدی (سات پھیروں) کے بعد دلہن کا پیر چکی کے ایک پڑ پر یا کسی بڑے پتھر پر رکھواتے تھے۔ یہ پتھر ''استھرتا'' یا ''واٹل پدوی'' کی علامت ہوتا تھا کہ لڑکی کے پیر اپنے سسرال میں یوں جم جائیں، جس طرح اس پتھر پر کُھپ جاتے ہیں۔ پھر لڑکی قطب تارے کی طرف دیکھ کر کہتی تھی کہ ''اے دھرو تارا، تو جس طرح ایک جگہ پر جم کے کھڑا ہے، اسی طرح میں بھی کاش اپنے سسرال میں مستحکم اور اٹل پدوی حاصل کروں!'' اس وقت دولہن اور دولہے کے پیر ناپتے ہیں، اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ دولہا اپنی دلہن سے اچھی چال چلن رکھے اور دونوں کی آپس میں محبت قائم رہے اور ایک دوسرے کی آتمک انتی (روحانی ترقی) کی بھی فکر کرتے رہیں۔ اپنی کنیادان کرنے کے وقت دلہن کا باپ اس طرح کا وعدہ دولہے سے لیتا تھا، اور اسے تاکید کرتا تھا کہ ''مذہب، ارتھ اور کام کی پراپتی میں میری بیٹی کو نظر انداز نہیں کرنا''۔ اس پر دولہا نہایت ہی سنجیدگی سے اس سے وعدہ کرتا تھا کہ ''ناتی چرامی'' یعنی ''میں اُسے کبھی بھی نظر انداز نہیں کروں گا''۔ یہ وعدہ وہ تین دفعہ کرتا تھا، وہ اس لئے کہ تینوں لوگوں کے دیوتا سنیں کہ ''اُنہیں حاضر ناظر جان کر میں ہر ایک لوک کے دیوتا کے سامنے ایسا وعدہ کرتا ہوں''۔ اس طرح کے کیے ہوئے وعدے کی آج بھی پیروی ہوتی ہے۔ آج بھی دولہا اور دلہن زندگی میں تو ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی ہوتے ہیں، لیکن ان میں سے اگر کوئی ایک مر جائے تو جو زندہ ہوگا وہ مرے ہوئے کو ختمہ دلاتا ہے۔ مطلب یہ کہ مرنے کے بعد بھی بیوی اور شوہر کو ایک دوسرے کی فکر ہوتی ہے کہ دونوں کی یہ دنیا سکھی اور وہ دنیا آسان ہو۔

سسرال کے گھر پرویش: دلہن اپنے دولہے سے لاؤں (شادی کی ایک رسم) کے ادا ہونے کے بعد، گھر والوں سے رخصت ہوکر سسرال کے گھر گھوڑے گاڑی میں بیٹھ کر جاتی تھی، جس کے اوپر چھتری ہوا کرتی تھی۔ آج تک کئی جگہوں پر دولہا اور دلہن چھکڑے یا بیل گاڑی میں چڑھ کر جاتے ہیں۔ بہت دیر سے یہ دستور جاری ہوا کہ دولہا گھوڑی پر چڑھ کر جاتا تھا اور دلہن ڈولی میں بیٹھتی تھی، جسے مزدور اُٹھا چلتے تھے۔ اس وقت دولہا اور دلہن اکثر موٹر کار میں چڑھ کر جاتے ہیں''۔ لیکن ویدک زمانے میں چھتری والے چھکڑے ہوتے تھے، جنہیں گھوڑے یا بیل

کھینچتے تھے۔ دلہن کو میکوں سے جو منکے، کپڑے وغیرہ ملتے تھے، وہ اپنے ساتھ گاڑی میں رکھتی تھی۔ اس وقت دولہا اسے کہتا تھا کہ ''اے دلہن'' میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھ! اپنا جہیز بھی گاڑی میں رکھ۔ ہمارے گھر میں تو ہمارے سر کا موڑ بننا! کاش سسر تیری بڑی قدر کرے! کاش ساس کو تو اچھی لگے! کاش بیٹیاں اور نندیں تم سے محبت کریں''، وغیرہ۔

رگ وید میں یوں بھی درج ہے کہ دولہا اپنی دلہن سے کہتا تھا کہ ''اے دلہن، اپنے پتی کے گھر میں خوش قسمتی والا قدم رکھ تو ہمارے گھر کے افراد اور مال مویشی پر خدا کی رحمت ہو۔ کبھی بھی آنکھ میں شور نہیں ڈالنا، نرم دل رکھنا، سورما اور دھرماتما بیٹے جننا، جو بھگوان کی بھگتی کریں۔ اے دلہن، تو ساس سسر اور اپنے دیور اور نندوں کے اوپر رانی بن کر راج کر۔ کاش ورن دیوتا اور دوسرے دیوتا ہمارے دلوں کو آپس میں جوڑ دیں''، وغیرہ (رگ وید، منڈل دسواں، ۸۵، ۴۳۔۔۴۷)۔ لگتا ہے کہ یہ آخر والے الفاظ وہ جوان کہتا تھا جس کے ماں باپ عمر رسیدہ ہوتے تھے، اور گھر چلانے کا بوجھ اس کے اپنے سر ہوتا تھا، جس وجہ سے دلہن بھی گھر کی بڑی ہوتی تھی، اور سارے گھر کے افراد کے اوپر گویا رانی بن کر راج کرتی تھی۔ بہرحال اس تھوڑے سے ہی مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیویوں کا مان مرتبہ کوئی کم نہیں ہوتا تھا۔ سسرال کے گھر پاؤں رکھنے سے دلہن گھر کی رانی شمار ہونے لگتی تھی، اور اسے سر کا موڑ سمجھتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ لڑکی بلوغت کو پہنچی ہوئی ہوتی تھی، اس لئے سسرال کے گھر پہنچنے سے ہی گھر کی باگ ڈور اُسکے ہاتھ میں دے دی جاتی تھی۔

پردھان آہوتی یا بڑا ہوم: دلہن سسرال کے گھر جاتی تھی تو دولہے سے دامن باندھ کر ہون ہوم کرتی تھی۔ ان سے بڑا یا اہم ہوم ''پردھان آہوتی'' کہلاتا تھا۔ ہر دولہا یوں سمجھتا تھا کہ ''بیوی ہے دیوتاؤں کی دی ہوئی نعمت''، اس لئے ان دیوتاؤں کی تعریف کرتا تھا، جن سے اسے یہ نعمت ملتی تھی۔ پردھان آہوتی یا اہم ہوم کرنے کے وقت دولہا اپنی دلہن سے کہتا تھا کہ ''پہلے سوم دیوتا نے تمہیں پایا، پھر گندھروں اور ان کے بعد اگن دیوتا نے تمہیں پایا، اور اب میں انسان ذات سے پیدا شدہ تمہارا شوہر بنا ہوں، تاکہ تجھ سے اولاد پیدا کروں''۔ ہر ایک دولہا فقط سوم دیوتا، گندھروں اور اگن دیوتا کی اس طرح تعریف کیوں کرتا تھا، اور یہ مذکورہ بالا الفاظ کیون کہتا تھا، اور ان کے کیا معنی ہیں، یہ باتیں ہر شخص اپنے آپ سمجھ نہیں سکے گا، اس لئے شارح حضرات نے جو کچھ لکھا ہے، وہ اختصار کے ساتھ یہاں درج کیا جاتا ہے، تاکہ یہ اہم بات سمجھنے میں آسانی ہو۔

سوم ایک نشیدار جڑی بوٹی کا نام ہے، جس کا رس پینے سے قدیم آریوں کے جسم میں تازگی آ جاتی تھی۔ سوم رس میں یہ خوبی رکھنے والا بھی ''سوم'' دیوتا ہی کہلاتا تھا۔ اُسے پوجتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ساری نباتات (Vegetable Kingdom) کے اوپر وہ ہی دیوتا ہے۔ جس طرح سلہ بڑھ کر درخت ہو جاتا ہے، اسی طرح سوم دیوتا کی پوجا سے انسان کا جسم بھی بڑھتا ہے اور بدن پر بال نکل آتے ہیں، جس طرح سورج کی تپش پر درخت وغیرہ ابھرتے رہتے ہیں، اسی طرح سوم دیوتا کی رحمت سے کنواری لڑکی کے جسم پر بال نکل آتے ہیں، گویا کہ سوم دیوتا نے اسے پایا تھا۔[1]

کنیا (لڑکی) کے جسم کو مزید خوبصورتی، گندھروں (Good Goblins) کی مہربانی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اس کی چھاتی ابھرنے لگی ہے، اور اس میں جوانی کے آثار نظر آنے لگتے ہیں۔ اس طرح گندھرو گویا کہ اس لڑکی کو پا لینے کے بعد اسے جوان کرتے ہیں، اور بعد میں اُسے اگن دیوتا کے حوالے کرتے ہیں۔

''اگن'' لفظ کے معنی ہیں آگ، اور اسی عنصر کا دیوتا بھی ''اگن'' (اگنی) کہلاتا ہے۔ یہ دیوتا کنواری کنیا (لڑکی) میں آگ پیدا کرتا ہے، جس وجہ سے ہر ماہ اسے ماہواری آتی ہے۔ جس لڑکی کو ابھی ماہواری نہیں آتی، وہ ''گوری'' کہلاتی ہے، لیکن جس وقت اُسے ماہواری آنا شروع ہو جاتی ہے، اس وقت وہ ''روہنی'' کہلاتی ہے۔ اس طرح گویا کہ اگن دیوتا گوری کو پا کر اسے روہنی بنا دیتا ہے۔ وہ بھرپوری پوری عورت بن جاتی ہے، اور شادی کر کے بچے جننے کے لائق ہو جاتی ہے۔[2] اسی سبب بیوی ہے ان دیوتاؤں کی دی ہوئی نعمت۔

اب اچھی طرح سمجھ میں آئیگا کہ جن دیوتاؤں کے کرم سے کنواری کنیا (لڑکی) ابھر کر جوانی میں پہنچ کر بچے جننے کے لائق ہو جاتی ہے، ان دیوتاؤں کی شکر گذاری کرنا دولہا اپنا فرض سمجھتا تھا، اور یہ بڑا ہوم اسی لئے کرتا تھا۔ ویدوں میں یہ درج نہیں ہے کہ کس عمر کی لڑکی بیاہی جائے، لیکن اتنا واضح طور پر درج ہے کہ جب اگن دیوتا اسے پا لیتا ہے، یعنی جب اُسے ماہواری آتی ہے، اس کے بعد وہ شادی کے لائق ہو جاتی ہے۔ مطلب یہ کہ بچپن میں شادی کرانا گڑیا اور

(1) آج کل جو لڑکیوں کے اسکول ہیں، ان میں کچھ لڑکیاں سات آٹھ برس کی ہوتی ہیں تو کچھ بالغ بھی ہوتی ہیں، جس لئے اب عام طور پر کہتے ہیں ''کنیا'' معنی لڑکی، بھلے اس کی عمر کتنی ہی ہو۔ درحقیقت ''کنیا'' لفظ کے معنی ہیں ''چھوٹی لڑکی'' (تقریباً دس برس کی)، جس کے سر کے بالوں کے علاوہ باقی جسم پر بال نہیں ہوتے۔ مصنف۔

(2) "When hair has appeared (on the pubes) Soma enjoys (protects) a maiden; the Gandharva enjoys (protects) her when the breasts are developed, and Agn when she had the menstrual discharge". Sjt. Sastri: Marriage after Puberty, p. 6.

گڈے کو بیاہنے کے مترادف ہے۔ اس لئے بچپن میں شادی کی رسم، جو بعد میں کافی زور پکڑ گئی، وہ ویدوں کے خلاف سمجھنی چاہئے۔ پردھان ہوم کے جو منتر ہیں، ان میں سے بھی یوں ہی ظاہر ہے کہ لڑکی تب شادی کرتی تھی جب بالغ ہو جاتی تھی۔ (1)

تین راتیں برہمچریہ: شادی کی رسومات ادا کرنے کے بعد دولہا کچھ وقت کے لئے اپنی بیوی کے قریب نہیں جاتا تھا۔ جلدی میں جلدی بھی چوتھی رات دولہا اور دلہن ہمبستر ہوتے تھے۔ (2) دولہا اور دلہن دونوں بالغ، تو پھر کیوں پہلی تین راتیں دور رہتے تھے، یہ بات ویدوں میں درج نہیں ہے؛ لیکن گریھ سوتروں میں وضاحت سے بیان کی گئی ہے۔ اس بات کا چند الفاظ میں یہ مطلب ہے کہ شادی کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ اپنی نفسانی خواہشات پوری کی جائیں؛ لیکن یہ ہے کہ اولاد پیدا کی جائے، جو گھر والوں بلکہ پوری نسل کا سہارا بنے۔ اولاد تین قسم کی ہوتی ہے: ایک ''نامسک''، یعنی تمی گنوں والی، جو بلکل کالی بھیڑ بن کر ابھرتی ہے، اور اپنا خواہ اپنی پوری کل کا نام بدنام کرتی ہے۔ دوسری ''راجسک''، یعنی رجی گنوں والی، جو محنتی، سمجھو اور عقلمند ہوتی ہے، لیکن مذہبی رجحان اس میں کم ہوتا ہے، تیسری ''ساتوک'' یعنی ستی گنوں والی، جو بڑی دھرماتما ہوتی ہے، اور اپنی سات نسلوں کا نام روشن کر لیتا ہے۔ ایسا اُتم بیٹا تب پیدا ہوگا، جب شروع ہی میں ماں باپ اپنی نفسانی خواہشات پر پوری طرح ضابطہ رکھیں گے۔ وادئ سندھ کے باشندے اسی سبب شادی کے وقت یہ سنکلپ کرتے تھے کہ ہم ساتوک پد کے یعنی سات گنوں والی پیدا کریں گے۔ اسی دل کی مراد پانے کے لئے دولہا اور دلہن پہلی رات سے لے کر کوئی بھی نمکین چیز نہیں کھاتے تھے، اور زمین پر سوتے تھے۔ اگر ایک ہی گلم یا زمین پر سوتے تھے، تو بھی درمیان میں کچھ فاصلہ چھوڑ دیتے تھے، اور یوں سمجھتے تھے کہ ہمارے بیچ میں ''وشواوسو گندھرو'' (Visvavasu Gandharva) بیٹھا ہے، اس لئے ایک دوسرے کو نہ لپٹیں، اسی طرح تین راتیں نفس پر ضابطہ رکھتے تھے، اور اسے ''تر راتر برہمچریہ'' (Triratra Brahmacharya) یعنی تین راتوں والا برہمچریہ کہتے تھے۔ چوتھی رات دولہا ہون ہوم کر کے، گندھرو دیوتا سے کہتا تھا کہ ''اے وشواوسو، ہم تمہیں منت کرتے ہیں کہ اب ہمارے درمیان میں سے اٹھ جا۔ اب جا کر کوئی ایسی ابھرتی ہوئی کنیا (لڑکی) تلاش کر جسے تمہاری مدد کی ضرورت ہو، یعنی جو ابھی مکمل جوانی میں

(1) "Pre-pubescent marriage is a mock-marriage and is unquestionalby unvedic." R. Raghu Natha Rao: The Aryan Marriage , P. 53.

(2) "From a study of the Vedic marital rituals it appears that the marriage had to be consummated at the earliest on the fourth night after the ceremony, and this would not have been possible if the bride was not a yourthful lady." Dr. A.C. Das: Reg Vedic Culture, P. 251.

نہ آئی ہو، اُس کی مکمل جوانی میں آنے کی مدد کر۔ یہ دلہن جواب میری بیوی ہے، اسے میرے پاس چھوڑ کے جا تا کہ ہمارا آپس میں ملاپ ہو"۔ اسی طرح تین راتیں اپنے نفس پر کنٹرول کر کے چوتھی رات ساتوک سنتان پیدا کرنے کے ارادے سے ہمبستر ہوتے تھے۔ پہلے کچھ جوان ایک مہینہ، چھے مہینے، بلکہ بارہ مہینے بھی تعین کرتے تھے اور یہ سارا عرصہ نفس پر ضابطہ رکھے ہوئے ہوتے رہتے تھے۔

بوُدھایوں کے گریھ سوتروں (پرشن پہلا، ادھیاء ساتواں، کانڈ گیارھواں) میں درج ہے کہ پہلی تین راتیں برہمچر یہ پالن کیا جائے گا تو "تروتریہ" (Srotriya) پیدا ہوگا، یعنی وہ براہمن پیدا ہوگا، جو ویدوں کی ایک شاکھا کا مطالعہ کرنے والا ہوگا۔ بارہ دن برہمچر یہ کیا جائے گا تو "اَنُوچن" (Anuchana) پیدا ہوگا، یعنی وہ برہمن پیدا ہوگا جو ویدانگن کا جاننے والا ہوگا۔ ایک مہینہ برہمچر یہ پالن کیا جائیگا تو "رشی کلپ" (Rishikalpa) پیدا ہوگا، یعنی وہ براہمن پیدا ہوگا جو سوُتروں اور پَروچنوں (Pravachanas) کا ماہر ہوگا۔ چھ مہینا برہمچر یہ پالن کیا جائیگا تو رشی پیدا ہوگا، جو چاروں ویدوں کا جاننے والا ہوگا۔ اگر دولہا اور دلہن شادی سے لے کر بارہ مہینوں تک مسلسل نفس پر ضابطہ رکھیں گے تو پھر انہیں جو اولاد ہوگی وہ نجنسی دیوتا ہوگا۔ مطلب یہ کہ وادئ سندھ کے قدیم آریہ لوگ شادی ہونے کے بعد کم از کم تین راتیں برہمچر یہ پالن کرتے تھے، اور سمجھتے تھے کہ اگر پہلی رات بے بس ہو کر اپنی بیوی سے ہمبستر ہو لیا جائے گا تو شہوت کے اثر کے باعث تامسک بچہ پیدا ہوگا، جو اتنا زیادہ نام نہیں کمائے گا، اور کالی بھیڑ بن کر ابھرے گا۔

بچہ رحم میں ٹھہرے اور ستوگنی پیدا ہو، اس کے لئے "شیشن ہوم" کرتے تھے۔ اگر چوتھی رات دولہا یا دلہن میں سے کوئی بیمار پڑ جاتا تھا اور وہ ہمبستر نہیں ہو سکتے تھے، پھر بھی جو ضروری منتر ہوتے تھے وہ ضرور پڑھتے تھے، کیونکہ اس امر میں دیر کرنا اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ اسی طرح اپنے مذہب پر پوری طرح چل کر، دولہا اور دلہن گرہست آشرم والی زندگی گذارتے تھے۔ ان تمام باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم لوگوں کو اپنے نفس پر بڑی حد تک ضابطہ تھا۔

بیویوں کا مرتبہ: نئی دلہن کو سسرال کے گھر قدم رکھتے ہی بڑی عزت ملتی تھی، اور ہر بات میں مردوں کی طرح آزاد ہوتی تھی تب بھی خود خیالی سے کام نہیں لیتی تھی۔ وہ ہمیشہ اپنے شوہر کے سامنے سر جھکاتی تھی (رگ وید، منڈل پانچواں، ۸۰، ۶)، اور اس کے کہنے میں ہوتی تھی۔ جو بھی کام

اس کا شوہر اسے کہتا تھا، وہ کرتی تھی (رگ وید، منڈل پہلا، ۱۲۲، ۲۵)۔[1] اس سبب بیوی کا مرتبہ کم نہیں ہو جاتا تھا۔ بیوی آج تک آدھا جسم کہلاتی ہے۔ یگین اور پوجاؤں کے وقت میاں بیوی ایک دوسرے سے پلّو باندھ کر بیٹھتے تھے، اور سمجھتے تھے کہ دونوں کی گت بھی ایک ہی وقت ہوتی ہے۔ دونوں میاں بیوی ایشور سے جب مل کر دعا مانگتے تھے، اس وقت دونوں کی روحیں بھی گویا کہ مل کر ایک ہو جاتی تھیں! میاں بیوی کے اس طرح کے بندھن سے دونوں کی زندگی سکھی گذرتی تھی۔ رگ وید میں بیوی کو گھر کا زیور یا سینگار کہا گیا ہے (منڈل پہلا، ٦٦، ۳)۔ منوسمرتی میں لکھا ہوا ہے کہ ”جن کلوں میں بیویاں سکھی رہتی ہیں، ان پر دیوتا پرسن ہوتے ہیں، اور جن نسلوں میں بیویوں کی عزت نہیں ہے، ان میں سارے پنچ نرپھل ہوتے ہیں“ (ادھیاء تیسرا، شلوک ۵٦)۔[2]

منوسمرتی ہوسکتا ہے عیسوی سن سے کچھ صدیاں پہلے یا بعد میں لکھی گئی ہو، لیکن اس میں جو باتیں درج ہیں، وہ ویدک زمانے کی ہیں، جو بعد میں قلمبند کی گئی تھیں۔ رگ وید والے زمانے میں کچھ بازاری عورتیں بھی ہوا کرتی تھیں، پھر بھی عام طرح عورتوں کے اخلاق کا معیار اعلیٰ درجے کا ہوتا تھا، جس وجہ سے نہ صرف گھر کے افراد، بلکہ اور بھی عورتوں کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ان قدیم لوگوں کی گھریلو زندگی کا اب ذکر کیا جاتا ہے، جس سے اور بھی ان تمام باتوں کی وضاحت ہو جائے گی۔

گھریلو زندگی: رگ وید میں لوگوں کی گھریلو زندگی کی نہایت ہی اچھی طرح سے تصویرکشی کی گئی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ ”آبرودار، سچار، کام کی چست، نیک گھر مالکنیں، جنہیں صبح کے سہانے وقت کی قدر ہوتی تھی، وہ صبح الصادق کے وقت اُٹھتی تھیں (منڈل پہلا، ۷۹، ۱)۔ وہ سمجھتی تھیں کہ سورج طلوع ہونے کے بعد جو لوگ سوئے ہوئے ہوتے ہیں ان کی نصیب ضائع ہو جاتی ہے“ (اتھرو وید، منڈل ساتواں، ۱۳، ۲)۔ پرانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم آریہ لوگ جب میرو پربت کی طرف برفانی میدانوں میں رہتے تھے، تب بھی صبح الصادق کے وقت اٹھ کر، مسواک کرتے تھے، اور سردی اور ہوا کی کوئی پرواہ نہیں کرتے تھے، روزانہ نہاتے بھی اسی وقت تھے۔ صبح کو مرغ کی بانگ سن کر بعض لوگ دریاء پر نہانے جاتے تھے۔ اس قدیم زمانے سے لے کر ہندوؤں کا یہ طریقہ آج تک جاری ہے۔

(1) "The Reg Veda reveals a stage showing that Aryan women, at any rate of the higher and better classes, enjoyed equal freedom in all matters, social and religious. It was this feeling of equality and freedom that evoked the highest virtue of Aryan womanhood and lifted society to a high state of culture." Dr. A.C.Das: Reg. Vedic Culture, p. 106.

(2) "The standard of female morality appears to have been fairly high." Cambridge History of India, Vol. I. D. 88-97

سندھی میں مسواک کو ''پربھاتی'' بھی کہتے ہیں۔ یہ لفظ خود اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ مسواک پربھات (صبح الصادق) کے وقت کرنا ہے، نہ سورج طلوع ہونے کے بعد۔ مصنف نے خود دیکھا سنا ہے کہ پچھلے لوگ کہتے تھے کہ ''سورج طلوع ہونے کے بعد جس نے مسواک کیا، اس نے گویا کہ کتے کی دم سے دانت صاف کیے''۔ آج کل بعض لوگ سورج طلوع ہونے کے بعد، بعض دوپہر کو نہا کر بعد میں کھانا کھاتے ہیں، لیکن عام طور پر صبح سویرے نہانے کی عادت ہندوؤں میں اتنی ہے کہ آج تک ہندی میں ایک کہاوت ہے کہ:

''پراتھ کال جو کرے اسنانا،
دوکھ روگ تانکو نہیں آنا۔''

یعنی صبح الصادق کے وقت جو نہاتا ہے، اُسے دکھ اور بیماری نہیں ہوتی۔ مطلب یہ کہ صبح سویرے نہانا تندرستی کے لئے مفید ہے۔ آج تک کئی ہندو نہانے سے پہلے کھانا کھانا واجب نہیں سمجھتے۔ کبیر بھگت نے بھی کہا ہے کہ: ''دھرگ بھوجن اشنان بنا''، یعنی نہائے بغیر کھانا پینا قابل نفرت ہے۔

ویدک زمانے میں پوجا کے لئے سویرے نہانے کی اور بھی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ گھر مالکن پو پھوٹنے کے وقت اُٹھ کر، نہا کر، پہلے یگیہ کی اگنی جلاتی تھی، اور شوہر کے ساتھ اگن دیوتا کی پوجا کرتی تھی (منڈل پہلا، ۱۷۳،۲ اور منڈل تیسرا، نیز ملاحظہ ہو منڈل پانچواں اور آٹھواں)۔ صبح الصادق کے وقت اگنی دیوتا کو سوم رس کا چڑھاوا کر کے، اگنی کو چکر لگا کر، ہاتھ جوڑ کر سر جھکاتے تھے (اتھرو وید، منڈل چھٹا، ۴۷، ۴۳ اور منڈل ساتواں، ۵۰، ۳)۔ اس وقت وہ رس خود بھی پیتے تھے اور گھر کے تمام افراد کو بھی پلاتے تھے۔ وہ اس رس کو ''امرت'' (Ambrosia) کے طور پر سمجھتے تھے۔ یہ پہلا اور اہم کام سورج طلوع ہونے سے بہت پہلے اٹھ کر کیا جاتا تھا، اس لئے صبح الصادق کو آج تک ''امرت وقت'' کہا جاتا ہے، یعنی وہ وقت جس وقت امرت تقسیم کیا جاتا ہے۔ امرت وقت کو ''سدھوں کا وقت'' بھی کہا جاتا ہے، کیونکہ سدھ پرش میں بھی امرت اسی وقت تقسیم کیا جاتا تھا۔ اس وقت جبکہ سوم رس پینے کا رواج نہیں ہے، تو بھی ہندو صبح کو سویرے اٹھ کر، نہا شہا کر، پوتھی پنہ نکال کر، بیٹھ کر پڑھتے ہیں، اور بھگوان کی بھگتی کرتے ہیں۔ گرو نانک نے بھی کہا ہے کہ ''امرت ویلا سچ نانء وڈیائیاں ویچار''۔ آج تک امرت وقت، گرو کے سِکھ آسا کی وار کرتے ہیں، اور اسی وقت ہر ایک مندر میں کئی لوگ جا کر اکٹھے ہوتے ہیں۔ دیندار مسلمانوں کا بھی یہی دستور ہے کہ صبح الصادق کے وقت اُٹھ کر خدا کی بندگی کرتے ہیں، اور صبح کی نماز پڑھتے ہیں۔

رگ وید میں درج ہے کہ گھر مالکن نہ صرف صبح الصادق کے وقت اٹھتی تھیں؛ لیکن گھر میں ''جو بستر میں لپٹے سوئے ہوئے ہوتے تھے'' انہیں اس وقت یوں نیند سے اٹھاتی تھیں، جس طرح ''نیند میں سوئے ہوئے کو مکھیاں اٹھاتی ہیں'' (منڈل پہلا، ۱۲۴، ۲)۔ اس وقت نوکروں اور نوکرانیوں کو اٹھا کر کام میں لگا دیتی تھیں۔ مطلب یہ کہ گھر کا کام کاج بھی اُسی وقت شروع ہوتی تھی۔ زیادہ تر ہر کسی کے پاس مال مویشی ہوتا تھا، اس لئے پہلا گھر کا کام تھا اس مویشی کی سنبھال اور دودھ دوہنا۔ سنسکرت ''دھتر'' (بیٹی)، پارسی ''دختر''، اور انگریزی ''ڈاٹر'' (Daughter) کا مادہ ہے ''دھ'' (Duh) معنیٰ ''دوہنا''۔ قدیم سب آریوں کے گھروں میں گائیں، بھینسیں اور بکریاں وغیرہ کے دوہنے کا کام بیٹیوں پر رکھا ہوا ہوتا تھا، جس طرح اوپر پہلے ہی کہا جا چکا ہے۔ نوکر اور نوکرانیاں بھی دودھ نکالنے کا کام کرتی تھیں۔ اتھرو وید کے منڈل ساتویں، (۷۳، ۶) میں ''گودھک'' (Godhuk) لفظ بھی استعمال ہوا ہے، جس کے معنیٰ ہیں ''گائیں دوہنے والا''۔ اس سے سمجھا جاتا ہے کہ کچھ لوگوں کا پیشہ ہی گائیں دوہنا تھا۔ منڈل نواں (۱۰، ۴) میں کہا گیا ہے کہ وہ ''گودھک'' گائیں دوہنے کے کام میں بڑے ماہر تھے۔ دودھ پاریوں میں جب آتا تھا تو گھر مالکن اسے آگ پر گرم کرتی تھی، اور پھر اس میں سے جتنا اُسے جمانا ہوتا تھا اتنا جماتی تھی۔ ''مندھانیاں گھر کے کھمبوں سے اس طرح بندھی ہوئی ہوتی تھیں، جس طرح گھوڑا آگے سے اور پیچھے سے بندھا ہوا ہوتا ہے'' (رگ وید، منڈل پہلا ۲۸، ۴)۔ گھر مالکن سب کو روزمرہ کے کام میں صبح الصادق کے وقت لگاتی تھیں (رگ وید ۱۰۸، ۴۸، ۶)؛ بعض لکڑی کی اکھلی مہلی کے ذریعے چاول بھوسے سے الگ کرتی تھیں (اتھرو وید، منڈل ۱۲، ۳، ۱۳)، تو بعض مندھانی سے لسی بنا کر مکھن نکالتی تھیں''۔ دیہاتوں میں آج تک دستور ہے کہ گھر گھر میں صبح سویرے لسی بنائی جاتی ہے، اور اناج پیسا جاتا ہے۔

''ویرون ولوڙن جون ساريان گھٹو صبوح''
(شاھ)
[فجر کو دودھ بلونا بہت یاد آتا ہے]

جن کے پاس نوکر اور نوکرانیاں ہوتے تھے، ان سے گھر مالکن اچھی طرح سے کام لیتی تھیں؛ لیکن ان کے ساتھ نرمی سے پیش آتی تھیں (منڈل دسواں، ۸۵، ۴۳)۔ کبھی کبھار گائیں اور دوسرے مویشیوں کی خود نظرداری کرتی تھیں، اور نوکروں کے اوپر بھی نظرداری کرتی تھیں، کہ کام صحیح کر رہے ہیں یا نہیں (منڈل دسواں، ۸۵، ۴۴)۔ کچھ گھروں میں نوکر شوکر نہیں ہوتے تھے۔ رگ وید میں درج ہے کہ کچھ گھر مالکن خود کھانا پکاتی تھیں، اور برتن بھی خود دھوتی تھیں۔ ان کی

بیٹیاں کنوؤں سے پانی بھر کر لاتی تھیں (رگ وید، منڈل پہلا، ۱۹۱، ۱۴)۔ ان کے سروں پر گھڑے نہایت ہی اچھی طرح رکھے ہوئے ہوتے تھے۔ (اتھر وید، منڈل دسواں، ۸، ۱۴)۔ گھر کے دوسرے کام کاج میں ان کی بیٹیاں ہاتھ بٹاتی تھیں۔ ماں جب باورچی خانہ میں ہوتی تھی تو اس وقت اس کی بیٹیاں اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کا خیال رکھتی تھیں۔ دوپہر کا کھانا کھانے اور گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر گھر مالکن کنگی شنگی کرتی تھی۔ خود بھی کپڑے تبدیل کرتی تھی اور بچوں کو بھی نہا شہا کر تازہ کپڑے پہناتی تھی (منڈل پہلا ۱۲۳، ۱۱، ۱۲۴، ۷، اور منڈل چوتھا اور دسواں)۔ وہ کپڑے شپڑے پہن کر خود کو اچھی طرح سے ملبوس کرتی تھی اور زینت بھری دیکھنے میں آتی تھی (منڈل چوتھا، ۵۸، ۸)، جس وجہ سے اپنے میاں کو اچھی لگتی تھی۔ شوہر کا ہر قسم کا کام کرتی تھی، اور اس کے لئے بستر لگاتی تھی (منڈل چوتھا، ۳، ۲)۔ بچوں کو بہت پیار کرتی تھی اور بچوں میں اس کی جان ہوتی تھی (منڈل ساتواں، ۸۱، ۴)۔

چھوٹے چھوٹے بچے گھر میں کھیل کھیلا کرتے تھے، اور وہ گھر کا سینگار ہوتے تھے (منڈل ساتواں، ۵۶، ۱۶)۔ چھوٹے بچوں کو اگر کوئی چیز چاہئے ہوتی تھی تو اپنے باپ کی توجہ مبذول کروانے کے لئے اس کی قمیص کا دامن کھینچتے تھے، اور لاڈلے انداز میں اسے کہتے تھے کہ ان کو کیا چاہئے (منڈل تیسرا، ۵۳، ۲)۔ بچوں کو کھیل کھیلنے کا شوق اتنا ہوتا تھا کہ کھیل کے وقت وہ کھانا بھی بھول جاتے تھے۔ ان کی ماں اگر انہیں کھانے کے لئے کہتی تھی تو اسے ہاتھ لگا کر کہتے تھے کہ تو ایک طرف ہو جا (منڈل دسواں، ۹۴، ۱۴)۔ دودھ پیتا بچہ زمیں پر گھسیٹتا ہوا ماں کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا تھا، اور کسی وقت ماں دیکھتی تھی کہ اس کی چھاتیوں سے دودھ بہہ رہا ہے تو اُسے بچہ لا کر دیتے تھے، جسے اپنے پہلو میں سُلا کر، اپنی چھاتی سے دودھ پلاتی تھی، اور اسے لاڈ کوڈ کرتی تھی (منڈل نواں ۶۱، ۱۴)۔ ماں جس وقت اپنا بچہ اپنی گود میں رکھ بیٹھتی تھی تو بہت اچھی لگتی تھی (منڈل ساتواں، ۴۳، ۳)۔ بچے جس وقت اپنے باپ کی طرف بڑھ کر اس کے ساتھ توتلے پن سے بات کرتے تھے، تو ان کا توتلہ بولنا بہت اچھا لگتا تھا (منڈل ساتواں، ۱۰۳، ۳)۔ لڑکیوں کی طرح لڑکے بھی کانوں میں بالیاں پہنتے تھے، اور گلے میں بھی جڑت جڑی ہوئی مالا پہنتے تھے (منڈل پہلا، ۱۲۲، ۱۴)۔

گھر گھر میں رات کا کھانا سویرے تیار ہوتا تھا، گویا سورج کو پتھروں سے بھگا کر، کھانا کھاتے تھے۔ بچے کھانا کھا کر فارغ ہوتے تھے تو ماں ان کے لئے بستر بچھا کر سویرے انہیں سلا دیتی تھی۔ وقت بیوقت چرخہ بھی چلاتی رہتی تھی، کیونکہ سوت کاتنے کا رواج کئی قوموں سے پہلے وادیٔ سندھ کے لوگوں نے شروع کر رکھا تھا۔ چرخی چلاتے ہوئے یا گھر کا کوئی دوسرا کام کرتے

ہوئے بعض عورتیں گیت گاتی تھیں۔ کبھی کبھی کچھ عورتیں آپس میں مل کر تفریح کے لئے نکلتی تھیں (منڈل پہلا، ۲،۵۶)۔ کچھ عورتیں اپنے شوہروں یا کسی دوسرے عزیز واقارب کے ساتھ سبھاؤں میں جاتی تھیں، تو کچھ محفلوں اور میلوں میں جاتی تھیں۔ اگر کوئی عورت پرائے گھر میں رات کو جا کر رہتی تھی تو اس کی شہرت ہو جاتی تھی/ (اس کے خلاف باتیں بنائی جاتی تھیں) (منڈل پہلا، ۱۲۳، ۸۷)۔ اگر کسی مرد کو اپنی بیوی میں شک ہو جاتا تھا، تو پھر جب تک وہ جلتی ہوئی آگ کے بیچوں بیچ میں گذر کر اپنی پاکیزگی کا ثبوت نہیں دیتی تھی، تب تک مرد کی اپنی بیوی سے نہیں بنتی تھی۔ کچھ حالات میں عزیز واقارب یا دوست واحباب بیچ میں آ کر میاں بیوی میں صلح کرواتے تھے (منڈل دسواں، ۶۸، ۲)۔

رگ وید والے زمانے میں پردے کا رواج نہیں تھا۔ یہ رواج اتھاسون کے زمانے مین ہوتا تھا۔ اس لئے اس سے متعلق تذکرہ اتھاسوں کے باب میں کیا جائے گا۔

گھر کا سامان اور برتن: رگ وید کے منڈل ساتویں (۸، ۵۵) میں ''تلپ'' (Talpa) لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ ایک لکڑی کا صندل ہوا کرتا تھا، جس پر سوتے تھے۔ ''پروستھ'' (Prostha) ایک کشادہ بینچ یا صندل ہوا کرتا تھا، جس پر عورتیں سوتی تھیں۔ شاید اپنا چھوٹا بچہ بھی اپنے ساتھ سلاتی تھیں، اس لیے وہ کشادہ ہوتا تھا۔ ''وہیہ'' (Vahya) ایک قسم کا ''کوچ'' یا آرامدہ بستر ہوتا تھا۔ تکیہ یا گدی کو ''اُپبرھنہ'' (Upa - barhana) کہتے تھے، جس کے اندر اُون ڈالتے تھے۔ صندلی کو ''آسندی'' کہتے تھے اور اس پر گدی پڑی رہتی تھی۔ لوگوں کے گھروں میں دھاتو بلکہ لکڑی سے بنے ہوئے برتن ہوتے تھے، اور مٹی کے برتن بھی ان کے پاس ہوتے تھے، جو جلدی میں ٹوٹ جاتے تھے (منڈل پہلا، ۱۹۱، ۱۴)۔ سونے کے پیالے اور چاندی کے برتن بھی ان کے پاس ہوا کرتے تھے۔ چمڑے کی چھوٹی مشکیں بھی ان کے پاس ہوتی تھیں۔ ڈوئیاں، کرنڈیاں، اُکھلیاں، مہلیاں، چھاج اور برن بھی ان کے پاس ہوتے تھے۔ چھت میں چھبیاں لٹکاتے تھے، جن میں کھانے پینے کی اشیاء رکھتے تھے، تاکہ چوہے ان کو کتر کاٹ نہ جائیں (اتھرو وید، منڈل نواں، ۳، ۶)۔ قیمتی چیزیں پیٹیوں میں رکھتے تھے (منڈل دسواں، ۴۲، ۶)۔ برتنوں اور دیگر اشیاء رکھنے کے لئے ان کے پاس اتنی بڑی پیٹیاں ہوا کرتی تھیں کہ اس میں آدمی سو سکے (منڈل پانچواں، ۸۷، ۵)۔ اتنی بڑی پیٹیاں مصنف نے جب ہوش سنبھالی تو لوگون کے گھروں میں دیکھیں تھیں۔ اگر کچھ گھروں میں یہ پیتیاں آج تک ہوں تو کوئی عجب کی بات نہیں۔ یہ پیتیاں تقریباً پانچ فوٹ لمبیاں، چار فوٹ کشادہ اور تین چار فوٹ گہری ہوا کرتی تھیں۔

کپڑوں کے تھیلے، مصری کے کنے، منکوں کی دبلیاں، وغیرہ ان میں رکھتے تھے۔ رات کو اس پیتی پر بستر بچھا کر سو جاتے تھے، یہ مصنف کی آنکھوں دیکھی بات ہے۔

زمین میں دولت دفن کرنے کا رواج: لوگوں کے پاس پہلے صرف مال مویشی ہوتا تھا۔ بعد میں سونے کے سکے بنانے کا رواج پڑا، تو وہ سکے اور منکے اور انگوٹھیاں کچھ برتنوں میں ڈال کر، زمین میں دفن کرتے تھے (منڈل پہلا، ۱۱۷، ۱۲)۔ زمین میں دولت دفن کرنے کا رواج بعد میں جاری رہا، اور آج بھی دیہاتوں میں عام ہے۔ اسی سبب سندھی میں کچھ کہاوتیں بھی عام ہوئیں۔ مثلاً: ''ڏن هجي ڏوڙ ۾، ته چمڪو ڏئي نور ۾ ''۔ یعنی اگر کسی کی دولت زمین میں دفن ہوگی، تب بھی اس کی شکل سے لگے گا کہ یہ بندہ شاہوکار ہے۔ دوسری کہاوت ہے کہ ''کڏ ! چي، جيءُ سڏ ! '' یعنی اگر گڑھے میں دولت مدفون ہوگی تو ضرورت کے وقت وہ گڑھا بھی آواز سن لے گا۔ زمین میں مدفون دولت جس وقت جا کر نکالتے تھے تو انہیں وہ امانت با سلامت ملتی تھی۔ اس لیے ایک کہاوت ہے کہ ''پرائی امانت میں زمین بھی خیانت نہیں کرتی''۔ مطلب یہ ہے کہ کسی کی امانت میں خیانت نہیں کرنی چاہیے۔

کھانا پینا: رگ وید میں ''گودھرم'' یعنی گیہوں اور ''ورہی'' (چاول) الفاظ استعمال نہیں ہوئے لیکن ''دھانیہ'' لفظ استعمال ہوا ہے، جس کا تلفظ سندھی میں ہے ''ڌاڃ''، جس میں ہر ایک قسم کا اناج شامل ہے۔ تاہم، مونگ، تل، اور جو الگ سے بھی درج ہیں، اور یہ بھی درج ہے کہ تلوں اور جَو کی فصل بہت اچھی ہوتی تھی۔ رگ وید میں جَو کی فصل بہت اچھی ہوتی تھی۔ رگ وید میں جَو کا تذکرہ بہت ہے، جس سے لگتا ہے کہ لوگ جَو کی روٹی اور مونگ کی دال کھا کر پیٹ بھرتے تھے۔ مونگ کی پکی ہوئی دال کو ''مدگ اُدن'' یعنی مونگ کا کھانا کہتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ دال کے ساتھ روٹی کھانے کا رواج نہایت قدیم زمانے سے ہے۔ چنے کی دال کھانے کا رواج شاید بعد میں جاری ہوا۔ جَو سے روٹی کے علاوہ اور چیزیں بھی بناتے تھے۔ جَو بھون کر اس سے آش پکاتے تھے جس میں پکانے کے دوران تھوڑا سا گھی بھی ڈالتے تھے۔ اس آش میں لسی ملا کر کھاتے تھے۔ آش کو کہتے تھے ''کرنبھ'' (Karambha) (منڈل پہلا، ۱۸۷، ۱۶، منڈل تیسرا ۵۲، ۷)۔ اگر آش میں لسی ملاتی تھے تو اُسے ''دوَدھیہ اودَن'' (Duhya - odana) - یعنی لسی کا کھانا کہتے تھے۔ جَو کی گھی کے ساتھ پھلکے پکاتے تھے، اُسے کہتے تھے ''اُپُوپ'' (Apupa) منڈل تیسرا، ۵۲، ۷)۔ دودھ میں جَوؤں کے دانے ڈال کر کھیرنی بناتے تھے، جسے ''کشیر اودن'' یعنی دودھ کا طعام کہتے تھے (منڈل آٹھواں، ۶۹، ۱۴)۔ جَو سے ستو بھی

بناتے تھے (منڈل دسواں، ۷۱، ۱۰)۔ یہ ستو دودھ میں ابالتے تھے۔ مطلب یہ کہ زیادہ تر جوَ استعمال ہوتے تھے۔

قدیم لوگوں کو دودھ بہت پسند تھا، اس میں بھی گائے کا دودھ زیادہ ان کے لئے پسندیدہ تھا۔ ہر ایک خاندان کو اپنی گائیں ہوتی تھیں۔ دودھ گرم کر کے، اس سے لسی بناتے تھے۔ ''دہی'' اصل میں ہے سنسکرت ''ددھی''، یہ لفظ رگ وید کے منڈل آٹھویں، ۹، اور منڈل نویں، ۸۷، ۱ میں استعمال ہوا ہے۔ لسی بنانے کے لئے ان کے پاس مندھانی ہوا کرتی تھی (منڈل پہلا، ۲۸، ۴)، ''گیھ'' اصل میں سنسکرت ''گھرت'' (Ghrta) ہے، جو رگ وید میں کئی مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ مکھن نکالنے کے بعد جو لسی بچتی تھی، اسے ابال کر ''پاکھی'' بناتے تھے، جسے آج تک بہت لوگ دل لگا کر پیتے ہیں۔

''پاهي پاڪي پنڙي، پرين ساڻ پيئان''
[میں اپنے ساجن کے سنگ پاکھی خوب پیؤں]

اس وقت کتنے ہندو مچھلی کا گوشت دیکھتے ہیں تو انہیں کراہت آتی ہے، لیکن قدیم لوگ ویشنو نہیں ہوتے تھے۔ اس وقت کے حالات بھی اور طرح کے تھے۔ رگ وید والے زمانے میں وادیٔ سندھ میں زیادہ تر پورا سال سردی پڑتی تھی، جس وجہ سے سال کو ''ہم'' (برف) یعنی سخت سردی کہتے تھے (منڈل پہلا، ۶۴، ۱۰، دوسرا ۱، ۱۱، ۳۲، ۲، پانچواں ۵۴، ۱۵، اور چھٹا ۱۰، ۷، ۴۸، ۸)۔ لگتا ہے کہ زیادہ برف پڑنے کی وجہ سے انہوں نے گوشت کھانے کو ضروری سمجھا، ایک دفعہ ان کی داڑھ جب عادی ہو گئی گوشت کھانے کی، پھر تو نہ صرف بکریوں، بکری کے بچوں، بھیڑوں اور مینڈھوں، بلکہ گھوڑوں کا گوشت بھی کھاتے تھے۔ کئی لوگ گائے کا گوشت خواہ بھینس کا گوشت حلال سمجھتے تھے۔ رگ وید کے آخر میں جو جو ائتریہ براہمن ہے، اس میں درج ہے کہ جب راجا یا کوئی بڑا آدمی مہمان بن کر آئے، تب جو گائے ''وِہت'' ہو یعنی بچے نہ دیتی ہو، اسے مہمانی کے لئے ذبح کیا جانا چاہئے (منڈل پہلا، ۳، ۴)۔ یجر وید کے پیچھے جو شتپتھ براہمنہ ہے، اس میں درج ہے کہ کسی بڑے آدمی کی مہمانی کے لئے ''مہوکش'' (مہا + کش) یعنی بڑی عمر کا بیل ذبح کرنا چاہئے (تیسرا، ۴)۔ مہمانوازی کے یہ نمونے کن رشیوں کے بتائے ہوئے ہیں؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ کچھ رشی اس خیال کے بھی تھے کہ گائے اور بیل جیسے مفید جانور ذبح نہیں کرنے چاہئیں، اس لئے بیل کو انہوں نے کہا ''اَگھنیہ'' یعنی جسے ذبح نہیں کیا جانا چاہئے۔ رگ وید میں ''اگھنیہ'' لفظ تین دفعہ استعمال ہوا ہے؛ لیکن مؤنث لفظ ''اگھنیا'' (گائے) سولہ دفعہ استعمال ہوا ہے۔ گائے سے دودھ، لسی اور مکھن کی سہولیات ہیں، لیکن دودھ سے مختلف الانواع مٹھائیاں اور

غذائیں بنتی ہیں۔ بیل نار اور ہل چلانے، بار لادنے بلکہ سواری کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ایسے مفید جانوروں کے ذبح کے خلاف کچھ رشیوں نے رگ وید والے زمانے میں ہی آواز بلند کی تھی، لیکن اس وقت یہ بات سنی ان سنی کر دی گئی۔ یہ رواج اتہاسوں والے زمانے میں بھی تھا۔ اشومیدیکیہ یعنی گھوڑے کی قربانی کا یکیہ رگ وید والے زمانے سے لے کر اتہاسوں والے زمانے تک لوگ مسلسل کرتے آرہے تھے اور لوگ گھوڑے کا گوشت بھی کھاتے تھے۔ مچھلی کھانے رواج بہت بعد میں بند ہوا۔ اسی وجہ سے آج پورے ہندستان میں ویشنو زیادہ ہیں۔ جو گوشت کھاتے ہیں، وہ بھی اپنے لئے جانور ذبح کرنا اکثر گناہ سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل کسائی سارے مسلمان ہیں۔ فقط کچھ سکھ لوگ ''جھاٹکہ'' (ایک ہی ضرب سے جانور کی سسی کاٹ کے رکھ دینا) مارتے ہیں۔ اس کے باوجود اس وقت سب ہندو لوگ گائے کو ''گئو ماتا'' سمجھتے ہیں، اور گائے کو ذبح کرنا بڑا گناہ سمجھتے ہیں۔[1] قدیم مصر کے لوگ بھی گائے کو دیوتا سمجھ کر پوجتے تھے۔

رگ وید کے منڈل آٹھویں (۶۷) میں درج ہے کہ لوگ جال میں مچھلی پکڑتے تھے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ مچھلی کھانے کا رواج تھا۔ منڈل پہلے، دوسرے، چوتھے اور آٹھویں میں شکاریوں (شکار کرنے والوں) کا تذکرہ ہے۔ منڈل پہلے (۹۲، ۱۰) میں یوں بھی درج ہے کہ ''شوگھنی'' (Sva - ghni) (یعنی شکاری) پرندوں کے پر کاٹ لیتے تھے، تاکہ اڑ نہ جائیں۔ ہرن کا شکار کرنے کا رواج بھی عام تھا۔ کئی لوگ ''مرگ چھالا'' یعنی ہرن کی کھال عام طور پر اوڑھتے تھے۔ لوگ گھروں میں مرغیاں بھی پالتے تھے۔

رگ وید والے زمانے میں لوگوں کا سارا زور مچھلی کھانے پر نہیں تھا، لیکن میوے بھی کھاتے تھے۔ منڈل دسویں (۱۴۶، ۵۔۔۶) میں درج ہے کہ لوگ درختوں سے میٹھے میوے کھا کر درختوں کے نیچے آرام کرتے تھے۔ کوئی کنڈھی اٹکا کر پکے ہوئے میوے، درختوں سے گراتے تھے (منڈل تیسرا، ۴۵، ۴)۔ میووں کے نام درج نہیں ہیں، باقی منڈل پہلے ۱۶۴، ۲۰) میں میٹھے بیروں کا تذکرہ ہے، جن میں پرندے بھی اپنی چونچ مارتے تھے۔ منڈل نویں (۸۶، ۱۸) میں ''اُکشو'' یعنی ''گنا'' لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس سے سمجھا جاتا ہے کہ گنے کی فصل ہوتی تھی، اور لوگ اس کا رس پیتے تھے۔ ''مدھو'' یعنی ''شہد'' لفظ رگ وید میں کئی مقامات پر استعمال ہوا ہے (منڈل پہلا، دوسرا، تیسرا، چوتھا، ۳۸، ۱۰)۔ مطلب یہ کہ قدیم لوگ روٹیاں، کھیرنی، لسی، مکھن، شہد اور میوے کھاتے تھے۔ اناج کو دیوتا سمجھتے تھے (منڈل پہلا، ۱۸۷)۔

(1) "The cow was gradually acquiring a special sanotity, as is shown by the name Aghnya (not to be slain) applied to it in several passages". Vedic Index II, 146.

آگ جلانے کا ہنر: کھانے پکانے کا کام آگ کے علاوہ ہو نہیں سکتا، اس لیے کھیتی شروع ہونے سے پہلے لوگوں نے ضرور آگ جلانے کا ہنر ڈھونڈ لیا ہوگا۔ آتش فشاں پہاڑوں سے آگ نکلتی ہے، لیکن آتش فشاں پہاڑ ہر جگہ نہیں ہیں، باقی آسمان میں بجلی کی چمک ہوتی ہے جو ہر کوئی دیکھ سکتا ہے۔ سورج بھی اگنی کا روپ ہے، اور اسے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس طرح آگ دیکھنا تو آسان، لیکن اسے پیدا کیسے کیا جائے؟ آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے کہ جب ہوا زور سے چلتی ہے، اور جنگلوں میں بانس کی لکڑیاں یا کچھ درختوں کی ٹہنیاں ایک دوسرے سے زور سے لگ کر رگڑتی ہیں، تب اس رگڑ میں سے آگ خود بخود پیدا ہو جاتی ہے، اور کبھی کبھار تو جنگلات جل جاتے ہیں۔ قدیم رشی جو قدرت کی باتیں جاننے کے شائق تھے، انہوں نے اس بات کا جائزہ لے کر، یہی طریقہ اختیار کیا اور آگ جلانے کا رواج جاری کیا۔ آئرون رشی، جس سے ''اتھرو وید'' منسوب ہے، اس سے متعلق رگ وید کے منڈل چھٹے (۱۶، ۳) میں کہا گیا ہے کہ آگ جلانے کا رواج اول اس نے جاری کیا۔ دو لکڑیوں کو آپس میں رگڑ کر اس نے آگ پیدا کی۔ اسی طرح آکاسوں کی آئر بجلی گویا کہ نیچے زمین پر اتر کر، لوگوں کے چولہوں میں قیام کیا۔

قدیم لوگ اَشوتھ درخت کی لکڑی کو ''شامی'' نامی کنڈی کو لکڑی سے رگڑ کر، آگ پیدا کرتے تھے۔ ایک لکڑی کو گیھ لگا لیتے تھے، اور گھاس کی مٹھیا بھی اس کے نزدیک پکڑے ہوئے ہوتے تھے، تاکہ جیسے ہی آگ پیدا ہو تو گھاس کو لگ جائے اور گیھ کے زور پر لکڑیاں بھڑک کر جل پڑیں۔ اشوتھ درخت اور شامی لکڑی میں انہوں نے بڑی خوبی دیکھی، تو اشوتھ کی انہوں نے بڑی تعریف کی۔ شامی (کنڈی) درخت کو پوجنے کا رواج بھی انہوں نے جاری کیا۔ آج بھی سارے ہندستان کے لوگ دسہرے کے دن کنڈی لکڑی کی پوجا کرتے ہیں۔ اگر کسی جگہ کنڈی کا درخت نہیں ہوتا تو کسی اور جگہ سے اسے لے آتے ہیں، زمین میں اسے کھوڑ کر اس کی پوجا کرتے ہیں۔ یہ رواج اس قدیم زمانے کی یاد دلاتا ہے، جس زمانے میں قدیم لوگوں نے آگ جلانے کا فن ڈھونڈھ لیا تھا۔ اس وقت ہندستان والوں نے ایران، اور یورپی لوگوں کے آباء و اجداد ایک دوسرے کے قریب رہتے تھے، جس وجہ سے سنسکرت لفظ ''اگنی'' کا تلفظ لاطینی زبان میں ''اِگنس'' (Egnis) ہوا۔ پارسیوں میں اگنی پوجا کا رواج بھی اسی دوران پڑا۔

آگ جلانے کے لئے اشوتھ درخت کی لکڑی اوپر سے اور شامی کنڈی کی لکڑی نیچے سے پکڑے رکھتے تھے۔ اوپر والی لکڑی کو ''پرورس'' (Pururavas) اور نیچے والی کو ''اُروشی'' (Urvasi) کہتے تھے۔ جس طرح چندرونسی گھرانے کے راجا ''پروروس'' کو ''اُروشی'' نامی اپسرا

سے بیٹا ہوا تھا، اسی طرح ان دو لکڑیوں کو آپس میں رگڑنے سے ''اگن دیوتا'' (آگ) پیدا ہوتی ہے؛[1] لیکن یہ پھر بھی دو رانی لکڑیاں ہیں، اس لئے رگ وید کے منڈل پہلے (۲،۳۴-۱) میں اگن دیوتا کو ''دوی ماترک'' یعنی دو مائیں کا بیٹا کہا گیا ہے، اور منڈل پانچویں، (۹،۳) میں وضاحت کے ساتھ درج کیا گیا ہے کہ دو لکڑیوں میں سے اگن دیوتا اس طرح پیدا ہوتا ہے، جس طرح ''تازہ پیدا شدہ بچہ''۔

رگ وید کے منڈل دوسرے (۱۲،۳) میں یوں بھی درج ہے کہ اندر دیوتا دو پتھروں کے بیچوں بیچ آگ پیدا کی تھی۔ اسی سبب منڈل دسویں، (۲۰، ۷) میں اگنی کو ''ادریھ سُونھ'' (Adreh Sunuh) یعنی پتھر کا بیٹا (پتھر سے پیدا شدہ) بھی کہا گیا ہے۔ یہ آگ جلانے کا دوسرا نمونہ ہے۔ آسمان میں بادل ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں، تو گرج پیدا ہوتی ہے، اور برق پیدا ہوتی ہے۔ لگتا ہے کہ قدیم لوگوں نے یہ نمونہ دیکھ کر، ایک پتھر دوسرے پر مار کر آگ جلانے کا یہ دوسرا نمونہ ایجاد کیا۔ یہ دوسرا نمونہ بھی سندھ میں کئی ایک برسوں تک جاری رہا۔ اس کے لئے ثبوت یہ ہے کہ آج تک کوہستان کے لوگ یہی نمونہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ کوہستان کے لوگوں کو جب آگ جلانی ہوتی ہے، تب لکڑیاں اور گوبر اکٹھے کر کے، ان کے اوپر چھلکے، باریک چھوٹی چھوٹی لکڑیاں اور تنکے اور پتے وغیرہ رکھتے ہیں۔ پھر چقمق پتھر کی ایک طرف پُرز (سَن کا شیرہ گندھک میں مارہ ہوا) رکھ کر، چقمق کے اوپر پتھر یا لوہے کے ٹکڑے سے ضرب لگاتے ہیں، تو آگ کی چنگاریاں پیدا ہوتی ہیں، جو پرز کو آ کر لگتی ہیں، جس وجہ سے پہلے تنکے، چھوٹی چھوٹی لکڑیاں، چھلکے وغیرہ جلنے لگ جاتے ہیں، اس کے بعد گوبر اور لکڑیوں کو آگ لگ جاتی ہے، تو بڑی آگ جل اُٹھتی ہے! آج کل ہم سیڈن اور دوسرے ممالک کے ماچس استعمال کرتے ہیں۔ ماچس بنانے کے کارخانے انیسویں صدی میں شروع ہوئے۔ اس سے پہلے آگ جلانے کے یہی دو طریقے تھے، جن میں سے پہلا طریقہ زیادہ عام تھا۔

کسی بھی وقت کھانا پکایا جائیگا یا پانی وغیرہ گرم کیا جائیگا، تو ضرور آگ جلانی پڑے گی۔ بار بار آگ جلانے سے بہتر ہے کہ اس میں گوبر اور لکڑی ڈالتی رہنی چاہئے۔ کئی ایک مڑھیوں میں دیکھیں تو وہاں آگ سلگتی رہتی ہے۔ قدیم لوگ بھی یہی کچھ کرتے تھے۔ اگنی بارہ ہی مہینے جلتی رہے، اس کے لئے اگن میں تین دفعہ آہوتی (لکڑیاں، جَو، گیھ وغیرہ) ڈالتے تھے: صبح، دوپہر اور شام۔ اگنی کو ''گرھ پتی'' یعنی گھر کا مالک یا گھر کا دیوتا سمجھتے تھے، اس لئے صبح صادق کے وقت آگ جلا کر، پہلے اگنی پوجا کرتے تھے۔ یگین اور ہون ہوم کی ابتدا اسی طرح سے ہوئی۔

(1) سنسکرت میں ''اگنی یا اگن دیوتا'' جنس مذکر ہے؛ لیکن سندھی میں ''اگنی'' کی جنس مؤنث سمجھی جاتی ہے۔ مصنف

پارسیوں میں بھی اگنی پوجا کا دستور آج تک جاری ہے، خصوصاً یگیہ کے لئے اگنی کو جلانے کا رواج انگیرس نامی ایک رشی نے ڈالا (رگ وید، منڈل پہلا، ۴۵،۳، ۷۱، ۲۔۔۳: ۸۳، ۴)۔ گوتم رشی بھار دواج اور دیگر کئی رشی، انگیرس رشی کی کل سے تھے، اور اگنی دیوتا کے پوجاری تھے۔ سب گھروں میں اگنی دن رات جلتی رہتی تھی، تو وہ پھر ''اکھنڈ جوت'' کہلائی جانے لگی۔ آج تک کئی مڑھیوں اور مندروں میں جوت ہمیشہ جلتی رہتی ہے۔ دریاہ پنتھی بھی دریاہ تھان کا دیئہ کبھی بھی بجھنے نہیں دیتے تھے۔ کئی ہندو صبح کو نہا شہا کر سورج کو ہاتھ جوڑتے ہیں۔ شام کو دیئہ جلاتے ہیں تو اُس کے سامنے بھی ہاتھ جوڑتے ہیں۔ ان باتوں میں یہ مذہبی خیال پنہاں ہے کہ ایشور جوتی سروپ ہے، اور اس کی جوت کبھی بھی بجھنے والی نہیں ہے۔ اس لئے اس اکھنڈ جوت کا ہمیشہ دھیان رکھا جائے۔ اگنی، دیئہ اور سورج اس کی جوت کے سروپ ہیں، اور اسی سبب ہندو ان کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہیں۔ اس طرح کھانا پکانے کے لئے جو اگنی عام طور پر جلائی جاتی ہے، اس سے قدیم آریوں کی توجہ مبذول ہو کر پرماتما کی طرف چلی گئی، کیونکہ ان کا ذہنی رجحان ہمیشہ مذہب کی طرف تھا۔ یجر وید کے تیتریہ سنہتا، (کانڈ ۲، پرپاٹھک ۵، انوا واک ۸، واگ ۶) میں درج ہے کہ یگیہ کی اگنی میں آہوتی ڈالنے کے وقت کہتے تھے ''سواہا'' (Svaha)! یوں دیوتاؤں کو پکارتے تھے، کہ یگیہ آ کر قبول کریں اور یگیہ کرنے والوں پر اپنی رحمت کریں۔

رگ وید والے زمانے میں ہی لوگوں نے گوبر کی بھی قدر کی تھی۔ گوبر کی تھاپڑیاں بنا کر سوکھاتے تھے، اور وہ سوکھے ہوئے گوبر کی تھاپڑیاں ایندھن کے طور پر کام میں لاتے تھے۔ کئی گھروں میں اب ٹائیلز کی فرش بندی ہے، لیکن پہلے گھر گھر میں پوتھی پانے کے لئے گوبر عام طور پر استعمال کرتے تھے۔ یہ رواج دیہاتوں میں ہندوؤں خواہ مسلمانوں کے گھروں میں آج تک ہے۔ کوئی ہندو مرتا ہے تو اول پوتھی پا کر، اسی صاف جگہ پر پرانی کو رکھتے ہیں۔ گوبر بڑی خوبیوں والی چیز ہے۔ رگ وید والے زمانے میں بکریوں کی پھولڑیاں بھی جلاتے تھے یا نہیں، یہ کہیں بھی درج نہیں ہے، لیکن انہیں عام طور پر کھادھ کر کے استعمال کرتے تھے۔

نشیدار چیزیں: قدیم لوگ خالی پانی یا لسی اور دودھ وغیرہ سے اپنی پیاس نہیں بجھاتے تھے، لیکن خمار کے لئے ذرا ک بھی لیتے تھے۔ آج کئی لوگوں کو شراب، بھنگ اور کسنبی (گلا ہوا آفیم) کی علت ہے، جس میں سے کسنبی کا رواج تھر میں بہت ہے۔ بھنگ اور آفیم کے استعمال کا رواج بہت بعد میں جاری ہوا؛ باقی شراب پینے کا رواج نہایت قدیم ہے۔ پہلے لوگ دو قسم کی نشیدار چیزیں استعمال کرتے تھے: ایک سوم دوسری سُرا (شراب)۔ ''سوم'' ایک جڑی بوٹی ہوا کرتی تھی

جو سرسوتی اور دریائے سندھ کے کنارے پر، اور امبالئی ضلع میں کرکیتھر کی ''شریناوت'' (Saryanavat) جھیل کے کنارے پر پیدا ہوتی تھی (رگ وید، منڈل نواں، ۶۱، ۷، ۱۱۳، ۱)، لیکن قیمتی اور اچھی سوم ہمالیہ جبل کی ''مجوت'' (Mujavat) نامی چوٹی پر پیدا ہوتی تھی، جس وجہ سے ''موَجوت'' (Manjavata) یعنی مجوت کی پیدائش کہلاتی تھی (رگ وید، منڈل دسواں، ۳۴، ۱)۔ کچھ علماء سمجھتے ہیں کہ ''کیلاس'' پربت کا دوسرا نام ''مُجوت'' تھا۔ یہ جڑی بوٹی کئی صدیوں سے نایاب ہے، کیونکہ ملکی طبعی حالات تبدیل ہو چکے ہیں۔ پہلے وادیٔ سندھ کی طبعی حالتیں کچھ اور تھیں۔ اس زمانے میں یہ جڑی بوٹی گرمی خواہ سردی میں ختم ہو جاتی تھی، اور صرف برساتی موسم میں ابھرتی تھی۔ قدیم ایرانی لوگ بھی اس جڑی بوٹی کا رس بڑے شوق سے پیتے تھے۔ وہ سوم کی بجائے کہتے تھے ''ہوم'' (Haoma)۔ یہ لفظ پارسیوں کی کتاب زنداوستا میں استعمال ہوا ہے۔

قدیم لوگ سوم جڑی بوٹی کے پتے اول ''اَدری'' (اڈی) [1] پر رکھ کر انہیں کوٹ کر پتلا کرتے تھے۔ جڑی بوٹی کو باریک کرنے اور رگڑنے کا کام اکثر عورتیں کیا کرتی تھیں۔ جب بوٹی رگڑی جا چکی ہوتی تھی تو اُس کا رس عورتیں انگلیوں سے نچوڑ کر نکالتی تھیں (منڈل نواں، ۹۷، ۹۔۱۲)۔ رس نچوڑنے کے وقت عورتیں سوم کی تعریف میں گیت گاتی تھیں (منڈل نواں، ۶۶، ۸)۔ یہ رس شاید بہت گاڑھا ہوتا تھا، اس لئے اس میں پانی ملا کر، بعد میں عورتیں ساری رس کو چھانتی تھیں۔ اس وقت جو لوگ آفیم کو گال کر ''کسنبو'' کر کے پیتے ہیں، وہ کسنبہ چھاننے کے لئے روئی کی پوٹلیاں بناتے ہیں، جن کو ''منیئان'' کہا جاتا ہے۔ سوم رس چھاننے کو وقت بھی عورتیں اُون کی پوٹلیاں بنا کر، وہ لوٹے کے اوپر رکھ کر رس ڈالتی جاتی تھیں، تو گندگار پوٹلیوں کو چمٹ جاتا تھا، اور باقی خالص رس نکل کر، لوٹے میں جا کر پڑتا تھا۔ رس چھاننے کے وقت ان میں انگلیاں گھماتی جاتی تھیں (منڈل نواں ۶۷، ۹۔۱۲)۔ انگلیاں گھمانے کا مقصد یہ تھا کہ صرف اوپر والا پانی نکل کر نہ آئے؛ لیکن جو سوم تلے میں پڑی ہو وہ بھی پانی میں گھل جائے۔ رس چھانی چکی ہوتی تھی تو پھر اس میں دودھ یا لسی، اور کبھی کبھی شہد بھی ملاتی تھیں (منڈل نواں ۱۰۳، ۳)۔ قدیم لوگ اس رس سے پہلے دیوتاؤں کو کے لئے چڑھاوا کر کے، بعد میں خود پیتے تھے۔ اوائل میں خالص سوم رس کا اندر دیوتا اور وایو دیوتا کو بھوگ لگاتے تھے (منڈل پہلا ۱۳۷، ۱، تیسرا ۳۲، ۲، اور آٹھواں ۲، ۹۔۱۰)۔ بعد میں یہ رواج بند کر کے لسی دودھ یا شہد ملانے لگے (منڈل نواں، ۹)۔

(1) آج کل کسی درخت کا موٹا ٹکڑا یا لکڑی کا موٹا ٹکڑا ''اہرن'' کے طور استعمال ہوتا ہے، جس پر گوشت یا مچھلی رکھ کر کاٹتے ہیں۔ پہلے اہرن پتھر کے بنے ہوئے ہوتے تھے، کیونکہ لکڑی چیرنے کے لئے کوئی اوزار نہیں تھا۔ انگریزی لفظ ''ہمّر'' (Hammer) یعنی مطرقہ کے اصل معنی بھی یہی ہیں ''پتھر کا ٹکڑا''۔ مصنف

رگ وید کا پورا نواں منڈل، اور دوسرے منڈل کے چھ سُوکت (Hymns) سوم رس کی تعریف میں ہیں۔

پنجاب اور سندھ کے باشندے سوم رس پیتے تھے، تو ان کا جسم مستی میں آ جاتا تھا، زیادہ کام کرتے تھے تو انہیں تھکاوٹ نہیں ہوتی تھی، یوں سمجھتے تھے کہ اس رس پینے کی وجہ سے آدمی عمر بڑھتی ہے (منڈل آٹھواں، ۴۸، ۱۱)، جنگی جوان جنگ میں داخل ہونے سے پہلے سوم رس کی تھوڑی سی مقدار پی کر داخل ہوتے تھے، تاکہ برجستائی سے لڑ سکیں (منڈل نواں، ۱۰۶، ۲)۔ سوم رس میں ساری خوبیاں تھیں، اس لئے امرت کہلاتی تھی، اور دیوتاؤں کو بھوگ لگانے کے لائق شمار ہوتی تھی۔ قدیم لوگوں میں یہ خوبی تھی کہ جن چیزوں میں کوئی خوبی دیکھتے تھے تو انہیں دیوتا سمجھ کر پوجتے تھے۔ سوم رس کو بھی اسی طرح دیوتا سمجھ کر پوجنے لگے۔ اسی طرح اناج بھی دیوتا کہلاتا ہے۔ سوم رس استرگی دینے والا (Stimulant) تھی، اس لئے جو لوگ اسے مناسب مقدار میں پیتے تھے، وہ لوگ اپنا کام کاج بڑی مستعدی سے کرتے تھے، باقی جو لوگ بار بار پیتے تھے، یا زیادہ مقدار میں پیتے تھے، ان پر نیند کے خمار چڑھ جاتے تھے (منڈل نواں، ۶۹، ۶)۔ اس آخری حالت میں اسے ''مدھ'' (شراب) کے جیسا سمجھا جاتا تھا (منڈل نواں ۶۸، ۳، ۶۹، ۳)۔ نشہ ہونے سے انہیں شہوت کا خیال بھی ہوتا تھا (منڈل نواں، ۶۷، ۱۰۔۱۲)۔

سوم جڑی بوٹی کے پتے بھورے اور ہلکے لال ہوتے تھے، جس وجہ سے منڈل نو، ۳۳، ۲، ۶۳، ۴) میں سوم کو ''ببھرو'' (بھورا) اور ''اورن'' یعنی ہلکا لال کہا گیا ہے۔ (منڈل نواں، ۴۰، ۲، ۴۵، ۳)۔ اس کا رس رات کو چاند کی طرح چمکتا تھا (منڈل نواں، ۸۵، ۱۲)۔ اسی سبب سنسکرت میں ''سوم'' کے ایک معنی ہیں چاند اور دوسرے معنی ہیں یہی بوٹی یا اس کا رس۔ سنسکرت میں چاند کو ''اِندو'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے دوسرے معنی ہیں ''سوم'' رس قطرہ یا چمک''۔

''سُرا'' ایک شراب کی قسم تھی۔ وہ کس طرح بناتے تھے، یہ رگ وید میں نہیں لکھا۔ وٹنی صاحب کے خیال موجب یہ ایک قسم کا ''بیر'' (Beer) تھا۔ کیلڈنر صاحب کے خیال موجب یہ ''برانڈی'' (Brandy) تھی۔ جیسا کہ رگ وید والے زمانے میں جَو کی فصل اچھی ہوا کرتی تھی، اور وسکی اور بیر پسے ہوئے جَو سے بنائے جا سکتے ہیں، اس سے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ قدیم لوگ یہ شراب جَو سے بناتے تھے۔ ان دنوں شیشی کی بوتلیں نہیں ہوا کرتی تھیں، اس لیے یہ شراب چمڑے کی بنی ہوئی سانداریوں میں رکھتے تھے، جنہیں ''درتی'' (Drti) کہتے تھے (منڈل پہلا، ۱۹۱، ۱۰)۔ رگ وید میں اس شراب کی کوئی تعریف نہیں ہے، لیکن اب یوں لکھا ہوا ہے کہ ''سُرا'' پینے کی علت ایسی ہے، جیسی جوا کی علت''۔ سرا پینے کے بعد لوگ بکواس میں پڑ جاتے تھے، اور

وقتی گناہ کے کام کرنے لگ جاتے تھے (منڈل ساتواں، ۸۶، ۶)۔ یہ شراب پینے کی علت آج تک ہمارے لوگوں میں عام ہے۔ سندھ میں جتنا شراب کا استعمال ہے، اتنا گجرات اور دیگر مقامات پر نہیں ہے۔ رگ وید والا ''سُرا'' لفظ بھی سندھی زبان میں کلھوڑوں کی حکمرانی تک عام تھا، اس لیے شاہ صاحب نے بھی اپنے رسالے میں کئی مقامات پر اسے استعمال کیا ہے۔ سندھی میں اس کا تلفظ ہے ''سُرڈ''۔

''سسي سي گھرن، جي واتيندڙ وچ ھِر،
اُوءِ ڪي پيو پچن، سرو جن سنباھيو.''
يمن ڪلياڻ

[طلبگار سر رندان پہ ساقی
نہ جانے مغبچے کیا مانگتے ہیں۔]
(ایاز)

پوشاك

ماءُ پيتان ننگو آيس، ننگو ويندس آنءُ،
ڏٽيءُ ڏنا، ڏٽيءُ ورتا، سڳورو سندس ناءُ.
حضرت ايوب(1)

[میا تن سے ننگا آیا، ننگا ئی اور جاوے،
اللہ دیوے، اللہ ہی لیوے، بھلا نام جپ جاوے۔]

ہر ایک انسان اپنی ماں کے پیٹ سے ننگا پیدا ہوتا ہے، اور اس کے جسم کی کھال اس کی اوائلی پوشاک ہے، جو گوشت اور ہڈیوں کو ڈھانپتی ہے۔ انسان کو جب یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ ننگا ہے تب وہ اپنا جسم ڈھانپنے کی سعی کرتا ہے۔ ہر ایک ملک کی آبہوا الگ الگ ہے، اس لئے لباس کے نمونے آب و ہوا اور دیگر ملکی حالات پر منحصر ہوتے ہیں۔ تاہم، اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ جو قوم جنگلی حالت سے نکل کر سدھری ہوئی حالت میں آ جاتی ہے، اس کی ترقی کا ادراک اول اس کے لباس سے ہوتا ہے، وہ لباس بھلے کسی بھی نمونے کا ہو۔ قدیم سے قدیم ہندو زمانہ، جس کی کوئی تاریخ ہی نہیں ہے، اس زمانے کا احوال ''وستر'' لفظ سے ملتا ہے۔ ''وستر'' معنیٰ ''جو پہنا جائے'' یعنی لباس، لیکن اس کے بنیادی معنی ہیں جو ''وَسا'' یعنی چربی کو ڈھانپتا ہے، یعنی کھال۔ خدا تعالیٰ اپنی کرم سے

(1) "Naked came I out of my mother's womb and naked shall I return thither; the Lord gave, and the Lord hath taken away: blessed be the name of the Lord" Job II, P. 21.

پہلے ہی ہر جاندار کے جسم پر پہلے ہی سے کھال چڑھا دی ہے؛ لیکن دیگر کئی اقوام کی طرح قدیم آریوں نے بھی اپنے جسم کو ڈھانپنے کے لئے کھال کے اوپر کھال چڑھا دی۔ لوگ گلے دھارنا سیکھے تو اول بکریاں پالنے لگے، اور بکریوں کی کھالوں سے پہلے اپنا جسم ڈھانپنے لگے۔ یجر وید کے آخر میں جو شتپتھ براہمن گرنتھ ہے، اس میں ''اَجین واسن'' لفظ استعمال ہوا ہے (۳، ۹، ۱، ۱۲)۔ سنسکرت میں ''اَج'' معنی ''بکرا'' (اَجا معنی بکری)، اور ''اَجین واسن'' معنیٰ ''بکری کی کھال سے ڈھانپہ ہوا'' یا ''بکری کی کھال سے ملبوس (آدمی)''۔ یہ تھا وادیٔ سندھ کے باشندوں کا قدیم سے قدیم لباس۔ افغانستان، بلوچستان اور تھبیٹ کے باشندے آج تک ''پوستین'' پہنتے ہیں۔ قدیم آریوں نے ہرن کی کھال خوبصورت دیکھی، تو جس وقت انہیں شکار کرنے کا طریقہ ہاتھ آ گیا اور ہرن پکڑنے لگے، اس وقت ''مرگ چھالا'' یعنی ہرن کی کھال بھی استعمال کرنے لگے۔ یہ رواج بعد میں بھی کئی صدیوں تک جاری رہا۔ آج تک ہندو جنیئو پہننے کے وقت اور دیگر اوقات میں رسم خاطر مرگ چھالا استعمال کرتے ہیں۔ یہ اس قدیم زمانے کے رواج کی ایک علامت ہے۔

رگ وید میں درج ہے کہ اس قدیم زمانے میں وادیٔ سندھ میں سردی زیادہ پڑتی تھی۔ رگ وید کے منڈل چھٹے، (۵، ۵) میں ''ہست گہن'' لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے معنی ہیں کہ ''چمڑے کا دستانہ''۔ اس قدیم زمانے میں سُوئیاں نہیں تھیں، اس لئے لگتا ہے کہ چمڑے کے ٹکڑے میں کانٹے وغیرہ سے سوراخ کر کے، اس میں سے بل دی ہوئی گھاس کی ڈوری دوسری کوئی ڈوری گذار کر، گانٹھ دے دیتے تھے، تو دستانہ ہاتھ سے چمٹا رہتا تھا۔ اس وقت سوتی اور اونی دستانے بھی بن رہے ہیں، ورنہ ہم نے خود دیکھا ہے کہ لوگ عام طور پر چمڑے کے دستانے استعمال کرتے تھے؛ اور یہ قدیمی رواج ہے۔

یجر وید کے آخر میں جو تیتریہ براہمن گرنتھ ہے، اس میں ''وَلکل'' لفظ استعمال ہوا ہے (۱، ۴، ۷)۔ ''ولکل'' کے عام طور پر معنی کیے جاتے ہیں ''درختوں کے چھلکوں سے بنا ہوا لباس''۔ درخت کے چھلکوں سے لباس کس طرح بناتے تھے، یہ بات کہیں بھی درج نہیں ہے، اور خود سے سمجھنا بھی مشکل ہے۔ گیلے یا سوکھے چھلکوں سے لباس نہیں بن سکتا، اگر بن بھی جائے، تو چھلکے جسم پر خراشیں ڈال دیں گے، اور لباس مصیبت بن جائے گا۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ گھاس پھوس سے لباس بنانے کا رواج عام تھا، اور بعد میں بھی کئی صدیاں جاری رہا۔ اس بات کا تذکرہ یونانی مؤرخ ہیرو ڈوٹس نے کیا ہے، جو ۴۵۰ برس ق۔م گذر چکا ہے۔ سرکنڈوں کو کوٹ کر، چٹائیوں کی طرح بنائی کر کے، پھر اس سے اپنا جسم ڈھانکتے تھے۔ یہ تھا ان کا لباس۔(1) شتپتھ

(1) Herodotus records: "These Indians wear a garment made of rushes which, when they have cut the reed from the river and beaten it, they plait like a mat and wear it like a corset." (Ancient India - Herodotus by Mac Crindle p. 2)

براہمن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص یگیہ کرتا تھا، تب اس کی بیوی ''کُش'' نامی گھاس میں سے بنا ہوا لباس پہنتی تھی۔ ان سب باتوں کو یکجا کر کے جب غور کیا جاتا ہے تو یوں سمجھ میں آتا ہے کہ گھاس کو بن کر، چٹائیوں کی طرح پڑے بناتے تھے، اور جب سرکنڈوں کو کُوٹ سُوٹ کر بُنتے تھے، تب اس سے بنے ہوئے لباس کو ''ولکل'' کہتے تھے۔

رگ وید کی رچائیں علحدہ علحدہ زمانوں کی بنی ہوئی ہیں، اس لئے لباس میں جو وقت بوقت ترقی ہوئی، اس کا احوال اس سے زیادہ تر ملتا ہے۔ رگ وید میں کپڑے بُننے والوں کا تذکرہ ملتا ہے، اور ''تاجي'' اور ''پيتو'' الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں (منڈل دسواں ۳۰)۔ ''پین'' کا رواج بھی اس وقت تھا۔ آج تک یہ دستور ہے کہ ''پین'' یعنی ابلے ہوئے چاولوں کے پانی میں کپڑے بننے والے ''تاجي'' بھگوتے تھے، تاکہ ڈوریاں مضبوط ہوں۔ ''پین'' ہے کلف، اس لئے پین لگنے سے کپڑا ٹھوٹھ بن جاتا ہا۔ کھیسوں اور لوئیوں کو پین لگاتے ہیں، لیکن ان کو استعمال کرنے سے پہلے ہاتھ سے رگڑ کر پین نکال لی جاتی ہے، تاکہ نرم ہوں۔ پین اس لئے بھی نکال لی جاتی ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اناج کی بوء پر کوئی چوہا آکر لوئی کو کاٹنے لگے۔ رگ وید میں درج ہے کہ تانجی کے تندوں کو چوہے کاٹتے تھے۔ رگ وید میں منڈل دسواں، (۵۷، ۸) سے معلوم ہوتا ہے کہ قیمتی اچھی اُون کے لئے تین مقام مشہور ہوا کرتے تھے:

(۱) پرشنی (راوی) ندی کے کنارے والا ملک

(۲) وادیٔ سندھ اور

(۳) گندھار (قندھار) یعنی پشاور اور کے اردگرد والا علاقہ

ان تین مقامات میں سے سندھ کا کپڑا کتنا مشہور تھا، اس بات کا پتہ بھی رگ وید کے اِسی منڈل دسویں (سوکت ۷۵) سے چلتا ہے، جس میں دریائے سندھ کی تعریف کرتے ہوئے، سندھ کو ''سُواسا'' یعنی ''خوبصورت کپڑے تیار کرنے والا'' اور ''اُرناوتی'' یعنی ''اُون پیدا کرنے والا'' کہا گیا ہے۔ اس میں یوں درج ہے کہ سندھ میں کپڑے کی بہتات تھی (منڈل ۱۰، ۷۵، ۸)۔ آج بھی تھر میں کھیس، لوئیاں اور کملیاں بڑی تعداد میں اور نہایت عمدہ بُنتی ہیں۔ اُن دنوں وادیٔ سندھ میں بہت ٹھنڈ پڑتی تھی، اس لئے زیادہ تر اونی کپڑا استعمال ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے بھیڑیں اور گھیٹے زیادہ پالتے تھے۔[1]

رگ وید میں ''کرپاس'' (کپاس، روئی) لفظ استعمال نہیں ہوا، لیکن اس کے لئے یوں نہیں کہا جائیگا کہ وادیٔ سندھ کے باشندوں کو کپاس اور سوتی کپڑے کا کوئی علم نہیں تھا۔ اسی طرح

(1) "Who bestowes easily obtained happiness on our steed, our rams, our ewes, our men, our cows." Wilson's Reg Veda, III, p. 276.

اگر رگ وید میں ''ہاتھ'' اور ''پاؤں'' الفاظ استعمال نہیں ہوئے تو اس کا مطلب نہیں کہ لوگوں کے ہاتھ پیر تھے ہی نہیں۔ مہن جو دڑو سے دیسی کپڑے سے بنا ململ کا ٹکڑا ملا ہے۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے سر جان مارشل لکھتے ہیں کہ وادیٔ سندھ میں سوتی کپڑا بننے کا رواج ۵۰۰۰ برس ق۔م شروع ہو چکا تھا۔ سندھ کی ململ قدیم زمانے میں مصر ملک اور یورپ میں بھی فروخت کے لئے جاتی تھی۔ وادیٔ سندھ کی آب و ہوا ایسی ہے، جو سال کا بڑا حصہ سوتی کپڑے پہننے پڑتے ہیں، اس لئے ڈاکٹر میوئر نے بھی اسی رائے کا اظہار کیا ہے کہ رگ وید والے زمانے میں ہی لوگوں کو سوتی کپڑے کا علم تھا۔(1)

رگ وید میں ریشم کے لئے بھی کوئی بھی لفظ تا حال کسی سنسکرت عالم کو نظر نہیں آیا، لیکن چونکہ راماین اور مہا بھارت میں درج ہے کہ رانیاں، راجکماریاں، اور صاحب ثروت لوگوں کی بیویاں قیمتی اچھے ریشمی کپڑے پہنا کرتی تھیں، تو پھر یوں سمجھ میں آتا ہے کہ ریشمی کپڑے بنانے کا ہنر رگ وید والے زمانے میں ہی شروع ہوا تھا، جس میں اتہاسوں والے زمانے میں، لوگوں نے مزید اصلاح اور اضافہ کیا۔ اتنا ضرور کہا جائیگا کہ رگ والے اوائلی زمانے میں زیادہ ٹھنڈ پڑنے کے سبب اول اونی کپڑے پہننے کی ضرورت ہوئی تھی، اور بعد میں آب و ہوا تبدیل ہونے کی وجہ سے سوتی اور ریشمی کپڑے پہننے کا رواج جاری ہوا۔

سندھ میں آج بھی جوان لڑکیاں اور نوجوان لڑکیاں قیمتی اچھے لباس پہنتی ہیں، اور سنگھار کرتی تھیں، تو پہلے بھی اس بات کی کمی نہیں تھی۔(2) رگ وید کے منڈل تیسرے، (۲،۳۹) اور پانچ، (۲۹، ۱۵) میں درج ہے کہ عورتیں اچھے اچھے لباس پہنا کرتی تہیں۔ منڈل چوتھے، (۲،۳) میں یوں بھی کہا گیا ہے کہ عورتیں اس لئے اچھا خاصا لباس پہنا کرتی تھیں کہ اپنے شوہروں کو مزید خوبصورت نظر آئیں! منڈل پانچویں (۵۵، ۶) میں ''ہیرن میان اَنکان'' (Hirann ayanatkan) الفاظ استعمال ہوئے ہیں، جس کے معنی ہیں ''زری سے بھرت بھرے ہوئے کپڑے!''۔ اس سے یوں لگتا ہے کہ صاحب ثروت لوگ جو کپڑے پہنتے تھے، ان کے کنارے پر زری کی پٹی لگاتے تھے، جو وقت پر اتار کر رکھتے تھے۔ منڈل ۲ (۶،۳)، منڈل ۴ (۳۶، ۷) اور ۷ (۳۴، ۱۱) میں ''پیش'' لفظ استعمال ہوا ہے جس کے بھی یہی معنی ہیں کہ

(1) It is difficult to conceive that cotton (which, as we learn from prefessor J.H.Balfour, is supposed to have been indigenious in India), though not mentioned in the hymns, should have been unknown when they were composed, or not employed for wearing the light cloth which is necessary in so warm a climate. Dr. Muir; Original Sanskrit, Tests V. P. 462.

(2) Considerable attention was already paid to personal decoration. Ibid . p. 462.

''بھرت بھرا ہوا یا گلکاری والا کپڑا''۔ یجروید میں ''پیش کاری'' لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے معنی ہیں ''بھرت بھرنے والی''۔ شاید کن عورتوں کا پیشہ یہی ہوتا تھا، جو بھرت بھرنے کا کام کرتی تھیں۔ یہ بھرت بھرنے کا کام اتنا قیمتی اور اچھا ہوتا تھا، جو لوگ خلعتیں بنوا کر دوسروں کو تحفتاً دیتے تھے، اور انہیں عمدہ لباس پہنواتے تھے۔ رگ وید میں ان باتوں کا جہاں تذکرہ ہے، ان کی تشریح کرتے ہوئے، پروفیسر ولسن، جس نے رگ وید کا ترجمہ کیا ہے، کہا ہے کہ ''اگر میرا ترجمہ صحیح ہے تو پھر کہا جائیگا کہ خلعت پہنانے کا رواج ہی ہندستان سے جاری ہوا، اور یہ رواج نہایت ہی قدیم ہے''۔(1) قدیم راجا رشیوں کو خلعتیں پہناتے تھے، اس بات کا رگ وید میں کئی مقامات پر تذکرہ ملتا ہے۔ مثلاً: سندھ کے راجا سونیہ بھاویہ اپنے داماد کاکشون رشی کو خلعت پہنائی تھی۔ یہاں یہ بھی درج کرنا ضروری ہے کہ جو وقت رشی گھر میں گذارتے تھے، وہ وقت اچھے اچھے طعام کھاتے تھے اور اچھے اچھے کپڑے پہنا کرتے تھے، لیکن جس وقت رشی، راجا اور دیگر لوگ دنیا ترک کرکے، جنگل میں جا کر زندگی گذارتے تھے، اس وقت ہرن کی کھال اور تھمبیا (صراحی جیسا برتن) اپنے ساتھ لے جاتے تھے، اور ''ولکل'' پہنتے تھے۔ یہ ہوئی تارک دنیا والوں کی پوشاک؛ باقی سب لوگ قیمتی اچھے کپڑے پہنا کرتے تھے۔ مطلب یہ کہ جس زمانے میں کئی قوموں کو ابھی اپنا جسم ڈھانکنے کی خبر تک نہیں تھی، اس زمانے میں وادیٔ سندھ کے باشندے اس قدر ترقی کر چکے تھے کہ شاہی لباس پہنتے تھے، اور دوسروں کو بھی خلعتیں پہنایا کرتے تھے!

مردوں اور عورتوں کے لباس میں کیا فرق ہوتا تھا، یہ بات رگ وید میں درج نہیں ہے۔ تاہم، یہ پتہ چلتا ہے کہ مرد تین کپڑے پہنتے تھے: ایک کپڑا ''نیوی'' (Nivi) کہلاتا تھا، جو ان کی قمر سے باندھا رہتا تھا، جس وجہ سے سمجھا جاتا ہے کہ ''کوپین'' یا ''لنگوٹی'' باندھتے تھے۔ دوسرا کپڑا تھا دھوتی اور تیسرا تھا چادر، جسے ''اَدھی واس'' یعنی ''اوپر سے اوڑھنے کا کپڑا'' کہتے تھے۔(2) سنگالی آج تک دھوتی اور چادر پہنتے ہیں اور یہ ویدک زمانے کا دستور ہے۔ ہمارے بھائیبند بھائی بھی دھوتی باندھتے ہیں، لیکن جو انگرکھا (جسم پر اڑھنے کے لئے کپڑا) اوڑھتے ہیں، وہ مہا بھارت والے زمانے کے رواج کے مطابق ہے۔ ہمارے جو جوان سوٹ بوٹ پہنتے ہیں، وہ دھوتی باندھنا گھٹیہ کام سمجھتے ہیں، لیکن دھوتی کوئی گھٹیہ چیز نہیں۔ کئی یورپی

(1) If the rendering be correct, this shows the custom of pressing honorary dresses to be of Indian, and of origin considerable antiquity. Wilson's Reg Veda, III, P. 277.

(2) پوپاک صاحب نے لکھا ہے کہ ''قدیم یونانی لوگ ہندوؤں کی طرح دھوتی باندھتے تھے، اور کندھوں پر چادر ڈالتے تھے''۔ وہ طرف ہندوؤں ہی نے آباد کیا تھا، اس لئے ہندو رواج وہاں عام ہوئے تھے۔ مصنف

علماء نے اس کی تعریف کی ہے۔ مثلاً: کرنل میڈوز ٹیلر دھوتی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دھوتی سے زیادہ کوئی دوسری آسان، باسہولت پوشاک، جس میں چلنا، بیٹھنا اور سونے میں آسانی ہو، وہ بنانا ہی ممکن نہیں۔ [1] یہ بات کرنے سے ہماری مراد یہ ہے کہ قدیم لوگ صرف خوبصورتی کے پیچھے نہیں ہوتے تھے؛ لیکن پوشاک میں بھی آسانی اور سہولت کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ اتھرو وید کے منڈل پندرہویں، (۱۰۲) میں ''اُشنیش'' (Ushnisha) لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے معنی ہیں ''پٹکہ'' یا سر اوڑھنے کے لئے کپڑا۔ اس سے سمجھا جاتا ہے کہ پٹکہ باندھنے کا رواج بھی ویدک زمانے میں ہی تھا۔

عورتیں پہلے شاید چڈی استعمال نہیں کرتی تھیں۔ نل دمیتی والی کہانی سے معلوم ہوتا ہے کہ دمینتی کو صرف دو کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ رامائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت (تریتا جگ میں) بھی عورتیں صرف دو کپڑے پہنتی تھیں: ساڑھی نیچے اور چادر اوپر۔ مہا بھارت میں لکھا ہوا ہے کہ دریودھن نے جب دروپدی کو بھری محفل میں بلا رہا تھا، تب اس نے جانے سے انکار کر دیا، اور کہا کہ میں ''ایک وستر'' ہوں، یعنی جسم پر صرف ایک ہی کپڑا ہے۔ اس قسم کے حقائق سے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ عورتیں ایک کپڑا نیچے سے اور دوسرا اوپر سے (چادر) اوڑھتی تھیں، اور گھر میں چادر پہن کر نہیں بیٹھتی تھیں، اس لئے گھر میں ''ایک وستر'' ہوتی تھیں۔ آج بھی خوبصورت عورتیں صرف ایک کپڑا (چادر یا دوپٹہ) نیچے سے باندھ کر، گھر میں پوچھ جھاڑو کرتی ہیں، اور چھاتی ان کی برہنہ ہوتی ہے، تو اس بات کی فکر نہیں کرتی ہیں۔ باہر جانے کے وقت شاید زری کے کنارے والی ساڑھی باندھتی ہونگی، کیونکہ لوگوں نے ترقی کر کے زری اور بھرت کا رواج جاری کیا تھا۔ انگرکھوں پہنے کا رواج اتہاسوں والے زمانے میں پڑا، اس کے بعد بھی مرد زیادہ تر دوھتی یا چادر اوڑھتے تھے، اور دونوں کپڑوں کی اکثر مول مڑی ہوئی نہیں ہوتی تھی۔

زیور: مہن جودڑو والے زمانے، خواہ رگ وید والے زمانے میں، عورتیں اور مرد عام طرح زیور پہنتے تھے۔ آج بھی کئی ایک کچھی، مارواڑی اور دیگر مرد حضرات گلے میں سونے یا چاندی کی ہسی، کانوں میں بالیاں اور بازوں پر پٹے پہنتے ہیں۔ انگوٹھیاں اور چھلے پہننے کا رواج تو عاملوں خواہ بھائیبندوں میں عام ہے۔ پہلے بھی اسی طرح تھا۔

اس وقت جس طرح سونے کی گنیاں اور ڈالر ہیں، اسی طرح رگ وید والے زمانے میں بھی سونے کے سکے ہوتے تھے، جو ''نشک'' (Nishka) کہلاتے تھے۔ ان کا وزن ایک جیسا

---

(1) "Anything more convenient to walk, to sit, or to lie in, it would be impossible to invent." Col. Meadows Taylor; Endinburg Review for July, 1867.

نہیں ہوتا تھا، لیکن عام طور پر ان میں سولہ ماسے یا سوا تولا سونا ہوتا تھا۔ جس طرح آج کل کچھ عورتیں گینیوں کے ہار پہنتی ہیں اسی طرح پہلے نشکوں کا ہار پہنتی تھیں، جو ان کی چھاتی تک لٹکتا رہتا تھا، اس لئے اسے چھاتی کا زیور کہا گیا ہے۔ عام طرح یہ ''نشک گریو'' (Nishka Griva) یعنی گلے کا نشک کہلاتا تھا (منڈل پانچواں، ۱۹، ۳)۔ دوسرا ایک زیور دری یا لکری کی طرح ہوتا تھا، جو چھاتی پر لٹکتا رہتا تھا۔ یہ ''رُکم'' (Rukma) کہلاتا تھا (منڈل پہلا، ۱۶۶، ۱۰، منڈل چوتھا، ۱۰، ۵ اور منڈل پانچواں، ۱، ۵۷، ۵)۔ سندھی لفظ ''سونارو'' در اصل سنسکرت لفظ ''سورن کار'' معنیٰ سونے کا کام کرنے والا ہے، لیکن سنسکرت میں صراف کو ''رُکم کارک'' بھی کہا جاتا ہے، جس کے لفظی معنیٰ ہیں ''رکم بنانے والا'' لگتا ہے کہ رکموں کا رواج نہایت عام ہوتا تھا، اس لیے کئی صراف صرف رکم بنانے کا کام کرتے تھے۔ عورتیں کانوں میں سونے کن یا دُر پہنتی تھیں، جو ''کرن شوبن'' یعنی ''کانوں کی خوبصورتی'' کہلاتے تھے۔ مرد حضرات اپنی پیشانی پر سہرے یا ہار باندھتے تھے، جو پھولوں یا زری سے بنے ہوتے تھے۔ انہیں ''سرج'' (Sraj) کہا جاتا تھا۔ یہ سہرے شاید شادی کے وقت یا دوسرے کن خاص مواقع پر باندھتے تھے، کیونکہ نشکوں اور سرجن بنانے والوں کو فکر ہوتی تھی کہ گاہکوں کو وقت پر بنا کر دیں، تاکہ خوش اسلوبی سے عہدہ برآ ہو جائیں، ورنہ تب تک ان کی نیند حرام ہو جاتی تھی (منڈل آٹھواں، ۴۷، ۱۵)۔

رگ وید میں کئی ایک مقامات پر موتیوں اور قیمتی پتھروں کا تذکرہ ہے (منڈل پہلا، ۳۵، ۴، اور منڈل دسواں، ۶۸، ۱)۔ موتیوں کے ہار لوگ خود تو پہنتے تھے لیکن گھوڑوں کو بھی موتیوں کی کنٹھیاں پہناتے تھے (منڈل دسواں، ۶۸، ۱)۔ ''منکے'' یا جواہروں کا تذکرہ منڈل پہلے، (۳۳، ۸) میں ہے۔ اسی منڈل (۱۲۲، ۱۴) میں ''منی گریو'' (Mani-Griva) لفظ استعمال ہوا ہے، جس سے سمجھا جاتا ہے کہ منکوں کا ہار بنا کر گلے میں پہنتے تھے۔ دولہا شادی میں سونے کے زیور پہنتا تھا، اور خوشبودار پانی اور تیل اور سنگھار کی دیگر اشیاء استعمال کرتا تھا (منڈل پانچواں، ۶۰، ۴)

بالوں کی سجاوٹ: رگ وید والے زمانے میں عورتیں اپنے بالوں کی سجاوٹ علحدہ علحدہ نمونے سے کرتی تھیں۔ بعض بالوں کی بنائی کر کے چار چوٹیاں کرتی تھیں، وہ ان کی پیٹھ پر لٹکتی تھیں (رگ وید، منڈل دسواں، ۱۱۴، ۳)۔ بعض ''اوپش'' بناتی تھیں، یعنی پیشانی پر بالوں کو گھنگھریالہ بنا کر رکھتی تھیں (منڈل پہلا، ۱۷۳، ۶، آٹھواں، ۱۴، ۵، نواں، ۷۱، ۱ اور دسواں ۸۵، ۸)۔ بعض عورتیں اپنے بال اپنے سر پر اس طرح لپیٹ کر رکھتی تھیں، جو گویا کہ کوئی چھوٹی سی گدی ان کے سر پر رکھی ہے۔ بعض بالوں کو لپیٹ کر، سر پر استادہ اور سینگ کی طرح نوکدار کرتی تھیں۔

بالوں کی سجاوٹ کے یہ نمونے اتھرو وید کے منڈل چھٹے، (۲،۳۸) میں بھی درج ہیں۔ منڈل چوتھے میں تو یوں بھی کہا گیا ہے کہ عورتیں بالوں میں پھول لگاتی تھیں۔ مرہٹوں کی عورتیں آج تک بالوں میں پھول لگاتی ہیں۔ ان کو دیکھ کر، سن ۱۹۲۵ع سے کئی سندھی لڑکیاں بھی یوں ہی کرنے لگی ہیں۔ مطلب یہ کہ رگ وید والے زمانے کا رواج اب پھر لوٹ آیا ہے۔ مصنف نے ہوش سنبھالتے دیکھا تھا کہ عورتیں چوٹیہ کی تیں لچھے بنا کر، انہیں بنائی کر کے، ایک ہی لمبی چوٹی کرتی تھیں، اور سر کے بلکل بیچ سے بالوں کو دائیں بائیں کنگی سے موڑ دیتی تھیں۔ تھوڑے برسوں سے بالوں کو علحدہ علحدہ نمونے میں سجانے کا رواج عام ہوا ہے، لیکن اس معاملے میں ہماری لڑکیاں اکثر پارسیوں اور گوریوں کی نقل کرتی ہیں۔

مردوں میں سے بعض لمبے بال رکھتے تھے، تو بعض کٹواتے تھے۔ وشٹ منی کی کل والوں کے بال لمبے ہوتے تھے، (رگ وید، منڈل ساتواں، ۳۳، ۱)، اور وہ سر کے دائیں جانب لپیٹ کر گانٹھ دے دیتے تھے، جس طرح آج کل جوگی کرتے ہیں۔ بعض داڑہی رکھواتے تھے تو بعض منڈواتے تھے (رگ وید، منڈل دسواں، ۱۴۲، ۴)۔ اِندر دیوتا کے نام کہا گیا ہے کہ وہ داڑہی سے تھا، (منڈل دسواں، ۲۳، ۱-۴)۔ پہلے سندھ میں داڑہی رکھنے کا رواج عالموں میں، اور داڑہی منڈوانے کا رواج بھائیبندوں میں عام تھا۔ تھوڑے برسوں سے داڑہی منڈوانے کا رواج عالموں میں بڑھ گیا ہے۔ بعض تو موچھیں بھی منڈوا دیتے ہیں۔ یہ موچھیں صاف کرنے کا رواج انہوں نے حالیہ انگریزوں سے سیکھا ہے۔

راگ اور موسیقی کے آلات: انسان اپنے ذاتی مزاج کی وجہ سے شاعر ہے، اور راگ اس کی روح میں ابتدا ہی سے سمایا ہوا ہے۔ ''راگ'' لفظ کے اصل معنی ہی ہیں ''موج یا روح کی رؤ''۔ راگ نہایت دلپزیر چیز ہے، اور اس میں جادو جیسا اثر ہے، اس لئے نہ صرف آدمی بلکہ جنگلی جانورون کو بھی موہ لیتا ہے۔ سانپ بھی مرلی پر مست ہو جاتا ہے۔ ایسی طاقت اور اثر والا ہنر اول وادیٔ سندھ میں، خصوصاً پنجاب میں شروع ہوا۔ آج تک کہاوت ہے کہ'' راگ نے پنجاب میں جنم لیا اور تھر میں اس کی موت ہوئی''۔ تھری لوگوں کو زیادہ تر راگ کا علم نہیں۔

قدیم آریوں میں سے کئی دریائے سندھ کے کنارے پر بیٹھ کر، سریلی آواز سے ویدوں کے منتر پڑھتے تھے۔ ویدوں کی رچائیں خود اس بات کا ثبوت ہیں کہ ان کے پاس راگ کی بڑی قدر تھی۔[1] قدیم آریوں کے کان ہمیشہ قدرت کی طرف مائل تھے، اور خود قدرت سے انہیں اَندر کا آلاپ سننے میں آتا تھا، جنہیں انہوں نے اُپنشدنوں میں سجایا ہے۔

(1) Cambridge History of India, 1, 103.

سرليءَ من موهن جي، اٺ ئي پهر ٿي وڄي،
ٻڌي ٻن ڪنن سان، ساميءَ ڪين رڄي،
توڙي پران ٿجي، تان پيي ڌن ڌيان ۾.
[دن کے آٹھوں پہر، موہن کی بینا (مرلی) بجتی ہے،
وہ دونوں کانوں سے سنتے ہوئے بھی، گویا نہیں سنتے،
چاہے وہ قریب ہوں یا دور، ان کے دھیان میں دھن رہتا ہے۔]

قدیم ہندوؤں نے راگ میں دن بدن حیرت انگیز ترقی کی۔ ہندو لوگ سال میں چھ موسمیں شمار کرتے ہیں۔ ہر ایک موسم کے لئے انہوں نے ایک خاص راگ تجویز کیا۔ ان چھ راگوں کے نام: بھیرو، ہندول، میگھ، سریراگ، دیپک اور مالکوس ہیں۔ راگوں کو تمثیلی طور پر دیوتا کہنے لگے۔ ہر ایک دیوتا کے نام سے انہوں نے کہا کہ اسے پانچ بیویاں اور آٹھ بیٹے ہیں۔ ان بیویوں کو راگنیاں کہنے لگے۔ راگ اور راگنیوں کو مجسم (Personify) کر کے ہر ایک کی دلکش تصویر اس کے مضمون موافق نکالی۔ مثلاً: بھیرو کو شِو بھگوان کی طرح تین آنکھیں ہیں، اس کی پیشانی پر چاند چمک رہا ہے، اس کے جٹاؤں سے دریائے گنگا بہتی ہے، سر پر اس کے شیش ناگ لپٹا ہوا ہے اور گلے میں کھوپڑیوں کی مالا پہنی ہوئی ہے۔ ہندول سونے ہندورے میں لڑ رہا ہے۔ اس کے چاروں طرف کئی اپسرائیں کھڑی ہیں، جو ہندورے کو ہلا رہی ہیں اور راگ گا رہی ہیں۔

میگھ لفظ کے معنی ہی ہیں بادل، اور اس سے سندھی لفظ ''مینھن'' (برسات) بنا ہے۔ میگھ کا ورن کالا ہے، اس کی پوشاک پیلی ہے، اس کے ہاتھ میں تیز تلوار ہے اور بادل پر سوار ہے۔ عام طور پر یوں کہتے ہیں کہ میگھ راگ اگر کوئی پورے دھیان اور گیان سے گائے، تو یکا یک برسات برسنا شروع ہو جاتی ہے!

سریراگ ایک حسین جوان ہے۔ سفید لباس میں ملبوس ہے۔ لعلوں اور بلوروں کا ہار اس کے گلے میں ہے، اور وہ اپنے ہاتھ میں کنول پھول لیے ہوئے ہے۔

''دیپک'' لفظ وہ ہے جس سے سندھی لفظ ''ڈیئو'' بنا ہے۔ دیپک آگ کی طرح چمکیلے کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ اس کی پیشانی سے آگ کے شعلے نکل رہے ہیں، اور ایک مست ہاتھی پر سوار ہے۔ کہتے ہیں کہ دیئے میں تیل اور بتی ڈال کر، کوئی پوری توجہ سے دیپک گائے گا تو دیئہ خود بخود جلنا شروع ہو جائے گا! کچھ تو یوں بھی کہتے ہیں کہ یہ راگ کوئی پوری توجہ سے گائے تو آگ کے شعلے اس کے اندر سے نکل کر اسے خود کو جلا کر ختم کر دیں!

مالکوس ایک ہٹا کھٹا جوان ہے۔ اس کے چہرے سے خون چھلکتا ہے، اس کی آنکھیں نشے میں مخمور ہیں، اور اس کے ہاتھ میں لاٹھی ہے۔ اس کا لباس نیلا ہے، اور اس کے گلے میں موتیوں کی مالا پہنی ہوئی ہے۔

قدیم یونانیون نے بھی اسی طرح راگوں کی اقسام کو مجسم کیا ہے۔ اتنا ہے کہ ہر کسی ملک اور قوم کے گانے والوں کا نمونہ اپنا اپنا ہے۔ انگریزی راگوں سے بعض کو مزہ آئیگا تو بعض کو نہیں بھی آئیگا۔ اسی طرح ہندستان کا راگ بھی کسی کو اچھا لگے گا، تو کسی کو اچھا نہیں لگے گا۔ باقی ہر ایک قوم کو اپنا اپنا راگ نہایت ہی اچھا لگتا ہے۔ ہر ایک قوم اور ہر ایک ملک میں راگ کے بڑے بڑے استاد گزرے ہیں۔ ہندستان میں ایسے بڑے استادوں میں سے تان سین نہایت معروف گویہ گزر چکا ہے۔

پنجاب اور سندھ کے قدیم باشندے ساز بجانے میں بھی ماہر تھے۔ ساز لے کر ''سامن'' گاتے تھے، جو الاہی محبت کے راگ ہوتے تھے۔ بعض ''گاتھا'' گاتے تھے، جس کا تلفظ سندھی میں ہے۷ ''گاھ''۔ سندھ جہاں کہیں بھگت لگاتے ہیں، تب کوئی قصہ یا کہانی سناتے ہوئے درمیان میں بیت سُر سے گاتے ہیں، جنہیں ''گاہیں'' کہتے ہیں۔

چونکہ یہ ویدک لفظ ہے، اس لئے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ یہ گاہیں دینے کا دستور نہایت قدیم زمانے سے ہے۔ گاہیں دینے والے کو ''گاتھن'' کہتے ہیں۔ لگتا ہے کہ کئی لوگ مل کے گاہیں دیتے تھے، یا ایک گاہیں دے کر خاموش ہو جاتا تھا تو دوسرا شروع کرتا تھا۔ جو اول گاہیں دیتا تھا، وہ ''گاتھانی'' یعنی گاہ چلانے یا شروع کرنے والا کہلاتا تھا (رگ وید، منڈل پہلا، ۱۹۰، ۱، اور منڈل آٹھواں ۹۲، ۲)۔ گاہوں میں اگرچہ مذہبی امور سے متعلق مضموں ہوتا تھا، پھر بھی وہ ویدوں کے رچاؤں میں شامل نہیں ہیں (ائتر ییہ براہمن ۷، ۱۸)۔ کن رشیوں کو راجاؤں سے دان ملتے تھے، تو وہ ان کی سخاوت کے راگ گاتے تھے۔ انہیں ''دان اُستیاں'' یا سخا کی تعریفیں کہا گیا ہے، اس لئے یہ ''تعریفی شعر'' (Panegryic Poetry) کہا جائیگا۔ سوم رس انگلیوں سے نچوڑنے کے وقت سات عورتیں مل کر سوم رس کی تعریف میں گیت گاتی تھیں (منڈل نواں، ۶۶، ۸)۔ یہ گیت بھی مدیحی شعر کے طور پر شمار ہیں۔ رگ وید کی کچھ رچاؤں میں جنگیوں کا تذکرہ ہے۔ یہ رچائیں ''رزمیہ شعر'' (Epic poetry) کے طور پر شمار ہیں۔ کن رچاؤں مین شادی وغیرہ اور دیگر باتوں کا تذکرہ ہے۔ یہ بیانی شعر (Descriptive Poetry) کے طور پر شمار ہیں۔ اسی طرح ویدوں کی رچاؤں کو ان کے مضامین کے حساب سے الگ الگ طبقات میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

اسی قدیم رواج کے مطابق سندھی کا موجودہ شعر بھی الگ الگ مضامیں سے متعلق ہے، اور اس

کے گانے کا شوق ساری سندھ میں ہے۔ سکھر ضلع میں یہ شوق سب سے زیادہ ہے، اس میں بھی شوقین شہر شکارپور، راگ خواہ ساز بجانے کے ہنر میں ماہر ہے۔

قدیم لوگ جنگ خواہ صلح کے دوران، ایک قسم کا ڈھول یا نغارہ بجاتے تھے، جسے ''دُندُبھی'' (Dundubhi) کہتے تھے۔ (منڈل پہلا، ۲۸، ۵ اور چھٹا، ۴۷، ۲۹۔۔۳۱)۔ دوسرا بجانے کا ساز ایک بین کی طرح کا سا ہوتا تھا، جسے ''کرکری'' (Karkari) کہتے تھے (منڈل دوسرا، ۳۵، ۱۳)۔ وینیں (ایک ساز کی قسم) بھی بجاتے تھے (منڈل پہلا، ۸۵، ۱۰)۔ رگ وید کے منڈل دسویں، (۱۴۶، ۲) میں ''آگھاٹی'' لفظ استعمال ہوا ہے۔ پروفیسر منکڈونیل اور کیتھ نے لکھا ہے کہ ناچ کے وقت کنجھیاں (ایک ساز کی قسم) بجاتے تھے، انہیں آگھاٹیاں کہتے تھے، لیکن شاین آچاریہ، جس نے ویدوں کی شرح کی ہے، اس کے خیال میں یہ وینے (بینا) تھے، جن میں سے علحدہ علحدہ سُر نکالتے تھے۔ یہ ساری باتیں اس بات کا بتہ دے رہی ہیں کہ وادیٔ سندھ کے قدیم باشندوں کے پاس اچھی خاصی رونق لگی ہوئی ہوتی تھی۔

ناچ: سنسکرت لفظ ''نرتیہ'' کا تلفظ سندھی میں تبدیل ہوکر ہوا ہے ''ناچ''۔ رگ وید والے زمانے میں عورتیں خواہ مرد ناچتے تھے، لیکن ایسا کوئی ثبوت نہیں ہے جس سے سمجھا جائے کہ دونوں مل کر ناچتے تھے۔ شری کرشن نے بچپن میں گوپین سے راس لیلا کی تھی، اس سے سمجھا جاتا ہے کہ لڑکیوں اور عورتون کے ناچ میں صرف چھوٹے لڑکے شامل ہو سکتے تھے۔ رگ وید کے منڈل پہلے، (۱۰،۱) میں درج ہے کہ بانس کی لکڑیاں سیدھی کھڑی کر کے ناچ کیا کرتے تھے۔ لگتا ہے کہ جس طرح گجرات میں لڑکیاں اور عورتیں ڈانڈیاں ہاتھ میں پکڑ کر ''گربہ'' کرتی ہیں، اسی طرح پہلے بھی کرتے تھے۔ ناچ کرنے والے مرد کو ''نرت'' (nrta) اور ناچ کرنے والی عورت کو ''نرتو'' (nrtu) کہتے تھے۔ منڈل پہلا، (۹۲، ۴) میں شاید کسی بازاری ناچ کرنے والی عورت کا تذکرہ ہے۔ کیونکہ اس میں درج ہے کہ ''اُسے بھرت بھرا ہوا لباس پہنا ہوا ہوتا تھا، لیکن دوسروں کی توجہ حاصل کرنے کے لئے اپنی چھاتی ننگی کرتی تھی''۔ اچھے گھرانے کی عورتیں اس طرح بے شرمی سے نہیں ناچتی تھیں۔ کیونکہ منڈل آٹھویں (۱۷، ۷، ۲۶، ۱۳) میں درج ہے کہ ''عورتیں خود کو اچھی طرح ملبوس ہوکر، پھر دوسروں کے سامنے آتی تھیں۔ رگ وید میں یوں بھی لکھا ہے کہ ''عورتیں اور کنواریاں لڑکیاں اچھے خاصے کپڑے پہن کر محفلوں میں جاتی تھیں، اور جب زمینیں اور جنگلات ہریالی سے خوش نما نظر آتے تھے، تب لڑکیاں اور لڑکے وہاں جا کر ناچ کرتے تھے۔ لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر، راس ڈالتی تھیں یا چیکلہ لگاتی تھیں، ''تو دھرتی جھوم اُٹھتی تھی اور لوک لٹ میں لٹ جاتے تھے جو وہاں موج سنانے آتے تھے''۔ اس وقت جومٹی اوپر اُٹھتی تھی، وہ ان لوگوں کو لپیٹ لیتی تھی، جو موج سے وہاں آ کر جمع ہوتے تھے۔ اِس دوران کھنجریان اور جھانجھ بھی بجتے تھے۔[1]

(1) Kaegi: The Reg Veda. p. 19.

جھولے: مرد، عورتیں اور بچے بڑے شوق سے جھولوں میں جھولتے تھے، کیونکہ یہ بھی ان کے لئے بڑی تفریح کا سامان تھا (منڈل ساتواں، ۸۷، ۵، ۸۸، ۳،۸)۔ آج بھی دیہاتوں میں کئی بچے بلکہ بڑے بھی کسی درخت میں رسی باندھ کر اس میں جھولے کی طرح جھولتے ہیں۔

میلے اور جلسے: قدیم لوگ کچھ میلے، محفلیں اور جلسے منعقد کرتے تھے، جن میں عورتیں اور مرد حضرات دل بہلانے کے لئے جاکر اکٹھے ہوتے تھے (رگ وید، منڈل پہلا، ۱۲۴، ۸، منڈل چوتھا، ۵۸، ۸، منڈل چھٹا، ۷۵، ۴، اور منڈل ساتواں ۲، ۵)۔ بعض اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے لئے تو بعض روزی کمانے کے لئے وہاں آتے تھے۔ کوی اور شاعر اپنا نام کمانے کے لئے وہاں جاتے تھے (منڈل دوسرا، ۱۶، ۷ اور منڈل نواں، ۴۹، ۴۷)، بعض تیر اندازی میں انعام جیتنے کے لئے تیر کمان لے کر آتے تھے، (منڈل چھٹا، ۷۵، ۳۔۔۵)۔ بعض کشتی لڑتے تھے، (رگ وید، منڈل تیسرا، ۲۰، ۲۰)۔ گھوڑوں پر شرطیں بھی لگتی تھیں، (منڈل نواں، ۹۶، ۹)۔ ایسے یہ جلسے یا میلے رات سے صبح تک جاری رہتے (منڈل پہلا، ۴۸، ۶)۔ جوان لڑکے اور لڑکیاں وہاں ایک دوسرے سے ملتے تھے اور لڑکیاں اپنے لئے وہاں اپنے لئے شوہر منتخب کرتی تھیں۔ (رگ وید، منڈل ساتواں، ۲، ۵، اور اتھرو وید، منڈل دوسرا، ۳۶، ۱)۔ ایسے مواقع پر رنڈیاں اپنی کمائی کے لئے وہاں جاتی تھیں، (رگ وید، منڈل چوتھا، ۵۸، ۸)۔ ایسے جلسے آج تک شمالی ہندستان میں، خصوصاً سولن اور پسی میں ہوتے ہیں، جن میں عورتیں بڑی تعداد میں آکر جمع ہوتی ہیں۔ ان میلوں سے پھر ایک بڑی خرابی پیدا ہوئی۔ حال ہی میں پسی والے میلوں میں عورتوں کو قطار میں کھڑا کرتے تھے، اور جو ان کے لئے اچھی بولی لگاتا تھا، اُسے وہ عورتیں نیلام کر کے دیتے تھے۔ ویدوں والے زمانے کے ''سمن'' (Samana) میں لڑکیوں کو صرف اپنے لئے شوہر تلاش کرنے کا موقع ملتا تھا، لیکن بعد میں اس طرح عورتیں فروخت ہونے لگیں، تو ملکی حاکموں نے ہمت کر کے یہ بد رسم بند کروائی۔

گھوڑے سواری اور گھوڑوں پر شرطیں: رگ وید والے زمانے میں سندھ کا ملک اپنے اچھے گھوڑوں کے سبب بہت مشہور ہوتا تھا، (منڈل دسواں، ۷۵، ۸)۔ عام طور پر لوگ گھوڑے پر سواری کرتے تھے۔ جنگ کے وقت رتھوں میں گھوڑے جوتتے تھے، رتھوں کے اوپر چمڑے کے سرپوش کور ہوتے تھے، جیسا کہ آج کل دھمن اکثر چمڑے کی بنی ہوئی ہوتی ہے۔ جنگی جوانوں کی سواری کے لئے گھوڑے علحدہ ہوتے تھے، جو گرد باد کی طرح اڑتے ہوئے جاتے تھے۔ تفریح کے لئے گھوڑوں پر اور رتھوں پر شرطیں لگاتے تھے۔ رگ وید کے منڈل چوتھے، (۲۴،

۹) اور منڈل دسویں، (۱۵۶، ۱) میں ''آجہ'' (Aji) لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے ایک معنی ہیں ''دوڑ پر شرط لگانا'' اور دوسرے معنی ہیں ''شرط کا میدان''۔ یہ میدان نہایت کشادہ ہوتے تھے، اور ان کا فاصلہ ناپ لیتے تھے، (منڈل آٹھواں، ۸۰، ۸)۔ شرط جیتنے والے کو وہیں انعام ملتا تھا، (منڈل پہلا، ۸۱، ۳)، منڈل چھٹا، ۴۵، ۱، اور منڈل آٹھواں، ۸۰، ۱)۔ شرط کے میدان میں جن گھوڑوں کو دوڑاتے تھے، انہیں دھو کر اچھی طرح انہیں سنگارتے تھے، (منڈل دوسرا، ۳۴، ۳، منڈل نواں، ۱۰۹، ۱۰، اور منڈل دسواں، ۶۸، ۱)۔ رتھوں میں اکثر گھوڑیاں باندھتے تھے، اور وہ نہایت ہی اچھی ہوتی تھیں۔ جیکب آباد اور تلہار میں، جنہوں نے گھوڑوں کی نمائش دیکھی ہوگی، انہیں اچھی طرح سے پتہ ہوگا کہ اس وقت بھی سندھ میں اچھے گھوڑوں اور گھوڑیوں کی کمی نہیں ہے۔ پہلے راجا رشیوں کو گھوڑے اور گھوڑیاں بھی خیرات میں دے دیتے تھے، اس لئے رگ وید میں رشیوں نے ان کی تعریفیں کی ہیں۔

پانسہ کھیل: قدیم لوگوں کے لئے عام طور پر تفریح کا کھیل پانسہ کھیل تھا۔ اسی کھیل کا شوق آج تک ہمارے لوگوں میں آج تک جاری ہے۔ پہلے اُطاقیں بہت ہوا کرتی تھیں، جن میں بیٹھ کر پانسہ کھیل کھیلتے تھے۔ اب بعض لوگ مڑہیوں اور ٹکانوں کو اُطاقیں بنا لی ہیں، جہاں حقہ کی بُڑ بُڑ اور پانسے کی ٹرٹر دن رات سننے میں آتا ہے، اور بھنگ چھاننے کا صافہ بھی سوکھنے نہیں دیتے۔

ویدک زمانے میں جوا کے اڈے عام تھے، جہاں پر جواریوں کے لئے شراب اور کباب کا بندوبست بھی ہوتا تھا (اتھرو وید، منڈل چھٹا، ۷۰، ۱)۔

سنسکرت میں پانسہ کو کہتے ہیں ''اَکش'' جس کے دوسرے معنی ''آنکھ'' کے بھی ہیں۔ اس وقت جو پانسے عام طور پر استعمال ہوتے ہیں، وہ عاج سے بنے ہوئے ہیں، اور ان پر ہندسوں کے نشانات آنکھ کی طرح بنے ہوئے ہیں۔ اتہاسوں والے زمانے میں عاج کے پانسے ہوا کرتے تھے، جن میں دغابازی کر کے شیہہ پگھلا کر بھر دیتے تھے، تاکہ پانسہ اس طرح کی گرے کہ بازی جیتی جا سکے۔ رگ وید کے منڈل ساتویں، (۸۶، ۶) اور منڈل دسویں، (۳۴، ۱) میں پانسوں کے لئے ''وبھیتک'' لفظ استعمال ہوا ہے، جس کا اُچار سندھی میں ہے ''بہیڑ و''۔ آورے، بہیڑے، اور ہریڑیں، ان تینوں کو ملا کر ''ٹپھلو'' (اطریفل) کہتے ہیں۔ اس سے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ پہلے بہیڑوں کا بیج پانسے کے طور پر اِستعمال ہوتی تھا۔ وہ بیج بھورے رنگ کی ہوتی ہیں، اس لئے رگ وید میں پانسے کے لئے ''ببھر و'' (بھورا) لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔

اس وقت پانسہ کھیل میں تین پانسے استعمال ہوتے ہیں، اور ہر ایک پر نشان ہوتے ہیں۔ پروفیسر منکڈونیل اور کیتھ نے لکھا ہے کہ "پانسوں پر ہندسوں کی علامتیں نہیں ہوتی تھیں، جس وجہ سے جیتنے اور ہارنے کا پتہ پانسوں (بج) کی تعداد سے چلتا تھا"۔[1] رگ وید میں "ترپنچشھ" لفظ بھی استعمال ہوا ہے، جس کے لفظی معنی ہیں "چلاکی"۔ کچھ یورپی علماء نے اس کے معنی کیے ہیں "پندرہ" تو کچھ نے کیے ہیں "ترپن"۔ رگ وید کے منڈل دسویں، (۳۴، ۱۸) سے اتنا بھی ظاہر ہے کہ بہت پانسے (کھکھڑیاں) اکٹھے پھینکے جاتے تھے۔ یہ کھیل کس طرح کھیلتے تھے اس کا پتہ رگ وید سے نہیں چلتا، باقی "آدھیدیوں" (Adhidevana) لفظ استعمال ہوا ہے جس کے لفظی معنی ہیں "جس پر کھیل کھیلا جاتے"۔ دوسرا لفظ "دیوان ارین" (Devana Irina) استعمال ہوا ہے، جس کے معنی "جوا کا اڈہ" بھی ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر اناش چندر داس نے لکھا ہے کہ زمین میں تھوڑا سا گڑھا کھودتے تھے، جنہیں ان ناموں سے پکارتے تھے۔[2] اس سے مطابق یہ ایک گولیوں کا کھیل تھا، جس کے لئے زمین میں "بج" کھودتے تھے۔ کچھ یورپی علماء ان الفاظ کے معنی کرتے ہیں "پانسہ کھیل کے لئے تختہ"۔ اس سے پھر یوں سمجھ میں آتا ہے کہ کپڑے سے بنی ہوئی چوپڑ ان دنوں نہیں تھی، لیکن کوئی میز وغیرہ ہوا کرتی تھی، اور اس میز میں کوئی گڑھا ہوا کرتا تھا، جس میں کھکھڑیاں اس طرح جا کر گرتی تھیں، جس طرح "بلیئرڈ" کھیل میں گیند کپڑے کی گتھلیوں میں جا کر گرتے ہیں۔

رگ وید سے اتنا ظاہر ہے کہ اس کھیل کا اصول طاق اور جفت پر تھا، اور جفت والا جیت جاتا تھا۔ جو کھکھڑیاں "بج" میں جا کر گرتی تھیں، ان میں سے اگر "چونک" (چار چار دانے) بنتے تھے، تو اسے "کرت" (Krta) کہتے تھے۔ اگر ٹرٹن (تین دانے اکٹھے) بنتے تھے، اور اسے "تریتا" اور "ہڑن" (دو دانے اکٹھے) کو "دواپور" کہتے تھے۔ اگر "بج" میں کسی کا دانہ ہی ایک گرتا تھا تو وہ دانا "کلی" (Kali) کہلاتا تھا۔ کھیل وہ جیتتا تھا جس کے "کرت" (چونک) گرتے تھے، اور ایک دانہ کم گرنے پر ہار جاتے تھے (منڈل پہلا، ۴۱، ۹)۔ کھیل میں جو بازی پھینکتے تھے اسے "گرھ ــ گربھ" کہتے تھے، (منڈل آٹھواں، ۸۱، ۱، اور نواں ۱۰۶، ۳)۔ کھیل ختم ہونے کے بعد وہ پانسے (کھکھڑیاں) کسی ڈبیہ میں ڈال کر رکھ دیتے تھے، اور وہ ڈبہ "اَکش وپن" (Aksa-Vapana) کہلاتا تھا، یعنی جس میں پانسے یا کھکھڑیاں پھینک کر رکھے جائیں۔ کھیل میں جو

(1) Vedic Index, I. P. 4.
(2) Moses said, "If a man die, having no children, his brother shall marry his wife, and raise up seed unto his brother." St. Matheuw, XXII, 24 ff.
Dr. A.C.Das: Reg Vedic Culture, P.229.

بازی رکھتے تھے، اُسے ''وِج'' کہتے تھے۔ اس جوا میں بہتوں کا خانہ خراب ہو جاتا تھا۔ جوا میں دولت اور مال مویشی تو ہار جاتے تھے، اور بعض اوقات اپنی بیویاں بھی ہار جاتے تھے! لوگوں کو اس جوا کی لت کتنے قدر تھی، اور اس لت کی وجہ سے ان کی کیا حالت ہوتی تھی، ان کے جگر چاق کرنے والے احوال اتہاسوں ملتے ہیں۔ نل دمینتی کا دلسوز قصہ پڑھیں۔ مہا بھارت میں بھی دیکھیں کہ راجا یدھشٹر جیسی دھرماتما پرش جوا میں اپنی راجائی تو کھو بیٹھا، لیکن دروپتی بھی ہار گیا! لیکن یہ بھی تو تھی بعد کی بات۔ خود رگ وید زمانے میں ہی جواریوں کی حالت ہوتی تھی، وہ یہاں رگ وید میں سے درج کیا جاتا ہے، تاکہ جو اس وقت جوا کھیلتے ہیں وہ اس سے سبق سیکھیں۔

جواری کا ارمان: ایک جواری نے، جوا میں اپنا خانہ خراب کر کے، بلکہ اپنی بیوی سے بھی جدا ہو کر بعد میں جس ارمان کا اظہار کیا ہے، وہ رگ وید کے منڈل دسویں، (۳۴) میں یوں درج ہے:

''بہیڑ ون میں سے پیدا شدہ پانسے جس طرح اُلٹ پلٹ ہوتے جاتے ہیں، اسی طرح میرے دل کو خوشی ہو رہی ہے، وہ چکھے مجھے یوں اکسا رہے ہیں، جس طرح سوم رس پر آدمی اکنے لگتا ہے''۔

''میری بیوی نے مجھ سے کبھی کسی قسم کا جھگڑا نہیں کیا، نہ ہی کبھی مجھ سے نفرت کا اظہار کیا، لیکن پانسہ کھیل سے دل لگا کر، میں نے اپنی وفادار بیوی کو نکال دیا ہے''۔

''اپنی ساس کو میری شکل اچھی نہیں لگ رہی، اور میری ساس اب مجھے اپنے پاس آنے نہیں دیتی، تنگی کے وقت جواری کو کوئی تسلی دینے والا نہیں''۔

''جس طرح گھوڑے کی پیٹھ گانٹھ سبب زخمی ہو جاتی ہے، اور اسے کوئی سکون نہیں ہوتا، اسی طرح جواری کے دل کو اس سے زیادہ سکون نہیں''۔

''جس آدمی نے اپنی دولت پانسہ کھیل میں ہرا دی ہے، اس کی بیوی کے پاس دوسرے مرد اسے اکسانے کے لئے جاتے ہیں۔ اس کا (جواری) باپ، ماں اور بھائی پکار کر کہتے ہیں کہ ''ہم اسے جانتے تک نہیں، بلاشک باندھ کر اسے لے جاؤ''۔

''میرے دوست و احباب مجھ سے علحدگی اختیار کر کے مجھے چھوڑ کر چلے گئے ہیں، اس لئے عہد بھی کروں تو آئندہ پانسہ کھیل نہیں کھیلوں گا، لیکن جب جواری بھورے چکھے پھینکتے ہیں، اور پانسوں سے آواز پیدا ہوتی ہے، تب جوا کے اڈے کی طرف میں اس طرح قدم اُٹھا کر جاتا ہوں، جس طرح کوئی عورت اپنے آشنا کی طرف جائے''۔

''آدمی کیسا بھی شوخ سے شوخ ہوگا، تو بھی پانسے اس کے غضب سے ڈر کر، اس کے سامنے سر نہیں جھکاتے، لیکن خود راجا بھی آ کر پانسوں کے سلامی ہوتے ہیں''۔

''پانسے زیر و زبر ہوتے جائیں۔ انہیں ہاتھ نہیں ہیں، لیکن جن کے ہاتھ ہیں ان پر وہ غالب آ جاتے ہیں''۔

''یہ پانسے انگاروں کی طرح ہیں، جو خود اگرچہ ٹھنڈے ہیں، تو بھی دل کو لو لگا دیتے ہیں''۔

''جواری کی ڈتڑی ہوئی بیوی پریشان ہے، اور یہ ہی حال ہے اس ماں کا، جسے پتہ ہی نہیں، کہ اس کا بیٹا جاتا کہاں ہے''۔

''جواری پر قرض چڑھا ہوا، اور اسے پیسے کی ضرورت، وہ رات کو ڈرتا اور کانپتا ہوا دوسروں کے گھروں کی طرف (چوری کرنے کی خاطر) جاتا ہے''۔

''جواری جب دیکھتا ہے، دوسری عورتیں اپنے اپنے گھروں میں سکھی ہیں، تب اپنی بیوی کی بری حالت دیکھ کر، اس کی جان جل جاتی ہے، لیکن صبح کو پھر جا کر پانسہ سے کھیلتا ہے، اور رات کو جس وقت چولہے کی آگ بجھ جاتی ہے، اس وقت تک خود بھی زبوں حالت کو جا کر پہنچتا ہے۔''

''کبھی بھی پانسہ کھیل نہیں کھیلا کرو۔ کھیتی باڑی کرو۔ جو ملکیت تمہارے پاس ہے اس پر راضی رہو، اور یوں سمجھو کہ وہ آپ کے لئے کافی ہے۔ قابلِ پرستش سوتر دیوتا (سورج دیوتا) مجھے یوں کہہ رہا ہے کہ ''اے جواری، لے یہ تمہاری گائیں، اور لے یہ تمہاری بیوی، ان کو سنبھال لو''۔

یہ مضموں نہایت نصیحت آمیز ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ اس سے یہ پتہ بھی چلتا ہے کہ جس رشی نے یہ لکھا ہے، اس نے انسانی مزاج کا اچھی طرح مطالعہ کیا ہے۔

بیوی کے زندہ ہوتے ہوئے دوسری بیوی لانے کا رواج: جوا کی علت کے علاوہ ایک اور بری رسم جو آج تک ساری ہندو ذات پر ایک کوڑہ کا داغ ہے، وہ ہے بیوی کے زندہ ہوتے ہوئے دوسرے بیوی لانے کی رسم۔ اس بد رسم کی بنیاد ہے غلامی، جو خود ایک بد رسم ہے۔ پہلے جنگ میں گرفتار شدہ عورتوں کو غلام بنایا جاتا تھا، اور وہ ملکیت سمجھی جاتی تھیں۔ بہت زیادہ بیویاں رکھنے کا رواج اسی طرح پڑا۔ رگ وید والے زمانے میں اکثر بڑے صاحب ثروت لوگ زیادہ بیویاں شادی کر کے لاتے تھے، منڈل ساتواں ۱۸، ۷، اور منڈل دسواں ۹۵، ۶)۔ کچھ کم ذات بھی دو دو تین تین شادیاں کرتے تھے، کیونکہ گرفتار شدہ عورتیں فروخت بھی ہوتی تھیں۔ تاہم، درمیانی طبقے کے لوگ ''ایک پتنی ووّاہ'' یعنی ایک بیوی رکھنا (Monogamy) کو پسند کرتے تھے، جس طرح کاکشون رشی سندھ کے راجا سونیہ بھاویہ کی دس بیٹیوں سے شادی کی

تھی۔ بہت شادیاں کرنے سے گھر جنسی کرہن (جھگڑے) کا اکھاڑہ بن جاتا ہے۔ اس لئے کئی رشیوں کا عام طور پر خیال تھا کہ گھریلو سکھ تب ہے، جب مرد صرف ایک بیوی رکھتا ہے۔ (رگ وید منڈل تیسرا، ۵۳، ۶)۔ بعض نے یہ بھی اعلیٰ آدرش سامنے رکھا کہ فقط ایک ہی بیوی رکھی جائے اور اسی سے ہی ناتہ جوڑے رکھا جائے، اور دوسری عورتوں کو ماں بہن کے طور پر سمجھا جائے۔ اسی سبب آج تک ایک کہاوت ہے کہ "ایک ناری سدا برہمچاری"، یعنی جو مرد صرف اپنی ایک بیوی سے گزارا کرتا ہے، وہ گویا ہمیشہ برہمچاری ہے۔ لوگوں میں اگرچہ یہ خیال عام بھی تھا، تب بھی "بہو پتنی وواہ" یعنی زیادہ بیویاں رکھنے کی رسم (Polygamy) پھر بھی جاری رہی۔ رامائن والے زمانے میں راجا دسرتھ کے گھر میں سوتن پنے ایسی حالت پیدا کر دی، کہ خود اپنے مربلی بیٹے شری رامچندر کو چودہ برس بنواس بھگتنے پڑے، اور جدائی میں اپنے پران تیاگ گیا! ایسی مثالیں ہوتے ہوئے بھی لوگوں نے ایسی بد رسم کبھی نہیں چھوڑی۔ ہندوؤں کے شاستروں میں زیادہ بیویاں رکھنے سے منع نہیں ہے۔ حکومت نے ہندوؤں کے لئے جو قاعدہ وضع کیا ہے، وہ سارا ہندوؤں کے شاستروں اور روجوں پر مبنی ہے، اس لئے بیوی کے زندہ ہوتے ہوئے دوسری بیوی لانے کی قانون کے مطابق کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ اس کے باوجود بہت لوگ اس رسم کو ٹھکرانے لگے، اس لئے سندھ میں، خواہ دوسرے کئی مقامات پر اس رسم پر کچھ پابندیاں عائد کی گئیں۔ کئی برسوں سے عام رواج یہ ہے کہ کوئی بھی شخص ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسرے بیوی اُس صورت میں لا سکتا ہے جب:

۱- بیوی بلکل پاگل ہو، اور اسکے ٹھیک ہونے کی امید بلکل نہ ہو۔

۲- کوڑھ یا اس طرح کا کوئی دوسرا خوفناک مرض اس میں ہو، اور اس سے شفایاب ہونے کی امید بلکل نہ ہو۔

۳- بیوی بنجر ہو، اور اپنے شوہر کو دوسری شادی کرنے کی اجازت وہ خود دے اور

۴- بیوی صرف بیٹیوں ہی کو جنم دیتی ہو، اور اپنے شوہر کو دوسری شادی کرنے کی خود اجازت دے، کہ بلاشک دوسری بیوی سے بیٹا پیدا کرے۔

جسے ان چار اسباب میں سے کوئی سبب نہیں ہے، وہ ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسرے شادی نہیں کر سکتا۔

پنچایتوں نے اس طرح کی بندشیں لاگو کیں، اس کے بعد بھی کچھ لوگ باز نہیں آئے۔ ان کی پنچایتوں نے ان پر مقدمے درج کیے، کہ انہوں نے دستور کے برخلاف شادی کی ہے، اس لئے یہ شادی رد و باطل قرار دی جائے۔ کچھ لوگ ایک نہ دوسرا سبب دے کر اپنی جان چھڑا گئے، تو

کچھ حالات میں پنچایتوں نے بھی معافی دینا ضروری سمجھا۔ اب مزید برآں یہ کوشش جاری ہے کہ اس بد رسم کو قاعدے کی چھری سے سرے سے کاٹ دیا جائے۔ اس کے لئے ایک مسودہ حکومتِ ہند کی قاعدہ ساز کاؤنسل میں پیش ہوا ہے۔ اگر یہ بحال ہو جائیگا، تو سارے ہندستان کے ہندوؤں کا اس میں بھلا ہو جائیگا۔

اولاد کا ماں کے نام پیچھے پکارا جانا: پہلے عام طور پر راجا، رشی اور دیگر زیادہ بیویاں شادی کرتے تھے، تو اس رواج سے ایک اور رواج نے جنم لیا، جو اس وقت عجیب لگ رہا ہے۔ اس وقت ہر کوئی اپنے باپ کی اولاد کہلاتا ہے، لیکن پہلے ہر کوئی اپنی ماں کی اولاد کہلاتا تھا، اس لئے سمجھنا آسان ہوتا تھا کہ باپ کی کس بیوی سے پیدا شدہ ہے۔ کاکشون نامی ایک رشی نے سندھ کے راجا سونیہ بھاویہ کی دس بیٹیوں سے شادی کی تھی۔ اس رشی کے باپ کا نام ''درگھ تمس'' (Drigha - Tamas) یعنی ''لمبا اندھیرا'' تھا، اور اس کی ماں کا نام ''اوشج'' تھا، اس لئے رگ وید میں کاکشون رشی ''اوشج'' یعنی اُشج کا بیٹا کہا گیا ہے۔ اس طرح کی اور بھی کئی ایک مثالیں ہیں۔ مثلاً: ''اُنجنیہ'' معنیٰ ''انجنا کے بیٹے''۔ یہ طریقہ دیوتاؤں اور دیتوں سے بھی لاگو کیا گیا۔ مثلاً: ''آدتیہ'' معنیٰ آدتی کے بیٹے (سورج دیوتا وغیرہ)، اور ''دئتیہ'' (دیت) معنیٰ دتی کے بیٹے۔ یہ رگ وید والے زمانے کا رواج بعد میں بھی جاری رہا۔ راجا دسرتھ کا بیٹا شری رامچندر، راجا رگھو کی نسل سے تھا، اس لئے اپنے اس جد امجد کے نام پیچھے ''رگھوپتی'' یعنی رگھونسل کا مالک تھا، اور ''راگھو'' یعنی راجا راگھو کی اولاد کہلانے میں آیا۔

''رگھوپتی، راگھو، راجا رام،
پتت پاون، سیتا رام''۔

شری رامچندر، راجا دسرتھ کو رانی کوشلیا سے پیدا ہوا تھا، اس لئے ''کوشلیہ'' یعنی کوشلیا کا بیٹا بھی کہا گیا ہے۔ اس کا بھائی لچھمن ''سمتریہ'' یعنی رانی سُمترا کا بیٹا، کہا گیا ہے۔ مطلب یہ کہ تینوں بھائیوں کا باپ ایک ہی تھا، لیکن مائیں الگ الگ تھیں، اس لئے اپنی اپنی ماں کے نام پیچھے بھی پکارے جانے لگے تھے۔

مہا بھارت سے معلوم ہوتا ہے کہ ارجن راجا پانڈو کا بیٹا تھا، اس لئے ''پانڈو'' یعنی راجا پانڈو کا بیٹا کہلاتا تھا، لیکن اس کی ماں کا نام ''کنتی'' تھا، اس لئے ''کونتیہ'' اور ''کنتی نندن'' بھی کہلاتا تھا۔ کنتی کا دوسرا نام ''پرتھا'' تھا، اس لئے شریمد بھاگوت گیتا میں ارجن کا دوسرا نام ''پارتھ'' یعنی پرتھا کا بیٹا لکھا ہوا ہے۔ اس طرح اتہاسوں والے زمانے میں دونوں نمونے رائج

تھے، یعنی ہر کوئی باپ خواہ ماں کے نام پیچھے پہچانا جاتا تھا۔ اس سے بہت بعد میں ہر کوئی صرف اپنے باپ کی اولاد شمار ہونے لگا، بھلے وہ باپ کی کسی بھی بیوی سے پیدا ہوا ہو۔ کچھ علماء کا کہنا ہے کہ یہ دراصل دراوڑوں کا دستور تھا، جسے قدیم آریوں نے بھی اختیار کیا تھا۔ کسی بھی صورت میں یہ پکی بات ہے کہ زیادہ بیویاں شادی کرنے کے رواج کے سبب یہ رواج جاری ہوا، اور پھر جس طرح ایک بیوی شادی کرنے کا رواج عام ہوا، اسی طرح یہ رواج کم ہوتا چلا گیا، اور اب بلکل ہے ہی نہیں۔

مردوں کا دوبارہ شادی کرنا: زیادہ بیویاں شادی کرنے کے بجائے فقط ایک بیوی رکھنے کا رواج عام ہوتا چلا گیا، تو اتنا ہوا، کہ جس کی پہلی بیوی وفات پا جاتی تھی، وہ دوسری شادی کرتا تھا۔ دوسری بیوی بھی وفات پا جاتی تھی تو کسی کو تیسری اور چوتھی بیوی شادی کرنے سے منع نہیں تھی، اور یہی رواج آج تک جاری ہے۔ اکثر سالی سے شادی کرنا روا سمجھا جاتا تھا، کیونکہ سالی ایک ہی گوتر میں سے نہیں ہوتی۔ اگر کسی کو پہلی بیوی میں اولاد ہوتا تھا تو بچوں کی وہ خالا اپنے بھانجوں اور بھانجیوں کو کم توجہ نہیں دیتی تھی۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ ماں پھر بھی ماں ہے، اور خالا پھر بھی خالا ہے، اور اگر وہ تبدیل ہو کر ماں بنے گی بھی، تو بھی جتنی ہمدردی ماں کو ہوتی ہے، وہ سوتیلی ماں یا خالا کو نہیں ہوگی۔ اسی سبب ایک کہاوت ہے کہ:

ماءُ سا ماءُ، ٻيو سڀ دنيا جو واءُ،
ماسي نه ٿئي ماءُ، توڙي ڪيي ڏئي ساهه.
(پھاکو)

[ماں ہی ماں ہے، باقی سب دنیا کی ہوا ہے، خالہ نہ ہوئے
کبھی ماں، چاہے فدا کرے جاں]

اس کے باوجود کسی اور جگہ سے شادی کرنے کے بجائے پھر بھی اپنی سالی سے شادی کرنا بہتر سمجھا جاتا تھا، کیونکہ غیر عورت کی بنسبت پھر بھی خالا کو بچوں کی زیادہ فکر ہوگی۔ اگر کسی کو پہلی بیوی سے اولاد نہیں ہوتا تھا، پھر بھی سابقہ سسرال والوں سے محبت کا رشتہ توڑنے کو واجب نہیں سمجھ کر، سالی سے شادی کرتا تھا اور اسی طرح پچھلا رشتہ قائم رکھتا تھا۔ ان اسباب کی بنا پر سالی سے شادی کرنا آج بھی عام ہے۔ بیوہ بھابھی سے بھی شادی کرنا جائز سمجھا جاتا تھا، کیونکہ بھابھی بھی ایک ہی گوتر سے نہیں ہوتی۔ یہ بیوہ ''ودھوا وواھ'' (Widow Marriage) کی بات ہے، اس لئے اس کا تذکرہ علحدہ کیا جائے گا۔ یہاں صرف اتنا درج کیا جاتا ہے کہ دیور کا بھابھی سے

شادی کرنا گھٹیا بات سمجھی جاتی تھی، اس لئے بھابھی یا دوسری کسی بیوہ سے شادی کرنے کا رواج آج بھی اتنا عام نہیں ہے۔

ودھوا وواھ: ''ودھوا'' لفظ میں ''وِ'' معنیٰ ''سوائے'' اور ''دھوَ'' معنیٰ ''شوہر''، سنسکرت لفظ ودھوا کا تلفظ انگریزی میں ہے ''وِڈوُ'' (Widow) اور اس کے بنیادی معنیٰ ہیں ''شوہر کے بغیر''، یعنی ''بیوہ''۔ پہلے کیس لڑکی کا منگیتر وفات پا جاتا تھا تو، اس کا پھر منگنی کرنا اور شادی کرنا قابلِ اعتراض نہیں ہوتا تھا۔ آج بھی ایسا ہی ہے۔ اگر شادی کے بعد کسی کا شوہر مر جاتا تھا تو، نہ وہ بیوہ عورت شادی کرنا پسند کرتی تھی، نہ ہی لوگ کسی بیوہ سے شادی کرنا پسند کرتے تھے۔ اس کے باوجود ودھوا وواھ ہوتے تھے۔ ''ودھشو'' (Didhishu) معنیٰ ''وہ مرد جس نے کسی ودھوا سے شادی کی ہو''۔ ''پرپورو'' (Parapurava) معنیٰ ''وہ عورت جس نے دوسری شادی نہ کی ہو''۔ ''پونربھوَ'' (Paunarbhava) معنیٰ ''ودھوا عورت کا دوسرے شوہر سے بیٹا''۔ یہ الفاظ خود اس بات کا ثبوت ہیں کہ بیوہ عورتیں شادی کرتی تھیں۔

منوسمرتی میں درج ہے کہ قدیم زمانے میں ''وین'' نامی ایک راجا ہوا کرتا تھا، جو ودھواؤں کو زبردستی شادی کرواتا تھا، جس وجہ سے کئی ''دوجہ'' (Twice born) یعنی براہمن، کھتری اور وئش اس بات کا برا مناتے تھے، (۹--۶۵--۶۶ شلوک)۔ آج بھی کئی لوگوں کا یہی خیال ہے کہ جو کوئی ودھوا رہ سکے، اُسے زبردستی بیاہنا واجب نہیں ہے، لیکن جو نہ رہ سکے، اُسے دوبارہ شادی کرنے سے روکنا جائز نہیں ہے۔

رگ وید میں ''دیور'' لفظ استعمال ہوا ہے، جس کا تلفظ سندھی میں ہے ''ڏير'' اور اس کے معنیٰ ہیں ''شوہر کا بھائی''۔ پروفیسر میکس ملر کے خیال مطابق اس لفظ کا مادہ ہے ''دوَ'' معنیٰ کھیل کھیلنا۔ اس لفظ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ دیور اور بھابھی آپس میں بھائی بہن کی طرح کھیل کھیلا کرتے تھے۔ اس لئے ''دیور'' کے اصل معنیٰ تھے ''ساتھ کھیلنے والا'' (A play-mate)۔ آج بھی کئی مقامات پر دیور اور بھابھی مل کر تاش کھیلتے ہیں یا کوئی اور کھیل کھیلتے ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سنسکرت لفظ ''دیور'' اصل میں ہے ''دوی ور'' یعنی دوسرا شوہر۔ یہ اس لحاظ سے کہتے ہیں، کیونکہ دیور اپنی بیوہ بھابھی سے شادی کر سکتا ہے۔ درحقیقت بھابھی سے شادی کرنے کا رواج ہندوؤں میں نہ پہلے عام تھا، اور نہ اب عام ہے۔ آج بھی دیور کا بھابھی سے شادی کرنا ایک گھٹیا بات سمجھی جاتی ہے، سو یوں سمجھنا کہ ''دیور'' اصل میں دوسرا شوہر شمار ہوتا تھا، یہ بلکل غلط بات ہے۔ دیور اور بھابھی کے ملاپ بنسبت پہلے ایک نہایت عجیب رواج بھی کچھ عرصہ جاری رہا، جسے ''نیوگ'' کہتے تھے۔ اس کا ذکر علحدہ کیا جاتا ہے۔

نیوگ (Levirate): رگ وید والے زمانے میں عام دستور یہ ہوتا تھا کہ جس بیوی کا شوہر مر جاتا تھا، وہ اپنے شوہر کے ساتھ چکھیا پر چڑھ کر (آگ میں کود کر) خود کو جلا کر بھسم کر دیتی تھی۔ یہ رواج کئی صدیوں تک مسلسل جاری رہا۔ کچھ حالات میں ودھوا اپنے دیور یا شوہر کے قریبی عزیز سے شادی کرتی تھی۔ کبھی کبھار یوں بھی ہوتا تھا کہ جس جوان بیوی کو اپنے شوہر سے کوئی اولاد نہیں ہوتا تھا، وہ اپنا نسل قائم رکھنے کے لئے اپنے دیور سے کچھ عرصہ اکٹھی رہ کر، بچے پیدا کرتی تھی، (رگ وید، منڈل دسواں، ۴۰،۲)۔ دیور کے ساتھ رہنے کے لئے شادی کی رسومات نہیں ہوتی تھیں، کیونکہ وہ ساری زندگی میاں بیوی بن کر زندگی گزارنے والے نہیں ہوتے تھے۔ اس رواج کی مثال مہا بھارت سے بھی ملتی ہے۔ مہا بھارت والے زمانے میں وید ویاس اپنی بڑی بھابھی انبکا سے ایک دفعہ جنسی ملاپ کر کے ''دھرتراشٹر'' (کوروں کا باپ) کو جنم دیا۔ اسی وید ویاس نے اپنی چھوٹی بھابھی انبالکا سے ''پانڈو'' (پانڈوں کا باپ) کو جنم دیا۔ یہ بچے پیدا ہونے کے بعد وید ویاد کبھی بھی اپنی بھابھیوں کے نزدیک نہیں گیا، کیونکہ اس تھوڑے وقت کے لئے جنسی ملاپ کا مقصد صرف اتنا تھا کہ بیٹا پیدا ہو، جو خاندان کا نام قائم رکھے۔ اسی رسم کو ''نیوگ'' کہتے تھے۔ اسی رواج کا منوسمرتی (۹، ۸۹۔۷۰) میں بھی ذکر ہے۔ شلوک ۷۰ میں کہا گیا ہے کہ بھابھی کا ناتہ اپنے دیور سے فقط اس وقت تک رہیگا، جب تک اسے بیٹا پیدا ہو۔ راجا دھرتراشٹر اور راجا پانڈو خواہ جو بڑے گھرانے کے آریہ تھے، تو بھی اس نیوگ کا رواج سب آریوں میں عام نہیں تھا۔ یہ کمذات لوگوں کا رواج تھا، اس لئے بڑے گھرانے کے آریوں نے اس رواج کو زور پکڑنے تو نہیں دیا، لیکن اسے بلکل بند ہی کر دیا، اس لئے صرف کمذات لوگ ہی اس رواج کو چلاتے آئے۔ آج تک اوڑیسا کے کچھ کمذات ہندو اپنی بیٹی کی شادی اس شخص کرواتے ہیں، جسے کوئی بھائی ہوتا ہے، تاکہ شوہر مر جانے کی صورت میں، دیور کے ساتھ بیاہی جا سکے، اور ہمیشہ کے لئے اُسے ودھوا بن کر نہیں رہنا پڑے۔ اسی طرح آگرہ اور اوَدھ کے مشترکہ علاقوں، اور بہار کے کچھ کمذات ہندو بیوہ عورت کو اپنے دیور سے اولاد پیدا کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ مطلب یہ کہ بڑے گھرانے والے ہندوؤں نے اس رواج کو بلکل بیہودہ سمجھ کر اسے لات مار کر پھینک دیا، اس لئے آج کچھ کمذات ہندو اس رواج کو جاری رکھے ہوئے ہیں، اور وہ بھی ہر جگہ عام نہیں ہے۔

یہ نیوگ کا رواج اس بات کا ثبوت ہے کہ اسے اصل آریوں نے جاری نہیں کیا تھا، ورنہ نیوگ کی کئی مثالیں اتہاسوں اور پرانوں میں سے مل جاتیں۔ تاریخ کے مطالعہ سے مصنف کو یوں سمجھ میں آتا ہے کہ یہ رواج اصل میں بنی اسرائیل (یہودیوں) نے جاری کیا تھا، اور ان کو دیکھ کر کچھ عرصہ کے لئے آریوں نے بھی جبر کے حالات میں اسے جاری رکھا، لیکن انہوں نے اسے کبھی

بھی مروج کرنے کی کوشش نہیں کی۔ رگ وید والے زمانے میں ہی شمالی ہندستان اور جنوبی ہندستان کے تاجر لوگ تجارت کی خاطر بئبلونیا، سیریا یا شام ملک اور مغربی ایشیا کے دیگر علاقوں میں جاتے تھے، اور پھر وہاں انہوں نے اپنی بیٹھکیں بھی قائم کیں، بلکہ ان میں سے کچھ یہودیوں اور دیگر سیمیٹک قوموں سے رشتے بھی استوار کئے۔ اس بڑے اور گہرے تعلق کا ایک اثر یہ ہوا کہ، بنی اسرائیل کا یہ رواج آریوں کی بعض شاخوں نے بھی اختیار کیا، لیکن کن مجبور حالات میں۔

بنی اسرائیل میں نیوگ کا رواج نہایت قدیم زمانے سے تھا، اور بعد میں حضرت موسیٰؑ نے اسے زور پکڑوایا۔ یہ حقیقت عیسائیوں کی کتاب انجیل سے اچھی طرح معلوم ہوتی ہے۔ انجیل میں واضح طور پر لکھا ہوا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا کہنا ہے کہ ''اگر ایک بھائی بغیر اولاد کے مر جائے، تو پھر دوسرا بھائی اپنی بیوہ بھابھی میں سے اس کے نام کے لئے بچے پیدا کرے''۔ (1) حضرت موسیٰؑ کے فرمودے موجب قدیم یہودی اس طرح کرتے تھے، جو اگر کسی کا ایک بھائی مر جاتا تھا تو اس کی بیوہ بیوی دوسرے بھائی کے ساتھ رہتی تھی اور اگر دوسرا بھائی بھی بغیر اولاد کے مر جاتا تھا تو پھر تیسرے، چوتھے، پانچویں، چھٹے اور ساتویں بھائی کے ساتھ رہ کر بچے پیدا کرتی تھی''!

بائبیل کے عہد عتیق (Old Testament) سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم یہودیوں کا اصل قاعدہ یہی تھا کہ ''اگر بھائی اکٹھے رہتے ہوں، اور ان میں سے اگر کوئی بغیر اولاد کر مر جائے، تو مرحوم کی بیوی کسی غیر سے شادی نہ کرے۔ اس کا دیور اس سے اپنی بیوی کے طور پر جنسی ملاپ کرے، اور جو پہلا بچہ پیدا ہو، وہ اس مرحوم کی اولاد سمجھا جائے، تاکہ بنی اسرائیل میں مرحوم کا نام قائم رہے''۔ اس قاعدے موجب اپنی بیوہ بھابھی سے بچہ پیدا کرنا دیور پر فرض ہوتا تھا۔ اگر کوئی دیور اپنے اس فرض ادائی سے انکار کرتا تھا تو اس کی بیوہ بھابھی شہر کے بزرگوں کے پاس فریادی بن کر جاتی تھی، اور مکھی اور پنچ اس کے دیور کو بلا کر اسے سمجھاتے تھے۔ ان بزرگوں کے سمجھانے کے بعد بھی اگر کوئی دیور اپنی بھابھی کے قریب نہیں جاتا تھا تو، تو وہ ان بزرگوں کے سامنے اپنے دیور کے منہ پر تھوکتی تھی، تاکہ لوگ دیکھیں کے یہ ایسا نالائق ہے، جو اپنے بھائی کے نام کے لئے بچہ پیدا کرنے سے انکاری ہے، اور دوسرے اس بات سے عبرت لیں کہ اگر کوئی دیور اپنا فرض ادا نہیں کریگا، وہ لعنت ملامت کے لائق ہوگا! یہ رواج اس وقت بہتوں کو عجیب لگے گا، لیکن قدیم یہودیوں کے قاعدے یہی تھے، جو ان کی پاک کتاب توریت میں درج ہیں۔ (2)

قدیم آریوں نے بھی ''نیوگ'' کا رواج کچھ عرصہ قائم رکھا، اور اس میں انہیں کوئی عار محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اتنا ہے کہ بھیشم پتامہ اپنے باپ کا دل خوش کرنے کے لئے ساری زندگی

(1). Moses said, "If a man die, having no children, his brother shall marry his wife, and raise up seed unto his brother: st. Matheus, XXII, 24 ff.

(2) Deuteronomy, XXV - 5-9.

برہمچاری بن کر رہنے کا عہد کیا تھا، اور بعد میں اسے کہا گیا کہ اپنی بھابھیوں کے ساتھ کچھ عرصہ رہ کر بیٹے پیدا کر اور اس نے ایسا کرنے صاف انکار کر دیا، تو کسی نی بھی اسے برا بھلا نہیں کہا۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہودیوں کی طرح آریہ لوگ بھی اپنی بھابھیوں سے بچے پیدا کرنے کے پابند نہیں ہوتے تھے۔ اس وقت یہ ''نیوگ'' کا رواج ''نہ یوگ'' (اجوگ) یعنی نامناسب یا غیر واجبی ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ دیور کی شادی اس وقت اگر بیوہ بھابھی سے کروائی جائے تو شادی کی ساتھ رسومات ہوتی ہیں، اور وہ جب تک زندہ ہیں، تب تک میاں بیوی بن کر زندگی گذارتے ہیں، لیکن اس طرح کی شادیاں بھی بہت کم ہوتی ہیں۔

ستی: ویدک زمانے میں عام دستور یہ تھا کہ ودھوائیں (بیوہ) اپنے شوہروں کی لاش کے ساتھ خود کو بھی لکڑیاں باندھ کر جلا دیتی تھیں۔ انہیں ''ستیاں'' کہا جاتا تھا۔ یہ رواج کس طرح جاری ہوا، یہ کہیں بھی نہیں لکھا ہوا۔ ڈاکٹر ابناش چندر داس کے خیال موجب اس رسم کی مراد یہ تھی کہ مرنے کے بعد بھی مُردوں کو گھر وسکھ کے لئے بیویاں ان کے ساتھ ہوں۔(32) یہ سچ ہے کہ کچھ قدیم لوگوں کے اس طرح کے خیالات ہوتے تھے۔ مثلاً: قدیم مصر کے لوگ یوں سمجھتے تھے کہ ہر ایک انسان کو مرنے کے بعد دوسرے جہان میں بھی ان چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، جو چیزیں وہ اس جہاں میں استعمال کرتا تھا۔ اسی سبب لاش کو دفن کرنے کے وقت، مٹکے، کپڑے، بسترہ اور دیگر گھر و سامان بلکہ گاڑیاں اور بیڑیاں بھی اس کے ساتھ دفن کرتے تھے! آج تک ہندوؤں میں بھی یہ دستور ہے کہ جب کوئی مرد مرتا ہے تو اسے سونے کی انگوٹھی پہنا دیتے ہیں، اور اگر کوئی عورت مرتی ہے تو اس کے ناک میں تھری یا اس کے کانوں میں بالیاں پہنا دیتے ہیں، تا کہ بھلے تو اس کا منکا انگوٹھی اس کے ساتھ ہو، لیکن مصنف کی رائے کے مطابق ستی لکڑی کا رواج اس قسم کے خیال سے جاری شدہ نہیں دیکھنے میں آ رہا ہے۔ ''ستی'' لفظ خود اس بات کا پتہ دے رہا ہے کہ جو ستیاں پتورت دھرم پالن کرتی تھیں، اور اپنے شوہروں کے ساتھ ان کی سچی مچی محبت ہوتی تھی، اور ایک لمحہ بھی ان سے دور رہنا نہیں چاہتی تھیں، وہ اپنے شوہر کے مرنے کے بعد اپنا جینا بیکار سمجھ کر، اس کے ساتھ چکھیا پر چڑھتی تھیں، تاکہ مرنے کے بعد بھی ایک دوسرے کے ساتھ ہوں، اور ہماری محبت جاری رہے۔ مطلب یہ کہ پتورت بیویوں کی اپنے شوہروں سے بڑی محبت ہونے کے باعث ستی لکڑی کے رواج نے جنم لیا۔ ان ے اس طرح کے خیالوں کے سبب آج تک ایک کہاوت ہے کہ:

(32) The idea probably was that the dead man must have his wives accompanying him to the next world for providing him with home comforts." Dr. A.C.Das: Reg Vedic Culture, P. 256.

پريت تو ايسي ڪيجئي، جئسي هندو ڪي جوءِ،
جيتي جي تو سنگ رهي، مئي پيي ستي هوءِ.

یعنی محبت اس طرح کی جائے، جس طرح ہندو کی بیوی کرتی ہے، زندہ تو اپنے شوہر کے ساتھ رہتی ہے، لیکن مرنے کے بعد بھی ستی بنتی ہے۔ دوسری ایک سندھی کہاوت ہے کہ "ستي لڪڙن ڪان موتي ته ڪتن هاب تئي." اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ستی کا لکڑیوں سے لوٹنا (خود کو نہ جلانا) بہت ہی گھٹیا بات سمجھی جاتی تھی، اور پھر ایسی بیوی کی عزت نہیں رہتی تھی۔ مطلب یہ کہ عزت ہوتی ہی ان بیویوں کی تھی جو اپنے شوہر کے ساتھ خود کو بھی جلا کر ختم کرتی تھیں۔ ستی لکڑی کا رواج کا تذکرہ اتھرو وید کے منڈل اٹھارویں (۳،۱) میں ہے۔ یہ رواج رگ وید والے زمانے میں بھی تھا، لیکن ہر ودھوا خود کو نہیں جلاتی تھی۔ رگ وید کے منڈل دسویں، سُوکت آٹھویں (اشٹک ستیوں کے چھٹے ادھیاء کے ورگ دوسرے) میں جو کچھ لکھا ہوا ہے، اس کا ترجمہ کچھ علماء نے ایک طرح سے تو دوسرے علماء نے دوسری طرح سے کیا ہے۔ بہت علماء نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے:

"ای ناری، اُٹھ! تو اس کے پہلو میں آکر لیٹ گئی ہے، جس کے پساہ پورے ہو گئے ہیں۔ زندہ لوگوں کی دنیا میں آ۔ اپنے شوہر سے دور ہو جا، اور اس کی بیوی بن جا، جو تیرا ہاتھ پکڑے ہوئے ہے، اور تمہارے ساتھ شادی کرنے کی مرضی رکھتا ہے"۔

اگر یہ ترجمہ صحیح ہے تو پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس وقت کوئی ستی اپنے مردہ شوہر کی چِکھیا کے پاس خود کو جلانے کے لئے جا کر لیٹ جاتی تھی، اس وقت اس کا کنوارہ دیور یا کوئی اور، جو اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہو، وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر اُٹھا لاتا تھا۔ اس طرح اس تھوڑے سے مضمون سے ستی لکڑی خواہ ودھوا وواہ کے رواج کے آثار ملتے ہیں۔ اتنا کہا جائیگا کہ ستی بننے کا رواج عام تھا۔ انگریزوں کی حکمرانی کے اوائل والے وقت تک بھی یہ رواج جاری تھا، لیکن بعد میں لارڈ ولیم بینٹک کے دنوں میں برہمو سماج کی بنیاد ڈالنے والے راجا رام موہن راء کی سرجوشی سے سرکاری قانون کے مطابق بند ہو گیا۔

مُردوں کو ٹھکانے لگانا: قدیم زمانے میں جب لوگ ابھی آگ جلانے کا ہنر نہیں سیکھے تھے، تب مُردوں کو ٹھکانے لگانے کے دو طریقے اختیار کیے جاتے تھے: ایک یہ کہ مُردے کو کسی کھلی جگہ پر رکھتے تھے، تاکہ بھلے اُسے جنگلی جانور کھا جائیں، یا پھر گدھوں کی خوراک بن جائے۔ پارسی آج تک ایسا ہی کرتے ہیں۔ لگتا ہے کہ یہ رواج کچھ عرصہ قدیم ہندوؤں میں بھی تھا، جس

سے متعلق رگ وید کے منڈل آٹھویں، (۲،۵۱) اور اتھرو وید کے منڈل اٹھارویں، (۳۴،۲) میں اشارہ ہے۔[33] اس کے باوجود، رگ وید میں کچھ ایسے منتر ہیں، جن میں سے علماء کو یوں سمجھ میں آ رہا ہے کہ اس قدیم زمانے میں ہندوؤں میں مردوں کو دفن کرنے کا رواج بہت عام تھا۔ منڈل دسویں (۱۸، ۱۰۔۱۳) میں درج ہے کہ مردے کو دفن کرنے کے وقت پرانی کو رشی کہتا تھا کہ ''اپنی دھرتی ماتا کی طرف جا، جو زیادہ پھیلی ہوئی اور آرام دہ ہے، اور جو پشم کی طرح نرم ہے''۔ یہ رشی بعد میں زمین سے کہتا تھا کہ ''اے دھرتی، تو اس کے اوپر پھیل جا، لیکن اسے بھکوڑنا نہیں، اسے آرام سے رکھنا! تو اسے اس طرح ڈھانپ لے جس طرح ماں اپنے کپڑے کے دامن سے اپنے بچے کو ڈھانپ لیتی ہے!۔۔۔ لاش کے اوپر جو مٹی ڈالی جاتی ہے، وہ کاش اس کے اوپر بے وزن ہو کر ٹھہرے (لاش پر بوجھ نہ پڑے)!۔۔۔ ای پرانی، میں تیرے چارو طرف مٹی کا ڈھیر لگاتا ہوں، اور تیرے اوپر پتھر ڈالتا ہوں وغیرہ''۔

قدیم ہندو پھر آگ جلانے کا ہنر سیکھے، تو مُردوں کو جلانے کا رواج عام ہوا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یوں بھی کرتے تھے، جو مُردہ جلا کر، اس بعد اس کی راکھ اور کچھ ہڈیاں کسی برتن میں ڈال کر، اس کے اوپر ڈھکنا دے کر، وہ برتن زمین میں دفن کرتے تھے، جس طرح اشولاین گریھ سوترن میں درج ہے۔ سنکھ دفن کر کے اس کے اوپر سادھ تعمیر کرنے کا رواج آج تک موجود ہے۔ آج تک یہ بھی دستور ہے کہ جب بچہ مردہ پیدا ہوتا ہے، یا پیدا ہونے کے فوری بعد مر جاتا ہے تو ہندو اس کا اگنی سنسکار نہیں کرتے، لیکن اسے دفن کرتے ہیں۔ ان باتوں کا گریھ سوتروں میں بہت تذکرہ ہے۔

قدیم زمانے میں قدیم آریہ لوگ اپنی جان و مال کی حفاظت کے لئے تیر کمان ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ ان میں سے اگر کوئی مر جاتا تھا تو اول اس کی کمان اس کے کندھے پر سے اتار کر، اسے نہلا کر، کورے کپڑے میں لپیٹ کر، پھر اس کی کائی (تابوت میت) اٹھاتے تھے۔ کائی پر اٹھانے کا رواج آج بھی ہے۔ اتھرو وید کے منڈل اٹھارویں، (۴، ۳۱) میں درج ہے کہ پرانی کو زیور پہناتے تھے، تاکہ اسے اُس دنیا میں کام آئیں۔ آج تک مُردہ آدمی کے انگلی میں انگوٹھی، اور مُردہ عورت کی ناک میں سونے کی نتھری، اور کبھی کانوں میں بالیاں پہناتے ہیں، جیسا کہ اوپر پہلے ہی کہا جا چکا ہے۔

کئی ہندو کہتے ہیں کہ مردوں کو دفن کرنے کے بجائے جلانے کا رواج قدیم ہندوؤں نے فقط حفظ صحت کے قواعد کے مدنظر جاری کیا تھا۔ اس کے مطابق یوں سمجھا جائے کہ حفظ صحت کے

(33) Dr. A.C. Das: Reg Vedic Culture, P. 242.

قواعد کا علم صرف قدیم ہندوؤں کو تھا، اور دیگر اقوام گویا کہ ان قواعد سے غیر واقف تھیں! در حقیقت مُردوں کو جلانے کا رواج قدیم ہندوؤں نے ایک مذہبی خیال سے ڈالا۔ یہ خیال انہیں یگیہ کی اگنی سے آیا۔ اگنی میں آہوتی ڈالی جاتی ہے تو وہ پوری جل کر بھسم ہو جاتی ہے، اور راکھ زمین پر رہ جاتی ہے، لیکن آہوتی کی خوشبوء اگنی اوپر آکاس میں دیوتاؤں تک پہنچاتی ہے، جس وجہ سے دیوتا خوش ہوتے ہیں، اور یگیہ کرنے والوں پر ان کی رحمت ہوتی ہے! ویدک مذہب والے آریوں کے اگنی سے متعلق یہی خیالات تھے۔ یہی مذہبی خیال مُردوں کو جلانے کے رواج میں پنہاں ہے۔ مردہ آدمی کا اگنی سنسکار کیا جاتا ہے، تو ماس اور ہڈیاں جل جاتی ہیں، اور سارے قصور اور کوتاہیاں بھی یہاں دھرتی پر ہی رہ جاتی ہیں، باقی اس کا تت یعنی آتما، دیوتاؤں جیسا جلوہ اپنا کر، پِتروں والا راستہ لے کر، جم لوک میں جاکر وارد ہوتی ہے، جہاں اس کے آباء و اجداد کی آتمائیں بھی ہیں (رگ وید، منڈل دسواں ۴، ۷)۔ قدیم ہندوؤں کے یہی خیالات تھے، جو دوسری اقوام کے لوگوں کے نہیں تھے، اس لئے دوسری قومیں آج تک مُردوں کو دفنانے کا رواج جاری رکھے ہوئے ہیں۔ پارسی بھی اگرچہ قدیم آریوں کی طرح اگنی پوجا کرتے ہیں، پھر بھی وہ یہ مناسب نہیں سمجھتے کہ اگنی جیسے پاک دیوتا میں مُردہ ڈال کر اسے ناپاک کیا جائے، اس لئے وہ مُردوں کو کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔ ہر کسی کے اپنے اپنے خیالات ہیں، اور اس قسم کے علحدہ خیالوں ہی نے الگ الگ رسمیں جاری کروائی ہیں۔

جم اور جم پری: اس وقت ہندو سمجھتے ہیں کہ جب آدمی مر جاتا ہے، تب جم کے دوت اسے جم پُری میں لے جاتے ہیں، اور اس کے کیے ہوئے گناہوں کے باعث اسے اُٹھا کر نرک میں ڈالتے ہیں، اور اگر اس کے اعمال صالح ہیں تو پھر اسے سرگ کے سکھ ملتے ہیں۔ نرک اور اس کے عذابوں کا ذکر اول اتھرو وید، (منڈل پہلا، ۱۵۴، ۵) اور کَتھ اُپنشد میں ہے۔ یجر وید کے آخر میں جو شتپتھ براہمن ہے، اس میں بھی نرک اور جونیوں کا تذکرہ ہے، لیکن رگ وید ان سب سے قدیم ہے۔ اس قدیم وقت میں ہندوؤں کے جم اور جم پری سے متعلق خیال ہی علحدہ ہوتے تھے۔ وہ یگیہ کو مکتی کا ایک سادھن کر کے سمجھتے تھے، اس لئے ساری عمر یگیوں پیچھے یگیہ کرتے رہتے تھے۔ وہ یوں سمجھتے تھے کہ جس طرح یگیہ کی اگنی میں جو آہوتی ڈالی جاتی ہے، اس میں اتفاق سے کوئی تنکہ یا درخت کا پتہ آ جاتا ہے، تو وہ وہیں جل جاتا ہے اور دیوتاؤں تک صرف آہوتی کا تت پہنچتا ہے، اسی طرح زمین پر رہ کر اگر کوئی شخص خطائیں یا گناہ کرتا ہے، تو وہ بھی تنکوں اور درخت کے پتوں کی طرح اگنی میں جل جاتے ہیں، اور صرف اس کی پوتر آتما جم پری یا پتر لوک

تک پہنچ جاتی ہے۔ یگیہ کی اگنی جب جلائی جاتی ہے تو بھڑک کر آسمان سے جا کر لگتی ہے، اس لئے اگنی گویا کہ زمین و آسمان کے بیچ میں ایک پل کی طرح ہے، جس پر سے آتما گزر کر سرگ کی طرف جاتی ہے، جہاں ہمیشہ جوت یا اجالا ہے (رگ وید، منڈل نواں، ۱۱۳، ۷)۔ اسے یم دیوتا کے دو بھوری آنکھوں والے کتوں کے پاس سے گزرنا پڑتا ہے، جنہیں چار چار آنکھیں ہیں، ناک ان کی چوڑی ہیں اور ان کے جسم پر پٹے ہیں۔ یہ ''سرما'' (Sarama) نامی دیوتا کی ایک کتیہ کے بچے ہیں، اور وہ کتے جم پری پر پہرہ دیتے ہیں۔ ان کتوں کے پاس کو گزر کر وہ جم پری میں اندر داخل ہوتا ہے۔ قدیم رشیوں کے اس طرح کے خیالات رگ وید میں واضح طور پر درج ہیں۔ ان کا انگریزی نظم میں بھی ترجمہ کیا ہوا ہے، ان میں سے چند سطور یہاں دی جاتی ہیں:

Thou, Agni, art our priest, divinely wise,
in holy science versed; they skill detects,
The faults that mar our rites, mistakes corrects,
And all our acts completes and snactifies.
Thou art the cord that stretches to the skies.
The bridge that spans the chasm, profound and vast,
Dividing Earth from Heaven, o'er which at last,
The good shall safely pass to paradise.
135 (Dr. J. Muir: Original Sanskrit Texts. Vol. I. P. 2217)

رگ وید میں یم دیوتا کو نرک کا دیوتا نہیں، بلکہ سرگ کا سوامی کہا گیا ہے، اور واضح طور پر کہا گیا ہے کہ وہاں اندھیرا ہے ہی نہیں، لیکن ہمیشہ اجالا ہے (رگ وید، منڈل دسواں، ۱۱۳، ۷۔۹)۔ یوں بھی کہا گیا ہے کہ ہمارے جا آباء و اجداد وفات پا گئے ہیں، وہ وہاں یم دیوتا کے پاس رہتے ہیں، (منڈل دسواں، ۱۵، ۱۴)، اور زمین پر رہ کر، جو صالح اعمال انہوں نے کیے ہیں، ان کا صلہ وہ بڑے آرام سے وہاں پا رہے ہیں (منڈل پہلا، ۱۵۴، ۵)۔ مطلب یہ کہ رگ وید میں جم پری کے نقشہ کی نہایت عمدگی سے عکاسی کی گئی ہے، اور اسے سرگ کہا گیا ہے۔ یوں بھی کہا گیا ہے کہ وہاں رہ کر، آدمی اَمر ہو جاتا ہے، اور اس کی ہر کامنا پوری ہوتی ہے (منڈل نواں، ۱۱۳، ۷۔۱۰)۔ رگ وید کے بعد کی ساھتیہ میں جم پری کو نرک کہا گیا ہے، اور ان کے ہیبتناک بیان کیے گئے ہیں، جو گرڑ پران میں بھی درج ہیں۔

جونیاں اور کرم: ڈاکٹر سُنیتی کمار چٹر جی اور دیگر کن علماء کا کہنا ہے کہ رگ وید میں یہ کہیں بھی درج نہیں ہے کہ آدمی اپنے کیے ہوئے کاموں کی بدولت بار بار جونیاں لیتا ہے۔ اسی سبب یہ قیاس آرائی کی گئی ہے کہ اس قدیم زمانے میں لوگوں کا جونیوں میں یقین تھا ہی نہیں، اور یہ

عقیدہ بعد میں انہوں نے دراوڑون سے سیکھا۔ ڈاکٹر ابناش چندرداس اور دیگر کن علماء کا کہنا ہے کہ رگ وید میں مرنے اور پھر زندہ ہونے کا تذکرہ ہے، اور یہ خیال قدیم لوگوں نے شاید سورج اور چاند سے سیکھا۔ سورج روزانہ صبح کو جنم لیتا ہے، دوپہر کو جوانی کو پہنچ جاتا ہے اور شام کو گویا پچھلی سانسیں لے کر مر جاتا ہے، اور پھر دوسرے دن نیا جنم لیتا ہے۔ اسی طرح چاند بھی جنم لیتا ہے، بڑھتا ہے، اور مر جاتا ہے، اور پھر نئے مہینے نیا جنم لیتا ہے۔ سورج اور چاند بنسبت یہ باتیں رگ وید کے منڈل دسویں (۸۵، ۱۵) میں درج ہیں۔ اِسی منڈل دسویں (۷۲، ۸۔۹) میں آدتی کے بیٹے مارتنڈ (سورج دیوتا) سے متعلق کہا گیا ہے کہ اسے پھر جنم لینا اور مرنا پڑتا ہے۔ منڈل پہلا، (۳۲،٦۴) میں جو کچھ کہا گیا ہے، اس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ آدمی جب ماں کے پیٹ ہی میں ہے، تب ہی جونیوں کے تابع ہے۔ جو آرزوئیں اس میں ہیں، ان کے مطابق اس کی حالت ہوتی ہے، اور اپنے کیے کا پھل پاتا ہے۔ یوں جونیوں اور کاموں سے متعلق اشارے رگ وید میں ہی ہیں، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اِس وقت ہندوؤں کے جو عقائد ان باتوں سے متعلق ہیں، وہ رگ وید والے زمانے میں بھی تھے۔

☆

باب ۱۱

اہم دھندے، ہنر اور کاریگریاں

اہم دھندے: وادیٔ سندھ کے باشندے پہلے صرف مال مویشی رکھتے تھے، اور پھر کھیتی کرنا سیکھے۔ ان دو اہم دھندھوں کے بعد دوسرے ہنر اور کاریگریاں جاری ہوئیں، تو کسی بھی کام کاج کرنے سے کوئی عار نہیں کرتے تھے۔ اس بات کا ایک رشی نے رگ وید کے منڈل نو (۱۱۲، ۱۔۴) میں نہایت دلچسپ انداز میں ذکر کیا ہے:

[ہر اک کی اپنی عادت ہوتی ہے،
ہر انسان اپنا دھندھا کرتا ہے،
لہر (پانی کی) کو کچھ کاٹنے کے لئے چاہیے،
طبیب کو کوئی بیمار ٹھیک کرنے کو چاہیے،
پروہت کو کوئی مرید چاہیے،
کہ وہاں سے اسے اچھا دان چاہیے،
ہر کوئی اپنے دل سے دھندھا کرے،
کسی دوسرے کے سون میں بھلے بھائیوار بنے۔]

هرهڪ انسان جي آهي ذرت پنهنجي،
هر هڪ انسان جي آهي ڪرت پنهنجي،
لهر کي ڪا شي ڪٽڻ لاءِ گهرجي،
ويج کي ڪو بيمار چٽڻ لاءِ گهرجي،
پروهت کي سدا ڪو ججمان گهرجي،
وٺائنس ڪيس ڪجهه دان گهرجي،
هرڪو دل وٺان ڪري واپار،
ٻئي جي سون ۾ ٿئي ڀائيوار.

پھر اس نے اپنی بات کی ہے کہ:

[میں رشی ہوں، باپ حکیم ہے ماں اناج پیستی ہے،
کام کے لئے سب دوڑتے ہیں، لیکن جس کام میں جس کا دل لگے۔]

آئون رشي، بابو ويج، امان پيهين اَن،
ڪرت خاطر هرڪو ڊوڙي جنهن جو جنهن ۾ لڳي من.

(منڈل نواں، ۱۱۲، ۳)

رگ وید والے زمانے میں لوگوں کی ضروریات کم ہوا کرتی تھیں، اور کسی بھی کام کاج کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے تھے، اس لئے گاؤں سے ہر ضرورت کی چیز مل سکتی تھی۔ ہر ایک گھر میں چکی اور چرخہ بھی ہوتے تھے، جو مصنف نے اپنی آنکھوں سے بڑے خاندانی گھروں میں بھی دیکھے تھے۔ سندھ ملک اچھی اُون کے لئے مشہور تھا (رگ وید منڈل دسواں، ۷۵، ۸)۔ بھیڑیوں اور گھیٹوں کی اُون کاٹ کر، اونی کپڑے بناتے تھے (منڈل دسواں، ۲۶، ۶)۔ گھر میں کاتنے کا کام عورتیں کرتی تھیں۔[1] (منڈل دوسرا، ۳، ۶، ۳۸، ۴، اور منڈل پانچواں، ۴۷، ۶)۔

رگ وید والے زمانے میں کچھ مائیں اپنے بچوں کے کپڑے خود بُنتی تھیں، لیکن بزار میں کوری بھی ہوا کرتے تھے، جو بُننے کا کام کرتے تھے۔ رگ وید میں تانے بانے پین کے کلف کا ذکر ہے۔ یہ کوری ''وایہ'' یعنی بُننے والے کہلاتے تھے (منڈل دسواں، ۷۱، ۹)۔ عورتیں بھرت بھی بھرتی تھیں۔ ان دنوں رنگریز بھی ہوتے تھے، جو کپڑے رنگتے تھے۔ رگ وید میں ''سوَچک'' لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے اصل معنی ہیں ''سوچی یا سوئی سے کام کرنے والا''۔ اب اس کا تلفظ ہے ''سوچی''، جو جوتے بناتے ہیں، لیکن وہ جوتیوں پر بھرت کا کام بھی کرتے ہیں۔ پھر عام طرح یہ رواج جاری ہوا کہ جو وَیش شودر عورتوں سے شادی کرتے تھے، ان کی اولاد ''سوچی'' کہلانے لگے، اور جوتیاں سینا ان کا پیشہ بنا۔

رگ وید والے زمانے میں دوسرے اہم کاسب بڑھئی ہوتے تھے، جو ''توسٹر'' (Tuastra) (منڈل دسواں، ۱۱۹، ۵)، اور ''تکشت'' (بڑھئی) کہلاتے تھے (منڈل نواں، ۱۱۲، ۱)۔ یہ گھر تو بناتے تھے، لیکن گھروں کے لئے سامان (صندل وغیرہ)، اور گھر کے استعمال کے برتن بھی بناتے

(1) یہ رواج یورپ میں بھی تھا۔ انگریزی لفظ ''سپنسٹر'' (Spinister) معنی ''کنواری''، لیکن اس کے بنیادی معنی ہیں ''کاتنے والی''۔ اس لفظ سے پتہ چلتا ہے کہ یورپ میں کنواری لڑکیاں کاتنے کا کام کرتی تھیں۔ انگریزی لفظ ''بچلر'' (Bachelor) معنی ''کنوارہ''۔ اس کا مادہ بعض نے ایک بعض نے دوسرا لکھا ہے؛ لیکن عام طور پر کہتے ہیں کہ لاطینی زبان میں ''بکا'' Bacca (Vacca) معنی ''گائے''۔ پہلے کنواروں پر گائے چرانے کا رکھا ہوا ہوتا تھا، اس لئے یہ لفظ عام ہوا۔ اس طرح کن الفاظ کی مادوں سے بھی لوگوں کے پہلے پیشوں کا پتہ چلتا ہے۔ مصنف۔

تھے، جنہیں ''درون'' (لکڑی کے برتن) کہتے تھے (منڈل نواں ۶۵، ۶)۔ یہ بڑھئی رتھ اور کشتیاں بھی بناتے تھے۔ رتھوں کے اوپر چھت چمڑے کی ہوا کرتی تھی، لیکن جنگ میں استعمال کے لئے رتھوں کی چھت کسی دھاتو کی بنی ہوئی ہوتی تھی، تاکہ دشمن اسے توڑ نہ سکے۔ رواجی گاڑیوں میں گھوڑے اور بیل جوتتے تھے۔ گاڑیوں اور رتھوں کے بنانے والے کی بڑی عزت ہوتی تھی، کیونکہ گاڑیاں اناج وغیرہ لانے کے لئے اور رتھ جنگوں کے وقت، اور شرطیں رکھنے کے لئے کام آتے تھے۔ بڑھئیوں کے علاوہ لہار بھی ہوا کرتے تھے، جنہیں ''کرمار'' کہا جاتا تھا (منڈل نواں، ۱۱۲، ۲، اور دسواں ۷۲، ۲)۔ وہ بھٹی جلانے کے وقت پرندوں کے پر پنکھے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ وہ گھروں میں کام آنے والی اشیاء، کھیتی کی درانتیاں اور دیگر اوزار بناتے تھے۔ جنگ کے لئے بھالے، کلہاڑے اور دیگر ہتھیار بھی بناتے تھے۔ کلہاڑوں سے درخت بھی کاٹ کر گراتے تھے۔ اشوتھ، کھدیر، شامی وغیرہ درختوں کے نام رگ وید میں ہیں۔ صراف بھی ہوتے تھے، جو کنگن، کڑیاں، بالیاں وغیرہ بناتے تھے (منڈل آٹھواں، ۴۷، ۱۵، ۷۸، ۳)۔ جڑت کرنے والے بھی ہوتے تھے جو جڑت کا کام کرتے تھے۔ بعض پھولوں کے ہار بنا کر بیچتے تھے، جنہیں صاحب ذوق مرد و خواتین خرید کرتے تھے۔ کھال رچانے والے بھی ہوتے تھے، کھالوں سے ڈبیاں، پانی اور شراب کے لئے چمڑے کی چھوٹی مشکیں بناتے تھے[1] منڈل آٹھواں، ۳۵، ۳)۔

رگ وید والے زمانے میں کمہار بھی ہوتے تھے، جو نار کے لئے مٹی کے لوٹے اور گھر میں استعمال کے لئے مٹی کے برتن (مٹکے، گھڑے، ہانڈھیاں، اور مٹی کے تھال وغیرہ) بناتے تھے، جو جلدی جلدی ٹوٹ جاتے تھے (منڈل دسواں، ۸۹، ۷)۔ حجامت کے لئے نائی بھی ہوتے تھے۔ سنسکرت لفظ ''ناپتِ'' کا تلفظ سندھی میں ہے ''نائی''، لیکن رگ وید کے منڈل دسویں (۱۴۲، ۴) میں ''وپتا'' لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے معنی ہیں ''بال کاٹنے والا''۔ یہ مردوں کی داڑھیاں گرم پانی سے بھگو کر پھر مونڈتے تھے، (اتھرو وید، منڈل چھٹا، ۶۸، ۶)۔ سئس، پیلوان، رسیاں بنانے والے، رنگریز اور دیگر کاسبی بھی ہوا کرتے تھے۔ کچھ ناچنے والے بھی ہوتے تھے۔

(1) سندھ میں بڑی مشکیں اور چھوٹی مشکیں آج بھی عام طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ تھر میں مسافری کرنے کے وقت پانی کی اویاں بھر کر اپنے ساتھ لے لیتے ہیں۔ ان میں پانی اچھا خاصا ٹھنڈا ہو جاتا تھا۔ کوہستان میں پانی بھرنے کے لئے اوئی عام طور پر استعمال ہوتی ہے۔ اوئی رنگنے کے لئے فقط ببر کا چھلکا ڈالتے ہیں۔ کبھی کبھار کانہیری کا چھلکا بھی استعمال کرتے ہیں۔ اگر اوئی میں انہیں دودھ ڈالنا ہوتا ہے تو اسی کھال میں بیرولی اور انار کی کھال ڈالتے ہیں تو بڑی نرم ہو جاتی ہے، اور اس کا رنگ بھی تبدیل ہو کر پیلا ہو جاتا ہے۔ اگر اسی کھال کو انہیں گھی ڈالنے کے لئے استعمال کرنا ہوتا ہے تو اس میں مہندی کے پتے اور کھور درخت کے چھلکے ڈالتے ہیں۔ مزید اچھی اور خوشبودار اوئی بنانے کے لئے کھجور ابال کر، اس کا رس ڈال کر، کافی دن رکھ لیتے ہیں، اور پھر اوئی صاف کر کے، گھی ڈالنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اسے ''زک'' کہا جاتا ہے۔ پہلے بھی شاید اسی طرح کرتے تھے۔ مصنف

طبابت اور جراحت: وادیٔ سندھ کے باشندوں میں سے اگر کوئی بیمار پڑ جاتا تھا تو دوا دارو کرنے کے لئے طبیب یا حکیم بھی ہوتے تھے، جو ''بھشک'' (بھشج) (Bhishaj) کہلاتے تھے (منڈل نواں، ۱۱۲، ۱، ۳)۔ حکیموں سے متعلق رگ وید میں مذاقاً کہا گیا ہے کہ ''یوں چاہتے تھے کہ گاؤں میں کاش کوئی بیماری سر اٹھائے، اور ہماری کمائی بڑھے!'' ان میں سے کچھ حاذق حکیم بھی ہوتے تھے۔ اس طرح کے ایک جراح حکیم کا ذکر کرتے ہوئے، ایک رشی نے کہا ہے کہ ''اے حکیم، میں تمہیں گھوڑا، گائے اور کپڑے وغیرہ تو دوں، بلکہ میں تم پر اپنی جان بھی قربان کردوں'' (منڈل دسواں، ۹۷)۔ مطلب یہ کہ حاذق حکیموں کی لوگ بڑی قدر کرتے تھے۔

رگ وید والے زمانے میں آج کی طرح کوئی لیبارٹریز یا تجربگاہ (Laboratories) نہیں تھے، پھر بھی اس قدیم زمانے کے حکیموں کو طرح طرح کی جڑی بوٹیوں کی خصوصیات کا علم تھا، جن میں سے آنکھوں کے قطرے اور پھکی وغیرہ بنائی جاتی تھیں۔ اس وقت سطح مرتفع پر اور جبلوں کے ساتھ ساتھ، جو ان پڑھ لوگ رہتے تھے، وہ بھی جڑی بوٹیوں کی پہچان رکھتے تھے۔ ایک آسوری نے کوئی کالا پودا دریافت کیا، جو چمڑے کی بیماری اور برص کے لئے استعمال ہوتا تھا (اتھرو وید، ۱، ۲۴، ۲)۔ جن کو جڑی بوٹیوں کی ضرورت ہوتی تھی، وہ ''کراٹ'' (Kirata) نامی ایک جابلو قوم والوں کی بیٹیوں سے خرید لاتے تھے۔ یہ لڑکیاں پہاڑوں کی اونچی چوٹیوں پر چڑھ کر، وہاں سے جڑی بوٹیاں نکال کر لاتی تھیں، اور ان کے عیوض کپڑے، چٹائیاں، بکریوں کی کھالیں وغیرہ لیتی تھیں (اتھرو وید، منڈل چوتھا، ۷، ۶)۔ رگ وید کے منڈل دسویں میں ایک سُوکت (Hymn) سارا ہی بوٹیوں کی تعریف میں ہے۔ ان میں کن بوٹیوں کے نام بھی درج ہیں: جیسا کہ، آشووتی، سوموتی، اُرجینتی اور اُدُوجس۔ کن بوٹیوں کے نام ایسے ہیں، جن کی معنی اس وقت کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا: ''پرشنی پرنی'' (Prisni Parni)۔(Hermionitis Cordifolia) نامی ایک بوٹی عام ہوا کرتی تھی۔ جس عورت کے حمل ضایع ہونے کا امکان ہوتا تھا، اس کے لئے یہ مفید سمجھی جاتی تھی۔ سُشرت (۱، ۷۷، ۳، ۷) میں بھی حمل گرنے سے روکنے کے لئے یہی علاج بتایا گیا ہے۔ جڑی بوٹیوں کی خاصیتوں کو شمار کرتے ہوئے، رگ وید میں ایک رشی نے کہا ہے کہ ''جس طرح کوئی راجکمار جنگ کے میدان میں کھڑا ہوکر، دشمن کو ہٹاتا ہے، اسی طرح یہ بوٹیاں بیماریوں پر غالب آ کر انہیں بھگاتی ہیں۔ ۔۔ اے بوٹیو، تم جو زمین پر پھیلی ہوئی ہو، میری ناتواں ہڈیوں میں طاقت لاؤ۔ جو تمہیں زمین میں سے کھود کر نکالتے ہیں، وہ کاش تمہیں کوئی ضرر نہ پہنچائیں! کاش میرے پالتو پرندے اور مویشی بیماریوں سے چھٹکارا پائیں!'' اس سے ظاہر ہے کہ اس وقت کے حکیم نہ صرف لوگوں، بلکہ جانوروں اور پرندوں کا بھی علاج کرتے تھے۔ جڑی

بوٹیوں کے علاوہ سفید چیونٹیوں کی مٹی (بلوں سے نکالی ہوئی مٹی) بھی کئی ایک عارضوں میں دوا کے طور استعمال کرتے تھے۔ اس مٹی کو زہر کے لئے تریاق سمجھتے تھے۔ کوشک سُوتر (۳۱،۲۶) میں درج ہے کہ کسی آدمی کے جسم سے زہر نکالنا ہوتا تھا، تو یہ مٹی زہر والی جگہ پر رکھ کر باندھ دیتے تھے، پانی میں ملا کر اس شخص کو پلاتے تھے، اور اس مٹی میں ملے ہوئے پانی سے کلیاں بھی مریض سے کرواتے تھے۔ یہ مٹی گرم پانی میں حل کرکے اس کے جسم پر بھی لیپ کرتے تھے۔ اتھرو وید میں درج ہے کہ بہتے ہوئے (جاری) خون کو روکنے کے لئے بھی یہی مٹی استعمال ہوا کرتی تھی۔ بارہ سنگھے کا سینگ کھیتری (Heriditary) بیماریوں سے چھٹکارا پانے کے لئے استعمال ہوتا تھا (اتھرو وید، منڈل تیسرا، ۷، ۱)۔

کسی بھی مرض کا علاج کرنے سے پہلے مرض کی تشخیص (Diagnosis) ضروری ہے۔ ویدک زمانے میں ہی وادیٔ سندھ کے حکیم مرضوں کی پوری طرح تشخیص کر سکتے تھے۔ یہ بات اس سے ظاہر ہے کہ رگ ویذ اور اتھرو وید میں کئی مرضوں کے نام درج ہیں: مثلاً، ''ہرت'' (Harita) یعنی ''یرقان'' (Jaundice)، ''کلاس'' (Kilasa) یعنی چٹی یا کوڑھ، ''کاسکا'' (کھانسی)، ''پاما'' (Herpes)، ''ہردیوت'' (Hriddyota) یعنی دل کی بیماری، ''جایانیہ'' (Venereals) اور دیگر۔ رگ وید میں ایک سُوکت ''تکما'' (تپ ربخار) سے متعلق ہے؛ اس میں بخار کی ساری قسمیں اور کالی کھانسی کے سارے ارکان نہایت وضاحت سے درج ہیں۔ مرضوں کی پوری پوری تشخیص اور ان کے لئے صحیح صحیح علاج کرنے والے کو ہی ''وَیدیہ'' کہا جاتا تھا۔ ''وَیدیہ'' لفظ کی بنیادی معنی ہی ہیں ''جاننے والا''، (مادہ: ''وِدْ'' Vid معنیٰ ''جاننا''۔ انگریزی لفظ ''ڈاکٹر'' اور عربی لفظ ''حکیم'' کے بھی اصل معنی ہیں ''ڈاھو''۔ حکمت معنیٰ ڈاھپ۔ تقریباً ۳۲۵ برس ق۔م سکندرِ اعظم کے وقت میں بھی سندھ کے حکیم حاذق ہوتے تھے، اس لئے یونانی مورخوں نے ان کی بڑی تعریف کی ہے۔ مطلب یہ کہ قدیم زمانے سے لے کر سندھی لوگ طبابت میں ماہر ہوا کرتے تھے۔ مصنف نے دیکھا ہے کہ سن ۱۸۸۶ع تک حیدرآباد جیسے شہر میں ایک دو ڈاکٹر بمشکل ہوتے تھے، نہیں تو صرف ٹوٹکے بتانے والے اور حکماء ہوتے تھے، جو آج بھی بہت ہیں۔ دیہات میں لوگ ڈاکٹر سے دوا اکثر نہیں لیتے۔ کیسی بھی بیماری میں مبتلا ہو جائیں، تو کسی ٹوٹکے بتانے والے یا والی سے جا کر نسخہ پوچھیں گے، اور اس نسخے کے مطابق علاج کریں گے۔ چھوٹے بچوں کو اگر کوئی بیماری ہوتی تھی تو ان کی مائیں یا دادیاں ان کا علاج کرتی تھیں۔ آج بھی کئی عمر رسیدہ عورتیں اپنے بچوں کا علاج خود کرتی ہیں۔

قدیم لوگوں کو علم جراحت (Anatomy) کا بھی علم تھا۔ قدیم زمانے میں ''پرش میدھ'' یعنی لوگوں کی قربانی کا یگیہ (Human Sacrifice) اور ''اشو میدھ'' یعنی گھوڑوں کی قربانی کا یگیہ (Horse Sacrifice) عام طرح ہوتا تھا، اور دیگر جانور بھی قربان کرتے تھے۔ یگیہ کروانے والے رشی ہر ایک جاندار کے جسم کے حصے باترتیب کاٹ کر، ہر ایک حصہ اگنی (آگ) میں پھینکتا جاتا تھا۔ ان یگیوں میں سے ہی انہیں علم تشریح کا پتہ چلا۔ اس زمانے مین مچھلی کھانے کا رواج بھی عام تھا، اس لئے کسائی بھی ہوا کرتے تھے۔ جس طرح اس وقت کسائیوں کو اپنا کاروبار کرتے ہوئے بکریوں، بھیڑوں وغیرہ کے جسم کی بناوت کا علم حاصل ہوگیا ہے، جس وجہ سے ان کے جسم کا ہر ایک حصہ باترتیب کاٹتے ہیں، اسی طرح قدیم لوگوں کو نہ صرف بکریاں، بھیڑیں اور دیگر جاندار، بلکہ انسانوں کے جسم کی بناوت کا بھی پورا پتہ پڑ گیا ہے، اس لئے علم تشریح میں ماہر ہوتے تھے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ منتر بھی استعمال کرتے تھے (اتھرو وید، منڈل پہلا، ۱۷)۔

رگ وید میں ایسے اشارے موجود ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر کسی کا کوئی عضو خراب ہو جاتا تھا تو اسے پوری طرح کاٹ کر، اس کے عیوض کوئی مصنوعی عضو اسے لگاتے تھے، ''وشپلا'' نامی ایک برجستہ عورت کی ٹانگ لڑائی میں کٹ گئی، تو اشونی کمار دیوتاؤں نے لوہے کی ٹانگ بنا کر اسے لگادی (منڈل پہلا، ۱۱۲، ۱۰)۔ اس سے یوں سمجھا جاتا ہے کہ اس وقت کے ٹوٹکے بتانے والے اگر کسی کو شفایاب کرتے تھے تو یہ دعویٰ نہیں کرتے تھے کہ ہم نے بیماریوں سے چھڑاتے ہیں، لیکن کہتے تھے کہ یہ دیوتاؤں کی مہربانی ہے۔ اشونی کمار دیوتا کو دوسرے دیوتاؤں کا طبیب کہا گیا ہے، اس لئے اپنی تعریف کرنے کے بجائے اس کی تعریف کی گئی ہے۔ ایسی مثالیں اور بھی ہیں۔ رجراشو نامی ایک شخص بھیڑیں چراتے ہوئے ایک سَو بھیڑیں بھیڑیوں اور بھیڑیانیوں سے مروا کر واپس آیا، تو اس کے باپ کو اتنا غصہ آگیا کو اس نے اپنے بیٹے کی دونوں آنکھیں نکال ڈالیں، لیکن اشونی کمار دیوتاؤں نے پھر اسے آنکھیں ڈالیں، اور دیکھنے لگ گیا (منڈل پہلا، ۱۱۶، ۱۶)۔ پراواج (Paravaj) نامی ایک شخص اندھا اور منڈا تھا، تو اشونی کمار دیوتاؤں نے اسے بحال کیا (منڈل پہلا، ۱۱۲، ۸)۔ گھوشا نامی ایک عورت کا پورا جسم کسی بیماری کی لپیٹ میں آ گیا، اور اس کے تندرست ہونے کا کوئی آسرا نہیں تھا، اس لئے منگنی اور شادی کے قابل نہیں رہی تھی، لیکن بعد میں دیوتاؤں کی مہربانی سے اسے اس مرض سے چھٹکارا مل گیا اور اس نے شادی کرلی۔ ان باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ وادیٔ سندھ میں حاذق حکیم ہی قابل جراح ہوتے تھے۔ قدیم ہندوؤں کے اوزار بھی اتنے تیز ہوا کرتے تھے کہ بال کو لمبائی میں دو ٹکڑے کر دیتے تھے۔[1] کشتہ جات بھی ایسے تیار کرتے تھے کہ بوڑھے کو جوان کر دیتے تھے۔

(1) "The surgical instruments of the Hindus were sufficiently sharp, indeed, as to be capable of dividing a hair longitudinally". Mrs. Manning: Anceint and Mediaeval Inida, Vol. II: p. 346.

شیوَن (Cyavana) رشی کے بارے میں درج ہے کہ وہ بلکل بوڑہا ہو گیا تھا، لیکن بعد میں اسے نئی جوانی ملی، اور کئی لڑکیوں سے اس نے شادی کی (منڈل پہلا، ۱۱۶، ۱۰)۔ آج بھی ہمارے وئیج اور حکیم کشتہ جات تیار کرنے میں ماہر ہیں، لیکن کچھ نیم حکیم بھی ہیں، جو بیماروں کو یا تو تندرست کرتے ہیں یا پھر مار دیتے ہیں، یا پھر ساری عمر کے لئے اپنارل کر دیتے ہیں۔

جھاڑ جھپاڑ اور ٹونے پھینے: قدیم لوگ بیماریوں کے لئے علاج تو کراتے تھے، لیکن کبھی کبھار کسی کو اگر سانپ نے ڈس لیا، یا بچھو نے ڈنگ مارا، تو جھاڑ جھپاڑ بھی کرواتے تھے (رگ وید، منڈل پہلا ۱۹۱)۔ کسی کو اگر ایسی بیماری ہوتی تھی، جو اس کے عزیزوں کو بھی ہوتی تھی تو جَوْ کا تنکہ اس کے سر کے اوپر ہلا کر منتر پڑہتے تھے تاکہ یہ موروثی بیماری نکل جائے، اور اس کی اولاد اس جیسی بیماری میں مبتلا نہ ہو جائے (اتھرو وید، منڈل دوسرا، ۸، ۳)۔ جلندر میں مبتلا شخص کو جل پڑھ کر پلاتے تھے، اور اس کے اوپر پانی چھڑکاتے تھے تاکہ اس کے پیٹ والا پانی نکل جائے (اتھرو وید منڈل چھٹا، ۲۴)۔ بخار والے آدمی کی چارپائی کے ایک پائے سے مینڈک باندھ کر منتر پڑھتے تھے تاکہ ٹھنڈا مینڈک بخار کی گرمی کھینچ لے (اتھرو وید، منڈل ساتواں، ۱۱، ۶)۔ رگ وید والے زمانے میں ہی لوگ عام طور پر سمجھتے تھے کہ جن بھوت ہیں، ان کا اگر سایہ کسی حاملہ عورت پر پڑے گا تو اس کا کچہ بچہ گر جائے گا، یا مرا ہوا بچہ پیدا ہوگا، جس وجہ سے کبھی ایسا زہر بھی اس پر چڑہ جائیگا کہ وہ خود بھی مر جائیگی۔ جنوں بھوتوں کے اس طرح کے اثرات سے بچنے کے لئے ویدوں کے کچھ منتر پڑھتے تھے، جو رگ وید میں درج ہیں۔ اتھرو وید میں تو اس طرح کے منتر بہت ہیں۔ اگر کوئی عورت حاملہ نہیں ہوتی تھی تو اس کے لئے بھی منتر پڑھتے تھے۔ بدن سے ہر قسم کا درد نکل جائے اس کے لئے بھی کچھ منتر پڑہتے تھے (منڈل دسواں، ۶۳)۔ بعض لوگ صدقہ دیتے تھے، اور ٹونے پھینے کرتے تھے (منڈل دسواں، ۱۶۱)۔ اگر کوئی بیوی چاہتی تھی کہ اس کے شوہر کی اس سے محبت بڑہ جائے، تو اس کے لئے بھی منتر پڑہتے تھے (منڈل دسواں، ۱۵۹)۔ مطلب یہ کہ صدقہ دینا، جھاڑ ڈالنے، ٹونے پھینے کرنے اور تعویذات کرنے کا رواج، جو آج کل عام ہے، اس کا بیج رگ وید والے زمانے میں ہی بویا ہوا تھا۔ اس وقت کسی درد دفع کرنے، یا کسی برج کا اثر ٹالنے کے لئے باوے اور باہمن لوگوں کو پانی پڑھ دیتے ہیں، اس رواج کا ذکر بھی منڈل دسویں (۱۳۷) میں ہے۔ کوئی منتر پڑھ کر پانی میں پھونک مارتے تھے، تو پانی میں گویا بجلی کا سا اثر ہو جاتا تھا، اور وہ پانی بیمار کو پلاتے تھے، تاکہ پڑہا ہوا پانی اس کے درد کو نکال ڈالے۔ منتر پڑھ کر کپڑا جھاڑتے ہیں، یہ گویا درد کو جھاڑ کر دور کرتے ہیں۔ رگ وید میں ہر

ایک عضو سے بلکہ روم روم سے درد کو نکالنے کے لئے منتر ہیں۔ بعض علماء کا کہنا ہے کہ بھرم اور سنسا دراصل دراوڑوں میں تھے، جن کا بعد میں آریوں پر بھی اثر ہوا۔

جنگی سپاہ: رگ وید والے زمانے میں کچھ جوانوں کا دھندھ ہی جنگوں میں لڑنا تھا۔ رشیوں اور براہمنوں کی زیادہ توجہ مذہبی امور کی طرف ہوا کرتی تھی، پھر بھی ہتھاروں کے استعمال میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ کوئی بڑی جنگ لگتی تھی تو جنگی سپاہ کے پیچھے جنگ کے میدان میں جاتے تھے، اور دشمنوں کے ساتھ جوان مردی سے لڑتے تھے (رگ وید، منڈل ساتواں، ۳۳)۔ رشی، براہمن خواہ دوسرے جنگی جوان جنگ کے میدان میں تھوڑا سا سوم رس پی لیتے تھے، اور اس خمار میں اپنے سر کی پرواہ نہ کرتے ہوئے، بڑی مردانگی کے ساتھ لڑتے تھے، اور ہر ایک چھلانگ میں اندر دیوتا کا نام لیتے جاتے تھے۔ رگ وید والے اوائلی زمانے میں اندر مہراج نہ صرف برسات کا دیوتا، لیکن جنگ کا دیوتا (war - god) بھی سمجھا جاتا تھا۔ اندر کے پوجاری اسے سوم رس کا چڑھاوا کرتے تھے، اور اگنی (آگ) میں بھینسوں اور بیلوں کی چربی ڈالتے تھے، تاکہ اندر دیوتا خوش ہو کر اپنے پوجاریوں کو جنگوں میں فتحیاب کرے (رگ وید، منڈل چھٹا، ۳، ۵، اور منڈل دسواں، ۱۶، ۳)۔ آسمان پر جب کالے بادل اکٹھے ہو جاتے تھے، لیکن برسات نہیں ہوتی تھی، تو یوں سمجھتے تھے کہ آسمان پر کچھ دیت ہیں، جو برسات کے پانی کو اپنے قلعوں میں قابو کر کے بیٹھے ہیں۔ ان دیتوں سے مقابلہ کرنے کے لائق صرف اندر دیوتا ہی کو سمجھتے تھے، لیکن اندر دیوتا خمار میں ہو تب دیتوں سے لڑ پائے گا، جب سوم رس کی تھوڑی سی مقدار پی لے گا۔ اندر دیوتا کو سوم رس کا بھوگ لگانے کا اہم مقصد یہی ہوتا تھا۔[1] وہ سمجھتے تھے کہ سوم رس کے بھوگ لگانے کے سبب اندر دیوتا اس قدر مستی میں آ جاتا ہے، کہ ورتر اور دیگر دیتوں کے قلعوں کو بھی توڑ دیتا ہے، جس وجہ سے دشمنوں کے قلعوں میں اندر قابو برسات کا پانی فصلوں کے لئے ملتا ہے۔ اسی سبب اندر دیوتا کو "پُرَ بندر" یعنی قلعے ناس کرنے والا بھی کہا گیا ہے۔ اس طرح کے عقائد کی وجہ سے خود بھی جنگ جوتنے سے پہلے سوم رس کی تھوڑی سی مقدار پی لیتے تھے، تاکہ ہمت سے لڑ کر دشمنوں کے قلعے بھی توڑ دیے جائیں۔

جنگوں کے اسباب اور سپاہیوں کے ساج (Accoutrements): رگ وید والے زمانے میں کچھ جنگیں اور مقابلے خاص اس وجہ سے ہوتے تھے، کہ لٹیرے جو مال مویشی

(1) "The main object of the Soma sacrifice was to strengthen Indra in his fight with Vrtra, and bring down timely rains from the reluctant clouds for helping agricultural work." Dr. A.C.Das: Reg Vedic Culture, p. 508.

لے گئے ہوں، وہ ان سے واپس لے لیا جائے، یا دشمنوں کے مویشی بلکہ ان کی بیویاں بھی ہتھیا لی جائیں (رگ وید، منڈل نواں، ۶۷، ۱۰۔۱۲)۔ کبھی کبھار فصلوں کے پانی پر جھگڑے ہوا کرتے تھے (رگ وید منڈل چھٹا، ۲۵، ۴)، تو جنگی جوان جوش میں سے مخالفون کا پیچھا کرتے تھے (رگ وید، منڈل ساتواں، ۸۴، ۷)۔ جنگ کے وقت بہادر سپاہی اپنے جھنڈے کھڑے کرتے تھے (رگ وید، منڈل دسواں، ۱۰۳، ۱)۔ جنگ شروع کرنے کے وقت نغارے بجاتے تھے تو دور ہی سے پتہ چل جاتا تھا کہ اب جنگ لگ رہی ہے۔ جب دھوم سے دھمالیں بجنا شروع ہو جاتی تھیں، اس وقت جنگی بہادر شور مچاتے ہوئے، تیز تیر لے کر، جنگ کے میدان میں کود پڑتے تھے، اور ان کے شور کا پڑاؤ دور دور تک سنائی دیتا تھا (رگ وید، منڈل پانچواں، ۵۴، ۱۳)۔ اس وقت سارتھی (رتھ چلانے والے) اپنے رتھ تیز تیز چلاتے ہوئے، ناہموار زمیں پر سے بھی اتنے تیز جاتے تھے، جس طرح ندیوں کا پانی کسی بڑے اترائی سے بڑی تیزی سے نیچے اترتا ہے، اپنے گھوڑوں کی باگیں اپنے دونوں ہاتھوں میں مضبوط پکڑ کر، دشمنوں پر یوں جا کر ٹوٹتے تھے، جس طرح باز کسی شکار پر جا کر ٹوٹتا ہے (رگ وید، منڈل چھٹا، ۴۶، ۱۳۔۱۴)۔ کئی سواروں کے گھوڑے ہنہناتے ہوئے، بیک وقت تیز دوڑتے تھے تو بڑی دھول اٹھتی تھی۔ بعض جنگی جوانوں کو کاندھوں پر بھالے ہوا کرتے تھے، اور جو زیور انہیں پہنے ہوئے ہوتے تھے ان کی تجلی دور سے دکھائی دیتی تھی (رگ وید، منڈل پہلا، ۶۴، ۶)۔ کئی جوانوں کو پیروں میں کڑیاں پہنی ہوئی ہوتی تھیں۔ بعض کی سونے کی زنجیریاں ان کے سینوں پر لٹک رہی ہوتی تھیں (رگ وید، منڈل پانچواں، ۵۴، ۱۰)۔ بازوؤں میں انہیں پٹے باندھے ہوئے ہوتے تھے (منڈل پہلا، ۶۴، ۱۰)۔ بعض کو زرہ پہنے ہوئے ہوتے تھے، اور کمانیں ان کے کندھوں میں پڑی رہتی تھیں۔ ان کے گھوڑوں اور گھوڑیوں کو موتیوں کی مالائیں پہنی ہوئی ہوتی تھیں (رگ وید، منڈل ۷۷، ۱۸، ۲۲۔۲۳)۔ جنگی سپاہیوں میں سے کچھ ہاتھیوں، گھوڑوں اور رتھوں پر سوار ہوتے تھے، تو کچھ پیادے بھی ہوتے تھے۔ تیر رکھنے کے لئے ان کے پاس تیرکش ہوا کرتے تھے۔

قدیم یونانی لوگ تیر کمانوں میں ڈال کر، چھاتی تک کھینچ کر، پھر مارتے تھے۔ ہماری وادیٔ سندھ کے جنگی جوان تیر کمانوں میں ڈال کر، کانوں تک کھینچ کر، پھر مارتے تھے۔

دوبدو لڑنے کے وقت کلہاڑے، نیزے، اور ترسولوں کی طرح کے بنے ہوئے ہتھیار استعمال کرتے تھے۔ کسی جنگ میں فتحیاب ہوتے تھے تو نغارے زور سے بجاتے تھے، اور بلند آواز سے جئے جئے کار کے نعرے لگاتے تھے۔

☆

باب ۱۲

تجارت اور بیرونی ممالک میں بیٹھکیں

قدیم سندھ کے تاجر: رگ وید میں کئی مقامات پر "پنی" لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے معنی ہیں "تاجر" (بیوپاری)۔ اس لفظ کا مادہ ہے "پن" معنی "سودا کرنا، لینا" وغیرہ۔ وہ بڑی پکائی سے جنسوں کی خرید و فروخت کیا کرتے تھے، سودے میں مروت نہیں کرتے تھے، اور صرف اپنے سُود اور منافعے کی بات سوچتے تھے۔ اسی سبب رگ وید کے منڈل چھٹے، سُوکت ۵۱، رچا ۱۴، میں انہیں "بھیڑیوں کی طرح لالچی"، اور منڈل چھٹے کے سُوکت ۱۶۱ کی رچا پہلی میں "خود مطلبی" کہا گیا ہے۔

یہ "پنی" (بیوپاری) دراصل آریہ تھے یا دراوڑ، یا اگر فرض کر لیا جائے کہ اصل میں دراوڑ تھے، اور بعد میں آریوں سے رشتیداری کرنے کے سبب "آریہ" کہلانے لگے، تو بھی یہ توجہ طلب ہیں، کیونکہ وادیٔ سندھ کے اوائلی بیوپاری یہی ہیں۔ رگ وید میں ان "پنی" لوگوں کو "ونک" بھی کہا گیا ہے۔ ڈاکٹر ابناش چندر داس نے لکھا ہے کہ بعد کے سنسکرت کوشن (لغتوں یا ڈکشنریوں) میں جیسا کہ "راج نرگھنت" (Raja-Narghanta) میں "ونک" اور "پنک" ایک ہی قسم کے الفاظ کہے گئے ہیں۔ رگ وید میں درج ان پنی لوگوں میں سے بعد میں کچھ جنوبی ہندستان کی طرف نقل مکانی کر گئے، اور ان میں سے جو ہمیشہ کے لئے وادیٔ سندھ میں رہے، وہ ویدک آریوں کی پنگت میں داخل ہو گئے، اور وہ بعد میں "ویشوں" کے زمرے میں شمار ہونے لگے۔[1] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رگ وید والے زمانے کے پنی یا "پنک" اور "ونک" یہی ہیں جو آج کل "وانیے" (ونج کرنے والے) اور بھائیبند کہلاتے ہیں، اور آج تک "ویشوں" کے زمرے میں شمار ہوتے ہیں۔

سندھ میں اس وقت ہندوؤں کے دو اہم حصے ہیں: ایک عامل، اور دوسرے بھائیبند۔ بیچ بیچ موجودہ عاملوں میں سے بعض اصل بھائیبند ہیں، اور بعد میں عاملوں میں مل جل گئے۔ یوں

(1) "Those that remained in the country gradually became incorporated into the Vedic Arian society, and became the ancestors of Vanikas of later times, who formed the third twice-born caste, known as the Vaisya caste. Even in later Sanskrit lexicons, the Vanikas came to be identified with the Panikas who were no other than the Panis of the Reg Vedic times." Dr. A. C. Das: Reg Vedic India, Page 188.

بھی ہے کہ بعض عامل اور خدا آبادی بھائیبند ایک ہی جد کی اولاد ہیں، لیکن ان میں سے جنہوں نے کلہوڑوں اور میروں کی ملازمت کی، وہ ''عامل'' کہلانے لگے، اور جنہوں نے اپنے باپ دادا والے دندھے تجارت کو مسلسل جاری رکھا، وہ بھائیبند کہلانے لگے۔ چند عاملوں میں سے کچھ کھتری ہیں، ورنہ اکثریت وئشوں کی ہے، لیکن دونوں کی کراچی کے سیٹھ لوگوں، اور حیدرآباد کے مکھیوں اور دیگر خدا آبادی بھائیبندوں سے رشتیداریاں ہیں۔ اس قریبی عزازت کے سبب، عامل انہیں ''بھائیبند'' یعنی ''بھائی'' اور ''بندھو'' (رشتیدار) کہنے لگے، اور یہ اچھا اور میٹھا نام آج تک جاری ہے۔ بھائیبندوں میں سے آج کل کچھ ملازمت کرتے ہیں، ورنہ ان کا اہم دھندھہ تجارت ہے۔

ان بیوپاریوں کا قدیم سے قدیم احوال رگ وید سے ملتا ہے، جو مختصراً اس طرح ہے:

وادیٔ سندھ (پنجاب اور سندھ) کے دیہاتوں میں لوگوں کی ضرورت سے زیادہ جو اناج، کپڑا وغیرہ ہوا کرتا تھا، اسے یہ بیوپاری دوسرے مقامات پر بیچنے کے لئے لے جاتے تھے۔ غلاموں کا بیوپار بھی کرتے تھے۔ ہمالیہ جبل کے پاس سوم جڑی بوٹی بڑی مقدار میں پیدا ہوا کرتی تھی، اور اس کا استعمال بہت ہوتا تھا، اور وہ اچھے داموں بکتی تھی، اس لئے اس جڑی بوٹی کا بھی بیوپار کرتے تھے۔ تمام جنسوں کا بیوپار کچھ خشکی تو کچھ دریاہ یا سمندر کے راستے ہوتا تھا۔

خشکی کے راستے بیوپار کرنے کے لئے بیوپاری کارواں کی صورت میں جاتے تھے۔ اپنا مال گھوڑوں، بیلوں، اُونٹوں، اور گدھوں پر لاد کر، دور دراز علاقوں کی طرف جاتے تھے۔ اس زمانے میں بھی چور اور رہزن ہوا کرتے تھے۔ بیوپاری اپنی جان و مال کے تحفظ کے لئے کیا کوششیں لیتے تھے، یہ بات رگ وید میں درج نہیں ہے، باقی بعد کی ساہت سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں اپنے ''جیٹھک'' (وڈیرے یا مکھی) ہوا کرتے تھے، ان پر ان کی جان و مال کے تحفظ کی ذمیداری ہوتی تھی، اور وہ اپنا گائیڈ (راستہ دکھانے والا) اور سپاہی اپنے ساتھ لیتے تھے۔ یہ ویدک زمانے کے بعد کی باتیں بعد میں درج کریں گے، یہاں صرف اتنا کہا جاتا ہے کہ رگ وید والے زمانے میں قدآور کتے ان کے ساتھ ہوتے تھے، جن کے نزدیک آنے کی کسی چور یا رہزن کی مجال نہیں تھی۔ یہ بیوپاری کن ممالک کی طرف جاتے تھے، یہ بات رگ وید کے کسی بھی منڈل میں واضح طور پر درج نہیں ہے۔

سندھ اور پنجاب میں دریاء ہونے کے سبب ہمارے لوگوں نے کشتیاں اور بیڑے بنانے کی ضرورت کو محسوس کیا۔ پرانوں کے مطابق پورے جموں دویپ کے چاروں طرف سمندر تھا، اور رگ وید مطابق ''سپت سندھو'' کے اردگرد چار سمندر تھے، اس لئے جہاز بنانے کا فن اور جہازرانی

کا فن بھی اسی قدیم زمانے میں انہیں (معلوم) تھا۔[1] دریاء کے راستے مال درآمد اور برآمد کرنے کا رواج اس قدیم زمانے سے لے کر انگریزوں کے حکمرانی کے اوائل تک عام تھا۔ سن ۱۸۵۸ع میں کراچی سے لے کر کوٹڑی تک ریل گاڑی کا راستہ بنانے کی ابتدا ہوئی، اس کے بعد یہ آمدرفت کم ہوئی لیکن بلکل بند نہیں ہوئی۔ آج تک روہڑی، سکھر اور دیگر مقامات کے بیوپاری اپنا مال دریاء کے راستے لاتے اور بھیجتے ہیں۔

قدیم زمانے میں خرید و فروخت نقدی پر نہیں ہوتی تھی، جنسوں کی اکثر لین دین کرتے تھے۔ ایک جنس کے عیوض کوئی دوسری جنس، یا گائیں، بھینس اور دیگر مال مویشی، لیکن خاص طور پر گائیں لیتے تھے (رگ وید، منڈل چوتھا، ۲۴، ۱۰)۔[2] یہ لین دین کا دستور مصنف نے دیکھا کہ حیدرآباد میں عام تھا۔ اناج دے کر پنساری سے مصالحہ جات لیتے تھے۔ اسی طرح بعض لوگ سپیاں بھی دیتے تھے۔ آج بھی گوٹھوں اور بستیوں میں کسان لوگ اناج دے کر دکاندار سے کپڑا وغیرہ لے آتے ہیں۔ یہ قدیم زمانے کے رواج کی نشانیاں ہیں۔

قدیم زمانے میں ہی لوگ بڑی پکائی سے سودا کرتے تھے۔ رگ وید میں درج ہے کہ جنسوں کی خرید و فروخت کے وقت لوگ بڑا بحث کرتے تھے۔ قیمتیں پہلے ہی سے طے کر لیتے تھے، اس سے یہ قیاس آرائی کی جا سکتی ہے کہ نہ صرف موجود مال بکتا تھا بلکہ آئندہ دیے جانے والے مال کا سودا بھی ہوتا تھا۔ ایک دفعہ جو بولی طے ہو جاتی تھی اس سے کسی کو مکرنے نہیں دیتے تھے۔ رگ وید کے منڈل چوتھے (۲۴، ۹) میں درج ہے کہ ''کوئی شخص بڑی رقم والی چیز تھوڑے داموں دے دیتا ہے، اور پھر مڑ کر خریدار کو کہتا ہے کہ ''میں نے یہ بکری کی ہی نہیں، مجھے پوری رقم دے دو''، لیکن کچھ بھی اسے زیادہ نہیں ملتا، کیونکہ اسے اپنی زبان پر قائم رہنا ہے''۔ لگتا ہے کہ تنگی کے وقت بڑی داموں والی چیز تھوڑے داموں میں دیتے تھے، اور بعد میں مکر جاتے تھے، تو نہ انہیں فروخت شدہ چیز واپس ملتی تھی، اور نہ ہی مزید رقم انہیں ملتی تھی۔

بحری یا سمندری تجارت (Maritime Trade): گزشتہ انیسویں صدی کی شروعات میں تاریخ پر تحقیقات ہو رہی تھیں، تو سنسکرت ادب سے یورپی لوگوں کو یوں سمجھ میں آیا

(1) "It would have been strange if the many wide and deep rivers had not encouraged boat-building, even ship building and navigation; so that, while the general formation of the land, divided by intersecting mountain spurs in countless valleys, favoured the establishment of separate and independent tribes. The many easy ways of communication fostered neighbourly intercourse; and laid the beginnings of commerce." Z.A.Regozin: Vedic India, Page 112.

(2) "Movable property could change hands by gift or by sale, the later taking the form of a barter...The standard of value seems to have been the cow." Cambridge History of India Vol. I page. 97.

کہ قدیم آریوں کو جہاز رانی کا کوئی علم نہیں تھا! اس طرح کی رائے کا پروفیسر ہاپکنس نے اظہار کیا۔[1] پروفیسر مَکڈونیل، جس نے سنسکرت ساہت کی تاریخ لکھی ہے، اس نے تو یوں بھی کہا کہ رگ وید والے زمانے میں قدیم آریوں نے کبھی مہا ساگر (Ocean) آنکھوں سے دیکھا ہی نہیں تھا، اور شاید سمندر کا صرف نام انہوں نے سنا تھا۔[2] اس طرح کی غلط آرائیں ظاہر ہوئیں تو ہمارے بعض ملکی علماء نے ظاہر کیا کہ ان یورپی پنڈتوں نے ویدک ساہت کا سطحی مطالعہ کیا ہے، اس لئے ان کی آراء پر بڑی خبرداری سے چلنا چاہئے۔ پرفیسر ولسن، جس نے رگ وید کا ترجمہ کیا ہے، اس نے خود رگ وید میں سے حوالے دے کر، لکھا کہ وادئ سندھ کے آریہ لوگ بڑے سمندری سفر کرنے والے اور بیوپاری لوگ تھے۔ رگ وید کے سُوکتوں میں بڑے سمندر (ہندی بڑے سمندر) کا ذکر ہے۔ جہازوں پر بیوپاری اپنے سُود خاطر بڑا بحث کرتے تھے، اس بات کا بھی ذکر ہے، بلکہ ایک دفعہ کسی دور دراز جزیرے پر سمندر کے راستے چلے گئے تھے، لیکن ان کا جہاز ٹوٹ پڑا، جس وجہ سے ان کی مراد پوری نہیں ہوئی۔[3] پروفیسر ولسن کے بعد دیگر کچھ یورپی علماء نے تحقیقات کر کے ظاہر کیا کہ قدیم وادئ سندھ کے باشندے جتنے جہاز رانی میں ماہر تھے، اتنے ہی جہاز بنانے میں بھی قابل تھے۔ وہ سمندر طے کر کے بیوپار کرنے جاتے تھے۔ یہ حقیقتیں پوکوک صاحب،[4] جرمنی کے نامور عالم پروفیسر بلہر اور دیگر نے وضاحت سے بیان کی ہیں۔ اس لئے پروفیسر ہاپکنس اور پروفیسر مَکڈونیل جیسیوں کی آراء رد ہوگئیں، اور اب ان کی کوئی بھی قدر نہیں کرتا۔ پرفیسر بلہر نے تو یوں بھی درج کیا ہے کہ قدیم آریہ لوگ ہندی بڑا سمندر طے کر کے جاتے تھے، اور وہ بیوپاری ہندو بعد میں خلیج ایران کی طرف بھی بیوپار کی خاطر جاتے تھے۔

"There are passage in ancient Indian works which prove the early existence of a navigation of the Indian Ocean, and the somewhat later occurrence of trading voyages undertaken by Hindu merchants to the shores of the Persian Gulf and its rivers." Professor Bulher.

الغرض، کچھ یورپی علماء نے شروعات میں کچھ غلطیاں کیں، جو بعد میں کچھ یورپی علماء نے انہیں درست کیا، لیکن ان کی بہت ساری غلطیوں کو بے نقاب ہمارے ملکی علماء نے کیا، اس لئے ان سابقہ آراء درج کرنے کے بجائے حالیہ تحقیقات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

---

(1) Professor E.W.Hopkins: The Religions of India, Page 34.

(2) professor A. A. Macdonell: History of Sanskrit Literature.

(3) Professor Wilson's Translation of the Reg Ved, Introduction Page XII, Second Edition, 1860.

(4) "That the people of the country of the India ranked as navigators, in the most venerable antiquity, is perfectly clear from the ancient institutes of Manu, where merchants who traffic beyond the seas, and bring presents to the King" are expressly mentioned." Pococke: India in Greece.

حالیہ جو تحقیقات یورپی علماء خواہ ملکی علماء نے ویدک ساہت میں سے وضاحت کے ساتھ بیان کیں ہیں، ان کے مطابق رگ وید والے زمانے میں ہی وادیٔ سندھ کے ''پَنِی'' (بیوپاری) جہازوں میں مال لے کر، سمندر پار کر کے، بیرون ممالک کی طرف زر کمانے کے لئے جایا کرتے تھے (رگ وید، منڈل پہلا، سُوکت ۴۸ رچا ۳)۔ کئی بیوپاری آپس میں مل کر جہازوں کے قافلے دور دراز ممالک کی طرف لے جاتے تھے (منڈل پہلا، ۵۶، ۲۷)۔ ان کے جہازوں کو ایک سو اورا (Oras) ہوتے تھے (منڈل پہلا، ۱۱۶، ۵)، اور ''پکھ'' یعنی بادبان (Sails) بھی انہیں ہوتے تھے (منڈل پہلا، ۱۴۳، ۵)۔ سمندر کے بیچ جزیرے ہوا کرتے تھے۔ جہاز چلانے سے پہلے وہ بیوپاری ورن دیوتا کو التجا کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ اسی سمندر کے دیوتا ہی کو پتہ ہے کہ سمندر میں جہاز کس راستے سے چلائے جائیں، اور ہوا کون سی (آسان یا مشکل) چلے گی (منڈل پہلا، ۲۵، ۷)۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ بیوپاری ''آریہ'' تھے، اور ورن دیوتا کے پوجاری تھے۔

وادیٔ سندھ کے بیوپاری سفر پر نکلتے تھے تو ان کے پیچھے اگن دیوتا ان کے بچوں کا رکھوالا ہوا کرتا تھا (اتھرو وید، منڈل تیسرا، سوکت ۱۵، منتر ۷)۔ ان الفاظ سے یوں سمجھ میں آ رہا ہے کہ جس طرح آج کچھ سندھ واسی خود باہر چلے جاتے ہیں، اور ان کے پیچھے بھگوان ان کے گھروں کی رکھوالی کرتا ہے، اسی طرح قدیم بیوپاری بھی اگن دیوتا اور دیگر دیوتاؤں کے سہارے اپنے بال بچے چھوڑ کر دور دراز ملکوں کی طرف زر کمانے جاتے تھے۔

سمندری سفر کے لئے ایسے مضبوط جہاز چاہئیں جو لہروں کی حملے برداشت کر سکیں۔ قدیم زمانے میں ہی وادیٔ سندھ کے بیوپاری اپنی طرز کے نہایت مضبوط اور کارآمد جہاز بناتے تھے، اور یہ کاریگری کا نمونہ ان کی اولاد نے بھی اختیار کیا۔ یورپی لوگوں نے ہندستان کے لوگوں سے تعلقات قائم کر لئے، اس سے تقریباً دو سو سال بعد میں بھی قدیم جہازوں اور کشتیوں میں ایک بھی سدھارا نہیں دیکھ سکے۔[1] تاہم رگ وید سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم بیوپاریوں کے جہاز کبھی کبھی سمندر کا زور برداشت نہیں کر سکتے تھے، جس وجہ سے ان کے غوراب بعض اوقات غرق ہو جاتے تھے۔ ''بھجیو'' (Bhujya) نامی ایک شخص کسی دور دراز جزیرے پر سمندر کے راستے نکل پڑا، لیکن غوراب کے ڈوب جانے کے باعث تین دن اور تین راتیں لہروں پر تیرتا رہا، اور پھر ناستیہ (اشونی کمار دیوتاؤں) نے اسے گہرے پانی سے بچا کر ساحل پر پہنچایا۔ یہ جو اتفاق ہوا،

(1) "Indian vessels are so admirably adapted to the purpose for which they are required that, not withstanding their superior science, Europeans were unable, during an intercourse with India for two countries, to suggest or to bring into successful practice one improvement." Sir John Malcolm, Journal of Royal Asiatic Society, Vol. I.

اس کا تذکرہ رگ وید منڈل پہلے اور ساتویں میں کئی مقامات پر ہے۔ اس حقیقت سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم وادئ سندھ کے بیوپاری اپنی جان خطرے میں ڈال کر دور دراز ممالک کی طرف جہاز لے جاتے تھے۔ اس طرح کی جرئت ہمارے موجودہ سندھ ورکیوں میں بھی ہے، جو اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے سمندر کی مسافری کرتے ہیں۔

چار سمندروں کا ذکر: رگ وید میں اگرچہ یہ درج نہیں ہے کہ اس قدیم زمانے میں وادئ سندھ کے بیوپاری کون سے سمندروں اور جزیروں کی طرف جاتے تھے، پھر بھی رگ وید کے منڈل نویں (۶۳)، اور منڈل دسویں (۲،۴۷) میں چار سمندروں کے ذکر ہے، جن میں سے ایک کو ''پورو سمدر'' یعنی مشرقی سمندر انہوں نے کہا ہے (رگ وید، منڈل دسواں، ۱۳۶، ۵)۔ ڈاکٹر ابناش چندر کے خیال موجب خلیج بنگال کو ''پورو سمدر'' کہا گیا ہے۔ دوسرا بحرِ ہند ہے، اور تیسرا موجودہ بحیرۂ عرب ہے۔ چوتھے سمندر سے متعلق یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کونسا سمندر تھا۔[1] جیالاجیکل محکمے والوں کو تحقیقات کرنے سے یوں معلوم ہوا ہے کہ کسی زمانے میں بحیرۂ عرب بڑھ کر راجپوتانا تک ہوتا تھا، جس وجہ سے پورا راجپوتانا والا علاقہ، اور موجودہ تھر کا علاقہ پہلے پانی تلے تھے[2] اور بعد میں زلزلے کے سبب سمندر دور چلا گیا۔ سمندر کی نشانیاں راجپوتانا اور تھر کی موجودہ بھٹیں ہیں۔ رگ وید کے منڈل ساتویں، سُوکت ۹۵، رچا ۲ میں درج ہے کہ سرسوتی ندی پہاڑوں میں سے بہہ کر سمندر میں جا کر گرتی ہے۔ یہ اشارہ بلا پوچھے راجپوتانا سمندر کی طرف ہے۔ لگتا ہے کہ جس زلزلے کے وقت راجپوتانا سے سمندر دور چلا گیا، اس وقت سرسوتی ندی کا بہنا بھی بند ہو گیا۔ سابقہ سرسوتی ندی کے شکم سے اس وقت جو پانی برساتی موسم میں بہہ آتا ہے، وہ راجپوتانا کی ریت کو جذب کر لیتا ہے، جس سے ظاہر ہے کہ سرسوتی موجودہ پٹیالہ راج میں سے گزر کر، اسی راجپوتانا سمندر میں جا کر گرتی تھی۔ اب ہمیں اس بات کی کھوج لگانی ہے کہ وادئ سندھ کے بیوپاری کن ممالک کی طرف جاتے تھے۔

---

(1) جیالاجیکل محکمہ والوں کا کہنا ہے کہ پہلے ایک سمندر موجودہ ترکستان سے لے کر سعبیر یا تک، اور منگولیا سے لے کر بحیرۂ اسود تک تھا، جو بعد میں شاید زلزلے کے باعث غائب ہو گیا۔ رگ وید میں (اسی) سمندر کی طرف اشارہ ہے یا نہیں، یہ نہیں کہا جا سکتا۔ مصنف

(2) "The existence of the Rajputana sea to the south of this region (Sapta Sindhu) down to the seventh or eighth millwnium B.C, has already been referred to....It is further certain that the Arabian sea also sent up an arm towards the Indus through and crossed a large part of the province of Sindh, which is now occupied by desert and the lower course of the Indus". Dr. A.C. Das: Regvedic India, PP. 26-27.

بنگال اور چین کے ساتھ تجارت: رگ وید میں مذکور چار سمندروں میں سے ایک ''پورو سمدر'' یعنی مشرقی سمندر کہا گیا ہے (رگ وید، منڈل دسواں، سُوکت ۱۳۶، رچا ۵)۔ ڈاکٹر ابناش چندر کے خیال موجب خلیج بنگال کو (پورو سمدر) کہا گیا ہے۔ ہمیں یہ بات دل سے لگ رہی ہے۔ سندھ اور پنجاب کے بیوپاری چین ملک کو جاتے تھے، ان کے جانے کا راستہ ہی خلیج بنگال سے تھا۔ ویدک والے زمانے کے بعد اتہاسوں کا زمانہ آیا، تو بھی چین سے تعلقات قائم رہتے آئے، جس کے لئے ایک ثبوت یہ ہے کہ رامائن میں چین ملک کی ریشم اور دیگر پیداوار کا ذکر ہے۔ ویدک زمانے میں وادیٔ سندھ کے بیوپاری بئبلونیا، میسوپوٹیمیا اور مغربی ایشیا کے دوسرے علاقوں کی طرف گئے، تو بھی شاید چین کے ساتھ بیوپار جاری رکھا۔ لگتا ہے کہ بنی اسرائیل (یہودیوں) اور دیگر سیمیٹک قوموں کو چین ملک کا پتہ ان بیوپاریوں سے چلا، اس لئے عیسائیوں کی کتاب انجیل میں بھی چین کا نام درج ہے۔ انجیل یا بائبل میں چین کا تلفظ ''سئنام'' ہے۔ مغربی ایشیا میں مصر کے باشندے بیوپار کی خاطر ہندستان کی طرف آتے تھے، یہ بات توریت کی پہلی کتاب پیدائش باب ۳۸، آیت ۲۵ میں درج ہے۔ حضرت یوسف ان بیوپاریوں کے ہاتھ بیچا گیا تھا، جو ہندستان سے مصالحہ جات، خوشبوئیں، اور مُر وغیرہ اُونٹوں پر لاد کر مصر ملک کی طرف جا رہے تھے۔ ''پیرپلس'' سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسوی پہلی صدی میں چین ملک سے ریشم آتا تھا، اور یہ بیوپار ہندستان کے لوگ کرتے تھے۔ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ کلہوڑوں بلکہ میروں کے دور حکومت میں بھی سندھ کے بیوپاری تجارت کی خاطر چین کو جاتے تھے۔ اس بات کا تھوڑا سا ذکر شاہ صاحب کے رسالے کے سُر سریاگ میں بھی ملتا ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ:

سودي ڪارڻ سنيري، وهون وڻجارن،
ويا چين بنگال ڏي، رکي ماڻڪ من.
(شاهه)

[بن سنور کے بنجارن، پیا ملن کی آس میں آئی،
وہ تو گیا چین۔ بنگال کی اوَر، دولت اُس کو راس آئی۔]

ان دو مصراعوں کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی دھیان میں رکھی جانی چاہئے کہ انگریزوں نے سندھ فتح کی، اس سے صرف پانچ برس پہلے، یعنی ۱۸۳۸ع میں جو بیوپار کراچی میں چلا تھا، اس کا مفصل بیان کمانڈر کارلیس نے دیا ہے، جو کسی قدر ائکن صاحب والے ''سندھ گزیٹیر'' میں درج ہے۔ اس سال سندھ میں تقریباً ساڑھے اکیس لاکھ کی تجارت ہوئی تھی۔ جو اہم چیزیں درآمد

ہوئی تھیں، ان میں ریشم بھی تھا۔[1] ان حقائق سے معلوم ہوگا کہ ہمارے اس وقت کے بھائیبند، جو چین، جپان، برما، منیلا، سینگاپور اور مشرق بعید کو جانے لگے، یہ رواج ویدک زمانے میں ہی جاری تھا، جو بعد میں کلہوڑوں اور میروں کی حکمرانی تک جاری رہا، جس وجہ سے شاہ صاحب کے رسالے میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے۔

رامائن میں یون جزیرے اور سُورن جزیرے (جاوا اور سوماترا) اور لوہت ساگر (بحیرۂ قلزم Red Sea) کا ذکر موجود ہے، اس سے سمجھا جاتا ہے کہ ان علاقوں سے تعلقات ویدک زمانے میں ہی شروع ہو چکے تھے، جو بعد میں اتہاسوں والے زمانے میں بھی جاری رہے۔

جنوبی ہندستان اور سلون سے تعلقات: رگ وید میں موتیوں کا کئی مقامات پر ذکر ہے (منڈل پہلا، ۳۵، ۴، اور منڈل دسواں، ۶۸، ۱)۔ سندھ کے راجا سونیہ بھاویہ، کاکشون رشی کو موتی بخشش دیتے تھے۔ اس وقت کا راجا اپنے گھوڑوں اور گھوڑیوں کو بھی موتیوں کی مالہا پہناتے تھے۔ اتنے موتی کہاں سے لاتے تھے؟

اس وقت سندھ میں سمندر سے موتی نکالنے کا مقاطعہ کراچی کسٹم محکمہ والے دیتے ہیں، لیکن قریب سے جو سیپیں ہاتھ لگتی ہیں، ان میں سے اکثر صرف چھوٹے سے گھنگرو کی طرح کی ایک چیز نکلتی ہے، جو معجوں بنانے اور کچھ ادویات بنانے کے کام آتی ہے۔ قیمتی آبدار موتی آج بھی خلیج ایران سے آتے ہیں۔ ویدک زمانے کے بیوپاری بئبلونیا اور میسوپوٹیمیا کو خلیج ایران کے راستے آتے جاتے تھے، اور موتی بھی وہیں سے ہی لاتے تھے تو عجب نہیں، لیکن دوسرا راستہ بھی انہیں تھا۔

رگ وید زمانے میں قدیم آریہ کوہ ہمالیہ سے آکر، شمالی ہندستان میں اپنا دیس آباد کیا، تو اس وقت جو دراوڑ اور بیوپاری وادیٔ سندھ میں رہتے تھے، ان میں سے کئی جنوبی ہندستان کی طرف چلے گئے، یہ بات پرانوں میں درج ہے۔ اس سے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ ملبار، کالہ منڈل کنارہ اور سلون (لنکا) جو آج تک موتیوں کی وجہ سے مشہور ہیں، وہاں سے بھی موتی لاتے تھے۔ یقین پختہ اس بات سے بھی ہو رہا ہے کہ سنسکرت لفظ "مکت"، جس کا تلفظ سندھی میں "موتی" ہے، وہ دراصل دراوڑی زبانوں کا لفظ ہے، جس طرح پادری کالڈویل اپنی تصنیف کردہ دراوڑی زبانوں کی گرئمر، اور ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی اپنی تصنیف کردہ بنگالی زبان کی تاریخ میں درج کیا ہے۔

شمالی ہندستان کے بیوپاری سلون یا لنکا سے نہایت قدیم زمانے سے لے کر تجارت کرتے آرہے تھے۔ اسی آمدرفت جاری ہونے کے باعث ہی لنکا کا راجا راون شمالی ہندستان کو

(1). "A detailed report of the trade of Karachi 1838 by Commander Carless of the Indian Navy furnishes some particulars of much interest. The value of the whole trade for that year was estimated at Rs. 21,46,625. The most important items in the list of imports being China and Bengal silk." Gazetteer of the Province of Sindh, Vol. I. Chapter VIII, Page 368.

آیا تھا، جہاں سے سیتا کو اُٹھا کر لے گیا تھا، تو اپنے اس برے فعل کا نتیجہ اس نے بھگتا، یہ رامائن والے بات تریتا زمانے کی ہے۔ راون کے بعد لنکا والا علاقے اس کے نام پیچھے کہا جانے لگا۔ ایک یونانی مؤرخ ''تپ روبین'' (Taprobane) نام لکھا ہے، جس میں ''تپ'' معنی ''جزیرہ'' اور ''روبین'' (رہن) دراصل ''رانون'' ہے، اس لئے اس نام کے معنی ہیں ''رانون والا جزیرہ''۔ یونانی مؤرخ ''ٹالمی'' (Ptolmey) کے دور میں لنکا کو ''سلیس'' (Salice) اور وہاں کے باشندوں کو ''سلوئی'' (Saloe) کہتے تھے، جس میں سے ''سیلان'' (Ceylon) نام بنا۔ ہندو عام طور پر لنکا کو ''سنگلد یپ'' کہتے تھے۔ ۵۵۰ برس ق۔م بنگال کی رانی وجیہ یہ جزیرہ اپنے قبضہ میں لیا، اور اسے ''سنہل دویپ'' نام دیا، جس کا تلفظ بعد میں بگڑ کر ''سنگھلدیپ'' ہوا۔ اس نام پڑنے سے پہلے ہی یہ جزیرہ تجارت کے حوالے سے بہت مشہور تھا، اور اس کی یہ مشہوری بعد میں بھی جاری رہی، اس لئے یونانی تاریخ نویسوں نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ ''کامس'' (Comas) نے تو یوں بھی کہا ہے کہ سارے ہندستان، پرشیا (ایران) اور انتھوپیا سے بیڑے اور جہاز سلون کو آتے جاتے ہیں، اور سلون سے بہت مال سندھ کو جاتا ہے۔

سندھ کے بیوپاری قیمتی آبدار موتی خلیج ایران، کاری منڈل اور سلون سے نہ صرف منگواتے تھے، لیکن موتی ڈھونڈھنے کے لئے اپنے غواص یا غوطہ خور بھی بھیجتے تھے۔ یہ دستور کلہوڑوں کی حکمرانی تک جاری رہا، اس لئے شاہ صاحب کے رسالے میں موتیوں اور غواصوں کا تذکرہ ہے:

''ويا سي عميق ڏي، منهن ڪائو ڏيئي،
تن سپون سوجهي ڪڍيون، پاتاران پيهي،
پسندا سيئي، امل اکڙين سين.
(شاھ)

[جو پہنچے بحرِ بے پایاں کی تہہ تک
وہ نکلے گوہرِ شہوار لے کر
ہوئیں نظارہ حاصل سے آنکھیں
درخشاں و فروزاں مثلِ گوہر۔]
(ایاز)

ان دو مصراعوں سے ہی ظاہر ہے کہ شاہ صاحب کے دور میں (کلہوڑوں کی حکمرانی کے دور) میں ہمارے غواص عمیق (گہرے سمندر) میں، منہ پر شیشہ چڑھا کر جاتے تھے، تا کہ آنکھوں اور ناک میں پانی نہ جائے، اور پھر نیچے پاتال میں جا کر سپیں ڈھونڈھ نکالتے تھے۔ یہ دستور جو قدیم زمانے میں جاری ہوا تھا، وہ بعد میں بھی جاری رہا، جس کا آنکھوں دیکھا احوال رسالے میں موجود ہے۔

شاہ صاحب کے رسالے سے یہ ظاہر ہے کہ کلہوڑوں کی حکمرانی کے دنوں سندھی لوگ لنکا (سلون) تک جاتے تھے۔

"لنڪا لنڪا ڪن، لءِ لنڪا جي او هريا،
سٽي سون لنڪا جو، سڪ نه ساموندين."
(شاھ)

[اُٹھے لنگر سویرے ہی سویرے، یہ دریا آشنا تیرے نہ میرے،
تلاشِ سیم و زر میں سُوئے "لنکا" روانہ ہو گئے ہیں مُنہ اندھیرے
ہمیشہ کام ہے موجوں سے لڑنا، سدا ساگر میں ہیں اُن کے بسیرے]
(ایاز)

شاہ صاحب کے رسالے سے یہ بھی آسانی سے سمجھ میں آ سکتا ہے کہ سندھ کے بیوپاری ہندو لھانا تھے، اور دریاء کے پوجاری تھے۔ یہ مغلبھین تحصیل جاتی کی اس طرف کوری کھاڑی سے گزر کر، خلیج کچ کی طرف جاتے تھے، جہاں سے کنارے کے ساتھ ساتھ ملبار اور سلون کی طرف جاتے تھے۔ ان کی بیویاں دیئے جلا کر، اکھے اور بحرنا دریاء میں ڈالتی تھیں، تا کہ ان کے شوہر کاش آرام سے واپس آئیں!

جا جر جاتون نه ڏني، ڏئا نه موهي،
سڏون ڪوهه ڪري، سا پنهنجي ڪانڌ جون؟
(شاھ)

[جو اس ساگر کی سیوا کو نہ جائے، اُسے کیوں کر محبت راس آئے
جلائے جو بھی آشاؤں کے دیپک، وہی ساجن کو سینے سے لگائے]
(ایاز)

سری رامچندر رانون سے لڑنے کے لئے لنکا کی طرف گیا تھا، اور وہاں اس کے لشکر کو بہت سونا ہاتھ لگ گیا تھا۔ اس بات کی یادگیری قائم کرنے کے لئے آج تک سندھ کے براہمن ہمارے لوگوں کو یاد دلاتے ہیں۔ دسہرے کے دن ہندو کسی جگہ اکٹھے ہو کر کنڈی پوجتے ہیں۔ اس وقت براہمن ان کو گوندھی ہوئی مٹی دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ سنبھال کے رکھو گے تو بارہ مہینوں کے بعد سونا ہو جائیگی۔ اس طرح گویا کہ لنکا کو لوٹ کر سونا لے آتے ہیں۔

شاہ صاحب کے رسالے میں ایک اور بات بھی قابلِ توجہ ہے۔

قرقل، قوتا، پارچا، پاٽيٺ پاتائون،
ڪونيون قيمت سنديون تو ۾ تاڪيائون.
(شاھ)

[''لطیف'' اُن تاجروں پر رحمتِ حق
چلے ہیں لے کر جو انمول گوہر
سمندر میں ہوا کے رخ پہ ڈالا
سفینہ قیمتی سامان بھر کر]
(ایاز)

پھر پھل یعنی لونگ اور الائچی سندھ کی پیداوار نہیں ہیں۔ یہ ملبار یا فلپائن جزیروں سے لائے جاتے تھے، اور وہ پھر بیڑوں کے ذریعے لے کر دوسری جگہوں پر فروخت کرتے تھے۔

ویدک زمانے میں ہی بیڑوں اور جہازوں کے لئے پکا ساگ (درخت کی لکڑی) تو بلا پوچھے ملبار سے ہی انہیں لانا پڑتا تھا۔ آج بھی اسی طرف سے آتا ہے، کیونکہ شمالی ہندستان میں ساگ کی پیداوار ہوتی ہی نہیں۔ اس طرح اور بھی کچھ باتیں ملبار کے ساتھ تعلقات بنسبت ہیں، جن کا تذکرہ علحدہ کیا جائیگا۔ یہاں صرف اتنا درج کیا جاتا ہے کہ ویدک زمانے سے لے کر وادیٔ سندھ کے باشندے سمندر کا سفر کرنے کے عادی تھے، اور تجارت میں بحری تجارت اہم شمار کرتے تھے۔

برساتی موسم (چوماسے) میں سمندر میں سفر کرنا خوفناک ہے، اس لئے بیوپاری وہ وقت سمندر کے سفر سے رک جاتے ہیں۔ برساتی موسم (چوماسا) ختم ہوتا تھا تو خوشی مناتے تھے، اور سمندر میں ناریل ڈالتے تھے۔ یہ ناریل پورنما کا دن آج تک ہندوؤں میں ایک بڑا دن ہے۔ اس دن سے لے کر سمندر ساکن ہو جاتا ہے، جس وجہ سے سمندر کے راستے تجارت کرنے کی راہ کھل جاتی ہے۔ ناریل پورنما منانے کا رواج ہی اسی سبب پڑا، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ بڑا دن نہایت قدیم زمانے کے بحری بیوپار کی یاد دلاتا ہے۔ ناریل پورنما دن ہندو بیوپاری براہمن کو اتنے کھلے دل سے دان دیتے تھے، جو آج تک براہمن یہ ایک اہم دن کے طور پر شمار کرتے ہیں، اور اسی دن پرانا جنیئو اتار کر نیا جنیئو پہنتے تھے۔

سندھی اور گجراتی لوگوں سے جنوبی ہندستان کے لوگ یہ ناریل پورنما کا دن زیادہ دھوم دھام سے مناتے ہیں، کیونکہ رگ وید والے زمانے سے لے کر کئی دراوڑ لوگ سمندر کے بڑے سفر کرتے تھے۔ وہ جہاز بنانے اور جہاز رانی میں نہایت ہی ماہر تھے۔ اس وقت بھی سندھی میں ''آرکاٹی'' معنیٰ ''سکھانی''، لیکن اس کے اصل معنی ہیں ''آرکاٹ'' (آرکوٹ Arcot، مدراس علاقے کے شہر) کا رہواسی''۔ آرکوٹ کے سکھانی بہت نامور ہوتے تھے۔ اس لئے اس لفظ کو یہ خاص معنی ملے ہیں۔ کچھ بھج اور گجرات کے سکھانی عام طور پر ''معلم'' کہلاتے ہیں۔ وادیٔ سندھ کے بیوپاری جب بحری سفر سے لوٹتے تھے تو خوشی مناتے تھے، جس بات کا اتھرو وید منڈل تیسرا

(۱۵، ۸) میں نہایت دلچسپ انداز میں تذکرہ ہے۔ اس وقت خوشی سے خیرات کرتے تھے۔ ''بربو'' (Birbu) نامی ایک بڑے سیٹھ رشیوں کو دان دیے تھے، اس لئے رگ وید کے منڈل چھٹے (۴۵، ۳۲، ۳۳) میں اس کی بہت تعریف لکھی ہوئی ہے۔ آج بھی سندھ ور کی سلامتی سے لوٹتے ہیں تو خوشیاں مناتے ہیں، اور باواؤں اور برہمنوں کو دل کھول کر دان دیتے ہیں۔

ملبار سے تجارت اور اس کا زبان پر اثر: قدیم زمانے سے لے کر سندھ کے لوگ ملبار والوں سے تجارت کرتے آئے ہیں، تو اس بات کا زبان پر بھی اثر ہوا ہے۔ مثلاً، ''ایلاچی'' در اصل دراوڑی (Dravidian) لفظ ہے، جو پہلے سنسکرت میں رائج ہوا۔ سنسکرت میں صرف کہتے ہیں ''ایلا''، لیکن ہم کہتے ہیں ''ایلاچی''۔ لاحقہ (Suffix) کنڑ یز زبان سے لیا گیا ہے، جیسا کہ مسٹر دویٹیا اپنے تصنیف کردہ گجراتی زبان کی تاریخ میں لکھا ہے۔ ''کڑہی'' در اصل دراوڑی لفظ ''کری'' (Kari) ہے، جو مہاونش پراک میں بھی استعمال ہوا ہے، اور یہ پران ۷۷ ۴ع کا تصنیف شدہ کہا جاتا ہے۔ لگتا ہے کہ چاولوں کے ساتھ کڑہی کھانے کا رواج ہی دراوڑوں سے ہم سیکھے ہیں۔ ''کوتمیر'' (دھنیوں کے پتے)، ''چاڈی''، ''کابار'' اور دیگر کئی دراوڑی الفاظ سندھی میں مروج ہو چکے ہیں، اور وہ ''دیشی'' لفظوں کے زمرے میں شمار ہوتے ہیں۔ ناریل کے درخت ملبار کی طرف بہت ہیں، اور آج تک کھوپرے کا تیل نکالنے کے لئے ناریل وہاں سی آتی ہیں۔ ناریل کے تندوں سے بنی ہوئی رسیاں بھی در اصل ملبار اور مدراس کے دیگر علاقوں سے درآمد ہوتی تھیں۔ یہ کابار کی رسیاں سولہویں صدی عیسوی میں یورپ کی طرف برآمد ہوتی تھیں، اس لئے دراوڑی لفظ ''کایار'' انگریزی میں بھی مروج ہوا۔ انگریزی میں کہتے ہیں ''کایر'' (Coir)۔ گجرات اور سندھ کے میر بحر ''کانبار'' کہتے تھے۔ نامور عالم البیرونی[1] بھی سن ۱۰۳۰ع میں اسی تجارت کا ذکر کرتے ہوئے ''کانبار'' لفظ استعمال کیا ہے، لیکن آج کل ہم عام طور پر کہتے ہیں ''کابار۔۔کابارو''۔ ملبار کی طرف تعلقات ہونے کے باعث وہاں کی ''اِٹی ڈکر'' (ڈنڈا گلی) کھیل سندھ اور گجرات میں شروع ہوا۔ اِٹی اور ڈکر دونوں سنسکرت بنیاد کے الفاظ ہیں، لیکن اس کھیل میں ہمارے بچے ''وکٹ''، لنن، مُون، نار'' وغیرہ الفاظ استعمال کرتے ہیں، وہ دراوڑی یعنی تیلگو اور کنڑ یز زبانوں کے ہندسے ہیں، اور ان کے معنی ہیں ''ایک، دو، تین، چار''، وغیرہ۔ یہ سارا تعلقات کا اثر ہے، جو ہماری زبان میں آج تک نمایاں ہے۔

خلیج ایران، مغربی ایشیا اور مصر سے تجارت: ویدک زمانے میں شمالی ہندستان میں آریوں نے اپنا دیس آباد کیا، تو وادیٔ سندھ کے اصلی باشندوں میں سے کچھ ان کے ساتھ مل جل گئے، لیکن کئی ''بوپاری'' اور دیگر جنوبی ہندستان کی طرف چلے گئے، جیسا کہ پرانوں میں درج ہے۔ علماء کو

(1) البیرونی کا جنم ۹۷۰ع میں، اور وفات ۱۰۳۸ع میں ہوئے تھے۔ مصنف

تحقیقات کرنے سے معلوم ہوا ہے کہ جنوبی ہندستان میں یہ ملبار اور کالا منڈل کنارے آباد ہوئے، جہاں چول اور پانڈیہ (دراوڑوں) سے ان کے گہرے تعلقات قائم ہوئے اور ان کی تہذیب کا ان پر اثر ہوا۔ وہ بیرونی ممالک سے تجارت کرنے کے عادی تھے، اس لئے ایک جگہ پر ٹک کر نہیں بیٹھے۔ جنوبی ہندستان سے پہلے خلیج ایران کی طرف گئے، جہاں کے رہواسیوں سے تعلقات رکھتے آئے، اور اس کے ساتھ ساتھ جنوبی ہندستان کے لوگوں کے ساتھ بھی تعلقات استوار کرتے آئے۔ پکا ساگ، کابارہ، مصالحہ جات اور دیگر اس قسم کی چیزیں وہیں سے ہی ملتی ہیں۔ کسی وقت سیمیٹک قوم والوں نے ان کی بیٹھکوں پر حملہ کیا، تو وہ وہاں سے نقل مکانی کر کے سریا (شام ملک) کی طرف، ساحل سمندر کے نزدیک اپنے ٹھکانے بنا کر بیٹھ گئے، اور ساتھ ساتھ شام ملک والوں کے ساتھ اچھے تعلقات کو انہوں نے واجب سمجھا۔ ان کے ساتھ بالآخر اتنے رل مل گئے، جو ان میں سے بعض کے ساتھ رشتیداریاں بھی کیں، جس کے باعث یہ "پنی" بعد میں "پیونک قوم" (Punic race) والے اور "فنیشن" (Phoenicians) کہلانے لگے،[1] جو ملک خود قبضے میں رکھے ہوئے تھے، وہ بھی ان کے نام پیچھے "فنیشیا" (Phoenicia) کہلانے لگا۔[2] یہاں سے انہیں آرچیلیگو والے جزیروں، یورپ کے جنوبی حصے اور آفریکا کے شمالی حصے کے ساتھ تجارت کرنے میں آسانی ہوگئی۔

مذکورہ بالا احوال، جو زیادہ تر سارے کا سارہ ڈاکٹر ابناش چندرداس کی کتابوں "رگ وید انڈیا" اور "رگ ویدک کلچر" سے لیا گیا ہے، ان میں اس صاحب نے یوں بھی لکھا ہے کہ "پنی" لوگوں میں سے بعض نے میسوپوٹیمیا میں بھی جا کر بیٹھکیں قائم کیں، اور پھر سریا کے سمندر کے ساحل کی طرف اور بحیرۂ روم کے جزیروں میں جا کر مقیم ہوئے، اور آفریکا کی شمال کی طرف بھی گئے۔

"پنی" لوگوں کے ساتھ ساتھ پھر جنوبی ہندستان سے چول (Cholas) لوگ بھی اسی طرف گئے۔ ان پر، آریوں کی تہذیب کا اثر تو پہلے ہی سے تھا۔ یہ چول لوگ مغربی ایشیا میں، جس جگہ اپنی بیٹھکیں ڈال کر بیٹھ گئے، وہ ان کے نام پیچھے "چول دیش" کہلانے لگا، جس کا تلفظ بعد میں تبدیل ہو کر "کیلڈیا" (Chaldea) ہوا، اور وہ خود بھی "کیلڈی" (Chaldees) کہلانے لگے۔ الغرض، ڈاکٹر ابناش چندرداس کی تحقیقات موجب میسوپوٹیمیا کے سمرین لوگ اور کیلڈیا یا بیبلونیا (بابل)[3] کے کیلڈی لوگ اصل میں وادیٔ سندھ کے "پنی"، اور جنوبی ہندستان

(1) "The phoenicians were the descendents of the Panis, and the product of an amalgamation of the Aryan and semetic races." Dr. A.C.Das: Reg Vedic Culture, Page 88 and 152.

(2) "The Panis moved on towards the north of Syria, which they called Phoenicia or the land of the Panis or Panikas." Dr. A.C.Das: Reg Vedic India, Page 204.

(3) "There can be no question now as to who the Sumerians or the Chaldeans were, and whence they immigrated to Chaldea. They were, as I have already said a mixed race sprung from the Panis, and the Dravidians (Cholas), and were immigrants from the Coromandal and the Malbar Coasts." Dr. A.C. DAS: Reg Vedic India, Page 226.

کے چول لوگ تھے، جو بعد میں سیمیٹک قوموں سے رشتیداریاں کر کے ان کے ساتھ رل مل گئے۔[1] دیگر علماء نے بھی یوں ہی لکھا ہے کہ سیمیٹک قوموں میں بئبلونیا اور اسیریا کے لوگ ہنروں میں قابل تھے، اور انہوں نے یہ ہنر قدیم کلڈی لوگوں سے سیکھے تھے۔[2]

میسوپوٹیمیا کی طرف بیٹھکیں: مغربی ایشیا میں وادیٔ سندھ والے آریوں کی بیٹھکیں تھیں، اس کے لئے کئی ایک ثبوت اب تک مل چکے ہیں، لیکن یہ بات کسی ملکی خواہ یورپی عالم نے لکھا ہی نہیں کہ میسوپوٹیمیا کے باشندوں پر ''سمیرین'' (Sumerians) نام کیسے آیا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹنیکا خواہ کچھ تاریخوں سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ کسی قدیم زمانے میں کچھ لوگ میسوپوٹیمیا میں آ کر آباد ہوئے۔ ان کی اصل نسل کا کچھ پتہ نہیں، لیکن وہ ''شمیر'' (Shumer) کہلائے جانے لگے، اور اس سے ''سمیرین'' نام وجود میں آیا۔ انسائیکلوپیڈیا میں ''سمیرین'' لفظ کے عنوان تحت یوں بھی درج ہے کہ بائیبل میں ''شمیر'' کے عوض ''شنر'' (Shinar) نام استعمال ہوا ہے، اور یہ دونوں نام ایک ہی ہیں۔[3] بائیبل میں استعمال شدہ ''شنر'' لفظ سے متعلق پوپوک صاحب نے اپنی کتاب ''انڈیا ان گریس'' (India in Greece, pp 45-47) میں لکھا ہے کہ یہ ہے ''سندھور'' یعنی ''دریائے سندھ کے باشندے (The people of the Indus)[4] مصنف کے خیال موجب میسوپوٹیمیا کے باشندے ''شمیر'' (Shumer) اور سمیرین (Sumerians) کہلانے لگے، سو اس نام سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ جو آریہ لوگ اصل قطب شمالی کی طرف سمیر پربت (میرو پربت) پر رہتے تھے، اور بعد میں وادیٔ سندھ کی طرف آئے، ان میں سے کچھ ''پنی'' (پنی = بنی = بیوپاری لوگ - بنیا لفظ اس ہی سے مشتق ہے) لوگوں کے ساتھ بئبلونیا اور کنلڈیا کی طرف گئے، اور میسوپوٹیمیا میں اپنی علحدہ بیٹھکیں قائم کیں۔ یہ لوگ تازہ سمیر پربت سے آئے ہوئے تھے، اس لئے خود میسوپوٹیمیا پر ''شمیر'' (سمیر) نام پڑ گیا اور وہاں

(1) "Considered as artists, the Babylonians and Assyrians stand foremost among the semites, but they are indebted for this to the early Chaldeans." Hist. Hist. of the World, Vol. I. PP. 546-47.

(2) Babylon an ancient city on the left of the Euphrates about 70 miles south of Bagdad. "Babylon" is the Greek form of Babel or Baba-illi, "The gate of the God" which again is the semitic translation of the original sumerian name Ka-di-mirra. Encycl Britt. article "Babylon."

(3) "Shumer actually did mean all Babylonia appears evident from the biblical use of shinar i.e. Shumer to describe the district which contained the four chief Babylonian cities viz. Babel, Erech, Accad and Calnch (Genesis X. 10)... The identity of Shinar and Shumer is also demonstrated by the Septuagint rendering of shinar in Isiah XI. II by Babylonia." Encycl. Britt article. Sumer and Sumerians.

(4) See also st. Chamanlal's "Hindu America." P. 45.

کے رہواسی ''سمیرین'' کہلانے لگے؛ اور ''سمیر'' کا تلفظ بعد میں سیمیٹک قوم والوں نے تبدیل کر کے ''شنر'' کر دیا۔ دونوں حالتوں میں یوں ہی کہیں گے کہ یہ ہماری وادیٔ سندھ کے بسنے والے تھے، جو میسوپوٹیمیا والے علاقے میں آباد ہو گئے، اور سندھو تہذیب کا وہیں پر پھیلاؤ کیا۔

سندھ وادی کی تہذیب کا پھیلاؤ میسوپوٹیمیا میں کس قدر ہوا، اس بات کا تذکرہ کسی بھی مؤرخ نے نہیں کیا، کیونکہ اس کا ہمیں علم ہوا ہی ۱۹۲۲ع اور ۱۹۲۷ع کے وسط میں ہے۔ ان برسوں میں آرکیالاجیکل محکمے والوں نے مہن جو دڑو کی کھدائی کروائی تو وہاں سے کئی مہریں دریافت ہوئیں، جن پر اکثر جانوروں کی شکلیں ہیں، لیکن کن کن مہروں پر جانوروں کی شکلوں کے ساتھ ساتھ ایک دو سطور بھی لکھی ہوئی ہیں۔ ان حروف کے بیچ میں کہیں کہیں دیوناگری کی طرح کی ماترائیں یا لاکنائیں (زیر- زبر = اعراب) ہیں۔

میسوپوٹیمیا میں سے بھی کچھ ایسی مہریں دریافت ہوئی ہیں، جو ہوبہو مہن جو دڑو سے دریافت شدہ مہروں جیسی ہیں۔ میسوپوٹیمیا اور مہن جو دڑو کی تہذیب کے دیگر آثار بھی اس قدر ایک دوسرے سے مشابہ ہیں کہ خود آرکیالاجیکل محکمہ کے ڈائریکٹر جنرل، سرجان مارشل، مہن جو دڑو کی تہذیب پہلے نام دیا تھا ''انڈو۔۔۔سمیرین تہذیب'' (Indo Sumerian Civilization)؛ لیکن بعد میں نام تبدیل کر کے ''وادیٔ سندھ کی تہذیب'' کر دیا۔ دونوں جگہوں کی تہذیب بلکل ایک ہی ہے، اس لئے سمجھ میں آنے لگتا ہے کہ یہ وادیٔ سندھ کے آریہ تھے، جو اصل (سمیر) میرو پربت سے آئے تھے، اور انہوں نے اپنی تہذیب میسوپوٹیمیا میں جا کر پھیلائی، جہاں وہ ''سمیر'' (سمیر پربت سے آئے ہوئے) کہلانے لگے۔ یورپی علماء خواہ دیگر اس بات کو مان رہے ہیں کہ فنیشن لوگ اصل سیمیٹک قوم کے نہیں ہیں، لیکن وہ کہیں باہر سے آئے تھے۔ انسیئکلوپیڈیا برٹنیکا میں سے معلوم ہوتا ہے کہ فنیشن لوگ خود کہتے ہیں، کہ ہمارے قدیم شہروں کی بنیاد دیوتاؤں نے رکھی تھی، اور ہماری اصل قوم کو ۳۰ ہزار برس گزر چکے ہیں۔[1] یہ عرصہ خود گواہی دے رہا ہے کہ میسوپوٹیمیا کے اصل باشندے اسی زمانے کے تھے، جب سمیر پربت کا علاقہ آباد تھا، اور وہ سمیر پربت والے آریہ تھے، جن میں سے کچھ ادھر کو گئے۔ یہاں سے آریوں کی بیٹھکیں ملی ہیں، جن کا تذکرہ ابتداء میں کیا جا چکا ہے۔

مغربی ایشیا کی طرف سے جو آریوں کی بیٹھکیں ملی ہیں، وہ ویدک زمانے سے بہت بعد کی ہیں۔ یہاں کچھ اور ثبوت فراہم کیے جاتے ہیں، جن سے اچھی طرح سے سمجھ میں آ جائیگا کہ

---

(1) "The Phoenicians claimed that their oldest cities had been founded by the gods themselves, and that their race could boast antiquity of 30,000 years." Encycl: Britt: article "Phoenicians".

ویدک زمانے سے لے کر جو تعلقات اس طرف کے رہواسیوں سے وادیٔ سندھ والوں کے ہوئے، وہ ویدک زمانے کے بعد اتہاسوں والے زمانے، بلکہ بدھ دھرم والے زمانے تک مسلسل جاری رہے۔ یہاں پر اول ویدک زمانے کی ایک بات درج کی جاتی ہے۔

رگ وید منڈل آٹھویں، (۲،۷۸) میں ''منا'' (Mona) لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ ایک سونے کا سکہ تھا، جس کا وزن اور قیمت مقرر تھے، اس لئے بعض علماء کا کہنا ہے کہ ''منا'' لفظ کا مادہ ہے ''م'' معنیٰ ''ناپنا'' یا ''مَن'' معنیٰ ''قیمت لگانا''۔ پہلا یورپی عالم فرینکوئس لینورمنٹ (Francois Lenorment) تھا، جس نے لکھا کہ یہ رگ وید میں استعمال شدہ لفظ اسی معنی میں قدیم کیلڈیا یا بیبلونیا کی زبان میں بھی ہے۔ یہ سکہ اسی نام اور اسی معنیٰ میں بعد میں یونانیوں نے اپنے ہاں رائج کیا، اور اس کے بعد لاطینی زبان بولنے والوں نے اس کا تلفظ تبدیل کر کے ''مِنا'' بنایا۔ اس سے اُسے یوں سمجھ میں آیا کہ ہندستان اور بیبلونیا کے بیچ تعلقات کسی نہایت قدیم زمانے سے ہیں۔ اس بات کا میڈم رگوزن اپنی تصنیف شدہ کتاب ''ویدک انڈیا'' میں ذکر کیا ہے۔[1] جیسا کہ سارے ہندستان میں سے صرف رگ وید میں درج ''پنی'' بیبلونیا کو گئے، اور ان کے پیچھے جنوبی ہندستان والے چول لوگ گئے اور بیبلونیا ان ہی کے نام پیچھے ''کیلڈیا'' (چول لوگوں کا ملک) کہلانے لگا، تو پھر بلا پوچھے سمجھا جا سکتا ہے کہ رگ وید میں درج ''منا'' نامی سکہ انہوں نے ہی وہاں جا کر رائج کیا ہوگا۔

سندھ کی مغربی ممالک میں مشہوری: رگ وید والے زمانے میں سندھ کا ملک اُونی کپڑے کی وجہ سے مشہور ہوتا تھا، جس طرح خود رگ وید میں درج ہے۔ اس زمانے میں سندھ میں پورا سال سردی زیادہ پڑتی تھی، جس وجہ سے لوگ اُونی کپڑے پہنتے تھے۔ کس زمانے میں آب و ہوا میں تبدیلی آئی، اور لوگوں نے سوتی کپڑے پہننا شروع کیے، اس بات کا پتہ نہیں، باقی اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ کپاس کی فصل بونے کا رواج پہلے پہلے ہندستان میں جاری ہوا، اور کپاس کا اصلی وطن یہی ہے۔[2] آرکیالاجیکل محکمہ کے ڈائریکٹر جنرل سر جان مارشل نے لکھا ہے کہ کپاس میں سے کپڑا بنانے کا ہنر پہلے پہلے پنجاب اور سندھ میں شروع ہوا، اور تقریباً دو تین ہزار برس بعد میں برِاعظم ایشیا کی مغرب میں مصر ملک میں جاری ہوا۔[3] اس کے مطابق مطلب یہ ہوا کہ مہا بھارت والا زمانہ، جسے آج تقریباً پانچ ہزار برس گزر چکے، اس میں

(1) Ragozine: Vedic India, P. 304.
(2) "India is the original home of Cotton." Dr. James A.B. Scherer: "Cotton as World Power."
(3) Sir John Marshall: Mohan Jo Daro and Indus Civilization.

کپاس سے کپڑا بنانے کا رواج وادیٔ سندھ میں جاری ہوا، لیکن یہ رواج اس سے بہت پہلے کا نظر آتا ہے۔ رگ وید کے بعد جو ساہت ہے، اس میں یہ بات کہیں بھی لکھی ہوئی نظر نہیں آتی کہ رگ وید والے زمانے سے لے کر سندھ میں پورا سال سردی پڑتی تھی، اسی سبب یوں سمجھ میں آتا ہے کہ سندھ میں سوتی کپڑا بنانے کا رواج ویدک زمانے میں ہی جاری ہوا تھا۔ یہ بات اس لئے کہی جا رہی ہے، کیونکہ رامائن میں ریشمی کپڑے کا ذکر ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تریتا زمانے میں جب ریشم بنانے کا رواج تھا، تب سوتی کپڑا پہننے کا رواج ضرور پہلے ہی جاری ہوا ہوگا، کیونکہ ہر شخص ریشم نہیں پہنتا، اور سوتی کپڑے کے بغیر تو کوئی غریب آدمی رہ بھی نہیں سکتا۔ مطلب یہ کہ سارے ہندستان میں پہلے پہلے کپاس کی فصل بونے اور کپاس میں سے کپڑا بنانے کا رواج وادیٔ سندھ میں جاری ہوا، باقی سندھ کی کپاس اور اس میں سے بنے ہوئے کپڑے کو برآمد کرنے کا رواج بہت بعد کی بات ہے۔ یہ ہمارے سندھی لوگ تھے جو ضرورت سے زیادہ کپڑا بنا کر، بیرون ممالک روانہ کرتے تھے، جس وجہ سے سندھ کا نام بہت مشہور ہوا۔ اس بات کے کئی ایک ثبوت ہیں۔ مثلاً، قدیم زمانے میں مغربی ممالک کے درمیان جو تجارت ہوتی تھی، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے، رالنسن صاحب نے لکھا ہے کہ ۶۶۸ برس ق۔م کے کتب سریا (شام ملک) کے حاکم ''اسربنی پال'' کے ہاتھ لگے ہیں، جن میں ''سندھ'' لفظ ہندستانی کپاس کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔(1)

پروفیسر ای۔ ایچ۔ سئس نے لکھا ہے کہ ۴۰۰ برس ق۔م سندھ کا بنا ہوا کپڑا خلیج ایران کے راستے بئبلونیا اور مصر ملک کی طرف جاتا تھا۔(2)

پروفیسر لئسن نے لکھا ہے کہ مصر کے لوگ مُردوں کے کفن کے لئے سندھ کی ململ استعمال کرتے تھے۔

مئڈم زنگوزین اور دیگر کن علماء نے لکھا ہے کہ بابل یا بئبلونیا کے قدیم باشندے سندھ کی ململ کو ''سندھو'' کہتے تھے، کیونکہ یہ کپڑا آتا ہی سندھ سے تھا۔(3)

سندھ کی ململ خلیج ایران سے بئبلونیا (بابل) کی طرف برآمد ہوتی تھی، تو ایران اور بئبلونیا کے لوگوں سے یہودیوں کو اس بات کا پتہ چلا، تو وہ قدیم یہودی لوگ بھی سندھ سے ململ اور دیگر اجناس کی تجارت کرنے لگے۔ قدیم زمانے میں کراچی ضلع کے لاڑ میں ''پاتال'' نامی

(1) Professor H.G. Rawlinson: Intercourse between India and Western world.
(2) Professor A. H. Sayce. Hibbert Lectures (1887)
(3) "The Old Babylonian name for muslin was "Sindhu" i.e, that the stuff was simply called by the name of the country which exported it." Z.A. Ragozin. vedic india. P. 306.

ایک معروف بندرگاہ تھی، جہاں سے دریائے سندھ دو شاخیں بن کر بہتا تھا۔ ۳۲۵ برس ق۔م سکندر اعظم نے سندھ پر حملہ کر دیا، اس وقت بھی ''پاتال'' نہایت مشہور بندرگاہ تھی، اس لئے یونانی مؤرخین نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ میجر جنرل ہیگ نے اپنی کتاب ''انڈس ڈیلٹا کنٹری'' (Indus Delta Country) میں لکھا ہے کہ حضرت سلیمان کے وقت میں بیڑے اور جہاز دریائے سندھ کے آخری سرے (پاتال بندر) پر آکر ٹھہرتے تھے۔ دیگر علماء نے بھی لکھا ہے کہ قدیم یہودی لوگ سندھ کے ساتھ تجارت کرتے تھے۔ یہ تجارت اتنی زوروں پر تھی، کہ سندھ کا نام مغربی ایشیا میں مشہور ہو گیا، اور خود بائیبل میں بھی سندھ کا نام آ گیا۔ ''سندھو'' کا نام ایرانیوں نے تبدیل کر کے ''ہندو'' کر دیا، تو یہودیوں نے اس کا تلفظ مزید بگاڑ کر ''ہودو'' (Hoddu) کر دیا۔ یہ بات یول اور برنیل صاحبان نے اپنی تصنیف کردہ کتاب ''ہابسن جابسن'' میں درج کی ہے۔[1]

بئبلونیا کے باشندوں اور یہودیوں سے مصر ملک کے لوگوں کو سندھ کی ململ کا پتہ چلا، تو وہ بھی سندھ سے تجارت کرنے لگے۔ ڈیوڈ منکفرسن اپنی کتاب ''اینلس آف کامرس'' (Annals of Commerce) میں لکھا ہے کہ مصر ملک کے جہاز پاتال بندر (سندھ) تک جاتے تھے۔

سندھ کا نام ایرانیوں اور یہودیوں سے یونانیوں نے بھی سنا: بئبلونیا والا علاقہ وادیٔ سندھ کے قدیم ''پنی'' (بیوپاری) لوگوں نے اور کچھ دراوڑوں نے آباد کیا تھا، اور وہ پھر یورپ کی طرف بھی بیوپار کی غرض سے جاتے تھے، اس لئے یونانیوں نے سندھ کا نام ان سے سنا ہو تو کوئی عجب کی بات نہیں۔ بہرحال یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ قدیم ایرانیوں اور یونانیوں کو سندھ کی اعلیٰ تہذیب اور شاہوکاری کا پتہ اول ہی سے تھا، اور یہی سبب ہے کہ ایرانیوں اور یونانیوں نے سندھ پر حملہ کیا، اور اسے کچھ عرصے کے لئے اپنے قبضے میں لے لیا۔ یورپ کے لوگوں کو سندھ کی باریک اور نفیس ململ کا پتہ پہلی دفعہ تب چلا، جب سکندر اعظم کا لشکر یہ ململ تحفتاً اپنے ساتھ لے گیا۔ اس وقت سندھ اور پنجاب کے رہواسی خواہ دیگر ہندستانی سوتی کپڑے پہنتے تھے۔ سوتی کپڑے کا سطح لہردار ہوتا تھا، جس نے یورپی لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کروائی۔[2]

---

(1) Yule-Burnell: Hobson Jobson or Glossary of Anglo - Indian Words and phrases, article "India"

(2) "Cotton cloth was first seen in Europe when the soldiers of Alexander The Great brought some of it back, as a curiosity, in the fourth century before Christ. All India was clothed with it then, as today; some of the ancient textiles being so delicate and beautiful as to give rise to the poetic description, 'Webs of the woven wind'." Dr. James A.B. Scherer: Cotton as World Power.

قدیم یونانی لوگ سندھ کی ململ کو ''سنڈن'' (Sindon) کہتے تھے۔ اس وقت شاید یہ کہاوت عام تھی کہ ''ململ تو سنڈن'' (سندھ کی)۔ یہی سبب معلوم ہوتا ہے، جس وجہ سے سندھی لفظ ''سندھن'' ''ململ'' کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا، اور یونانیوں نے اس کا تلفظ تبدیل کر کے ''سنڈن'' کر دیا۔ حالیہ ملٹن نے بھی یہی لفظ استعمال کیا ہے، لیکن ملٹن والے مضموں میں اس کے معنی ہیں ''سنگین لپیٹنے کے لئے کپڑا، چہرہ ڈھانکنے کے لئے جالی''۔[1] انگریزی میں دوسرا لفظ ''سینڈل'' (Sendal) بھی عام ہوا، جو در اصل ہے سندھی لفظ ''سیندھڑ'' اور اس کے معنی ہیں ''سندھ کا سنگین دھاگہ''۔ نامور شاعر لانگ فیلو کے شعر سے سمجھا جا سکتا ہے کہ سندھ کے سنگین دھاگے سے بیرون ممالک میں پہلے کشتیوں کے لئے رسے بناتے تھے۔ یہ قیمتی رسے ان شاہی کشتیوں میں استعمال کرتے تھے جن کے بادبان ریشمی ہوا کرتے تھے۔ مطلب یہ کہ سندھ کا سنگین دھاگہ بھی یورپی لوگ ایک شاہی چیز سمجھتے تھے۔[2] اسی طرح صوبہ سندھ نے اپنا بڑا نام کمایا، جس وجہ سے مغربی ممالک میں اسے مشہوری ملی۔

شمالی ہندستان میں پنجاب اور سندھ نے سنگین ململ بنانے میں نام کمایا تو پھر جنوبی ہندستان بھی پیچھے نہیں رہا۔ ڈھاکا کی ململ اتنی سنگین ہوتی تھی، جو کہتے ہیں کہ ململ کا پورا تھان انگوٹھی میں سے گزارا جا سکتا تھا۔ یہ سنگین ململ بھی یورپ کی طرف برآمد ہونے لگی، اور یورپی لوگ اس کے لئے اچھے خاصے دام دیتے تھے۔ کئی برس مسلسل ہندستان کا مال یوں ہی یورپ کی طرف جاتا رہا۔ ہندستان کے لوگ قابل ہونے لگے تو یورپی لوگ حسد کرنے لگے۔ یورپ میں اونی کپڑا بناتے تھے، لیکن ہمارے سوتی کپڑے لنکشائر کے اونی کپڑے کے کارخانوں کو ضرب لگادی، تو لنکشائر میں بڑا غلغلہ مچ گیا۔ وہ اس قدر آگے گئے، کو انہوں نے سن ۱۶۶۶ع میں ایک قانون پاس کیا کہ اگر کسی فوتی کے لئے کفن اگر اس کا رشتیدار اونی کپڑے سے نہیں بنوائے گا، تو وہ جرمانے کی سزا کا مستحق ہوگا! اس عجیب قانون پاس ہونے کے بعد بھی جب دیکھا گیا کہ کئی یورپی ہندستان کے خوبصورت سوتی کپڑہ پہننے سے باز نہیں آرہے، تب لنکشائر کے کارخانوں والے خود بھی سوتی کپڑا بنانے لگے۔ اسی طرح ہندستان کے سوتی کپڑے نے یورپ میں ہنری انقلاب برپا کر دیا۔ یہ حقائق کئی ایک تاریخوں مین درج ہیں[3]، لیکن یہ تو ہیں اب کی باتیں، اس لئے ہم واپس قدیم باتوں کی طرف آتے ہیں۔

---

(1) "Wore she not a veil of Sindon!" Milton.
(2) "Sails of silk, and ropes of sendal, such as gleam in ancient lore." Longfellow.
(3) Dr. James A. B Scherer: Cotton as World Power.

اوپر پہلے ہی لکھا جا چکا ہے کہ قدیم وادیٔ سندھ کے ''پنی'' (بیوپاری) بئبلونیا اور میسوپوٹیمیا کی طرف گئے، تو جنوبی ہندستان کے چول لوگ بھی وہیں گئے، اور وہاں پر اپنی بیٹھکیں قائم کیں، جس وجہ سے وہ ملک چول لوگوں کے نام پیچھے ''چول دیش'' کہلانے لگا، جس کا تلفظ بعد میں تبدیل ہوکر چَلڈیا (کَلڈیا) ہوا، اور وہ ''بئبلونیا'' بھی کہلاتا ہے۔ بئبلونیا میں جن قدیم حکمرانوں نے حکومت کی تھی، ان کا دارالخلافہ ''اُر'' (Ur) نامی ایک شہر تھا، جو فرات (یوفریٹس) ندی کے موجودہ شکم سے چھ میل دور، جنوب کی طرف تھا۔ وہ قدیم شہر کئی برسوں سے ویران ہوگیا ہے۔ حال ہی میں وہاں کھدائی کرتے ہوئے ڈاکٹر ارنیسٹ مَنکی نے وہاں سے ایک مہر دریافت کی، جو ۲۱۰۰ سؤ برس ق۔م کی ہے، اور وہ ہوبہو ان مہروں جیسی ہے، جو مہن جو دڑو سے ملی ہیں۔ یہ حقیقت سر جان مارشل اپنی کتاب ''موہن جو دڑو اور سندھو تہذیب'' میں لکھی ہے۔ اس کے بعد ۱۹۳۱۔۔۱۹۳۰ع میں میسوپوٹیمیا کی طرف کھدائی کرواتے ہوئے، ڈاکٹر ایچ۔ فرینکفورٹ کو مہن جو دڑو میں سے دریافت شدہ مہروں میں سے ایک مہر ملی، جو ۳۰۰۰ ھزار برس ق۔م کی ہے۔

قدیم شہر ''اُر'' کے ویرانے سے پکا ساگ (عمارتی لکڑی) بھی ملا۔ پکا ساگ جنوبی ہندستان کی پیداوار ہے، اور مغربی ایشیا میں اس کی پیداوار ہوتی ہی نہیں، اس لئے یہ بھی ایک پکا ثبوت ہے کہ بئبلونیا کے باشندوں کے جنوبی ہندستان کے لوگوں سے قدیم زمانے میں ہی تعلقات تھے، اور جہاز خواہ عمارتیں بنانے کے لئے پکا ساگ ملبار سے منگواتے تھے۔ یہ حقیقت پروفیسر سَنس اپنی تقاریر (ہبرٹ لیکچرس، ۱۸۸۷ع) میں درج کی ہیں۔ مطلب یہ کہ مہن جو دڑو اور رگ وید والے زمانے سے لے کر سندھ واسیوں نے مغربی ایشیا، مصر ملک اور یورپ سے تجارت کر کے اپنے صوبے کو دیس بدیس مشہور کردیا تھا، اور تجارت اور جہاز رانی میں دراوڑوں کا بھی کوئی ثانی نہیں تھا۔ حالیہ ہمارے کئی سندھ ورکی بھائی اِدھر مالٹا، جبرالٹر، کیُرو (قاہرہ) اور دیگر مغربی جگہوں پر، تو اُدھر مشرق بعید میں رنگون، برما، سینگاپور، منیلا، چین اور جپان میں اپنی کوٹھیاں بنا کر بیٹھے، جو بعد میں جرمنی اور جپان کی جنگوں میں انہیں بند کرنا پڑیں۔

گوتم بدھ کے جنم کی کہانیاں جن کتابوں میں درج ہیں، انہیں ''جاتک'' یعنی جنم کی کہانیاں کہا جاتا ہے، جن کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہوا ہے۔[1] جاتک کہانیوں سے ایک کا نام ہے ''بیرو جاتک''۔ یہ بیرو لفظ وہی لفظ ہے، جس کا تلفظ اس وقت ''بئبلونیا'' ہے۔ پروفیسر رالنسن بھی اسی بیرو جاتک میں سے ہندستان اور بئبلونیا کی تجارت کی باتیں نکال کر اپنی کتاب میں درج کی ہیں۔ دیگر علماء نے بھی ایسا ہی کیا ہے، اور لکھا ہے کہ ہندستان اور بئبلونیا کے درمیاں تجارت غالبًا ۴۸۰ برس ق۔م بند ہوگئی۔[2]

---

(1) Jataka stories, translated by Cowell and Rause (Cambridge 1907) III P. 83.
(2) Radha Kumud Mookerji: Indian Shipping, P. 88.

ہمارے یہ بیوپاری، جن میں سے کچھ اصل وادیٔ سندھ کے ''پنی'' تو کچھ جنوبی ہندستان کے دراوڑ تھے، وہ پھر یورپ کی طرف بڑھ کر، بلکل شمال میں اسکنڈینیویا تک بھی گئے، اور اپنی تہذیب کا وہاں بھی پھیلاؤ کیا۔(1) پروفیسر نلسن (Professor Nilson) جو ''علم آثار قدیمہ'' (Archaeology) میں ایک بڑی سند سمجھا جاتا ہے، اس نے تحقیقات کر کے لکھا ہے کہ ان ''پنی'' یا ''فنیشن'' لوگوں نے ناروے کی شمال میں بھی جا کر اپنی بیٹھکیں قائم کی تھیں، اور وہاں ''بعل دیوتا'' (god Baal) کی پوجا کا رواج جاری کیا۔ قارئین کرام کو معلوم ہو کہ بعل دیوتا کی پوجا مہادیو کے لنگ کی پوجا کا ایک نمونہ ہے، اور وادیٔ سندھ کے شوی آریہ لوگ، اور جنوبی ہندستان کے دراوڑ لوگ لنگ کے پوجاری تھے۔ یہی ہمارے وادیٔ سندھ کے پنی ہیں، جنہوں نے یونان میں بھی اپنی بیٹھکیں قائم کیں، اور یونانیوں کو اپنی تہذیب کے رنگ میں رنگ دیا۔ کس زمانے میں ہمارے بیوپاری وہاں گئے، یہ سنہ ملنا مشکل ہیں۔ لیکن یہ پکی بات ہے کہ ان بیوپاریوں میں سے بعض ہمارے سندھی لوگ تھے۔ جس طرح آج کل سندھ کے کچھ ملاح مغلبھین، تحصیل جاتی کی اُس طرف سمندر میں سے گزر کر، خلیج کچ سے ملبار جاتے ہیں، اسے طرح پہلے بھی اسی راستے سے جاتے تھے اور ایک طرف خلیج ایران کی طرف بیڑے اور جہاز لے کر مغربی ممالک سے تجارت کرتے تھے۔ پوکوک صاحب نے اس سے متعلق یوں لکھا ہے:

"At the mouth of the Indus, dwell a sea-faring people, active, ingenious and enterprising, as when, ages subsequent to this great movement, they themselves, with the warlike denizens of the Punjab, were driven from their native land, to seek the far distant climes of Greece. The commercial people dwelling along the coast that stretches from the mouth of the Indus to the Coree, are embarking on that emigration whose magnificient results to civilization, and whose gigantic movements of art, fill the mind with mingled emotions of admiration and awe. These people coast along the shores of Mekran, traverse the mouth of the Persian Gulf and again adhering to the sea-board of Oman, Hadramant and Yemen (Eastern Arabia), and sail up the Red sea; and again, ascending the mighty stream that fertilises a land of wonders, found the kingdoms of Egypt, Nubia and Abyssinia. These are the same

(1) "These Panis or Phoenicians are known in history as the Punic race, who established colonies in Mesopatamia, Egypt, Pheonicia and North Africa, and even Norway, and played an important part in the early history of Europe" Dr. A. C. Das: Reg Vedic India, P. 587.

stock that, centuries subsequently to this colonisation, spread the blessings of civilization over Hellas and her islands. The connection, therefore, which is so constantly represented by Greek historians as subsisting between Egypt and Athens, as well as Benotia, and other parts of Greece, is perfect natural, and in fact is just what we should anticipate from a people, who so highly honoured and deeply venerated their parent state as to receive from its hands their sacred fire, and their ministers of religion."

"Of the triple connection that links Egypt, Greece and the lands of the Indus, there will remain no longer the shadow of a doubt, as the reader accompanies me in the geographical development of the colonisations of Africa founded by the mercantile and thriving community of Corinthus. This is past controversy; for the Abusin, a classical name for the Indus is reproduced in Greece as the Coi-Indus (Corinthus), that is the people of the Coi Indus." -- Pococke: India in Greece.

قرضہ اور سُود: رگ وید والے زمانے میں بیوپاری نہایت ہی شاہوکار ہوتے تھے (منڈل چوتھا، ۲۵، ۷)۔ وہ اکثر بھاری داموں اپنا مال فروخت کرتے تھے، اس لئے کئی بیوپاریوں کا نام بد ہوتا تھا۔ منڈل پہلے (۳۳،۳) میں اندر دیوتا کو آردھنا کرتے ہوئے، ایک رشی کہتا ہے کہ "تیرے پاس بہت ہی خزانے ہیں، لیکن پنیوں کی طرح ہمارے ساتھ سلوک نہ کر۔ دل کھول کر ہمیں دان دے دے، اور اس کے عوض ہم سے زیادہ نہیں مانگ"۔ مطلب یہ کہ ہماری تھوڑی سی پوجا پر راضی ہو جا، ہمارے ساتھ اپنا بڑا کرم کر۔

قدیم زمانے کی سیٹھ لوگ ضرورتمندوں کو بھاری سُود پر پیسے ادھار دیتے تھے۔ وقت پر تنگ طلبی کرتے تھے، جس وجہ سے قرض بڑا مرض سمجھا جاتا تھا۔ لوگ خدا سے یہ دعا کیا کرتے تھے کہ "قرض سے مجھے بری رکھنا"۔ کچھ لوگ جوا کھیلنے کے وقت بھی قرضہ لیتے تھے۔ جو قرضدار قرض واپس نہیں کرتے تھے، ان کو قرض خواہ کلون سے باندھ لیتے تھے (رگ وید، منڈل دسواں، ۳۴،۱۴)۔ شاید ان کا یہ مطلب ہوتا تھا کہ جب ان کے ساتھ سختی کی جائیگی، تب وہ خود، یا ان کے رشتیدار، یا ان کی دوست قرضے کی رقم واپس لوٹا دیں گے۔ جو قرضدار قرض کی رقم واپس نہیں کر سکتا تھا تو اُسے قرض خواہ کے ہاں کام کرنا پڑتا تھا۔ آج بھی کچھ لوگ قرض میں کام کاج کرتے ہیں۔ باپ دادا کا کیا ہوا قرضہ اتارنا لوگ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ قرضدار اپنے آپ کو اتنا

دکھی سمجھتے تھے، کہ کہتے تھے کہ ہمارے لئے سورج تو طلوع ہوتا ہی نہیں'' (منڈل دوسرا، ۲۸، ۹)۔ آج بھی ایک کہاوت ہے کہ ''قرض جیسا کوئی مرض نہیں''، اور ''قرض برص کا داغ''۔

سکے: قدیم زمانے میں جنسوں کا اکثر تبادلہ ہوا کرتا تھا، لیکن وقتی نقدی رقم بھی دیتے تھے۔ رگ وید والے زمانے میں ''نِستک'' نامی سونے کے سکے ہوا کرتے تھے۔ دوسرا ایک سونے کا سکہ ''منا'' نامی ہوتا تھا (رگ وید، منڈل آٹھواں، ۷۸، ۲)۔ ان سونے کے سکوں پر شاید گائے یا بیل کی شکل ہوا کرتی تھی، اور اس کا مول گائے کے مول کے برابر ہوتا تھا، اس لئے اگر کوئی گائے نہیں دیتا تھا تو سونے کا سکہ دے دیتا تھا۔ رگ وید کے منڈل پانچویں (۳۳، ۶) میں چاندی کے سکوں کا بھی ذکر ہے۔ اس وقت کے راجا سونے اور چاندی کے سکے اکثر اوقات دان کرتے تھے۔ منڈل آٹھواں (۲، ۴۱) میں راجا بھندو (Bibhindu) سے متعلق ایک رشی نے کہا ہے کہ ''اس راجا ایک دفعہ مجھے چالیس ہزار سکے اور دوسری دفعہ آٹھ ہزار سکے دان کیے تھے''۔ سندھ کے راجا سونیہ بھاویہ بھی کاکشون رشی کو بڑی دولت دی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دنوں ہی ملک شاہوکار تھا، اور دان دینے کی خوبی بھی لوگوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ جن کے پاس اناج کے انبار، اور سونے اور چاندی کے سکے بڑی تعداد میں ہوتے تھے، وہ بڑے لوگ شمار ہوتے تھے، اس لئے آج تک ایک کہاوت ہے کہ ''سونیتی، روپیتی، اَنیتی سلامُ''! یعنی جن کے پاس سونا ہے، چاندی ہے اور اناج ہے، ان کو ہر کوئی سلام کرتا ہے۔ ''مایا کو سلام''۔

☆

باب ۱۳

زبان، آئیویٹا اور ساہت

تہذیب کا وسیلہ زبان: تمام ممالک کی اقوام نے جو بھی ترقی کی ہے، وہ میل ملاپ اور مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ دنیا میں کروڑہا کارخانے، گودیاں، آفیسیں، اسکول، کالیجز، اور دیگر انجمنیں ہیں، یہ سب میل ملاپ پر دارومدار رکھتی ہیں۔ کارخانے کھولنے کے لئے سیٹھ لوگ بڑی بڑی رقمیں لگاتی ہیں، لیکن اگر کاریگر اور مزدور ان کے ہاں کام کرنے سے انکاری ہو جائیں، تو پھر کارخانے کس طرح چلیں گے؟ اسی طرح اگر کسان وغیرہ نہ ہوں تو زمیندار اکیلے سر کس طرح کدال چلا سکے گا؟ جب آدمی آدمی کے ساتھ مل کر کام کرتا ہے تب اچھی طرح چرخہ چلتا ہے، اور ہنروں اور تجارت میں ترقی کی جا سکتی ہے، ورنہ دنیا کا کاروبار ہی رک جائے۔

لوگوں کے میل ملاپ کے لئے، اور اچھی طرح چرخہ چلانے کے لئے زبان نہایت ضروری ہے۔ اگر زبان نہ ہو تو کیسے سیٹھ اور گماشتے، زمیندار اور کسان اور دیگر لوگ ایک دوسرے کی بات سمجھ سکیں گے؟ اگر پوری دنیا میں لوگ زبان استعمال کرنے کے بجائے گونگوں کی طرح اشارے دینا شروع کریں، تو شاید اتنی ترقی نہیں کر پائیں گے۔ اس سے ہر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ ہر ملک کے تہذیب کی ابتدا زبان سے ہوتی ہے، اور یہی تہذیب کی ترقی کا بڑا وسیلہ ہے۔ نئے نئے ہنر جاری ہونگے، تو ان سے وابستہ امور کے لئے لوگ ضرور صحیح صحیح الفاظ استعمال کریں گے، تاکہ جو ان کے دھندھے والے ہیں، یا جن کے ساتھ ان کی لین دین ہے، وہ ان کی بات اچھی طرح سمجھ سکیں۔ اسی طرح اخلاقی اطوار، وگیانی ویچار، روحانی راز اور دیگر کئی باتوں کا زبان کے وسیلہ سے اظہار ہوتا ہے، جن کے لئے صحیح صحیح الفاظ استعمال کرنے پڑتے ہیں، اس لئے لوگوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ زبان بھی ترقی کرتی ہے، اور تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ یہی باتیں ہمیں اس باب میں کھولنا ہیں، تاکہ قدیم وادیٔ سندھ کی تہذیب کی تاریخ سمجھنے میں آسانی ہو۔

سنسکرت اور اس کی اقسام یا درجے: ہر خطے کی زبان اپنی اپنی ہوتی ہے۔ قدیم وادیٔ سندھ کے آریہ لوگ بول چال خواہ تحریری طور پر جو زبان استعمال کرتے تھے، وہ یہی ہے،

جسے آج کل ''سنسکرت'' کہا جاتا ہے۔ ہندوؤں کے وید اسی زبان میں لکھے ہوئے ہیں، جن سے متعلق ہندو یوں کہتے ہیں کہ یہ ''انادی'' ہیں، یعنی ان کی آد یا شروعات ہے ہی نہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ سنسکرت نہایت قدیم زبان ہے۔ اس زبان بولنے کا رواج کب جاری ہوا، یہ بات کوئی بھی نہیں کہہ سکتا۔

ہندوؤں کے کل چار وید ہیں: رگ، یجر، سام اور اتھر۔ ان چاروں میں سے رگ وید نہایت ہی قدیم ہے، اور اس جیسا پرانا پستک کوئی دوسرا ہے ہی نہیں۔ سارا رگ وید منڈلوں یا بابوں میں تقسیم ہے، اور یہ منڈل الگ الگ زمانوں کے ہیں۔ رواں زبان میں وقت بوقت تھوڑی بہت تبدیلی آتی رہتی ہے، اور وہ پلٹہ کھاتی ہے۔ خود رگ وید کی زبان میں بھی تبدیلی ہے۔ رگ وید کی کچھ رچائیں ایسی کسی قدیم سنسکرت میں لکھی ہوئی ہیں، کہ جو رشی ویدوں والے زمانے کے جلد ہی بعد سرھار گئے، وہ بھی ان کا مطلب نہیں سمجھ پائے، اور آج تک کوئی بھی یورپی خواہ ملکی عالم ان کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ دیگر تین ویدوں کی زبان میں جزوی تبدیلی ہے، لیکن مجموعی طور پر ان چاروں ویدوں میں استعمال شدہ زبان کو ''ویدک سنسکرت'' کہا جاتا ہے۔ سر گریئرسن اور دیگر کئی یورپی اور ملکی علماء کا کہنا ہے کہ قدیم آریہ لوگ بات چیت خواہ لکھنے پڑھنے میں جو زبان استعمال کرتے تھے، اس کی مثال رگ وید والی زبان سمجھنا چاہیے۔

یہ قدرت کا قاعدہ ہے کہ جو زبان روزمرہ بات چیت میں استعمال ہوگی، اس میں تھوڑی بہت تبدیلی قدرتاً ہوتی رہے گی۔ سنسکرت میں بھی اسی طرح وقت بوقت تبدیلی رونما ہوتی رہی، لیکن عام طور پر اس کے تین اہم قسم یا درجے شمار ہوتے ہیں: قدیم، وسطی اور آخرین۔ قدیم سنسکرت، جسے ''ویدک سنسکرت'' یعنی ویدوں والی سنسکرت (ویدوں والے زمانے کی سنسکرت) کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد ''وسطی سنسکرت'' (Middle Sanskrit) ہے۔ یہ ویدوں کے بعد کی سنسکرت (Post Vedic)، سنسکرت اس زمانے کی ہے، جس میں ''سوتر'' لکھنے کا رواج تھا۔ ''سوتر'' ہے مذہبی اور دیگر امور سے متعلق چھوٹے سے قاعدے، جو نہایت یوں بلیغانہ انداز سے لکھے ہوئے ہیں، کہ گویا کہ ''سوتر'' (سوت یا دھاگے) میں موتی لگے ہیں، اس لئے اس وسطی سنسکرت کو عام طور پر ''سوتروں کے زمانے والی سنسکرت'' (Sanskrit of the Sutra Period) بھی کہتے ہیں۔ ویدوں کے آخر میں ''براہمن'' گرنتھ ہیں، اور وہ سوتروں میں لکھے ہوئے ہیں۔ اسی طرح پانی منی کی تصنیف کردہ ''اشٹا دھیائی'' (سنسکرت گریمر) اور دیگر کچھ پستک سوتروں میں لکھے ہوئے ہیں۔ قدیم آریہ لوگ جیسے جیسے دیگر اقوام (غیر آریہ) سے روابط میں آئے، ویسے ویسے ان کی زبان میں تبدیلی ہوتی چلی گئی، جس وجہ سے وسطی سنسکرت تبدیل

ہوکر آخرین درجے والی سنسکرت پر آ گئی۔ ہندوؤں کے یہ اتہاس (رامائن اور مہابھارت)، سمرتیاں، کوی کالیداس کے ناٹک اور دیگر جو بھی پستک آج تک سنسکرت میں نمودار ہوئے ہیں، وہ سب اسی میں لکھے ہوئے ہیں۔ ہندوؤں کے ''پران'' بھی اسی میں لکھے ہوئے ہیں، اسلئے یہ عام طرح ''پرانک سنسکرت'' کہلاتی ہے۔ ''حقیقتاً آج کل سنسکرت اسی آخرین درجے والی سنسکرت'' (Classical Sanskrit) کو ہیں، اور اس وقت یہی اسکولوں اور کالیجوں میں پڑہائی جاتی ہے۔[1]

زبان میں وقت بوقت تبدیلی دیکھ کر، قدیم آریوں نے یہ حکم جاری کیا کہ شودروں کو وید پڑہنے کا کوئی ادھکار (حق) نہیں ہے۔ پڑھنے اور پڑہانے کا کام صرف براہمن کریں، تا کہ ویدوں کے وہ منتر پورے طور پر تلفظ کریں، لیکن رواں زبان تو کسی قید میں قید نہیں ہوتی۔ سنسکرت میں پھر بھی تبدیلی ہوتی چلی گئی۔ رفتہ رفتہ ایسی حالت ہوئی، کہ جو سنسکرت عام طور پر بولی جاتی تھی، وہ ساری تبدیل ہو کر بلکل ایک نئے قسم کی زبان ہوگئی، اور وہ ''پراکرت'' کہلانے لگی۔ عام طور پر لوگ پراکرت بولنے لگے، تو سنسکرت بولنے کا رواج ہی بند ہو گیا۔ ہندوؤں کے وید اور دیگر مذہبی پستک سنسکرت میں لکھے ہوئے ہیں، اس لئے براہمنوں، رشیوں اور منیوں نے سنسکرت کا درجہ پراکرت سے اوپر رکھا، اور آج یہ سارے ہندستان کی پوتر بھاشا یا پاک زبان سمجھی جاتی ہے۔

مہا بھارت والا زمانہ دور پور جہاں کا اختتام کلجگ شروع ہونے سے تھوڑا پہلے تک جاری رہا، اور یہ سارا وقت سنسکرت رائج رہی۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ کلجگ کے شروع ہوتے ہی سنسکرت کا استعمال بند ہو گیا۔ اس کے باوجود بعد والے رشی اور منی سنسکرت پر زیادہ توجہ دیتے رہے۔ یاسک نامی ایک منی، جو ۶۰۰ برس ق۔م گزر چکا ہے، اس نے ''نرکت'' نامی ایک لغت (Vedic Glossary) ترتیب دی تھی، جس میں اس نے ویدک الفاظ کے معنی اور ان کا مادہ درج کیا ہے۔ اس کے بعد، ۵۰۰ برس ق۔م، پانی منی گزر چکا ہے، اس نے ویدک سنسکرت گریمر مرتب کیا، جو ''اشٹادھیائی'' کے نام سے مشہور ہے۔ پھر کاتیاینہ اور پتنجلی رشی سنسکرت گریمر مرتب یا، اس طرح سنسکرت کو مزید بگڑنے سے بچانے کے لئے اسے قواعد کے بندھنوں میں باندھ دیا۔ اسی وجہ سے جو سنسکرت پانی منی، کاتیاینہ اور پتنجلی رشی کے مرتب کردہ گریمر کے مطابق نہیں ہوگی، اُسے غلط تصور کیا جائیگا۔ یہی سبب ہے کہ اب سنسکرت میں مزید تبدیلی نہیں ہو رہی۔

(1) "The Mantras were not all composed at onetime. The Samihtas contain, to quote the words of one of the Mantras. 'ancient, intermediate and modern hymns" (RV. vi. 21. 5; v. 42, 6 etc) Quoted by P.T. Srinivas Lyengar: Life in Ancient India in the Age of the Mantras, page 4.

"سنسکرت" لفظ کے معنی: قدیم آریا لوگ اپنی زبان کو "بھاشا" کہتے تھے، جس کا مادہ ہے "بھاش" معنیٰ بولنا۔ "بھاشا" معنیٰ "جو بولی جاتی ہے" یعنی بولی۔ خود "بولی" کے معنیٰ بھی ہیں جو بولی جاتی ہے۔ آریوں کی زبان پر کوئی خاص نام رکھا ہوا نہیں تھا، اور "سنسکرت" نام کوئی زیادہ قدیم نہیں ہے، کیونکہ یہ ویدک ساہت میں درج ہی نہیں ہے۔ اس قدیم بھاشا بولنے کا رواج بعد میں بند ہو گیا۔ یاسک اور پانی منیوں نے اس کا گہرا مطالعہ کیا، تو انہیں یقین ہو گیا کہ یہ زبان نہایت سائنسی (Scientific) انداز میں بنی ہوئی ہے، اس لئے اُسے سنسکرت کا نام دیا، جسکے معنی ہیں "اچھی یا صاف یعنی تلفظ والی یا سدھری ہوئی زبان"۔[1] یہ نام خود پتہ دیتا ہے کہ یہ زبان کی صفت بیان کر رہا ہے، اور یاسک اور پانی منیوں نے اس بھاشا (زبان) کی عمدہ ساخت دیکھ کر، اس کا یہی نام رکھا۔ یہ لفظ بھی ان ہی کے وقت کا بنا ہوا ہے، اور بنایا بھی شاید انہوں نے خود تھا، کیونکہ اس سے پہلے یہ نام کہیں بھی استعمال شدہ نہیں ہے۔

"سنسکرت" اور "دیوناگری" ناموں پر غور: سنسکرت زبان عام طور پر "دیو وانی" یعنی دیوتاؤں کی زبان کہلاتی تھی۔ آخرین درجے والی سنسکرت (Classical Sanskrit) میں بھی اسے "سُر بھارتی" یعنی دیوتاؤں کی زبان کہا گیا ہے۔ "سُر" معنیٰ "دیوتا" اور "بھارتی" معنیٰ "وانی یا بولی"۔ سنسکرت زبان جس آئیوپٹا میں لکھی جاتی ہے یہ پہلے "براہمنی" رسم الخط کہلاتی تھی، اور اب وہ "دیوناگری" یعنی دیوتاؤں کے نگر (شہر) کی آئیوپٹا کہلاتی ہے۔ سنسکرت آئیوپٹا پر یہ نام کیسے پڑے، یہ بات پہلے کسی نے بھی واضح نہیں کی، اس لئے اس سے متعلق میں اپنی شخصی خیال کا اظہار کرتا ہوں۔

سارے ہندستان کے ہندو عام طور پر یوں کہتے ہیں کہ ہمارے دیوتا شمال کی طرف ہیں۔ ہندستان کے شمال میں کوہ ہمالیہ ہے، اور اس کے اُس پار میرو پربت تھا، جسے سمیر پربت بھی کہتے تھے۔ قدیم آریوں میں سے زیادہ تر وہاں مقیم تھے۔ ان میں سے بہت رشی تھے، جن میں سے سات رشی اہم تھے، اسی وجہ سے "سپت رشی" لفظ مہابھارت، پرانوں وغیرہ میں کئی مقامات پر استعمال ہوا ہے۔ شکل یجروید کے آخر میں جو شتپتھ براہمن گرنتھ ہے، اس میں ان سات رشیوں

(1) "سنسکرت" لفظ کا مادہ ہے "کر" (Kri) معنیٰ "کرنا" (To do)۔ اس کا اسم مفعول ہے "کرت" معنیٰ "کیا" یا "کیا ہوا" (Done)۔ "سم" ایک سابقہ (Prefix) ہے، جو کے معنی ہیں "اچھا"، جس وجہ سے "سمکرت" (سنسکرت) معنیٰ اچھی یا صاف کی ہوئی یا چمکیلی زبان (Polished or refined language)۔ سنسکرت اور سندھی کے قواعد (Rules of Euphony) ہیں، جن میں سے ایک قاعدا یہ ہے کہ "کر" مادہ سے پہلے اگر "سم" آ جائے، تو "س" کا تلفظ مشدد کر کے ملانا چاہئے۔ یہی سبب ہے جس وجہ سے "سمکرت" کے بجائے "سمسکرت" (سنسکرت) کہا جاتا ہے۔ اسی طرح "سمکار" کے بجائے "سنسکار" (Sacrament) کہا جاتا ہے۔ مصنف

کے نام: گوتم، بھردواج، وشوامتر، جمدگنی، وشسٹ، کشیپ اور اُتری درج ہیں۔ یہی قدیم رشی تھے، جن کی زبان میں سے ویدوں کے منتر ظاہر ہوئے۔ ویدوں کے منتر ایسے ویسے بندے کے منہ سے نکلنے والی چیز نہیں ہیں، لیکن بزرگیدہ لوگوں کے منہ ہی سے نکل سکتے ہیں۔ یہی رشی بزرگیدہ شخصیات تھے، اور موجودہ سارے براہمن قدیم رشیوں کی اولاد ہیں، اس لئے براہمنوں نے اپنے ان آباء و اجداد (رشیوں) کو ''دیوتا'' کہا تو یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ قدیم یونانی لوگ بھی اپنے آباء واجداد کو ''دیوتا'' کہتے تھے۔ وہ آج بھی کہتے ہیں کہ ہم دیوتاؤں کی اولاد ہیں۔

سپت رشی امر ہیں: آج بھی آنکھ اُٹھا کر آسمان کی طرف نگاہ کریں گے تو ستاروں کا ایک جھرمٹ نظر آئے گا، جس میں سات تارے ہیں۔ وہ اس طرح کھڑے ہیں گویا کہ آسمان میں ایک بڑا ریچھ کھڑا ہے۔ اس لئے انگریزی میں لکھی ہوئی نگول ودیا میں اسے (Ursa Major or Great Bear) یعنی ''بڑا ریچھ'' (دُبِ اکبر) کہا گیا ہے۔ ان سات تاروں کے گروہ کو ہندو ''سپت رشی'' کہتے ہیں، اور ان کو دیوتا کہہ کر پکارتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ان سات رشیوں کو نہ صرف براہمن، لیکن کھتری اور وَیش بھی دیوتا سمجھتے ہیں۔ منوسمرتی میں ان سات رشیوں کے ناموں کے ساتھ دوسرے تین نام دکش، بھرگو اور نارد بھی درج ہیں، اور ان سب دس ہی کو ''پرجاپتی'' (برہما) کہا گیا ہے، یعنی کہ ان سے متعلق کہا گیا ہے کہ ساری انسان ذات ان میں پیدا ہوئی تھی۔ ایسی حالت میں اگر ساری ہندو ذات نے قدیم رشیوں کو دیوتا تصور کیا، تو کہ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ خود قدیم رشی اپنے لئے یوں کہتے تھے کہ ہم دیوتاؤں کی اولاد ہیں۔ رگ وید کے منڈل ۳، (سُوکت ۵۳، رچا ۹) میں کہا گیا ہے کہ بڑا رشی وشوامتر دیوتاؤں میں سے پیدا ہوا تھا۔[1] قدیم رشی اور ان کے بڑے بول چال خواہ لکھنے پڑھنے میں سنسکرت زبان استعمال کرتے تھے، جو آج تک ہندوؤں کی پوتر بھاشا (پاک زبان) ہے، اور اسی سبب اسے ''دیووانی'' یعنی دیوتاؤں کی زبان کہتے ہیں۔ آخرین درجے والی سنسکرت میں بھی اسے ''سُر بھارتی'' یعنی دیوتاؤں کی زبان کہا گیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سنسکرت کو دیوتاؤں کی زبان کہنے کا رواج بھی کئی زمانوں سے جاری ہوا ہے۔

آسمان میں جو سات تاروں کا گروہ ہے وہ ''سپت رشی'' (Great Bear). کہلاتا ہے، اس میں دو تارے ''اشارہ کرنے والے'' (Pointers) ہیں۔ ان سے سیدھی لائن میں ''دھرہ تارہ'' (Pole Star) دیکھنے میں آتا ہے، جو ہمیشہ شمال کی طرف ہوتا ہے۔ یہ دھرہ تارہ آج تک گویا کہ یہ دکھاتا ہے کہ ان قدیم رشیوں کا وطن شمال طرف (میرو پربت) پر تھا۔ وشنو پران میں

(1) "The great rishi (Visvamitra), director of men, sprung from the gods." (R.v. iii, 53, 9) Quoted by J. Mulr: Original Sanskrit Texts, part iii, P. 145.

لکھا ہوا ہے کہ جموں دویپ (جزیرہ) میں میرو پربت تھا، اور اس پربت کی چوٹی پر ایک شہر قائم تھا، جو زمین پر بہشت تھا، اور وہ "برہما کا لوک" تھا۔ قدیم سپت رشی جو "پرجاپتی" (برہما) کہے گئے ہیں، ان کا اصلی وطن یہی "برہما کا لوک" تھا۔ اس سے یوں سمجھ میں آ رہا ہے کہ، یہی پہلا وطن تھا، جہاں پر سنسکرت آئیوٹا بنی، اور "برہما کے لوک" میں بننے کی وجہ سے یہ "براہمی" کہی جانے لگی۔ یہ بعد میں "دیوناگری" یعنی "دیوتاؤں کے نگر یا شہر" کی آئیوٹا کہی جانے لگی، وہ بھی اس وجہ سے کہ قدیم رشیوں کا شہر یہی "برہما کا لوک" تھا، جو میرو پربت کی چوٹی پر قائم تھا، اور یہ آئیوٹا دراصل اسی شہر میں بنی تھی۔

فنِ تحریر: گزشتہ انیسویں صدی میں تاریخ پر تحقیقات کرتے ہوئے، کن یورپی علماء نے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ ویدوں والے زمانے میں، بلکہ اس سے کئی صدیاں بعد میں بھی، قدیم آریوں کو لکھنے کا فن نہیں آتا تھا، اور ویدوں کی وانی، اور اتہاسوں اور پرانوں کی باتوں کا پھیلاؤ نسل در نسل حافظے سے کام لیتے ہوئے کیا جاتا تھا۔ کئی یورپی علماء نے ڈاکٹر بلہر (Dr. Bulher) کی رائے سے اتفاق کیا کہ "فنیشن" آئیوٹا، جو ۹۰۰ برس ق۔م مروج تھی، اس سے براہمی رسم الخط (دیوناگری) وجود میں آئی۔[1] اور اس کے بعد آریوں کے پاس لکھنے کا فن عام ہوا! یورپی علماء کا کہنا تھا قدیم زمانے میں ہندستان اور میسوپوٹیمیا کے درمیان زیادہ تعلقات ہونے کے باعث میسوپوٹیمیا کی فنیشن آئیوٹا ہندستان میں جاری ہوئی!

یورپی علماء کی اس طرح کی آرا سے ہمارے لوگوں میں غیرت جاگ اُٹھی، اور بہت جذبہ بیدار کیا۔ وہ بذاتِ خود تحقیقات کرنے لگے، کیونکہ یہ بات کسی کو بھی اعتبار میں نہیں آ رہی تھی کہ قدیم آریوں نے فنیشن آئیوٹا سے دیوناگری حروف بنائے تھے۔ ہمارے ملکی علماء میں سے، جنھوں نے یورپی لوگوں کی اس رائے کا اول رد دیا، ان میں سے اہم پروفیسر ڈی۔ آر۔ بھنڈارکر تھا۔ اس صاحب نے تحقیقات کر کے کہا کہ لکھنے پڑھنے کا فن رگ وید والے زمانے میں ہی ہندستان کے لوگوں کو تھا۔ تاریخ سے پہلے کے زمانے کی آئیوٹا کے نشانات جس طرح حیدرآباد دکھن سے دریافت شدہ برتنوں پر ہیں، ان حروف سے براہمی رسم الخط (دیوناگری) ماخوذ ہے۔[2]

(1) "Brahmi has been traced back to the Phoenician type of writing represented by the inscription in which Mesha, King of Meab (c. 850 B.C.) records his successful revolt against the kingdom of Israel." Cambridge of India, Vol. I.

(2) "The European views on this subject have recently been challenged by some Indian Scholars, notably by professor D.R.Bhandarkar. He maintains that the art of writing was known to the Indians as early as the time of Regveda, and derives the Brahmi alphabet from prehistoric alphabetic signs such as have been recently found on pre-historic dug out of the Hyderabad Cairns."

Dr. Ramesh Chandra Mojumdar: Outline of Ancient History and Civilization, Page 42.

اس سے متعلق جو مزید تحقیقات تاحال ہوئی ہیں، انہیں یہاں پر مختصراً بیان کیا جاتا ہے، تا کہ پوری بات سمجھنے میں آسانی ہو۔

کلکتہ یونیورسٹی کے تاریخ کے پروفیسر ڈاکٹر ابناش چندرداس خود رگ وید میں سے حوالہ دیکر لکھا ہے کہ رگ وید کے منڈل دسویں (سُوکت ۷۱، رچا ۴) میں لکھا ہوا ہے کہ "ایسے دو آدمی ہیں، جو وانی کے معنی اور مطلب سمجھنے کے علاوہ اُسے سنتے ہیں اور دیکھتے ہیں"۔

یہ حوالہ دے کر اس نے کہا ہے کہ "وانی تب دیکھی جا سکتی ہے، جب لکھی ہوئی ہوگی، اس لئے ان الفاظ سے بلا پوچھے یہ مطلب نکالا جا سکتا ہے کہ رگ وید والے زمانے میں ہی لوگوں کو نہ صرف لکھنے اور پڑھنے کا فن معلوم تھا، لیکن ان کے پاس کچھ پستک بھی تھے۔"(1)

ڈاکٹر ابناش چندرداس کی اس بات کو کوئی بھی یورپی خواہ ملکی عالم آج تک رد نہیں دے سکا، اور نہ ہی کوئی دے سکے گا۔ ہم خود یورپی علماء کی پہلی رائے کو سراسر غلط سمجھتے ہیں، اور ڈاکٹر ابناش چندرداس کی رائے سولہ آنے صحیح سمجھتے ہیں، اس کے لئے یہ بھی ایک زبردست سبب ہے، جو خود اتھرو وید کے منڈل انیسویں (سُوکت ۶۸، منتر ۲۷) میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ "پستک (وید) کے پاٹھ کرنے کے وقت اسے صندوق سے نکالتے تھے، اور پاٹھ پورا کرنے کے بعد اُسے صندوق میں واپس رکھتے تھے۔" اس سے زیادہ پکا پختہ اور نہایت واضح ثبوت اور کوئی ہو نہیں سکتا، اس لئے بلا پوچھے ماننا پڑے گا کہ ویدک زمانے میں ہی قدیم آریہ لوگ نہ صرف لکھنا پڑھنا جانتے تھے، لیکن ان کے پاس لکھے ہوئے پستک بھی تھے، جن کی بے حد سنبھال کرتے تھے، اور انہیں صندوق میں حفاظت کے ساتھ رکھتے تھے۔

لوکمانیہ بال گنگا دھر تلک اپنی تصنیف کردہ کتاب "آرکٹک ہوم" میں مہابھارت کی شانتی پَرو سے حوالہ دے کر لکھا ہے کہ قدیم آریہ لوگ جب قطب شمالی کی طرف میرو پربت پر مقیم تھے، تب بھی ان کے پاس وید اور پران تھے، جو آٹھ دس ہزار سال ق۔م بڑا سیلاب آنے کی وجہ سے گم ہو گئے، اور بعد میں رشیوں کو کشف کے زور پر جس قدر یاد آئے اس قدر از سر نو تحریر کیا۔ اس حقیقت موجب یوں کہا جا سکتا ہے کہ قدیم آریہ لوگ جب میرو پربت طرف تھے، اور ہندستان میں ابھی آئے ہی نہیں تھے، تب بھی وید اور پران ان کے پاس تھے، اور انہیں لکھنے پڑھنے کا ہنر بھی تھا۔

(1) "The question is whether the art of writing and books existed in Reg-vedic times. I have discussed this question elsewhere, and have come to the conclusion that the Reg-vedic Aryans were most likely acquainted with the art of writing, and probably there were books or granthas in which the mantras were recorded. The statement is the Reg-vedic verse (x.714) that "there are men who hear and see speech without understanding its meaning" unmistakeably points to Dr. A.C.Das: Regvedic Culture, PP. 387-388.

تحریر کے قدیم دستور یا نمونے: آرکیالاجیکل محکمہ والوں کو تحقیقات کرنے سے یقین ہو چلا ہے کہ پوری دنیا میں پہلے یہ دستور تھا کہ لوگوں کو جب کوئی اظہارِ خیال کرنا ہوتا تھا، تب اس کی شکل بناتے تھے۔ مثلاً: گھوڑے، بیل یا کسی اور جانور کا نام انہیں لکھنا ہوتا تھا تو اس کی شکل بناتے تھے۔ وہ شکلیں بعد میں اپنی صورت تبدیل کر کے موجودہ آئیویٹا بنی ہیں۔ ''لپی'' یا ''آئیویٹا'' کو ''ورن مالا'' کہا جاتا ہے۔ ''ورن'' لفظ کے معنی ہیں ''رنگ''۔ مثلاً: ''سون ورنو'' معنی سونے کے رنگ والا یعنی ''خوبصورت''۔ اس ''ورن مالا'' لفظ سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے آئیویٹا کے حروف کندہ کیے جاتے تھے، اور وہ کندہ حروف کی قطار اوائلی آئیویٹا تھی۔ ہماری یہ قیاس آرائی صحیح ہے، اس کی تصدیق ''لپی'' لفظ سے ہوتی ہے۔ ''لپی'' معنی ''آئیویٹا''، لیکن اس کا مادہ ہے ''لپ'' (Lip) معنی ''کندہ کرنا''۔ اس ''لپی'' لفظ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ پہلے آئیویٹا کے حروف کندہ ہوا کرتے تھے، اور بعد میں ہر ایک تلفظ کے لیے کچھ حروف مقرر ہوئے۔ خود حروف لکھنے کا نمونہ بھی وقت بوقت تبدیل ہوتا رہا ہے۔ نمونے کے لئے ٹرمپ صاحب والا اور بمبئی چھاپے والا شاہ جو رسالو ملاحظہ ہو، جن میں حروف کسی اور نمونے کے لکھے ہوئے ہیں۔ مطلب یہ کہ جس طرح زبان ترقی کر کے مختلف روپ لیتی ہے، اسی طرح آئیویٹاؤں نے بھی روپ تبدیل کیے ہیں۔ قدیم دیوناگری آئیویٹا ''براہمی لپی'' کہلاتی تھی، اور وہ علحدہ علحدہ زمانوں میں روپ تبدیل کر کے موجودہ دیوناگری بنی ہے۔ اس وقت سنسکرت میں لکھے ہوئے کئی کہنہ پستک ہیں، جن میں استعمال شدہ آئیویٹا موجودہ دیوناگری حروف سے بہت تبدیل ہے۔

ہندستان اور یورپ کے قدیم آریہ لوگ کس طرح لکھتے تھے، اس بات کا پتہ سندھی لفظ ''لکھ'' اور انگریزی لفظ ''رائیٹ'' (Write) سے چلتا ہے۔ ان دونوں لفظوں کے بنیادی معنی ہیں ''کھرچنا، رگڑ لگانا'' یعنی کندہ کرنا۔ اس بنیادی معنی سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے پتھروں یا دھاتو پر حروف کندہ کیے جاتے تھے، خود ''اکھر'' (حرف) (سنسکرت ''اکشر'') لفظ کے معنی ہیں ''جو مٹ نہ سکے'' مس قلم سے لکھے ہوئے الفاظ مٹ جاتے ہیں، لیکن کندہ حروف نہیں مٹتے۔ مطلب یہ کہ ''لکھن'' اور ''اکھر'' لفظ اس قدیم زمانے کے بنے ہوئے ہیں، جس زمانے میں حروف کندہ کرنے کا رواج تھا۔

ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی اپنی تصنیف کردہ بنگالی زبان کی تاریخ میں سنسکرت لفظ ''پستک'' کی نسبت پارسی لفظ ''پوست'' (کھال) سے لکھی ہے۔ یہ ایک تاریخی بات ہے کہ قدیم ایرانی لوگ گائے کی کھال کاغذ کی طرح باریک کر کے، اس پر لکھتے تھے۔ یہ حقیقت ڈاکٹر مارٹن ہاگ اپنی کتاب میں پارسیوں کے مذہب اور زبان کا تذکرہ کرتے ہوئے صفحہ ۱۳۶ پر درج کی ہے۔

''پستک'' لفظ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ قدیم ہندو لوگ بھی کچھ عرصہ کھالوں پر لکھتے تھے، کیونکہ گائے اور بیل ذبح کرنا اور گائے کا گوشت کھانے کا رواج مہابھارت والے زمانے تک بھی عام تھا۔

کاغذ کے مقابلے میں کھال بلکل مہنگی چیز ہے۔ کھال کو چھیل کر کاغذ جیسا باریک اور ہموار بنانا بھی خاصا محنت طلب کام ہے، اس لئے لگتا ہے کہ یہ رواج زیادہ عرصے کے لئے اور عام طرح جاری نہیں ہو سکا ہوگا۔

عام رواج یہ تھا کہ کئی ممالک میں لوگ درختوں کے پتوں پر لکھتے تھے، اور اس کی تصدیق کچھ الفاظ سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً، سندھی ''پن'' (Leaf) اور ''پنو'' (کاغذ) ایک ہی سنسکرت لفظ ''پرن'' سے ماخوذ ہیں۔ انگریزی لفظ ''لیف'' (Leaf) کے بھی ایک معنی ہیں ''درخت کا پتہ'' اور دوسرے معنی ہیں ''ورق'' (کتاب کا)۔ خود عربی لفظ ''ورق'' کے بھی یہی دو معنی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یورپ، عربستان اور ہندستان میں درختوں کے پتوں پر لکھنے کا رواج عام تھا، اور یہ رواج کئی صدیوں تک مسلسل جاری رہا۔

ہوان شیانگ نامی ایک چینی مسافر عیسوی ساتویں صدی میں ہندستان کی سیر کرنے کو آیا تھا، اور سندھ بھی گھوم کے گیا تھا۔ اس صاحب نے اپنے سفر نامہ میں درج کیا ہے کہ ہندستان میں کئی مقامات پر میں نے لوگوں کو درختوں کے پتوں پر لکھتے ہوئے دیکھا۔ سنسکرت ساہت میں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ''بھوج درخت'' (Birch Tree) کے پتے عام طور پر لکھنے کے کام آتے تھے۔ آج تک شریمد بھاگوت، گرڑ پران اور دیگر کئی پستک براہمنوں کے پاس ڈھیر لگے رکھے ہیں، اور وہ مجلد بھی نہیں ہیں۔ ہندو لوگ جب گھروں میں شریمد بھاگوت وغیرہ کا پارائن رکھواتے ہیں، تب براہمن ایک ایک پرت پڑھتے ہوئے، ڈھیر کے نیچے رکھتے جاتے ہیں۔ پہلے بھی یوں ہی کرتے تھے، لیکن شاید کسی وقت کاغذوں کا ڈھیرا گر جائے، اور پتہ پتہ سے الگ ہو جائے، اس لئے بھوج درخت کی چھال ان پتوں کے اوپر رکھ کر کاغذوں کے آر پار ایک سوراخ کرتے تھے، اور اس سوراخ میں سے دھاگہ گزار کر، گانٹھ لگا دیتے تھے، تو سیدھی سادھی کتاب بن جاتی تھی۔ اسے کہتے تھے گرنتھ، جس کے ایک معنی ہیں ''پستک یا کتاب''، اور دوسرے معنی ہیں ''گانٹھ''۔ سکھوں کے گروں کی بانی جس کتاب میں لکھی ہوئی ہے، اسے ادب اور احترام سے ''گرنتھ صاحب'' کہتے ہیں، ورنہ اس کے اصل معنی ہیں ''کتاب''، اور بعد میں اس کے خاص معنی ہوئے ''گروں کی بانی کی کتاب''۔ اسی طرح مسلمانوں کی پاک کتاب ''قرآن'' کا ''القران'' کہلاتی ہے، جس کے بھی لفظی معنی ہیں ''کتاب'' (The Book)۔ (قرء معنیٰ پڑھنا)۔ اسے ''مصحف'' یا ''المصحف'' بھی کہتے ہیں۔ اس لفظ کے بنیادی معنی ہیں ''کتاب''

(صحف معنی لکھا ہوا پرت)، اور وہ ''الکتاب'' بھی کہلاتا ہے۔ اس طرح لفظوں کو کچھ خاص معنی مل جاتے ہیں۔

اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس سے معلوم ہوگا کہ ویدک زمانے میں بلکہ اس سے کئی صدیاں بعد میں بھی آج کل کی طرح کتابیں نہیں ہوا کرتی تھیں۔ کاغذوں یا پتوں کو جوڑنے کا علم ہماری لوگ بہت بعد میں سیکھے، اور یہ گویا کہ کل کی بات ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینکا سے معلوم ہوتا ہے کہ کاغذوں اور پتوں کو جوڑنے کا رواج چین ملک میں ق۔م موجود تھا۔ سن ۷۵۱ع میں عربوں نے سمرقند پر حملہ کیا، تو چین کا لشکر ان کے مقابلے میں آیا۔ اس وقت عربوں نے کچھ چینی لوگ گرفتار کئے اور انہیں اپنے پاس نظر بند رکھا۔ ان گرفتار شدہ چینیوں نے عربوں سے کہا کہ ''اگر تم ہمیں آزاد کروگے تو ہم اس مہربانی کے عوض تمہیں ایک عمدہ ہنر سکھائیں گے۔'' عربوں نے اس بات سے اتفاق کیا۔ اس پر چینیوں نے انہیں کاغذ بنانے کا ہنر سکھایا۔ عربوں نے بھی اپنے وعدے کی پاسخاطری کرتے ہوئے انہیں آزاد کر دیا۔ یہ ہنر بعد میں ہندستان بلکہ یورپ کے لوگوں کو انہوں نے خود سکھایا۔ اس سے پہلے حسابی علم اور دیگر کچھ علوم عربوں کو ہندستان کے لوگوں نے سکھائے تھے۔ عربی میں حسابی علم کو کہتے ہی ''علم ہندسہ'' ہیں، کیونکہ یہ علم انہوں نے ہندستان سے ہی سیکھا تھا۔ بعد میں کاغذ بنانے کے ہنر ہندستان کے لوگوں کو انہوں نے سکھایا۔ اس طرح ایک دوسرے کا احسان انہوں نے اتار دیا۔

دیوناگری کا پھیلاؤ: تمام آریہ لوگ یا ان میں سے کچھ جب قطب شمالی کی طرف میرو پربت پر رہتے تھے، تب وہ سنسکرت زبان بولتے تھے۔ اس زبان کو لکھنے کے لئے براہمی رسم الخط استعمال کرتے تھے، جسے بعد میں دیوناگری کہا گیا۔ وہ قدیم لوگ پھر شمالی ہندستان میں آئے، تو دیوناگری حروف کا وادیٔ سندھ میں پھیلاؤ ہوا۔ رگ وید والے زمانے میں وادیٔ سندھ میں ''پنی'' (بیوپاری) تھے، اور بیوپاری لوگوں کو اپنا حساب کتاب رکھنے کے لئے کوئی نہ کوئی آئیوتا ضرور چاہئے تھی۔ یہ ''پنی'' قدیم برہمی لپی استعمال کرتے تھے، جو بات اس سے ظاہر ہے کہ وہ بعد میں جنوبی ہندستان میں گئے، جس طرح پرانوں میں درج ہے، اور حالیہ جنوبی ہندستان سے دریافت شدہ کچھ برتنوں پر جو حروف تحریر شدہ ہیں، ان سے متعلق ظاہر ہوا ہے کہ وہ قدیم براہمی لپی جیسے ہیں۔ یہ وادیٔ سندھ کے ''پنی''، اور جنوبی ہندستان کے چول لوگ بعد میں بئبلونیا، میسوپوٹیمیا اور مغربی ایشیا میں دوسری جگہ اپنی بیٹھکیں قائم کیں، اور سیمیٹک قوم والوں سے رشتیداریاں کر کے ان کے ساتھ رل مل گئے، جس وجہ سے وہ ''پیونک'' (پنک) قوم (Punic race) والے اور

"فنیشن" (Phoenicians) کہلانے لگے، اس وقت مغربی ایشیا میں جو اصل سیمیٹک قوم والے تھے، ان کو اپنی کوئی بھی آئیوپٹا نہیں تھی، اس لئے، ان ہندستان سے آئے ہوئے "پنی" لوگوں والی (براہمی دیوناگری) آئیوپٹا اختیار کی، اس لئے سیمیٹک قوم والوں کی آئیوپٹاؤں کی بنیاد "فنیشن" (پنی لوگوں) کی آئیوپٹا کہلاتی ہے۔ جیسا کہ انسائیکلوپیڈیا برٹنیکا اور دیگر کتابوں میں درج ہے۔(7)

اس وقت سنسکرت میں تینتیس حروف صحیح (ونجن)، سولہ حروف علت (سُر) ہیں۔ مصنف کو یوں سمجھ میں آتا ہے کہ قدیم براہمی لپی میں اصل فقط بائیس حروف صحیح تھے، اور ماترائیں تھی ہی نہیں۔ یہی سبب دکھائی دیتا ہے، جس وجہ سے جو "پنی" بعد میں "فنیشن" کہلانے لگے، ان کی آئیوپٹا میں صرف بائیس حروف صحیح تھے، اور حرف علت تھا ہی نہیں، اس لئے سیمیٹک قوموں کو ان سے فقط اتنے ہی آئیوپٹا کے حروف صحیح ملے اور ایک بھی حرف علت انہیں نہیں ملا۔ مثلاً، عربوں نے اپنی آئیوپٹا آرم ملک سیمیٹک قوم والوں سے لی، تو آج بھی دیکھیں کہ عربی میں سارے حروف صحیح ہیں اور حرف علت اس میں ہے ہی نہیں۔ عربوں کو جو حروف صحیح آرم ملک والوں سے ملے، ان میں سے کن کے منہ بند تھے، جو پھر عربوں نے کھولے۔ عربی میں کچھ تلفظ ہیں جو آرم سے ملی ہوئی آئیوپٹا میں نہیں تھے، تو اپنی ضرورت کے مطابق انہوں نے کچھ حروف ملا لئے۔ مثلاً، ب اور ت؛ ج، ح اور خ ایک ہی صورت والے حروف ہیں، تو ان میں نقطے نیچے اوپر شامل کرکے، اپنی آئیوپٹا کے حروف بڑھا کر اٹھائیس کر دیے۔ سن ۶۳۴۔۶۳۵ع کے لگ بھگ عربوں نے ایرن فتح کیا، تو وہاں پر عربی زبان اور عربی آئیوہٹا جاری ہوئی۔ ایرانی زبان میں کچھ ایسے تلفظات ہیں، جو عربی میں نہیں ہیں، تو ایرانیوں نے عربی آئیوپٹا میں اپنے اور حروف بنا کر ڈال دیے، جس وجہ سے آج فارسی آئیوپٹا میں بتیس حروف ہیں۔

کوئی بھی زبان حروف علت یا اعرابوں کے بغیر نہیں چل سکتی۔ سیمیٹک قوموں کو پنی یا فنیشن لوگوں کے رسم الخط سے اعرابیں یا حروف علت نہیں ملے، تو انہوں نے اپنی ذہانت کو استعمال کرتے ہوئے، اپنے لئے ایک آسان اور سہل راستہ نکال لیا۔ مثلاً، عربی اور فارسی میں "ا، و، اور ی" یہ تینوں حروف صحیح ہیں، اور ان کا اپنا اپنا تلفظ ہے، پھر بھی انہیں حروف علت کے طور پر بھی استعمال کیا جانے لگا۔ "الف" میں سے "اَ"، "وْ" میں سے "اُ" اور "ی" میں سے "اِ"، یے تین اعرابیں بنا لیں۔ یہ تینوں چھوٹی آواز والے اعراب ہیں، لیکن زبان میں لمبی آوازیں بھی تو ہوتی ہیں۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے عرب لوگوں نے انہی تین چھوٹی آوازوں کو دگنا کر کے

(1) "Devinagri is the original source, hence, the alphabets of Western Asia were derived." Sir William Jones: Asiatic researches. Vol. I page 423.

استعمال کرنے لگے۔ مثلاً، عربی میں لکھتے ہیں ''ادم''، جس کا تلفظ ہے ''آدم''۔ اسی طرح اَ+ اَ = آ، اِ + اِ = اِی اور اُ + اُ = اُو۔ جن قواعد کے مطابق دو چھوٹی آوازیں آپس میں مل کر، ایک لمبی آواز پیدا کرتی ہیں، انہیں کہا جاتا ہے ''سندھی کے قواعد'' (Rules of Euphoney)۔ سندھی کے قواعد قدرتی قواعد ہیں، اس لئے وہ سنسکرت، سندھی، عربی اور دنیا کی دیگر زبانوں کے ساتھ یکساں طور پر لاگو ہیں۔ مثلاً، سندھی میں ''پنج + اَسی'' کا تلفظ کرتے ہیں ''پنجاسی''۔ ''پنج'' لفظ میں ''ج'' کے اوپر زبر یعنی ''اَ'' کا تلفظ ہے، اور ''اَسی'' لفظ سے پہلے بھی ''اَ'' کا تلفظ ہے۔ یہ دونوں ''اَ'' کے تلفظات آپس میں مل کر ''آ'' ہوتے ہیں، اس لئے ''پنج + اَسی'' کے بجائے ہم کہتے ہیں ''پنجاسی''، ''چھ + اَسی'' کے بجائے ہم کہتے ہیں ''چھاسی'' اور ''ست + اَسی'' کے بجائے ''ستاسی'' کہتے ہیں۔

یہ ''پنی'' یا ''فنیشن'' لوگ بعد میں تجارت کی خاطر مغربی ایشیا سے یورپ کی طرف اس وقت گئے، جب یورپی لوگوں کو اپنا کوئی بھی رسم الخط نہیں تھا۔ پہلے پہلے یونانی لوگوں نے فنیشن رسم الخط اختیار کیا، اور بعد میں وہ یورپ میں پھیل گئی۔ فنیشن رسم الخط میں بھ، تھ، پھ، چھ وغیرہ ''وسرگ حروف'' یعنی ''ھ'' کے تلفظ والے حروف (Aspirates) ہیں، لیکن یورپی زبانوں میں یہ چار حروف نہیں ہیں، تو انہوں نے یہ چار حروف چھوڑ کر، اور فنیشن رسم الخط میں دوسری مطلوبہ تبدیلیاں کر کے، پھر اُسے استعمال کیا۔ مطلب یہ کہ براہمی رسم الخط یا دیوناگری رسم الخط ''فنیشن'' لوگوں نے یورپ میں پھیلایا، جو اصل میں وادیٔ سندھ کے ''پنی'' تھے۔[(8)] سر مونیئر ولیمس اپنی تصنیف کردہ سنسکرت ۔۔انگریزی لغت کے دیباچہ میں کھلم کھلا لکھا ہے کہ جو رسم الخط یونانیوں، رومن، اور یورپ کی موجودہ قوموں نے اختیار کیا، وہ بنیادی طور پر یورپ کا نہیں ہے، بلکہ ایشیا کا ہے، اور دیوناگری سے مشابہت رکھتا ہے۔ سر مونیئر ولیمس نے اپنی لغت کے دیباچے میں حروف کی تصویریں بھی دی ہیں، اور واضح کیا ہے کہ کس طرح ''فنیشن'' رسم الخط نے (قدیم دیوناگری) کے حروف اپنی صورت تبدیل کر کے موجودہ انگریزی حروف کی صورت اختیار کر لی ہے۔ نیز ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا برٹینکا کا تازہ ایڈیشن چودہ۔

عربی میں فقط ا، و، ی ۔۔۔ یہ تین حروف علت کے طور پر استعمال ہوتے ہیں؛ لیکن انگریزی میں چھ حروف علت a, e, i, o u & y ہیں۔ اس سے یوں سمجھ میں آ رہا ہے کہ

(1) "Let me then in the first place point out that our so-called European alphabet, as adopted by the Greeks, Romans and modern nations of Europe, is really Asiatic, and not European in its origin. And secondly, let me try to show that it has certain features which connect it with the so-called divine Nagri alphabet of the Brahmans." Sir Monier Williams: Sanskrit English Dictionary, Introduction, Page XXII.

شمالی ہندستان والے آریوں نے بعد میں قدیم دیوناگری حروف میں کچھ مزید اصلاح کی، اور جن ہندوؤں نے یونان، جرمنی اور اسکنڈ ینیویا وغیرہ کو جا کر آباد ہوئے، انہوں نے دیوناگری کا اصلاح شدہ نمونہ وہاں جا کر جاری کیا، یا پھر یہی پنی (فنیشن) جو بعد میں بھی ہندستان خواہ یورپ کے ساتھ روابط رکھے جاری رکھے ہوئے تھے، انہوں نے یہ اصلاح شدہ نمونہ یورپ میں پھیلایا۔ اس کے باوجود بھی اصلاح شدہ رسم الخط میں سے یورپی لوگوں کی ضرورت پوری نہیں ہوئی، اس لئے عربی کی طرز پر دو حروف علت اکٹھے ملا کر، ایک لمبی آواز (سندھی کے قواعد موجب) کرنے لگے۔ مثلاً، keep, wool, Tool, Fool, weep, sheep لفظوں میں''او'' (o) اور''ای'' (E) حروف دو دفعہ استعمال کر کے''اُوٗ'' اور''اِیٖ'' کی لمبی آوازیں پیدا کرتے ہیں۔

انگریزی زبان اس وقت پوری دنیا میں پھیل گئی ہے، لیکن اس کا رسم الخط کوئی اتنا عمدہ نہیں ہے۔ مثلاً، انگریزی لفظ''سیل'' (Cell) اور''کیچ'' (Catch) میں ایک ہی حرف''سی'' (C) کی آواز ایک جگہ پر''س'' کی ہے تو دوسری جگہ پر''ک''! انگریزی حروف علت کی ترتیب (Vowel system) تو اور بھی پریشان کن ہے، کیونکہ کہیں چار چار حروف ایک ہی قسم کے ہیں؛ لیکن آوازیں الگ الگ ہیں۔ مثلاً،''کاف'' (Cauf) Cough،''رف'' (Ruff) Rough،''بو'' (Bow) Bough،''ڈو'' (Do) Dough،''ہاک'' (Hock) Hough اور''تھرو'' (Throo) Through۔ انگریزی میں بھی عربی کی طرح دو دو چھوٹی آوازیں والے حروف علت ملا کر، ایک لمبی آواز پیدا کرتے ہیں، جیسا کہ اوپر پہلے ہی کہا جا چکا ہے۔ ان تمام باتوں کو یکجا زیرِ غور لاتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ سیمیٹک قوموں اور یورپی لوگون کے رسم الخط آدرش رسم الخط نہیں ہیں۔

آدرش رسم الخط (Ideal Alphabet) اُسے کہتے ہیں، جس میں ہر ایک آواز کے لئے فقط ایک ہی نشان (حرف یا اعراب) مقرر ہو۔ صرف سنسکرت رسم الخط میں ایسا ہے جس میں ہر ایک ماترا کو صرف ایک ہی آواز ہے، اس لیے عربی اور انگریزی کی طرح دو دو حروف علت اکٹھے استعمال نہیں کرنے پڑتے۔ دیوناگری رسم الخط کی دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے سارے حروف بلکل باترتیب کھڑے ہیں۔

ساری آوازیں منہ کے پانچ مقامات یعنی حلق (ک، کھ، گ، وغیرہ)، تالو (چ، چھ، ج وغیرہ)، زبان (ٹ، ٹھ، ڈ وغیرہ)، دانت (ت، تھ، د، وغیرہ) اور ہونٹ (پ، پھ، ب وغیرہ) میں سے بنتی ہیں۔ کچھ آوازیں ناک میں سے (ںگ، ںج، م وغیرہ) بھی نکلتی ہیں، اور یہی قدرت کی

بنائی ہوئی طریق ہے۔ دیوناگری رسم الخط کے سارے حروف اسی قدرت کے قاعدے کے مطابق بلکل باترتیب کھڑے ہیں، جس وجہ سے اس طرح کی سائنسی (Scientific) طریق سے بنا ہوا رسم الخط اور کوئی بھی نہیں ہے۔ اس سے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ قدیم براہمی رسم الخط (دیوناگری) کا پھیلاؤ مغربی ایشیا اور یورپ کی طرف ہوا، اس کے بعد ہندستان والے آریوں نے اس میں مزید اصلاح اور اضافہ کر کے اسے آدرش رسم الخط بنایا۔ ان کی زبان بھی سائنسی انداز میں بنی ہوئی ہے، اس لئے وہ بعد میں ''سنسکرت'' (صاف یا کامل زبان) کہی جانے لگی، ورنہ پہلے تو صرف ''بھاشا'' کہلاتی تھی۔ قصہ مختصر، ہر زبان ترقی کر کے کمالیت کو پہنچتی ہے، اسی طرح دیوناگری حروف نے بھی ترقی کر کے، اپنی پہلے والی صورت تبدیل کر کے یہ موجودہ صورت لے لی ہے۔

موجودہ دیسی رسم الخط: ویدک زمانے سے لے کر وادیٔ سندھ میں دیوناگری رسم الخط استعمال ہونے لگا، اور آج اس کا استعمال سندھ بلکہ پورے ہندستان میں ہے۔ مرہٹی اور ہندی آج تک دیوناگری حروف میں لکھی جاتی ہیں، اور ان کے لئے الگ کوئی رسم الخط ہے ہی نہیں۔ بنگالی، گجراتی، ہندوسندھی اور دیگر رسم الخط جو آج کل رائج ہیں، وہ زیادہ تر سب کے سب دیوناگری کی بگڑی ہوئی صورتیں ہیں۔ جدا جدا صوبوں کے لوگوں نے دیوناگری میں اپنے اپنے طریقے سے تبدیلیاں کر کے یہ رسم الخط بنائے ہیں۔ گجراتی اور دیوناگری میں ایک ہی قسم کی ماترائیں ہیں، لیکن راجستھان کے ''مہاجنی'' میں بغیر اعرابوں کے حروف ہیں یعنی ان میں لاکنائیں یا ماترائیں نہیں ہیں۔ پنجاب کے ہندو بیوپاری اپنا حساب کتاب جس رسم الخط میں رکھتے ہیں، وہ ''لُنڈے'' (دُم کٹے) حروف کہلاتے ہیں۔ سندھ کے بھائیبند ہندو سندھی یا واُنکے حروف استعمال کرتے ہیں، اور ان میں بھی ماترائیں نہیں ہیں۔ سندھ میں مسلمانوں کی حکمرانی کافی عرصے تک چلی، تو بھی خواجا اور میمن بیوپاری بھی ہندوسندھی رسم الخط استعمال کرتے تھے، اور آج تک کئی ایک اپنا حساب کتاب ان حروف میں رکھتے ہیں۔ ہندوؤں سے خواجوں کا طریق تحریر زیادہ پسندیدہ ہے، کیونکہ وہ چار لاکنائیں یا ماترائیں استعمال کرتے ہیں۔ سندھ میں اس وقت جو بھائیبند ہیں، ان میں سے کچھ پنجاب، کچھ گجرات اور راجپوتانا سے آئے ہوئے ہیں، اس لئے خود ہندوسندھی حروف میں بھی کچھ فرق ہے یعنی ساری سندھ میں سارے بھائیبند ایک جیسے حروف نہیں لکھتے۔ اس وقت ہندوسندھی کے فی الجملہ تیرہ نمونے ہیں، جو کپٹن جارج سٹک کی مرتب کردہ سندھی گریمر کی کتاب میں درج

ہیں۔ حروف میں تبدیلی کرنا، اور لاکنائیں یا ماترائیں نکالنے کا رواج بیوپاریوں کا جاری کردہ لگتا ہے۔ بیوپاریوں کو اپنی بہت سی باتیں چھپاکے رکھنی پڑتی ہیں، اس لئے الگ الگ جگہوں کے بیوپاریوں نے اپنے اپنے طریقے سے حروف میں تبدیلی واقع کی، تاکہ ان کی رقعے وغیرہ آسانی سے کوئی سمجھ نہ سکے۔ راجھستھان کی مہاجنی، سندھ کی ہندو سندھی اور پنجاب کے لنڈے حروف میں ماترائیں نہ ہونے کو سبب اس وقت حالت یہ ہے، کہ وقتی کچھ لوگ اپنی تحریر خود بھی نہیں پڑھ سکتے! مثلاً: گ اور ل حروف کو ملا کر لکھیں گے تو ان دو حروف کا تلفظ گل، گِل، گول، گولو، گولی وغیرہ ہو سکتا ہے، اس لئے مضمون کے مدنظر تلفظ کیا جا سکتا ہے۔ سکھوں کے گروں کی وانی ''گرمکھی'' رسم الخط میں لکھی ہوئی ہے۔ یہ حروف گروانگد صاحب ۱۵۳۸ اور ۱۵۵۲ع کے وسط میں بنائے تھے۔ گرمکھی حروف میں دیوناگری والی ماترائیں موجود ہیں، اس لئے ہندو سندھی سے زیادہ وہ پسندیدہ ہے۔

ویدک ساہت (Vedic Literature): ہر کسی ملک کا ساہت یا علم و ادب شعر سے شروع ہوتا ہے، یعنی جہاں کہیں پہلے نظم اور بعد میں نثر کہنے میں آتا ہے۔ ویدک ساہت میں بھی پہلے نظم اور پھر نثر ہے۔ اس سارے ساہت کا درجہ اور مان مرتبہ دوسرے ساہت سے اوپر ہے، اس لئے سندھ سمیت سارے ہندستان کے ہندو اس کی طرف عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اسی سبب یہاں یہ درج کرنا ضروری ہے کہ ''ویدک ساہت'' کسے کہا جاتا ہے۔

ویدک ساہت کے دو حصے ہیں: ایک شریتیوں یا وید، اور دوسرا سمریتیوں یا دھرم شاستر۔ وید لفظ کا مادہ یا بنیاد ہے ''وِدْ'' معنیٰ ''جاننا''۔ اس سے ''ودیا'' لفظ بنا ہے، جس کے معنی ہیں ''علم یا معلومات''۔ ''وید'' لفظ کے بھی بنیادی معنی ''علم یا معلومات'' کے ہیں، لیکن خاص طرح اس کے معنی ہیں ''خدائی علم'' یا ''روحانی علم''۔ مطلب یہ کہ ویدوں میں خدائی علم یا روحانی علم سمایا ہوا ہے، اس لئے یہ نام ان پر پڑا ہے۔

ہندو یوں سمجھتے ہیں کہ وید ''اپوَرشیہ'' ہیں یعنی کسی بھی آدمی کے بنائے ہوئے نہیں ہیں۔ قدیم رشیوں کو جیسے جیسے الہام ہوتا گیا، یا سرسوتی نے بات کی، تیسے تیسے ویدوں کے منتر کہتے گئے، اس لئے قدیم رشی ''منتر کرتا'' یعنی منتروں کے بنانے والے کہے جاتے ہیں، لیکن ''منتر درشٹا'' یعنی منتروں کے دیکھنے والے، گویا کہ جیسے خدا کے منہ سے جو الفاظ نکلے ویسے ہی رشیوں نے دیکھے اور سنے، اور خود بھی اسی طرح کہنے لگے۔ بالالفاظ دیگر یوں کہا جا سکتا ہے کہ ویدوں کے منتر خدا کے الفاظ ہیں، جو رشیوں کی زبان سے جاری ہوئے۔ اس

طرح ویدوں میں درج باتیں قدیم رشیوں نے آکاس وانی کے وسیلہ سے سنی، اس لئے وید ''شریتون'' (Books of Revelation) کہلاتے ہیں۔ ''شرتی'' لفظ کا مادہ ہے ''شرُ وُ'' معنی ''سننا''۔

قدیم رشیوں کو کئی مذہبی باتیں بر زبان یاد ہوتی تھیں، جو اپنے بچوں اور شاگردوں کو بھی بر زبان یاد کرواتے تھے۔ یہ باتیں بہت بعد میں قلمبند ہوئیں۔ جن مذہبی کتب میں یہ حفظ کی ہوئی باتیں لکھی ہوئی ہیں، انہیں ''سمرتیوں'' (Books of Tradition) کہتے ہیں۔ ویدوں میں روحانی علم منتروں میں لکھا ہوا ہے۔ لیکن سمرتیوں میں پنگتی، نیتی، راجنیتی اور دیگر دنیوی علوم سے متعلق ''سُوتر'' یعنی کتابچے ہیں؛ ان سے پتہ چلتا ہے کہ پیدائش سے لے کر موت تک کیسے پوری طرح مذہب پر رہا جائے۔ یہ پنگتی، راجنیتی وغیرہ سے متعلق قاعدے ویدک ساہت کے گریھ سوتریوں اور مذہبی سوتروں پر مبنی ہیں، اس لئے ''دھرم شاستر'' میں شرتیاں اور سمرتیاں دونوں ہی شامل ہیں، لیکن عام طور پر سمرتیوں کو ''دھرم شاستر'' یعنی مذہب پر چلنے کے قواعد کہا جاتا ہے۔ وہ ویدک ساہت کے اہم حصے ہیں۔ سمرتیاں بہت ہی ہیں، جیسا کہ: یاجنولکیہ سمرتی، پاراشر، ناردسمرتی وغیرہ۔ سب میں اہم منوسمرتی ہے۔ یہ سمرتیاں بہت بعد میں قلمبند ہوئی ہیں۔ جیسے جیسے رواج تبدیل ہوتے گئے، ویسے ویسے ان میں کی تبدیلیاں واقع ہوتی گئیں، لیکن ان میں درج قواعد ویدوں پر مبنی ہیں۔ اس لئے یہ ویدک ساہت کا حصہ ہیں۔ آج کل کی طرح پہلے لکھنے کی سہولیات نہیں تھیں، اسی سبب سمرتیوں کے قواعد اور دیگر بانی حفظ کرنے کا رواج نہایت عام ہوتا تھا۔ آج بھی دیکھیں کئی سکھوں کو گرو کی بانی بر زبان یاد ہے۔ کسی پوتھی پر سے دیکھ کر پڑھنے کے بجائے بر زبان بانی پڑھنا ہمارے لوگ زیادہ پسند کرتے ہیں، اس لئے ایک کہاوت ہے کہ ''ناڻو اھو جو ڳنڍين ۾ ٻاڌي اھا جا ڪنڍين'' یعنی پیسہ وہ جو گانٹھ میں بندھا ہوا ہو، اور بانی وہ جو بر زبان یاد ہو۔ پہلے گروکلوں میں ویدوں کی رچائیں یاد کرانے کی ترتیب ہی ایسی ہوا کرتی تھی، جو کوئی بھی ان رچاؤں کو بھلا نہیں سکتا تھا۔ جس طرح عربی بحر اور وزن پر بنے ہوئے شعر کی تقطیع (Scansion) کرنے سے جلدی میں سمجھا سکتا ہے کہ وزن صحیح ہے یا نہیں، اسی طرح قدیم ہندو ''پدپتھ'' ۔۔ (Padapatha or Word text) کے وسیلہ سے ایک ایک رکن تہجی کی چکاس کر سکتے تھے، اور ''سمہتا پتھ'' (Samhita - patha or Continuous Text) کی ترتیب ہونے کی وجہ سے ہر ایک غلطی درست کر سکتے تھے۔ پروفیسر ریپسن، جس نے قدیم ہندستان کی مختصر تاریخ مرتب کی ہے، اور ''کیمبرج ہسٹری آف انڈیا'' تالیف کی ہے، اس نے

قدیم لوگوں کے حیرت انگیز قوتِ حافظہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ آج بھی اگر سارے دستخط اور شایع شدہ وید گم ہو جائیں، تو بھی ایسے پنڈت موجود ہیں، جو تمام رچائیں بلکل پورے طور پر برزبان پڑھ لیں گے۔[1]

ویدوں کے منتروں کی تقسیم: مہا بھارت میں درج ہے کہ اوائل میں وید فقط ایک تھا، لیکن بعد میں لوگوں کی عمر اور طاقت کے مدنظر چار وید ہوئے: رگ وید، یجر وید، سام وید اور اتھرو وید۔ مہا بھارت اور رگ وید میں سے یوں بھی معلوم ہوتا ہے کہ رگ وید کے موجودہ پرانوں منتروں سے بھی کچھ قدیم منتر تھے جو ''نِوِدْ''، ''نِگَدْ'' اور ''آھاب'' کہلاتے تھے، اور یہ کہنہ منتر بڑے سیلاب کے دوراں غائب ہو گئے تھے، اور پھر بعد میں جس قدر رشیوں کو ویدوں کے منتر یار پڑے، اس قدر انہوں نے انہیں قلمبند کیا، تو بھی کئی پرانے منتر آج تک عدم موجود ہیں۔ ویدوں کے منتروں کو باترتیب مقرر کرنے کا کام جدا جدا زمانوں میں جدا جدا لوگوں نے کیا، اور وہ سب ''ویاس'' یعنی مؤلف (Compilers) کہلاتے ہیں۔ وشنو پران (۳،۴) موجب جملے ۲۸ ویاس گزر چکے ہیں، جن میں سے آخری ''کرشن دویپاین'' تھا۔

مہا بھارت میں لکھا ہوا ہے کہ پاراشر رشی کو ستیہ وتی نامی ایک میر بحر کی بیٹی سے کسی جزیرہ پر پیدا ہوا تھا، اس لئے وہ ''دویپاین'' یعنی ''دویپ (جزیرہ) پر پیدا شدہ'' کہلاتا تھا۔ یہ بچہ شکل میں ''کرشن'' یعنی سانولا تھا، اس لئے وہ ''کرشن دویپاین'' کہلاتا تھا۔ مہا بھارت والے زمانے میں موجودہ امبالے ضلع میں ''کرکھیتر'' نامی ایک ایک بڑا کھیتر (کھیٹ) تھا، جس کے نزدیک ''کھانڈو پرست'' نامی ایک بڑا اور گھنا جنگل تھا۔ پانڈون کے بیچ والے بھائی ارجن سری کرشن کی مدد سے اس بن کو آگ لگوا کر بلکل میدان کر دیا۔ اس کے بعد اس کرشن دویپاین ویدوں کے منتر باترتیب مقرر کئے تھے، اس لئے ''وید ویاس'' یعنی ویدوں کا مؤلف اس کے اوپر نام پڑا۔ مطلب یہ کہ وید اصل میں ایک ہی ہے، اور بعد میں ان منتروں کو منقسم کر کے، انہیں با

(1) "If all the manuscripts and all the printed copies were destroyed its text could now be recovered from the mouths of living men with absolute fidelity as to the form and accent of every single word. Such a tradition has only been possible through the wonderfully perfect organization of a system of schools of vedic study in which untold generation of students have spent their lives from boyhood to old age in learning the sacred texts and in teaching them to their pupils. This is, beyond all question, the most marvelous instance of unbroken inarvel increases when we consider that this extra ordinary continuity to be found in the history of mankind; and the human memory has been concerned rather with the minutely accurate preservation of the forms of words than with the transmission of their meaning."

ترتیب مقرر کر کے چار وید بنائے گئے، لیکن ان سب میں وہ ہی روحانی علم ہے، جو قدیم رشیوں نے خدا سے سنا، اس لئے قدیم زمانے سے لے کر سارے ہندستان کے ہندو یوں ہی کہتے آئے ہیں کہ وید ''اپورشیہ'' ہیں یعنی کسی بھی آدمی کے بنائے ہوئے نہیں ہیں (بلکہ خدا کی باتیں ہیں)، اور وہ ''آنادی'' ہیں، یعنی جن کی آد یا شروعات ہے ہی نہیں، اور ''نیتہ'' (ہمیشہ) ہیں (Existing in all eternity)، جس طرح اوپر پہلے ہی کہا جا چکا ہے۔

ویدوں کے حصے۔ سنہتا اور براہمن: ہر ایک وید کے دو حصے ہیں: ایک ''سنہتا'' اور دوسرا براہمن۔ ویدوں کے سنہتا والے حصے میں منتر جمع شدہ ہیں، اس لئے ویدک زمانے کو عام طور پر ''منتروں والا زمانہ'' (The Age of Mantras) کہا جاتا ہے۔ ہر ایک وید کے منتر پڑھنے کا نمونہ نرالہ ہے، اور ان کی بناوٹ بھی ایک دوسرے سے مختلف ہے، اس لئے ہر ایک وید کے لئے ''منتر'' لفظ الگ الگ معناؤں میں استعمال ہوتا ہے۔

''منتر'' کو ''رچا'' تب کہا جاتا ہے، جب وہ وزن پر بنا ہوا ہوتا ہے، اور اُونچی آواز سے پڑھنا پڑتا ہے۔ اس طرح کی رچائیں رگ وید میں ہیں۔

''منتر'' کو ''یجس'' (Sacrificial hymn) اس وقت کہا جاتا ہے، جب وہ نثر میں ہوتا ہے، اور اس کا صرف ورد کیا جاتا ہے یعنی فقط ہونٹوں میں پڑھا جاتا ہے۔ اس طرح کے منتر یجر وید میں ہیں۔ ''یجر'' اور ''یجس'' دونوں کے معنی ہیں ''یگیہ''۔

منتر کو ''سامن'' (Psalms) اس وقت کہا جاتا ہے، جب وہ وزن پر تشکیل کردہ ہو، لیکن ترنم کے ساتھ پڑھا جاتا ہے، یا جھاڑ جھپڑ کے وقت پھونکا جاتا ہے۔ اس طرح کے منتر سام وید میں ہیں۔ اوائل میں اہم منتر صرف ان تین ویدوں کے سمجھے جاتے تھے۔

ہر ایک وید کے پہلے حصے میں یہ جدا جدا قسم کے منتر جمع شدہ ہیں، اس لئے یہ حصہ ''سنہتا'' (Collection) کہلاتا ہے۔ ان منتروں میں سے کوئی کوئی نثر میں پرارتھناؤں کی طرز پر ہیں، ورنہ ہر ایک وید کا پہلا حصہ اکثر نظم کی صورت میں ہے۔ اس نظم کے اوزان (Measures) ہیں، جن میں سے سات اوزان اگن دیوتا کے ''ست مکھ'' کہلاتے ہیں: گایتری، ترشٹپ (Trishtap)، جگتی وغیرہ اوزانوں کے نام ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قدیم وادئ سندھ کے باشندے جب قطب شمالی کی طرف میرو پربت پر رہتے تھے، اسی دور ہی میں وہ علم عروض اور موسیقی میں اچھی خاصی ترقی کر چکے تھے، اور ان سے پہلے کسی دوسری قوم کو ان علوم کا کچھ پتہ تک نہیں تھا۔

ہر ایک وید کے منتروں کو پڑھنے میں اہم فرق ''سُور'' (سُر) (Suara or Musical accent) کا ہے۔ جیسا کہ ویدوں کے منتر پڑھنے کا دستور ترنم میں پڑھنا ہے، تو مصنف نے کسی پنڈت سے کہا کہ چاروں ویدوں کے کچھ کچھ منتر پڑھ کر سناؤ، تاکہ سُور (سُر) کا پتہ چل سکے۔ اس نے رگ وید کا سُر حلق سے اتنی بھری ہوئی سانس سے نکالا، اور ایک ہی سانس میں آواز کو یوں اوپر کھینچتا چلا گیا، کہ مجھے یقین ہوگیا کہ جس کی چھاتی کمزور ہوگی، وہ اس طرح کی بھری سانس میں پوری طرح نہیں پڑھ سکے گا، اور اگر کرے گا بھی، تو جلد ہی اس کی سانس پھول جائے گی۔ رگ وید کے منتر پڑھنے کو وقت بڑی حد تک سانس کو روکنا بھی پڑتا ہے، اس لئے یہ سُر نہایت مشکل ہے۔ پنڈت نے خود بھی کہا کہ پہلے لوگ برہمچاری بن کر رہتے تھے، اور جسم ان کے طاقتور ہوتے تھے، اس لئے یہ مشکل سُر آسانی کے ساتھ گا سکتے تھے۔ دوسرے ویدوں کے منتروں کو پڑھنے کے وقت چھاتی کی طاقت بھی بہت درکار ہوتی ہے۔

جدا جدا ویدوں کے منتر پڑھنے کے وقت پنڈت تال بھی الگ الگ طرح لینے لگا۔ رگ وید کے منتر پڑھنے کے وقت ہاتھ اس طرح اوپر سر پر رکھا، کہ گویا کہ ملٹری سیلوٹ کر رہا ہو، اور پھر جلدی ہی ہاتھ نیچے کرلیا۔ یجر وید کے منتر پڑھنے کے وقت وہ پنڈت اپنا ہاتھ ناگ کے پھن کی طرح ہلانے لگا۔ سام وید کا سُر سنانے کے وقت اپنے ہاتھوں کی انگلیاں ہلانے لگا۔ اتھرو وید کا سُر سنانے کے وقت زبان سے پڑھ رہا تھا اور اُس وقت اپنا سر بھی ہلا رہا تھا۔ مطلب یہ کہ ویدک زمانے میں ہی قدیم آریہ لوگ گائکی میں ماہر تھے، جس وجہ سے سُر اور تال کا پتہ انہیں ہوتا تھا۔ چھاتی بھی ان کی بلکل مضبوط ہوتی تھی، جس وجہ سے بھرے ہوئے سانس سے سُر کو اوپر لے جانا اور پھر وہیں پر سانس کو روکنا ان کے لئے آسان ہوتا تھا۔

ہر ایک وید کے منتروں کو پڑھنے کا کام کن خاص پروہتوں پر رکھا ہوا ہوتا تھا۔ یگیہ کے وقت رگ وید کے منتر، جو پروہت پڑھتا تھا، اُسے ''ہوتری'' (Invoking Priest) کہلاتا تھا۔ یجر وید کے منتر، جو پروہت پڑھتا تھا، اُسے ''ادھوریو'' (Adhvaryu) کہتے تھے۔ یہ ادھوریو پوجا کے لئے زمین کا ٹکڑا ناپ کر قربان گاھ (Altar) بناتے تھے۔ یگیہ کے لئے برتن اپنے ہاتھوں سے ترتیب سے رکھتے تھے۔ پوجا کے لئے پانی، اور یگیہ کی اگنی کے لئے لکڑیاں خود لاتے تھے۔ یگیہ کے وقت جو جانور کو قربانی پر چڑھانا ہوتا تھا، اُسے بھی خود لے آتے تھے، اور وہ اپنے ہاتھوں سے ذبح بھی خود کرتے تھے۔ مطلب یہ کہ یگیوں کے لئے، جو بھی محنت ہاتھوں سے کرنا ہوتی تھی، وہ ساری محنت پروہت خود کرتے تھے۔

سام وید کے ''سامن'' جو دیوتاؤں کو سوم رس کے چڑھاوے وقت گاتے تھے۔ اس پروہت کو ''اُدگات'' (Sengeing Preiest) کہا جاتا تھا۔

جو یگیہ کروانے والا تینوں ویدوں کے منتروں کا جاننے والا ہوتا تھا، وہ ''براہمن'' کہلاتا تھا (ستپتھ براہمن، ۹، ۵، ۸، ۱)۔ یاسک منی کی بنائی ہوئی ''نرکت'' (۷، ۵) موجب ہوتری، ادھوریو، براہمن اور اُدگات ایک ہی شخص کے نام ہوتے تھے، اور جس وقت جو یگیہ کرواتا تھا، وہ اس وقت اس نام سے کہلاتا تھا۔

ویدوں کا مضموں: ہر ایک وید کا مختصر ذکر یہاں الگ الگ کیا جاتا ہے، تاکہ سمجھ میں آئے کہ ہر ایک میں کیا کیا مضموں شامل ہے:

رگ وید: رگ وید میں ''رگ'' (رک یا رچ) یعنی ''رچائیں'' (Hymns) ہیں، اس لئے یہ نام اس پر پڑا ہے۔ پورا رگ وید دس منڈلوں (حصوں) یا آٹھ اشٹکوں میں منقسم ہے۔ ہر ایک منڈل میں ''سُوکت'' (س + اُکت) (Laudations) ہیں؛ اور ہر ایک سُوکت میں ''رچائیں'' (Hymns) ہیں، جنہیں منتر بھی کہا جاتا ہے۔ ان رچاؤں میں دیوتاؤں کی تعریف، یگین کی ودھی (Formula)، خدا کی اپاسنا اور اس کی پراپتی کے سادھن ہیں، اور خدا کی سوکھیم سروپ اور انسانیت کے اعلیٰ اور پاک تصورات کا ذکر ہے۔ رگ وید میں کچھ ''دان اُستتیاں'' (سخا کی تعریفیں)، ''ندی اُستتی'' (دریاؤں کی تعریفیں) اور ایک ''جواری کے ارمان'' کا بھی تذکرہ ہے۔ دیوتاؤں کی تعریف کرتے ہوئے قدیم رشیوں نے کس طرح شاعرانہ انداز میں اپنایا ہے، اس کا نمونہ اگنی دیوتا اور اُشا دیوی (Dawn) کا ذکر کرتے ہوئے درج کیا گیا ہے۔

پورا وید ایک مذہبی کتاب ہے، لیکن اس میں کئی ملکی، سماجی اور تہذیبی باتیں تشبیہ کے طور پر یا اور طرح سے درج ہیں، اس لئے اس میں سے تاریخ مرتب کرنے کے لئے بڑا مواد ہاتھ لگ جاتا ہے۔ رگ وید کی پرانے سے پرانی رچائیں منڈل دوسرے سے لے کر ساتویں تک ہیں، اور وہ وشوامتر، وامدیو، اَتری، بھردواج اور وسشٹ منی کے منہ سے ظاہر ہوئی تھیں۔

یجر وید: یجر وید میں یگین کے ودھیوں کا رگ وید سے بھی زیادہ وستار ہے۔ ''یجر'' یا ''یجس'' کے معنی ہی ہیں ''یگیہ کی پرارتھنا یا ودھی'' (Sacrificial Prayer or Formula)۔ یجر وید کے آدھے منتر نظم میں اور آدھے نثر میں ہیں۔ یہ پہلے شاید ملے جلے تھے، جنہیں بعد میں الگ الگ کیا گیا ہے۔ اس وقت یجر وید کے دو وبھاگ ہیں، جس میں سے ایک سشکل (White) یجر وید یا ''واجسنیئی سنہتا'' کہلاتا ہے۔ یاجنولکیہ (یاگیولک) رشی کا دوسرا نام ''واجسنیئن'' (Vajasneyin) تھا، اور سشکل یجر وید کے منتر اس کے منہ سے ظاہر ہوئے تھے، اس لئے یہ اس کے نام پیچھے کہلاتا ہے۔ دوسرا ''کرشن'' (Black) یجر وید ہے، اس میں درج یگیہ پر ودھیوں

سے متعلق قدیم آریوں کے علحدہ علحدہ اصول ہیں، جن کا پتنجلی رشی نے اپنی مرتب کردہ سنسکرت گریمر میں تذکرہ کیا ہے۔ ان الگ الگ متوں والوں کے نام پیچھے کرنے سے یجر وید کے ''سنہتا'' (Collection) پر علحدہ علحدہ نام رکھے ہوئے ہیں، جس میں سے دو اہم ''کاتھک سنہتا''، ''منتر یائی سنہتا'' اور ''تر تیبہ سنہتا'' ہیں۔ شالی ہندستان میں سشکل یجر وید اور جنوبی ہندستان میں کرشن یجر وید کے ابیاسی بہت ہیں۔

سشکل یجر وید اور کرشن یجر وید میں اہم فرق یہ ہے کہ پہلے میں فقط ''ببجس'' یعنی یگین کی ودھیاں ہیں، اور دوسرے میں منتروں کے ساتھ ان کی تشریح بھی موجود ہے، جو نثر میں لکھی ہوئی ہے، اور یہ درحقیقت براہمن والے حصے میں شامل کرنی چاہئے تھی، اسی سبب اوپر پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ یجر وید کے آدھے جتنے منتر نظم میں اور آدھے جتنے منتر نثر میں ہیں۔ سشکل یجر وید میں کچھ منتر لفظ بہ لفظ رگوید اور اتھروید والے ہیں۔ قادر اور قدرت بابت اس میں سوکھم ویچار نہایت عمدہ اور باریک بینی سے ظاہر کئے گئے ہیں، اس لئے رگ وید کے بعد یہ دوسرے نمبر پر سمجھا جاتا ہے۔

سام وید: سام وید میں خدا کی تعریف اور سوم یگیہ سے متعلق ''سام'' (Psalms) ہیں، جو زیادہ تر رگ وید سے لئے ہوئے ہیں، اس لئے رگ وید سے زیادہ تاریخی احوال اس میں سے نہیں ملتا، البتہ ہندی راگ کی تاریخ اس سے ملتی ہے۔

''سام'' کے لفظی معنی ہی ہیں ''سامت میں لانے والا''، ''سانت دینے والا، دل ٹھنڈا کرنے والا''۔ سام وید کے منتر دل کو سکون اور روح کو راحت دیتے ہیں، اس لئے ان پر یہ نام رکھا گیا ہے۔ یہ منتر جنہیں پروہت پڑھتے تھے، وہ ''اُدھ گھات'' کہلاتے تھے، اور ان کی میٹھی للکار سننے والوں کی قلبی سکوں مہیا کر دیتی تھی۔ لگتا ہے کہ بھجن گانے کا شوق ہمارے لوگوں میں سام وید کے وقت سے بڑھا۔

اتھرو وید: یہ وید اتھرون نامی ایک رشی کے نام پیچھے سمجھا جاتا ہے۔ اس رشی نے ''اتھرون'' یعنی آگ جلانے کا ہنر جاری کیا تھا، اس لئے اس پر یہ نام پڑا۔ اتھرو وید میں چند سُوکت نثر میں ہیں، لیکن کچھ رچائیں وہی رگ وید والیاں ہیں، اس لئے اس میں برہمن گیان کی باتیں ہیں۔ پیدائش سے لے کر موت تک جو جو سنسار کرنا ہیں، ان کا خواہ راجاؤں کی تاجپوشی کا احوال بھی اس میں ہے۔ اس میں ٹونے پھینے اور جھاڑ جھپ کا بھی تذکرہ ہے۔ کئی منتر جنوں، بھوتوں اور دائنوں کے اثر کو توڑنے، دشمن دفع کرنے اور دیگر دنیوی مرادیں پانے سے متعلق ہیں، اس لئے

کوٹلیہ کے ارتھ شاستر (Political Economy) تصنیف ہونے کے وقت یعنی ۳۲۰ سال ق-م تک وید فقط تین شمار ہوتے تھے، اور وہ ''تریئی'' (Trayee) اور ''تریودیا'' (The threefold Veda or Knowledge Traividiya) کہلاتے تھے، اور اتھرو وید بعد میں ویدوں کے زمرے میں شمار ہونے لگا۔

کئی علماء کا کہنا ہے کہ جنوں بھوتوں کے اثر، ٹونے ٹیکنے، جھاڑ جھپ، توہمات اور سوسون اور بھرمون کی باتیں قدیم دراوڑوں میں زوروں پر تھیں، جن کا بعد میں آریوں پر اثر ہوا، جس وجہ سے اتھرو وید میں اس طرح کی باتوں کو جگہ ملی۔ بہر حال قدیم لوگوں کی اوائلی حالت اور منورتی کے سمجھنے کے لئے اتھرو وید بلکل مفید ہے۔

منتر پڑھنے کا مقصد: انسانی فطرت جیسی آج ہے پہلے بھی تھی۔ اس وقت کئی لوگ پاٹھ پوجا، بھگتی اور شیوا اکثر اس لئے کرتے ہیں کہ ان کی دلی مرادیں پوری ہوں۔ کوئی خدا سے سوال کرتا ہے کہ ''مجھے بیٹا عطا کر، تکلیفیں دور کر، قرضے سے نجات دینا، فلاں فلاں تشویش سے چھڑانا وغیرہ''۔ قدیم آریہ لوگ بھی یہی کرتے تھے۔ یہ باتیں ویدک ادب میں واضح طور پر درج ہیں۔ مثلاً ویدوں کے منتر اس لئے پڑھتے تھے کہ:

۱- سوٗ برسوں تک زندہ رہیں، اور بیٹوں کی اولاد اپنی آنکھوں سے دیکھیں (رگ وید، منڈل پانچواں، ۱، ۸۹)۔
۲- ہر قسم کے خوف خطرے اور مصیبت سے بچیں (اتھرو وید، ۱۹، ۷)۔
۳- اوسر یا قحط نہ ہو (رگ وید، منڈل ۵، ۶۸)
۴- فصلیں اچھی ہوں (اتھرو وید، منڈل ۶، ۱۴۲)۔
۵- جو جنگ جوتیں، اس میں فتحیاب ہوں (رگ وید، منڈل پہلا، ۱۰۰، اور دوسرا، ۳۰)
۶- دلی سب مرادیں پوری ہوں (اتھرو وید، ۱۵، ۹)۔

کسی کو آسیب یا کوئی اور جن بھوت پکڑ لیتا تھا، یا کوئی اور طرح کی بیماری ہو جاتی تھی، تو اس کے لئے بھی منتر پڑھتے تھے (اتھرو وید، منڈل تیسرا، ۳۱، اور منڈل پانچواں، ۵، ۲۲)۔ میاں بیوی کی آپس میں صلح ہو جائے۔ روٹھے ہوئے دوستوں کی آپس میں بن جائے، دلپسند بیوی مل جائے، جس کام میں ہاتھ ڈالیں، اس کام میں فتح یقینی ہو وغیرہ، ان کے لئے منتر پڑھتے تھے (رگ وید، منڈل نواں، ۶۷، ۹-۱۱، اور اتھرو وید، منڈل ۳، ۴، ۵ اور ۶)۔

قدیم لوگوں نے بعد میں محسوس کیا کہ یہ ہے خدا سے سودے بازی کرنا، یعنی اے خدا، ہم تمہاری عبادت کرتے ہیں، اور ان کے عوض ہمیں فلاں فلاں نعمتیں عطا کر۔ یہ سوداگری کا خیال

ترک کر کے، پھر نشکام بھگتی کرنے لگے، کیونکہ وہ سمجھ رہے تھے کہ پریم بھگتی کے علاوہ کوئی اور بھگتی ہے ہی نہیں۔

ویدوں کے براہمن: ویدوں کا دوسرا حصہ ''براہمن'' کہلاتا ہے۔ ویدوں کے منتر نہایت قدیم ہیں، اور براہمن گرنتھ بعد کے ہیں۔ ان میں منتروں کی وضاحت، یگین کے ودھیوں کی بنیاد، اور یگین کا اندرونی مطلب نثر میں سمجھایا گیا ہے، اس لئے ویدوں کے منتروں والے حصے (سنہتا) سے وہ علحدہ ہیں، لیکن وہ بھی شرتین کے ذمرے میں شمار ہوتے ہیں۔ ہر ایک وید کے آخر میں الگ الگ براہمن گرنتھ ہیں، اور وہ ویدک ادب کا حصہ شمار ہوتے ہیں۔ بالالفاظ دیگر یوں کہیں گے کہ براہمن گرنتھ ''فقہ کی کتب'' (Theological Works) ہیں، جن میں برہم گیان اور قدیم براہمنوں کی فلسفہ سمایا ہوا ہے، اسی ہی وجہ سے انہیں ''براہمن گرنتھ'' کہا جاتا ہے۔

براہمن گرنتھوں سے کوئی بھی تاریخی احوال سیدھی طرح نہیں ملتا، لیکن یگین کے ودھیوں کی بنیاد سے متعلق جو کہانیاں ان میں ہیں، ان میں سے اس وقت کے لوگوں کے کئی رسم و رواج کا پتہ چلتا ہے، اس لئے تاریخ مرتب کرنے میں براہمن گرنتھ بھی کچھ مدد کرتے ہیں۔

آرنیک اور اُپنشد: ویدوں کے براہمنوں والے دو حصے ہیں: ایک ''آرنیک'' اور دوسرا ''اُپنشد''۔ ''آرنیک'' لفظ کے معنی ہی ہیں ''ارن یا بن کے پستک'' (Forest books)۔ قدیم رشی اور کئی راجا خواہ دیگر، پچیس برس مسلسل بن میں رہ کر، خدا یاد کرتے تھے، اور سارے سنسار، جیو آتما اور پرماتما سے متعلق غور وفکر کرتے تھے۔ ان کے یہ گہرے خیالات، جن میں اعلیٰ قسم کا فلسفہ پنہاں ہے، وہ آرنیکوں میں دیے گئے ہیں۔

آرنیکوں کے علاوہ اُپنشد بھی ہیں، جن میں سے کچھ براہمن گرنتھوں کے آخر میں دیئے گئے ہیں، تو کچھ الگ کتابی صورت میں ہیں، لیکن وہ بھی براہمن کا حصہ ہیں، اس لئے ویدک ادب میں شمار ہوتے ہیں۔ اُپنشدوں میں اکثر گرو اور چیلے کے درمیان برہم گیان اور آتم گیان کے گہرے فلسفہ سے متعلق گفتگو ہے۔ اسی سبب کئی یورپی علماء کا کہنا ہے کہ ''اپنشد'' لفظ میں ''اُپ'' معنیٰ ''قریب''، ''نی'' معنیٰ ''نیچے'' اور ''شد'' معنیٰ ''بیٹھنا'': مطلب یہ کہ گرو کے قریب جا کر، اس کے چرنوں کے سامنے بیٹھ کر، جو تعلیم حاصل کی جائے اُسے ''اُپنشد'' کہا جاتا ہے۔

''اُپنشدوں'' کو ''ویدانت'' بھی کہا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ ویدوں کے آخر میں دئے گئے ہیں، اس لئے ان پر یہی نام پڑا ہے۔ عام طور پر جسے ''ویدانت'' (مت) کہا جاتا ہے، اس کے معنی کیے جاتے ہیں ''وید کی انتہا'' یعنی کہ ویدانت سے اوپر کوئی علم ہے ہی نہیں، اور یہی برہمن گیان کی آخرین حد ہے۔

اہم براہمن گرنتھ اور اہم اُپنشد: اوپر پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ ہر ایک وید کے آخر میں الگ الگ براہمن گرنتھ ہیں، اور ان گرنتھوں کے آخر میں آرنیک اور اُپنشد ہیں۔ ان میں سے جو اہم ہیں وہ یہ ہیں:

۱- رگ وید کے آخر میں دو براہمن گرنتھ ہیں: ایک ''ائتر یہ براہمن'' (مہیداس ائرتیہ کا مرتب کردہ)، دوسرا، ''کوشیتکی یا شانکاین براہمن''۔ ان میں گہرے فلسفے کے ساتھ ساتھ سوم جڑی بوٹی اور یگیہ اور دوسرے بڑے یگیہ جو راجا کرتے تھے، ان کا تذکرہ ہے۔ ائتر یہ براہمن کے آخر میں جو آرنیک اور اُپنشد ہیں، وہ بھی ان ہی ناموں پیچھے ''ائتر یہ آرنیک'' اور ''ائتر یہ اُپنشد'' کہلاتے ہیں۔ کوشیتکی براہمن کے آخر میں کوشیتکی آرنیک ہے، جس کا ایک حصہ کوشیتکی اُپنشد کہلاتا ہے۔

۲- یجر وید کے دو بھاگ ہیں۔ شکل یجر وید ''واجسنئی سنہتا'' کے آخر میں شتپتھ براہمن دیے گئے ہیں، جو تمام براہمن گرنتھوں میں اہم ہیں۔ قدیم رشیوں کے فقہ اور فلسفہ، اور دیگر گہری باتوں خواہ رسم و رواجوں کا اس سے زیادہ پتہ چلتا ہے۔ شتپتھ براہمن کے چودویں باب کا پہلا حصہ آرنیک ہے، اور اس کے آخری حصے میں معروف براہدارنیک اُپنشد ہے۔ واجسنئی سنہتا کے آخر میں ''اِیش'' اپنشد ہے۔

(الف) کرشن یجر وید کے سنہتا میں کاٹھک سنہتا، کپشٹھل کٹھ (Kapishthala - Katha) سنہتا، منتریانی سنہتا اور تئتر یہ سنہتا ہیں، اور آخر میں دیے ہوئے تئتر یہ براہمن تئتر یہ سنہتا کا حصہ ہے۔ تئتر یہ براہمن کے آخر میں تئتر یہ آرنیک اور ان کے آخر میں تئتر یہ اپنشد ہے۔

۳- سام وید کے آخر میں تاندیہ مہا براہمن ہے، جس میں ''وراتیہ ستوم'' (Vratystoma) کا تذکرہ ہے۔ یہ گویا کہ شدھی کرنے کے لئے ایک یگیہ ہوتا ہے، جس کا مزید تذکرہ بعد میں کیا جائے گا۔ اس کے آخر میں چھاندگیہ اپنشد، کین اپنشد اور دیگر اپنشد ہیں۔ چھاندگیہ کا پہلا حصہ آرنیک ہے۔

۴- اتھرو وید کے ساتھ کوئی قدیم براہمن گرنتھ نہیں ہے، لیکن ''گوپتھ براہمنہ'' اس کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ منڈک اپنشد، پرشن (Prasna) اپنشد اور مانڈوکیہ اپنشد اتھرو وید میں ہیں۔

اُپوید (Subsidiary Vedas): چار ویدوں کے علاوہ چار اُپوید ہیں۔ یہ بھی ویدوں کے زمری میں آتے ہیں اس لئے ویدک ادب میں شمار ہوتے ہیں، لیکن شریتوں کے طور پر شمار نہیں ہوتے، کیونکہ وہ آدمیوں کے مرتب کردہ ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا تعلق دنیوی امور سے ہے، اس لئے ویدوں سے ان کا درجہ کم سمجھا جاتا ہے۔ ''اُپوید'' کے لفظی معنی ہی ہیں ''کم درجے والا علم'' (Inferior Knowledge)۔ اتنا ضرور ہے کہ ان اُپویدوں سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ قدیم ویدک زمانے میں ہی قدیم مقامات پر کتنی دنیوی علوم میں ترقی ہوئی تھی۔ وہ عدم یہ ہیں:

۱- رگ وید کا اُپوید ''ایوُر وید'' (Medical Science) ہے، جس میں چرک، ششرت، واکھبٹ وغیرہ گرنتھ ہیں۔ ان میں جسمانی طاقت، بیماریوں کو روکنے اور مرضوں سے نجات پانے کی تدابیر بتائی گئی ہیں۔ اس طرح طب کی کتابیں لکھنے کا رواج اول آریوں نے جاری کیا، اوپر پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ رگ وید والے زمانے میں ہی وادیٔ سندھ میں جراح، طبیب اور حاذق حکیم ہوا کرتے تھے۔ آج کل سندھ اگرچہ یونانی حکماء بھی ہیں، پھر بھی ہمارے سندھی وَندیہ (ویج) اپنے آباء اجداد والی حکمت تا حال اچھی طرح چلا رہے ہیں۔ یوں بھی دیکھا گیا ہے کہ ہمارے کئی لوگ انگریزی ادویات کے بجائے یونانی اور آیورویدک علاج زیادہ پسند کرتے ہیں، جس وجہ سے طبی ٹوٹکے سنانے والوں کی قدر سندھ میں آج تک ہے۔

۲- یجر وید کا اُپوید ''دھنر وید'' (Military Science) ہے۔ قدیم وادیٔ سندھ کے باشندے جنگی خاصیت والے تھے، انہوں نے اس سائنس کو ترقی دلائی، لیکن اب کے زمانے میں یہ خیال ہمارے لوگوں میں سے نکل گیا، جس کا نتیجہ آج بھی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔

۳- سام وید کا اپوید ''گندھرو وید'' (Music) ہے، جس کے دو حصے ہیں: ایک لوگوں کا دل بہلانے کے لئے، جس میں راگ اور راگنیاں تھیں، اور دوسرے میں ویدک راگ اور ویدوں کے سُر دئے گئے تھے۔ اس طرح گاین ودیا قدیم زمانے میں ہی وادیٔ سندھ میں، خصوصاً پنجاب میں زور پکڑا، جس وجہ سے آج تک ایک ضرب المثل ہے کہ ''راگ پنجاب میں پیدا ہوا، اور تھر میں جا کر مرا''۔ اس وقت گائن ودیا میں زیادہ دلچسپی سرحدی سندھ میں، خصوصاً شوقین شہر شکارپور میں ہے۔

۴- اتھرو وید کا اُپوید ''استھاپیہ وید'' (Mechanics) ہے، جس میں شِلپ (کاریگری) اور کلا (ہنر) کی تعلیم تھی۔ لکڑی کا کام، کاشی کا کام، جڑت جڑنا، بھرت بھرنا، لونگیاں اور

کھیس بنانا اور دیگر ہنر سندھ میں زوروں پر تھے۔ حیدرآباد میں خاتو بندوں کا محلہ آج تک ہے۔ آیور وید کے علاوہ دیگر سارے علوم زیادہ تر غائب ہو گئے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ دنیا میں لوگ بہت ساری کتابیں لکھتے ہیں، جن میں سے کئی زیادہ وقت چلتی ہیں، تو کچھ کا تھوڑے ہی عرصے بعد نام و نشان ہی مٹ جاتا ہے۔ کتاب کے تھوڑے یا زیادہ چلنے کا دارومدار اس کے مضمون اور لوگوں کی قدرشناسی پر ہے۔ کچھ اوپیدوں کی لوگوں نے بعد میں زیادہ قدر نہیں کی، تو وہ گم ہوگئیں، لیکن دوسرا قدیم ادب ہنوز سلامت ہے۔ ہندوؤں کے ویدوں، اتہاسوں اور پرانوں میں ایسا تو مواد جمع شدہ ہے، جو زمانوں سے وہ جیتے آ رہے ہیں، اور جب تک ہندو ذات زندہ ہے، تب تک یہ کہیں جانے کے نہیں ہیں۔ ساری ہندو ذات کو اپنے ان مذہبی پستکوں کے لئے بڑی عزت اور بڑا فخر ہے، اور کئی غیر قومیں بھی ان کی طرف عزت سے نگاہ کرتی ہیں۔ اُپنشدن کا ترجمہ فارسی میں ہوا، اور اس پر سے لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا، تو سکوپن ہور (Schopenhaver) نامی ایک فلاسافر اپنشدوں کے فلسفے کا مطالعہ کرکے، بے اختیار مندرجہ ذیل الفاظ کہے:

"In the whole world there is no study, except that of the originals, so beneficial and so elevating as that of the Oupnakht (Upnishad). It has been the solace of my life, it will be the solace of my death." sacred Books of the East Vol. I, P. LXI.

اپنشدوں سے متعلق پروفیسر مکس ملر نے بھی اس رائے کا اظہار کیا ہے:

"The earliest of these Philosophical.. will always maintain a place in the literature of the world, among the most astounding productions of the human mind in any age and in any country" (Sacred Books of the East, Vol. I, P. LXVII)

پانچواں وید- اتہاس اور پران: پہلے اتہاسوں اور پرانوں کو اکٹھے "پانچواں وید" کہتے تھے۔ بعد میں مہا بھارت پر یہ نام پڑا۔ سچ مچ یہ اتہاس ہی ہے، لیکن اس سے مذہب، نیتی اور دیگر امور کا پتہ چلتا ہے۔ ایک ضرب المثل ہے کہ "جو کچھ مہا بھارت میں نہیں ہے، وہ بھارت میں نہیں"، یعنی برصغیر ہند کی ساری اہم باتیں مہا بھارت میں موجود ہیں۔ یہ ایک بڑا بھنڈار ہے،

اس لئے اسے پانچواں وید شمار کیا جاتا ہے۔ اس میں تاریخی احوال بھی بہت ہیں، اس لئے قدیم ہندستان کی تاریخ مرتب کرنے کے لئے علماء نے اس میں سے بڑا ذخیرہ نکالا ہے۔

اتہاس: ''اتہاس'' کے لفظی معنی ہیں ''ایسا ہوا ہے'' (So it has been)۔[1] ہندوؤں کے دو اہم اتہاس رامائن اور مہا بھارت ہیں، لیکن پہلے ''اتہاس'' کے بڑے معنی ہوتے تھے۔ کوٹلیہ کے ارتھ شاستروں سے معلوم ہوتا ہے کہ پران، اِتیورت (Itivritta)، تاریخ (History)، اُدھرن (Illustrative Udharana Stories)، دھرم شاستر اور ارتھ شاستر (Science of Wealth i.e. Political Economy) ان سب کو اکٹھے ''اتہاس'' کہتے تھے، اور شمالی ہندستان کا ہر ایک راجکمار اتہاسوں کا مطالعہ کرتا تھا۔

پران: ''پران'' لفظ کے معنی ہی ہیں پرانی کہانی (Ancient lore)۔ اسی سبب سے دنیا کی کسی بھی کہنہ کہانی کو ''پران'' کہا جا سکے، لیکن ہندو اپنی ان کہنہ مذہبی پستکوں کو پران کہتے ہیں، جن میں ١- ''سرگ'' یعنی دنیا کی پیدائش، ٢- ''پرتیسرگ'' (Pratisarga) یعنی بڑا سیلاب اور دنیا کی از سرنو پیدائش، اور ٣- مہونتروں یعنی زمانوں کے احوال ہیں۔ ان کے علاوہ ان میں ۴- اور ۵- دیوتاؤں کا ذکر اور رشیوں اور راجاؤں کے کارنامے اور ان کے شجرے ہیں۔ ہر ایک پران کی یہ پانچ خصوصیات ہیں، اس لئے پرانوں کو ''پنچ لکشن'' (پانچ خوبیاں) بھی کہا گیا ہے۔

اہم پران اٹھارہ ہیں:

برهم، پسدم، وشنو، شو ۽ ڀاڳوت،
نارد، مارڪنديه اگني، ڀوش، برهم وئيورت،
لنگ، واراهه، سڪند، وامن، ڪُورم پراڻ،
متيه، گرڙ، برهماند سان جملي ارڙهن جاڻ.
(غريب)

[برہم، پسدم، وشنو، اور بھاگوت
نارد، مارکنڈیا، اگنی، بھوش، برہم وئیورت،
لنگ، واراہ، سکندھ، وامن، کورم پران،
متیہ، گرڑھ، برہمانڈ، کل اٹھارہ جان۔]

(1) سنسکرت میں ''اتی'' معنی ''آئین''، ''ھ'' معنی ''تحقیق یا سچ سچ'' اور ''آس'' معنی ''ہوا ہے'' (اس معنی ہونا) ــ یعنی ''یوں سچ سچ ہوا ہے''، یا ''ہوگزرا ہے'': اس لئے ''اتہاس'' معنی ''تاریخ یا روایت''۔ (کہانی)

اس سے دیکھنے میں آتا ہے کہ پرانوں پر زیادہ تر اوتار اور دیوتاؤں کے نام رکھے ہوئے ہیں۔ جو پران جس دیوتا کے نام ہے، اس میں اہم مہما اسی کی ہے، اور دوسروں کی معمولی۔ تاریخ کے حوالے سے ان پرانوں کی جتنی قدر کی جائے وہ کم ہے۔ ان میں سے قدیم رشیوں اور راجاؤں کے شجرے اور کارنامے درج ہیں، اس لئے قدیم ہندستان کی تاریخ مرتب کرنے کے لئے ان میں سے بہت مواد ملا ہے۔ یہ اگر نہیں ملتا، تو قدیم ہندستان کی تاریخ مرتب کرنا ہی مشکل ہو جاتا۔ جو یورپی علماء پہلے قدیم ہندستان کی تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کر رہے تھے، ان کی یہی شکایت تھی کہ قدیم آریوں کو اور تو عقل تھی، مگر تاریخ مرتب کرنے کی عقل نہیں تھی۔ پھر جب انہوں نے دوسرے ممالک کے مذہبی کتب کو دیکھا، تو انہیں معلوم ہوا کہ پہلے تاریخ مرتب کرنے کا نمونہ یہی تو تھا، کہ مذہبی امور کے ساتھ تاریخی امور بھی جوڑ دیتے تھے، اور کچھ تاریخی اور سائنسی باتیں کہانیوں کی صورت میں لکھتے تھے، تا کہ پڑھنے والوں اور سننے والوں کو یاد رکھنے میں آسانی رہے۔ اب یورپی علماء پرانوں کی بڑی قدر کرنے لگے ہیں، اور سمجھ رہے ہیں کہ ان میں سچے تاریخی احوال ہیں، اور جو کہانیاں ہیں، وہ بھی کن حقائق پر مبنی ہیں۔

☆

باب ۱۴

علم اور تعلیم کا انتظام

چار پرشارتھ (مقاصدِ زندگی): قدیم وادیٔ سندھ کے باشندے اپنے بچوں کو کس قسم کی تربیت دیتے تھے، اس سے متعلق پہلے یہ بات ذہن نشیں رہے کہ اسی قدیم زمانے میں ہی رشیوں اور منیوں نے اپنے لوگوں کے دلوں میں یہ بات بٹھادی تھی کہ زندگی کا مقصد صرف کھانا پینا، اور مزے اڑانا نہیں ہے۔ انہوں نے روحانی ترقی کی ضرورت پر زور دیا، اور اپنے لوگوں کو ایسے ہی ذہن نشین کروایا کہ سکھی زندگی گزارتے ہوئے بھی خدا کی طرف متوجہ رہنا، اور رفتہ رفتہ دنیوی سکھ ترک کر کے نجات حاصل کرنا، یہی ست پرش کی مرجاتا ہے، اور یہی ہے زندگی کا مول مقصد، اس لئے بچوں کو بچپن ہی سے اس طرح کی تربیت دینی چاہئے۔

زندگی کے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے، ہر انسان کو چار اہم مرادیں دل میں رکھنی ہیں، جس کے لئے اُسے پرشارتھ (پرکھارتھ) یعنی کوشش کرنا ہے۔ ''پرشارتھ'' لفظ میں ''پرش'' معنی آدمی اور ''ارتھ'' معنی مطلب، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ پرشارتھ گویا پدارتھ ہیں، جن سے ہر آدمی کا مطلب ہے۔ یہ چار پرشارتھ ہیں: دھرم، ارتھ، کام اور موکش۔

۱- پہلے پہلے درجے میں دھرم شمار کیا گیا ہے۔ انسان کے جو بھی فرائض ہیں، وہ سارے دھرم میں آ جاتے ہیں۔ اخلاقی یا نیتی کی باتیں بھی دھرم میں آ جاتی ہیں۔ یہ بھی انہوں نے واضع کیا کہ اگر کوئی شخص دھرم اور نیتی پر نہیں چلتا، تو خود راجا کا دھرم (فرض) ہے کہ اس کے ساتھ قاعدے کی کارروائی کرے، تا کہ آئندہ دھرم کی راہ پر چلے، اور کوئی بھی الٹا قدم نہ اٹھائے، اس لئے ڈنڈ نیتی (Science of Coercion) بھی دھرم کی حفاظت کے لئے ہے۔ قدیم رشیوں، منیوں اور دیگر براہمنوں نے دھرم کو بڑی اہمیت دی، جس وجہ سے ہندوؤں کے فوجداری خواہ دیوانی امور سے متعلق سارے قواعد دھرم پر مبنی ہیں۔ آج تک یہ قواعد ہندوؤں کے شاستروں میں دھرمی باتوں سے جڑے ہوئے ہیں اور وہ دھرم سے الگ کرنے کے نہیں ہیں۔

۲- ''ارتھ'' لفظ کے معنی ہیں ''دھن دولت یا سرمایہ''، ہر کسی غریب خواہ شاہوکار کو سرمایہ چاہئے، کیونکہ سرمایہ کے بغیر کوئی بھی کام نہیں ہو سکے گا۔ اس لئے ایک ضرب المثل ہے کہ:

''اُٹھ بھی پیسہ، بیٹھ بھی پیسہ،
پیسے بغیر مرد بیگانہ''

دھن دولت حاصل کرنے کے لئے ''ورت'' (Varta) یعنی گذران کے طریقے وضع کئے گئے، جیسا کہ: کھیتی، بیوپار، ہنر اور کاریگری اور دوسرا کوئی بھی کام۔ مطلب یہ کہ ہر کسی کو حلال کی کمائی میں سے اپنا پیٹ پالنا ہے، اور دولت کمانے کے لئے بھی دھرم پہ چلنا ہے۔ مثلاً: تول میں بے ایمانی نہیں کرنا ہے۔ اسی سبب ایک ضرب المثل بھی ہے کہ ''اگه ڪتيو ڪائجي، پر وت ڪتيو نه ڪائجي.'' یعنی جھوٹے پیمانے استعمال کر کے یا کم وزن دے کر منافعہ نہیں کھانا چاہئے۔

۳- ''کام'' کے معنی ہیں ''سکھ سے گزارنا'' اپنی حلال کی کمائی کر کے، اپنے بچوں کے ساتھ سکھ سے گزارنا، اس کے لئے بھی پرشارتھ یا کوشش کرنا ضروری ہے، اور یہ بھی انسان کی اہم مراد ہے۔

''موکش'' معنی نجات یا چھٹکارہ۔ اپنے دھرم کرم پر پورا رہ کر، حلال کی کمائی کر کے، سکھی زندگی گذارنا اور پھر رفتہ رفتہ دنیوی سکھ ترک کر کے، خدا کی طرف متوجہ رہنا اور آخر میں خدا میں لین (فنا فی اللہ) ہونے کو ''موکش'' کہتے ہیں۔ ایسا شخص پھر جنم موت کی تبدیلی سے آزاد رہتا ہے: اس طرح کی مثالی زندگی گزارنے کے لئے قدیم لوگوں نے تعلیم کا نظام ہی ایسا رکھا، اور اپنی ساری توجہ مذہبی تربیت پر دینے لگے۔

تعلیمی نظام: رگ وید میں کچھ اس طرح کے اشارے ملتے ہیں، جن سے صاف صاف سمجھا جا سکتا ہے کہ اُس قدیم زمانے میں ہی استاد اور شاگرد ہوتے تھے۔ مثال کے لئے ملاحظہ ہو رگ وید کا منڈل پہلا (سُوکت ۱۲، ۲)، جس میں کہا گیا ہے کہ ''اے اشونی کمار دیوتا، جو اُستاہی پوجاری خاص صرف تیری پوجا کرتے ہیں، وہ تمہاری رتھ (گاڑی) کے ارد گرد کھڑے ہو کر، تمہاری نعمت سے یوں فاعدہ حاصل کرتے ہیں، جیسے تربیت لینے کے لئے شاگرد اپنے استاد کی باتیں توجہ سے سنتے ہیں''۔ پھر منڈل ساتویں (۸۷، ۴۷) میں کہا گیا ہے کہ ''ورن دیوتا نے مجھ پاترشش (لائق شاگرد) کو تربیت دے کر برہم لوگوں کی پہیلیاں سنائی ہیں۔'' ان دو مثالوں میں

سے ظاہر ہے کہ رگ وید والے زمانے میں ہی رشی اور براہمن عام لوگوں کے معلم ہوا کرتے تھے، اور وہ انہیں روحانی تعلیم دیتے تھے۔ اس وقت وادیٔ سندھ میں براہمن پروہت، رشی اور راج رشی بہت تھے (رگ وید، منڈل دسواں، ۱۰۳، ۷)۔

وادیٔ سندھ کے باشندے بچپن ہی سے علم حاصل کرتے تھے، یہ بات اس سے سمجھی جا سکتی ہے، جو رگ وید کے منڈل ساتویں، (۱۰۳، ۵) میں کہی گئی ہے کہ ''برسات میں ایک مینڈک دوسرے مینڈک کی ٹاں ٹاں سن کر، خود بھی اسی طرح ٹاں ٹاں کرتا ہے، جس طرح کوئی نوآموز گار اپنے گرو کے منہ سے الفاظ سن کر، خود بھی اس طرح پڑھتا ہے۔'' اس سے ظاہر ہے کہ چھوٹے بچوں کے چلبلے بولنے کو مینڈک کی ''ٹاں ٹاں'' سے تشبیہ دی گئی ہے۔ آج بھی دیکھیں کہ سندھی اسکولوں میں چھوٹے بچوں کی کلاسوں میں پہلے استاد کوئی لفظ پڑھتا ہے، اور پھر اس کے پیچھے چھوٹے بچے بھی کوشش کر کے اُسی طرح چلبلے نمونہ کرتے ہیں۔ اس طرح یہ مینڈکوں والی ''ٹاں ٹاں'' جاری ہے۔

چھوٹے بچوں کی کلاسوں کے شاگرد جب کچھ علم سیکھ کر اوپر کی کلاس میں جاتے تھے، تب انہیں آچاریہ ویدوں کے منتر بر زبان یاد کرواتے تھے (رگ وید، منڈل دسواں، ۱۰۳، ۵)۔

پروفیسر منکس ملر کہتا ہے کہ جن دنوں لوگوں کے پاس لکھنے پڑھنے کا سامان (سیاہی، قلم، اور کاغذ) نہیں ہوا کرتا تھا، تب شاگردوں کو استاد کس طرح ویدوں کے منتر سکھاتے تھے، اس بات کا پتہ ''پراتیشا کھیا'' (Pratisakhya) سے چلتا ہے۔ چیلے اپنے گرو کے گلے میں بانہیں ڈال کر چھتے تھے کہ ''سوامی، پڑھو''۔ استاد سنجیدگی سے کہتا تھا: ''اوم'' (ہاں)۔ وہ پھر ایک پرشن (سوال) کہتا تھا، جس میں دو تین قافیہ (مصراعیں) ہوتے تھے، لیکن شاید کسی لفظ پر شاگرد کی پوری توجہ نہ رہے، اس لئے ہر لفظ پر زیادہ زور دے کر پڑھتا تھا، اور کچھ الفاظ دو دو دفعہ پڑھتا تھا، اس طرح جب گرو کچھ الفاظ کہہ چکا ہوتا تو پہلا شاگرد ان قافیوں میں سے پہلے الفاظ کہتا تھا۔ اگر کسی بات کی وضاحت کرنی ہوتی تھی، تو گرو اُسے کہتا تھا کہ ''ان الفاظ کا مطلب سنا''۔ شاگرد جب مطلب سنا چکا ہوتا، تب دوسرا شاگرد گرو والے الفاظ پڑھتا تھا۔ پھر سارے شاگرد اپنا سبق بار بار دہراتے تھے تاکہ پکا ہو جائے۔ بچوں کو زبانی سکھانے کا طریقہ یہی تھا۔ اس طرح شاگرد کئی باتیں بر زبان یاد کر لیتے تھے، جن کا پھر نسل در نسل حافظہ کے وسیلہ سے پھیلاؤ ہوتا رہتا تھا۔ ابتدائی تعلیم اس طرح لڑکے اور لڑکیوں کو دے کر، بعد میں انہیں اعلیٰ درجے کی تعلیم دیتے تھے۔

تعلیمِ نسواں: رگ وید والے زمانے میں ہی قدیم ہندوؤں کو تعلیم نسواں کی بڑی قدر تھی۔ بیٹیوں کو بھی بیٹوں کی طرح تعلیم ملتی تھی۔ جس طرح آج کئی لڑکیاں اسکولوں اور کالجوں کے امتحانات میں کئی لڑکوں سے سبقت لے جاتی ہیں، اس طرح پہلے بھی کئی عورتیں کن مردوں سے سبقت لے جاتی تھیں۔ عورتوں کی نہ صرف روایتی تربیت ہوتی تھی بلکہ مذہبی تربیت بھی ہوتی تھی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ گھوشا (راجکماری)، آپالا، لوبھ، مُدار اور وِشْوَارا نامی عورتیں رشیوں کے درجے کو پہنچی ہوئی تھیں۔ وہ ویدوں کے منتروں کی پوری پوری تشریح دوسروں کو سناتی تھیں، اور معلومات دیتی تھیں۔ وَشواوارا تو پوجا بھی کرواتی تھی، جس طرح آج بھی بعض گریانیاں کرتی ہیں۔ قدیم زمانے کے گروکل براہمن کی گویا کہ یونیورسٹیاں ہوتی تھیں، جن میں بیٹوں کے ساتھ بیٹیوں کو بھی اعلیٰ تعلیم ملتی تھی۔

گروکل اور آشرم: اتھرو وید کے منڈل نویں، (سُوکت ۵) میں بلکل صاف صاف لکھا ہوا ہے کہ شاگرد جنیہ پہن کر، برہمچاری بن کر رہتے تھے، اور گروکل میں رہ کر، علم حاصل کرتے تھے۔ ''آچاریہ کل واسن'' یعنی'' آچاریہ (استاد) کی کل میں رہنے والا'' لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ خود رگ وید کے منڈل دسویں، (۱۰۹، ۵) میں ''برہمچاری'' لفظ استعمال ہوا ہے۔ منڈل ساتویں (۱۰۳، ۱) میں کہا گیا ہے کہ ''براہمن ہمیشہ اپنے وعدے کا پاس رکھتے تھے۔'' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ براہمنوں کو بچپن ہی سے یہ اخلاقی تعلیم دی جاتی تھی کہ ''اپنا کیا ہوا وعدہ کبھی بھی نہیں توڑنا چاہئے''۔ برہمچاری کی یہ بھی ایک خوبی ہوتی تھی۔[1] اس قسم کے ثبوتوں سے خود بعض یورپی علماء سمجھتے ہیں کہ رگ وید والے زمانے میں ہی گروکل تھے، اس لئے کہا جائے گا کہ بہت ساری قوموں سے پہلے وادئ سندھ کے آریوں کو علم کی قدر تھی۔

پڑهڻ، ترڻ، تير هڻڻ، چوٿين سواري،
ننڍي هوندي جو نه سکي، وڏي خواري.
(کہاوت)

[پڑھنا، تیرنا، تیر چلانا، چوتھی سواری،
بچپن میں نہ سیکھی تو بڑی عمر میں خواری۔]

(1) کتھریوں کو یہ بھی تعلیم دی جاتی تھی کہ راج ہرشچندر کئی ایک تکالیف برداشت کیں؛ لیکن وعدہ خلافی نہیں کی۔ راجا دسرتھ اپنی رانی کیکئی سے وعدہ کیا، بعد میں اگرچہ اس نے بہت پچھتایا، لیکن پچھتاتے پچھتاتے غم سے اپنے جان دے دی، پھر بھی قول پر قائم رہا۔ بھشم پتامھ ساری عمر کنوارا رہنا قبول کیا، اور اپنے تخت پر سے بھی دستبردار ہو گیا؛ لیکن اپنا وعدہ نہیں توڑا، حال ہی میں گرنار کوٹ کے راجا راءِ ڈیاچ نے بیجل چارن سے کہا کہ ''مانگ جو مانگنا ہے''۔ اس نے کہا ''مجھے اپنی سری کاٹ کر دے دے''۔ اس بڑے دل والے نے وہیں پر بڑی درانتی لے کر اپنی سری کاٹ کرا سے دے دی؛ لیکن قول سے پھرا نہیں۔ مصنف

یہاں بھی دیکھیں کہ پہلے ہے پڑھنا، اور بعد میں دوسری باتیں ہیں۔ ''ان پڑھ پڑھے ہوئے لوگوں کے سامنے گھاس سر پر اٹھائے پھرینگے۔'' اس قسم کی کہاوتوں سے پتہ چلتا ہے کہ سندھی لوگ علم کی بڑی قدر کرتے تھے۔

قدیم لوگ انسان کی عمر سراسری ایک سؤ برس شمار کرتے تھے، اور یہ چار آشرموں یعنی منازل یا درجوں میں منقسم ہوتی تھی۔ ان چار آشرموں کے نام برہمچریہ، گرہستھ، وانپرستھ، اور سنیاس ہیں۔ ''برہمچریہ'' لفظ خود پتہ دیتا ہے کہ اس پہلی منزل میں ''برہم'' خدا کی طرف جانے والی راہ پر چلنا سیکھتے تھے، اور وہ ''برہمچاری'' کہلاتے تھے۔ ہر ایک آدمی اپنے ماں باپ سے پیدا ہوتا ہے، لیکن خدا سے ملنے کی راہ لینے کے لئے اُسے بچپن ہی میں دوسرا جنم لینا ہے۔ اس دوسرے جنم لینے کی نشانی ''جنیہ'' ہے۔ جنیہ پہننے والا ''دوجہ'' یعنی دوبارہ پیدا شدہ کہلاتا ہے۔ جنیہ پہننے کے وقت سے لے کر ''گایتری'' اس کی ماں ہے، اور آچاریہ (استاد) اس کا باپ ہے۔ قدیم لوگ بچپن ہی میں جنیہ پہن کر، پچیس برس کی عمر تک برہمچاری بن کر رہتے تھے، اور گروکل میں رہ کر علم حاصل کرتے تھے۔ برہمچریہ آشرم میں پہلی اور اہم بات تھی اپنی نفسانی خواہشات کو روکنا۔ اسی سبب وہ پچیس برس کی عمر تک کسی کی لڑکی یا عورت کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ انہیں اپنے نفس پر ضابطہ تھا، اس لئے ہمیشہ ہٹے کٹے ہوتے تھے، اور بڑے بہادر ہوکر بڑے ہوتے تھے۔ یہ سارا وقت وید کا علم اور دیگر علوم سیکھ کر، اپنی قوت اور سوجھ بوجھ بڑھا کر لوٹتے تھے۔ ان گریجوئیٹس کی اتنی عزت ہوتی تھی، جو دیس کا راجا خود ان کے استقبال کے لئے ان کی طرف آگے بڑھ کر جاتا تھا۔ برہمچاری گھر کو لوٹتے تھے، تو پھر جلد ہی کسی لائق لڑکی سے وہ شادی کرتے تھے۔ یہ دوسری منزل ''گرہست آشرم'' کہلاتی تھی۔ جس میں نوجوان گھرباری ہوکر رہتے تھے، اور حلال کی کمائی سے اپنا گزارا کرتے تھے۔ گھرباری ہوکر بھی اپنے فرصت کے وقت خدا کی بھگتی، ست پرشن کی شیوا اور سادھ سنگت میں سہلو کرتے تھے۔ وطن میں بے روزگاری تھی نہیں، اور لوگوں کی کمائی بھی کافی ہوتی تھی۔ اتہاسوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے ویسے محنت کش کو بھی سونے کی ایک مہر روزانہ ملتی تھی۔ بعض کو تنخواہ میں آدھا اناج، اور آدھے پیسے ملتے تھے۔ لیکن ویدوں والے زمانے میں ہی گرہستی لوگوں کے پاس اناج خواہ نقدی اتنے بچتے تھے، جو دوسرے آشرم والوں کو پیسہ خواہ اشیائے خوردنی کی مدد دیتے تھے، جس وجہ سے گرہستیوں یا گھرباریوں کی عزت بالا سمجھی جاتی تھی۔ آج بھی برہمن، باوے اور دیگر کئی گرہستیوں کی کمائی پر پل رہے ہیں۔

گرہستیوں کی اولاد بڑی ہوتی تھی، تو خود آہستہ آہستہ دنیوی امور سے توجہ ہٹا کر، پچاس برس کی عمر میں وانپرستھ آشرم میں قدم رکھتے تھے یعنی گھر چھوڑ کر جنگل کی طرف جاتے تھے۔ گھر

چھوڑنے کے وقت اپنی اولاد، چھوٹے بھائیوں اور دیگر گھر کے افراد کو گرہست آشرم کے فرض نباہنے کی بڑی تاکید کرتے تھے۔ ''اچھے وہ، جن کی اولاد اچھی''۔ خود جنگل کی طرف جاتے تھے، اور ان کے پیچھے شاید ان کی اولاد خاندان کیناک ڈبودے، اس لئے انہیں تاکید کر کے بعد میں جنگل کی طرف جاتے تھے: اپنی آرامدہ مکانات چھوڑ کر، جھونپڑیوں میں رہتے تھے، اور کسی بھی لذت کی تمنا نہیں کرتے تھے۔ روایتی لباس بھی نہیں پہنتے تھے، لیکن کچھ درختوں کی چھال اور کچھ گھاس کے تنکوں سے بنے ہوئے کپڑے پہنتے تھے۔ اس طرح کے کپڑے شمالی ہندستان میں آج بھی کہیں کہیں ملتے ہیں۔ بن میں بھی یگیہ کرتے تھے، لیکن اپنی نفسانی خواہشات کو روکنا ایک بڑا یگیہ سمجھتے تھے۔ اپنی بیوی ان کے ساتھ ہوا کرتی تھی، تو بھی اس کے قریب نہیں جاتے تھے۔ اپنے سریر کو تپسیا میں، دل کو ادھیاتم ویچار اور خدا کی حمد میں، ایکانت نواس دواران لگاتے تھے، تاکہ یہ دنیا سکھی اور وہ دنیا بھی سکھی ہو۔

یہ ون برستھ آشرم ویراگ پکانے کے واسطے تھا۔ ویدوں کے براہمنوں میں درج ہے کہ جس دن پورا پورا ویراگ پراپت ہو، اس دن سمجھنا چاہئے کہ ون پرستھ آشرم کا وقت پورا ہوا، اور پھر سنیاس آشرم میں قدم رکھا جائے۔ ''سنیاس'' لفظ میں ''سم'' معنی ''سب''، ''نی'' معنیٰ ''نزدیک'' اور ''آس'' معنیٰ ''پھینکنا''۔ ہر وہ چیز جو قریب ہو اُسے پھینک دینا یعنی ہر ایک چیز کو ترک کرنے کو ''سنیاس'' کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ آخری پچیس سال بلکل تارک دنیا بن کر سب کچھ ترک کر کے، یوگ دواران موکش پد (نجات) حاصل کرتے تھے۔ اس طرح اپنی ساری زندگی سپھلی کرتے تھے۔ رگ وید والے زمانے میں ہی شاید اسی طرح زندگی گزارتے تھے، کیونکہ اس طرح کے اشارے رگ وید میں موجود ہیں۔

منی اور وراثیہ: وادیٔ سندھ کے جا سنیاسی دنیا ترک کر کے جنگل میں زندگی گزارتے تھے، اور ویدوں کے منتر پڑھتے رہتے تھے، انہیں رگ وید میں ''منی'' (Sages) کہا گیا ہے۔ ''درختوں کے ہلنے کی آوازیں اس طرح سنائی دے رہی ہیں جس طرح منیوں کے منتر پڑھنے کا آلاپ'' (رگ وید، منڈل ساتواں، ۵۶، ۸)۔ ''منیوں کا ساتھی اندر دیوتا ہے، (منڈل ساتواں، ۷، ۱۴)۔ ان منیوں سے متعلق یوں بھی درج ہے کہ ان میں سے بعض تو ننگے ہوتے تھے، تو بعض کو گیرو رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے ہوتے تھے (رگ وید، منڈل دسواں، ۱۳۶، ۲)۔ وہ ''کیشی'' یعنی لمبے بالوں والے ہوتے تھے، اور ہوا کی طرح آزاد گھومتے رہتے تھے۔ انہیں دیوتا کے طور پر سمجھا جاتا تھا۔

دوسرے سنیاسی جو منیوں سے علحدہ ہوتے تھے، انہیں (Varatya) کہا جاتا تھا۔ وہ راہ بھٹکنے والے سادھو ہوتے تھے۔ انہیں سواری کے لئے سادہ گاڑیاں ہوا کرتی تھیں، جن میں بیل جوتے ہوئے ہوتے تھے، اور دو پیادے ان کے آگے اور دو پیادے ان کے پیچھے ہوتے تھے۔ ان کے بال ہوتے تھے، ان کے جسم پر سادھوؤں جیسا لباس ہوتا تھا، اور ان کے سر پر پگڑی ہوتی تھی۔ انہیں بھی دیوتا کے طور پر سمجھا جاتا تھا۔ یہ ورائیہ شاید مہادیو (شومہراج) کے پوجاری تھے۔ خود راجا ان کی عزت کرتے تھے (اتھرو وید، منڈل ۱۵، ۱۰)، اور براہمن انہیں اپنے گھر میں مہمان بناتے تھے (اتھرو وید، منڈل ۱۵، ۱۲)۔

جو رشی اور منی دنیا ترک کر کے جنگلوں میں رہتے تھے، ان کی جھوپڑیاں اگرچہ اپنی اپنی ہوتی تھیں، تو بھی کئی دفعہ کسی ایک میدان میں اکٹھے ہو کر، کتھا کیترن اور گیان گوشٹ کرتے تھے۔ مہا بھارت، سریمد بھاگوت اور دیگر کئی پرانوں کی شروعات میں درج ہے کہ یہ کتھائیں نمشارن جنگل کے بیچ میں بیٹھ کر، وید ویاس کی شش سؤ پر اٹھاسی ہزار رکھیشرن کو باندھی تھیں۔ اس سے معلوم ہوگا کہ جنگل میں بھی ان کے ہاں بڑی رونق ہوتی تھی، اور گیان اور ویراگ کی وارتائیں سننے کے وقت ہزاروں کی تعداد میں ایک جگہ جا کر اکٹھے ہوتے تھے۔

کگول ودیا اور جوتش کا مطالعہ- وقت ناپنا: قدیم رشی اور منی جو گوٹھوں میں گھر بنا کر رہتے تھے، یا ویراگ ورتی کی خاطر، جنگل میں جا کر گزارتے تھے، ان کی نہ صرف مذہبی باتوں پر توجہ ہوا کرتی تھی، لیکن قدرت کے ساتھ شاغل رہنے کے بھی بڑے شائق تھے۔ انہیں مشاھدے کی بڑی قوت ہوتی تھی۔ ان کی ایک اہم بات جو زیادہ توجہ طلب ہے، وہ یہ کہ رگ وید والے زمانے میں ہی سیاروں، تاروں، اور نکھتروں کی طرف نظر رکھتے تھے، اور اس طرح انہوں نے کگول ودیا اور جوتش کی بنیاد ڈالی۔

قدیم آریوں کی زیادہ تر توجہ یگین کرنے پر ہوتی تھی۔ کچھ بڑے یگیہ کرتے تھے، جنہیں ''ستر'' کہتے تھے۔ ان ستروں کے لئے اکثر وہ دن مقرر کرتے تھے، جن دنوں پر سورج کا سایہ موڑ لیتا تھا، اور دن بڑے اور راتیں چھوٹی، یا دن چھوٹے اور راتیں بڑی ہونے لگتی تھیں۔ لوکمانیہ پال گنگا دھر تلک نے اپنی کتاب ''اورنی'' میں درج کیا ہے کہ اس طرح یگیہ گویا کہ وقت کی ناپ دکھانے والے (Chronometers) ہوتے تھے۔

وقت کی ناپ چاند کے حساب سے بھی کرتے تھے۔ چاند کو کہتے تھے ''ماس''، جس کا تلفظ پارسی زبان میں ہے ''ماہ''۔ ماس یا ماہ کے ایک معنی ہیں ''چاند'' اور دوسرے معنی ہیں ''مہنہ''، اور

اس کا مادہ ہے ''ما'' معنی ''ناپنا''۔ جس وجہ سے ''ماس'' (ماھ) کے بنیادی معنی ہیں ''ناپنے والا''۔ اس لفظ سے خود پتہ چلتا ہے کہ وقت کی ناپ چاند کے حساب سے کرتے تھے۔ چاند پورا ہوا تو مہنا پورا ہوا، اس لئے دوسرا مہنا پھر نئے چاند سے شمار کرتے تھے۔ مہنے میں تیس دن شمار کرتے تھے، اس لئے سال میں ۳۶۰ دن شمار کرتے تھے، لیکن وقتی تیرہواں مہینہ بھی ملاتے تھے، جو عام طور پر ''ادھک'' یا ''لنڈ'' یا ''پرشوتم'' کا مہنہ کہلاتا ہے۔ ہر ایک دن کو سورج دیوتا کا ''دھام'' کہتے تھے (اتھرو وید، منڈل پہلا، ۱۱۶۴)۔ دن میں چال ساعتیں شمار کرتے تھے۔ سال موسم سرما سے شمار کرتے تھے، جس میں تین موسمیں (ہر ایک چار مہنوں کی) شمار کرتے تھے۔ بعد میں ایک سال میں چھ رُتیں شمار کرنے کا رواج جاری ہوا۔ وہ چھ رُتیں یہ ہیں: (۱) گریشم (موسم گرما)، (۲) ہیمنت (خزاں)، (۳) ششر (موسم سرما)، (۴) وسنت (بسنت بہار)، (۵) شرد (خزاں) اور (۶) ورشا (برساتی موسم) (اتھرو وید، منڈل چھٹا، ۲،۵۵، اور منڈل بارہواں ا، ۳۶)۔ اتھرو وید کے منڈل انیسویں (۷) میں اٹھائیس نکھتر درج ہیں، جو کرتکا (ثریا) سے شمار ہوتے ہیں۔ اس قدیم زمانے میں ہی سائنس کی باتوں پر اتنی توجہ دے رہے تھے، اس پر کئی یورپی علماء نے حیرت کا اظہار کیا ہے۔

☆

باب ۱۵

نیتی یا اخلاق

دان پنج : قدیم زمانے سے ہندو لوگ دان پنج کرنے کو ایک مذہبی فریضہ سمجھتے ہیں۔ ویدوں کے رچاؤں میں ان لوگوں کے لئے نفرت کا اظہار کیا گیا ہے، جن کے پاس اناج کے بھنڈار ہوں، لیکن دل ان کے اتنے پکے ہیں، جو کسی حاجتمند کو اناج کا ایک دانہ بھی نہیں دیتے۔ ایک رشی نے دیوتاؤں کو آرادھنا کی ہے کہ ''اَن اُدارتا'' (Illiterality) کاش دنیا میں ہو ہی نہیں کاش دنیا میں ایسا ہو) (رگ وید، منڈل دسواں، ۲۳، ۱۲)! ویدوں کے رچاؤں میں ان لوگوں کی تعریف درج ہے، جو غریبوں اور اناتھوں کی ضروریات پوری کرتے ہیں، اور کمزورون کے ساتھی بنتے ہیں۔ یوں بھی کہا گیا ہے کہ جو ''بھوج'' ہیں یعنی دوسروں کو کھانا کھلاتے ہیں، اور دوسروں کا دل خوش کرتے ہیں، ان کا یہ لوک سکھی اور پرلوک آسان ہوتا ہے (رگ وید، منڈل پہلا، ۱۲۶، ا، منڈل پانچواں، ۳۰، ۱۲، ۱۵، منڈل ساتواں، ۱۸، ۲۱، ۲۴)۔ جو راجا بڑا دل کر کے خیرات کرتے تھے، ان کی ''دان اُستیاں'' (سخا کی تعریفیں) رگ وید میں درج ہیں، جن میں سے منڈل پہلے میں سندھ کے راجا سونیہ بھاویہ کے سخا کے گُن کاکشون رشی نے گائے ہیں۔ رحم، مذہب کا مول کہا گیا ہے اور یوں بھی کہا گیا ہے کہ ''ديا بنا سڌ به ڪاسائي،'' (دیا (رحم) کے بغیر کوئی خواہش پوری نہیں ہوگی) اس لئے قدیم زمانے سے لے کر ہندو نہ صرف لوگوں پر بلکہ دوسرے جانداروں پر بھی رحم کرتے ہیں، گایوں کو گھاس اور آٹے کے پیڑے دینا، چیونٹیوں کو ٹوٹے چاول دینا، دریاہ میں مچھلیوں اور دیگر جاندارون کے لئے چارہ ڈالنا، اپنے روزانی کھانے میں سے کسی گداگر کو کھانا دینا، کتے اور کوے کو لقمہ دینا اور دیگر اس طرح کے رواج آج تک عام ہیں۔ یہ سارے ذی حیات پر رحم والے کام ہیں، جن کا لوگوں نے قاعدہ بنا لیا ہے۔ یے روزمرہ کے قواعد یاد دلاتے ہیں کہ جو کچھ کمایا جاتا ہے وہ صرف اپنے تن پروری اور سرخروئی کے لیے نہیں ہے، لیکن ہمیشہ دوسروں کو اس میں سے دیا جائے۔ ''ونڊ کاءُ، سک پاءِ، چپ کاءُ، چائي پاءِ.'' (تقسیم کر کے کھاؤ، سکھ پاؤ، چھپ کے کھاؤ، دکھ پاؤ) یہ ضرب المثل آج تک عام ہے۔

رگ وید میں ''پنی'' لوگوں (بیوپاریوں) کے لئے نفرت کا اظہار کیا گیا ہے، کیونکہ انہیں لالچ زیادہ ہوتی ہے، اور ان میں رحم برائے نام بھی نہیں ہوتا، اور لوگوں سے بھاری سُود لیتے تھے (منڈل آٹھواں، ۷۷، ۱۰)۔ ان کا ایک مُکھی ''بربُو'' (Brbu) نامی تھا، وہ رحم کرتا تھا، اور اس کی تعریف درج ہے۔

رگ وید والے زمانے کی بیوپاریوں کی موجودہ دور کے بیوپاریوں سے موازنہ کیا جاتا ہے تو زمین و آسمان جتنا فرق نظر آتا ہے۔ ہمارے سندھ ورکی بھائی خواہ دیگر بیوپاری اپنی کمائی سے ہمیشہ کچھ حصہ (ہر مہینے) دھرماؤ نکالتے جاتے ہیں۔ اس طرح بڑی رقمیں کٹھی کر کے کسی اچھے کام میں لگاتے ہیں۔ حیدرآباد شہر میں کئی مندر، ٹھاکر دوارا، دھرمشالائیں وغیرہ ہمارے بھائیبندوں ہی کی تعمیر کردہ ہیں۔ ٹھاکر دواروں اور ٹکانوں وغیرہ پر زیادہ خرچ کرنے کے بجائے اب حیدرآباد، شکارپور، اور دیگر مقامات کے سیٹھ لوگ گئوشالا، ناری شالا، کنیا پاٹھشالا، خیراتی ہسپتالوں، زچہ خانوں، اور دیگر مذہبی کاموں کی مد میں بڑی رقم خرچ کرتے ہیں۔ عاملوں کی جاری کردہ ناری شالائیں، کنیا پاٹھشالائیں، دھرماؤ ہسپتالیں وغیرہ بھی ہیں، لیکن جتنا پیسا سندھ کے بھائیبندوں نے اس طرح کاموں پر خرچ کیا ہے، اتنا عاملوں نے نہیں خرچ کیا۔

مہمان نوازی: رگ وید والے زمانے میں ہی مہمان نوازی کا رجحان ہمارے لوگوں میں تھا، اور اسے ایک فرض سمجھا جاتا تھا۔ لوگوں کے گھروں کے دروازے ہمیشہ مہمانوں کے لئے کھلے رہتے تھے (رگ وید، منڈل پہلا، ۱۲۸، ۶)۔ مہمان گھر میں داخل ہوتا تھا تو اسے خوش آمدید کہا جاتا تھا، ہاتھ منہ دھونے کے لئے اُسے پانی لاکر دیا جاتا تھا، اور چٹائی پر اُسے بٹھاتے تھے۔ وہ پھر نہا دھلا کر کھانا کھاتا تھا، اس کے بعد خود کھاتے تھے۔ رہنے کے لئے اُسے الگ کمرہ دیتے تھے۔ (رگ وید، منڈل پہلا، ۷۲، ۱)، جس میں تکیے اور گدیاں وغیرہ ہوتے تھے۔ صبح شام مہمان کو سکھی رکھنے کی فکر میں ہوتے تھے۔ مہمان کو اس طرح پوجتے تھے جس طرح لوگ اگن دیوتا کو پوجتے ہیں (منڈل ساتواں، ۳، ۵)۔ جن لوگوں میں خاطر تواضع نہیں ہوتی تھی، ان سے متعلق رشیوں نے کہا ہے کہ (کاش) ایسے لوگ تو دنیا میں ہوں ہی نہیں! (منڈل نواں، ۶۳، ۵)۔ آج تک ایک ضرب المثل ہے کہ ''مہمان آتے ہیں بڑے خوش نصیبوں کے گھر''۔ ہندوؤں کے شاستروں میں مہمان نوازی کو ایک بڑا یگیہ شمار کیا گیا ہے۔

اخلاق کی خوبی: قدیم لوگوں میں اخلاق کی خوبی کو زور پکڑوانے کے لئے، اور انہیں مذہب کی راہ پر چلانے کے لئے رشیوں نے انہیں یہ بات ذہن نشیں کروائی کہ دنیا میں جو اچھے خواہ

برے کام، چھپ کر یا کھلم کھلا کیے جاتے ہیں، وہ سارے خدا کو معلوم ہیں۔ سب کاموں کی گواہی دینے والا سورج دیوتا ہے، وہ گواہ کے طور پر اوپر کھڑا ہے، اس لے سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہئے۔ سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کے لئے انہوں نے ایک ہی ''اہنسا'' کا منتر سکھایا ہے۔ ''اہنسا پرمو دھرم'' کہا گیا ہے یعنی اہنسا بڑا دھرم (مذہب) ہے۔ اہنسا کا پرچار بعد میں گوتم بدھ اور مہابیر سوامی نے کیا، اس وقت مہاتما گاندھی اس کا اچھی طرح پرچار کر رہا ہے۔

''ہنسا'' کے لفظی معنی ہیں ''لگانا یا اذیت پہنچانا''، لیکن صرف کسی کو ضرب لگانا ہنسا نہیں ہے، کسی سے کوئی دھوکہ کرنا بھی ہنسا ہے۔ مطلب یہ کہ منیوں، وچنوں، اور کرموں یعنی دل سے، زبان سے، اور کسی فعل سے، کسی کو کوئی نقصان یا اذیت پہنچانا۔ اسے ''ہنسا'' کہتے ہیں۔ مہا بھارت انوشاسوں پرو کے ادھیاء تیرہویں میں دس قسم کے دوش یعنی گناہ درج ہیں، جن سے دور رہنا چاہئے۔ (1)

انسان خطا کا گھر کہا گیا ہے، بندہ ہمیشہ بھول جاتا ہے، تو پھر ان دس قسموں کے گناہوں سے اُسے بچائے کون؟

«قادر پنهنجي قدرت سين قائم آهه قديم.»
(شاهه)
[وہ قادر مطلق روز ازل (قدیم) سے اپنے قدرت سے قائم و دائم ہے]

قادر کی قدرت یعنی طاقت اَپار ہے، اور یہی ہر وقت حامی و ناصر ہوتی ہے۔ اسی طاقت کو مجسم (Personify) کر کے، اُسے نام دیا گیا ''درگا''۔ ''درگا'' لفظ میں ''دُر'' معنی مشکل اور ''گ۔۔گم'' معنیٰ جانا۔ ''درگا'' کے لفظی معنی ہیں ''جس مشکل میں جایا جائے''۔ اسی سبب سنسکرت میں ''درگا'' معنی قلعہ یا کوٹ، دوسرے معنی دیوی (شکتی)۔ دیوی اپنے پوجاریوں کے لئے ایک قلعہ یا بچاؤ ہے، اور اس کے کرم سے کوئی بھی دکھ یا گناہ تک نہیں سکتا۔ قادر یا سرب شکتیوان (ایشور) باپ ہے، اس کی قدرت ماں ہے، اور انہوں نے یہ سارا جہاں پیدا کیا ہے، اور سارے جہاں کو قدرت اس طرح سنبھالتی ہے، جس طرح ماں اپنے بچوں کو سنبھالے۔ دیوی کی پوجا کا رواج ان خیالوں کی وجہ سے جاری ہوا۔ پھر دریاء گنگا کو دیوی کا روپ سمجھ کر اس پر نام رکھا ''دشہرا'' یعنی دش (دس)

(1) تین دوش کایا یا سریر کے۔۔۔ کسی کو قتل کرنا یا کوئی بھی اذیت دینا، ناجائز طریقے سے دولت کمانا یا خرچ کرنا، کسی کی بیوی سے زنا کرنا (شلوک ۳)۔
چار دوش وانی کے۔۔۔ گندی گفتگو کرنا، شوخی کرنا، غیبت کرنا اور جھوٹ بولنا (شلوک ۴)۔
تین دوش دل کے۔۔۔ کسی کا مال یا کسی کی بیوی کو تاڑنا، کسی کو نقصان پہنچانے کے طریقے تلاش کرنا اور دیگر نامناسب تصورات کرنا، اور ویدوں میں وشواس نہ دھارنا وغیرہ۔
یہ دوش (گناہ) کرنا ہے ''ہنسا''، اور ان سے اجتناب کرنا ہے ''اَہنسا''۔

گناہوں کو لے جانے والی طاقت۔ کئی ہندو آج تک گنگا دسہرہ مناتے ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ گنگا میں ڈبکی لگانے سے دس ہی قسموں کے گناہ مٹ جاتے ہیں۔ پرانوں کے مطابق دیوی اس دن دیتوں پر فتحیاب ہوئی تھی، اس لئے دسہرے کو "وجیہ دشمی" یعنی فتح کی دسویں تاریخ بھی کہتے ہیں۔ اسی دن سری رامچندر نے بھی راونن پر فتح حاصل کی تھی، اس لئے اب عام طور پر دسہرہ سری رامچندر کی فتح منانے کا دن سمجھا جاتا ہے، ورنہ درحقیقت دسہرہ منانے کا رواج سری رامچندر سے بہت پہلے کا ہے اور دسہرہ دراصل درگا دیوی خواہ گنگا ندی کا نام یا لقب ہے۔

جرم اور سزائیں: قدیم رشیوں نے اگرچہ ہر قسم کے گناہ کی مذمت کی ہے، پھر بھی یوں نہیں سمجھنا چاہئے کہ رگ وید والے زمانے میں لوگ گناہ کرتے ہی نہیں تھے۔ انسانی فطرت جس طرح آج ہے اُس طرح ان دنوں بھی تھی، اس لئے لوگ طرح طرح کے گناہ کرتے تھے۔ کچھ لفنگے دوسروں کی عورتوں کو تاڑتے رہتے تھے، اور کچھ جوان لڑکیاں اور عورتیں ان کے شکنجے میں آ جاتی تھیں (رگ وید، منڈل پہلا، ۳۴، ۳)، منڈل چوتھا، ۵، ۵، منڈل نواں، ۳۲، ۵ وغیرہ)۔ اس کے باوجود عورتیں عام طور پر پتورت ہوتی تھیں، اور ان کے اخلاقی معیار بلند اور اعلیٰ ہوتا تھا۔[1] دوسرے کی بیوی سے زنا کرنا کبیرہ گناہ سمجھا جاتا تھا۔ جس طرح آج کل "کارو" (زانی) اور "کاری" (زانیہ) کو بروقت قتل کرنا واجب سمجھا جاتا ہے، اس طرح اُن دنوں بھی تھا، اور اس طرح کے قتل پر کوئی سزا نہیں تھی۔[2] بصورت دیگر اگر کوئی کسی کا قتل کرتا تھا تو مقتول کے عزیز قاتل کے پیچھے دوڑتے تھے، اور اُسی وقت اُسے پکڑ کر جان سے مار دیتے تھے۔ کبھی یوں بھی ہوتا تھا کہ قاتل بھاگ جاتا تھا، اور بعد میں ہاتھ لگ جاتا تھا تو راجا راضی نامہ کروا کے، مقتول کے عزیزوں کو خون کے بدلے گائیں اور بیل دلواتا تھا۔ آدمی اپنے بچاؤ میں اگر کسی کو جان سے مار دیتا تھا، تو ایسا کرنے کا اُسے حق تھا، اور اس کے لئے اُسے کوئی سزا نہیں ملتی تھی، بھلے مقتول کوئی براہمن یا راجکمار ہی کیوں نہ ہو۔[3]

رگ وید والے زمانے میں چور اور رہزن بھی ہوا کرتے تھے۔ "چور" کے لئے "تسکر" لفظ کئی دفعہ استعمال ہوا ہے۔ دوسرا لفظ "ستین" (Stena) ہے، جس کے معنی ڈاکو یا لٹیرا کے ہیں۔

(1) "The Standard of female morality appears to have been fairly high" Cambridge History of India Vol. I, P. 88 and 97.

(2) "Adultery was generally regarded among Aryan peoples as the serious offence against the husband of the woman affected. We accordingly find in the legal literture of India traces of the rule than an adulterer can be slain with impunity, if taken in the act." Dr. A.C. Das. Reg Vedic Culture, P. 257.

(3) "The right of self defence was also vested in the indivicual and as such the murder of an assailant, even if he were a prince or Brahmin was not punishable..Narayan Chandra Bandye Padhaya: Developement of Hindu Polity and Political Theories. P. 327.

دوسرے ایک چور ہوا کرتے تھے جنہیں ''تایو'' کہا جاتا تھا۔ انہیں نہ رواجی تسکروں جیسی ہمت ہوتی تھی، نہ ہی چوری ان کا پیشہ تھا۔ لگتا ہے کہ انہیں جب روزگار کی تنگی ہوتی تھی، یا قرض میں ڈوبے ہوئے ہوتے تھے، تب مجبور ہو کر چوریاں کرتے تھے۔ وہ رات کو گائیں اور کپڑے چوری کرنے جاتے تھے (منڈل چھٹا، ۱۲، ۵)۔ مال مویشی کی چوری عام ہوا کرتی تھی۔ چور گائیں چرا کر، گاؤں سمیت اندھیری غاروں میں جا کر چھپتے تھے (رگ وید، منڈل پہلا، ۶۵، ۱)۔ کچھ دوسروں کے گھروں کو نقب لگاتے تھے، لیکن کتے انہیں بھگا دیتے تھے (منڈل ساتواں، ۵۳، ۳)۔ کچھ رہزن بھی ہوا کرتے تھے، جو جنگلوں میں چھپ کر کھڑے ہو جاتے تھے، اور راہگیروں کو رسیوں سے باندھ کر انہیں لوٹتے تھے (منڈل دسواں، ۴، ۶)۔ کبھی کبھار کچھ ڈاکو آپس میں مل کر کسی گاؤں میں گھس جاتے تھے اور مال مویشی لے جاتے تھے۔ اس وقت گاؤں میں بڑا شور اٹھ کھڑا ہوتا تھا (رگ وید منڈل چوتھا، ۳۸، ۵)۔ سارے گاؤں والے ہمت کر کے ڈاکوؤں کا پیچھا کرتے تھے۔ کچھ ان کے ساتھ ''پگی'' یا پیروں کے نشان پہچاننے والے بھی ہوتے تھے، جو ڈاکوؤں اور چوری کیا ہوا مال مویشی کے پیروں کے نشانات ڈھونڈتے ہوئے ڈاکوؤں تک پہنچ کر انہیں پکڑ لاتے تھے۔[1]

اکثر جیسا گناہ ویسی سزا: اگر کوئی چور پکڑا جاتا تھا تو اُسے رسیوں اور زنجیروں سے باندھتے تھے۔ ویدک انڈیکس، ۱، ۴، ۳، نیز ملاحظہ ہو رگ وید، منڈل پہلا، ۲۴، ۱۳، ساتواں ۸۶، ۵)۔ اتھرو وید کے منڈل ساتویں (۷۰، ۵) میں درج ہے کہ چور کے دونوں بازو پیٹھ پیچھے باندھ دیتے تھے، اور پھر ایسی اس کی پٹائی کرتے تھے کہ اسی کی زنائیں بھی نکال دیتے تھے (اتھرو وید، منڈل چوتھا، ۳)۔ شروع میں یہ دستور ہوا کرتا تھا کہ جس آدمی کی چوری ہو جاتی تھی، وہ جس طرح کی سزا تجویز کرتا تھا، وہ چور کو دیجاتی تھی۔ شاید اس کا مقصد یہ ہو کہ جس کی چوری ہوئی ہے، وہ بلاشک اپنا کلیجا ٹھنڈا کرنے کے لئے چور کو سزا دلوائے، تاکہ بعد میں اس کے دل میں کوئی بغض باقی نہ رہے۔ بعد میں جب راجا مقرر ہوئے، تب چور کو راجا کے سامنے پیش کرتے تھے۔ راجا اکثر چوروں کی پیٹھ کو داغتے تھے (منڈل پانچواں، ۷۹، ۹، اور چھاندگیہ اُپنشد، ۶، ۱۶)۔ چوری کیا ہوا مال اگر ہاتھ آ جاتا تھا تو مالک کو واپس کیا جاتا تھا۔ لوگوں کی جان و مال کے تحفظ کے لئے راجا ذمیدار ہوتا تھا، اس لئے جب چوری کیا ہوا مال واپس ہاتھ نہیں آتا تھا تو سمجھا جاتا تھا کہ راجا نے اپنی فرض ادائی میں کوتاہی کی ہے۔ ایسی صورت میں راجا اپنے شاھی خزانے سے مالک کو مجرائی دلواتا تھا (اگنی پران، ۳۲۳)۔ اس طرح راجا ثابت کرتے تھے کہ اپنی پرجا کی

(1) "In one passage of Reg Veda there is a probable reference to the employment of trained men to recover stolen cattle." Cambridge History of India, Vol. I. page 97.

سنبھال اور تحفظ کا انہیں یہی فکر لاحق رہتی تھے۔ ''پرجا'' لفظ کے عام معنیٰ ہیں ''رعیت''، لیکن اس کے بنیادی معنیٰ ہیں ''اولاد''۔ اس لفظ سے پتہ چلتا ہے کہ راجا اپنی رعیت کو اپنی حقیقی اولاد کی طرح سمجھتے تھے۔ جس طرح بگڑی ہوئی اولاد کو ماں باپ سدھارنے کے لئے سزا دیتے ہیں، اسی طرح راجا بھی مجرموں کو سزا دیتے تھے۔ سزا دینے سے مجرم کو سدھارنے اور جرم کو روکنے کی کوشش کی جاتی ہے، لیکن اس کی مول مراد یہ ہے کہ رعیت کا بچاؤ کیا جائے، اور یہی حکومت کا فرض ہے۔(1)

سماج کے خلاف جو کوئی جرم کرے گا، اس کی سزا ضرور سماج اسے دیگا۔ اس سبب اگر کوئی مجرم کوئی بڑا گناہ کر بیٹھتا تھا، جو راجا سمجھتے تھے کہ ایسے آدمی کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہئے، تو ایسے آدمی کو جیل کی بالائی چوٹی پر سے نیچے گراتے تھے۔ اس وجہ سے وہ فی الفور مر جاتا تھا، یا پھر ہمیشہ کے لئے معزور ہو جاتا تھا (رگ وید، منڈل پہلا، ۱۲۹)، انہین اگر کسی کو موت کی سزا دینا ہوتی تھی تو بروقت اس کی سر دھڑ سے الگ کرواتے تھے۔

اگر کسی جرم کے لئے ثبوت ناکافی ہوتے تھے، تو مجرم کو شک کا فاعدہ دیا جاتا تھا، لیکن ہو سکتا ہے کہ فریادی کے دل میں یہ دکھ رہ جائے کہ وہ سمجھے کہ اس کے ساتھ انصاف نہیں ہوا، اس لئے ملزم کی کسی نی کسی طرح آزمائش کرتے تھے۔ ملزم کو اکثر کہا جاتا تھا کہ وہ جلتی ہوئی آگ میں سے گزر جائے: اگر آگ میں سے گزر کر جل جاتا تھا تو سمجھتے تھے کہ اس نے اپنا اجر پا لیا، اور اگر سلامتی سے اس بڑھکتی ہوئی آگ میں سے نکل جاتا تھا تو سمجھتے تھے کہ وہ بے قصور ہے۔ جس عورت کی عصمت پر انہیں شک ہوتا تھا، تو اس کی بھی اسی طرح آزمائش کرتے تھے۔

ست کی مہما: شرتیوں (ویدوں) میں ستیہ (سچ) کی مہما بہت لکھی ہوئی ہے۔ کہا گیا ہے کہ ست جیسا کوئی اور دھرم نہیں ہے۔ ستت ہی سناتن دھرم ہے۔ پرم مکتی پراپت کرنے کا وسیلہ بھی ست ہے۔ ست ہے دھرم، ست ہے تپ اور ست ہے یوگ۔ ست جیسا کوئی اور یگیہ بھی نہیں ہے، کیونکہ ست کے سہارے ہی اس سنسار کا بیڑا رواں دواں ہے۔ یہ باتیں قدیم لوگوں کے دلوں پر اس طرح نقش تھیں کہ جھوٹ سے وہ آگ بگولے ہو جاتے تھے۔ آج بھی ہمارے لوگوں کا یہی ایمان ہے کہ ''دھرم کی جئہ، پاپ کی کنہ''!

☆

(1) "Dandda or punishment is represented as a part of protection. Viewed in this light, punishment is, in its essence, neither retributive, nor determent or reformatory, but a reaction of the Social order against an unsocial tendency. This is the idea under lying the doctrine of coercion" Dr. Beni Prasad: Theory of Government of Ancient India, P. 344.

باب ۱۶

سناتن دھرم

''دھرم'' لفظ کے معنی: ''دھرم'' لفظ کا مادہ ہے ''دھر'' معنی پشتہ دینا۔ دھرم ایک پشتہ ہے جس کے سہارے یہ سارا سنسار چل رہا ہے۔ رگ وید میں ''دھرم'' لفظ کے معنی ہیں ''قاعدہ''۔[1] جس طرح راجا کے بنائے ہوئے قاعدے کے مطابق حکومت کا چرخہ چلتا ہے، اسی طرح خدا کی منشا موجب سنسار کا بیڑا دھرم پر چلتا ہے، جو ست ہے، وہ دھرم ہے۔ جو نیتی ہے، وہ دھرم ہے۔ یوں دھرم لفظ کے نہایت ہی وسیع معنی ہیں۔ انسان کے جو بھی فرائض ہیں وہ دھرم میں آ جاتے ہیں۔ خیرات کرنا اور دیگر صالح اعمال خواہ وہ کام جو روح کو راحت دینے والے ہوتے ہیں، وہ سب کے سب دھرم کے دھاگے میں لگے ہوئے ہیں۔ اس طرح دھرم کا نام اس دنیا اور اُس دنیا سے ہے۔ جو دھرم سنسار کی باتوں سے تعلق رکھتا ہے، وہ ''پرورتی دھرم'' کہلاتا ہے، اور جو موکش (نجات) سے تعلق رکھتا ہے، وہ ''نورتی درھم'' کہلاتا ہے۔ دھرم کے ان دونوں جہانوں کا بیان ویدوں کے براہمنوں، اُپنشدوں اور دیگر دھرم شاستروں میں ہے۔ سب شاستروں کی بنیاد وید ہیں، اس لئے ہندو دھرم عام طور پر ویدک دھرم کہلاتا ہے۔

وید انادی ہیں یعنی ان کی آدیا شروعات ہے ہی نہیں۔ اسی سبب ہندو دھرم ''سناتن د...
کہلاتا ہے۔ سناتن معنیٰ ''قدیم، اوائلی، دائمی''، اس لئے ''سناتن دھرم'' معنیٰ وہ قدیم د...
شروعات سے جاری ہو اور ہمیشہ ہے (Existing in all eternity)۔

دھرم کا خیال کیسے پیدا ہوا؟: کئی علماء کا کہنا ہے کہ ہندو خواہ دیگر...
خیال موت سے متعلق تصور کرتے ہوئے آیا، جو پیدا ہوتا ہے وہ لازماً مرتا ہے...
آدمی محنت کرتا ہے، مال ملکیت جمع کرتا ہے، لیکن بالآخر سب کچھ یہیں چھوڑ کر...
واقارب میں سے کوئی بھی ساتھی نہیں ہوتا۔ مرنے کے بعد آدمی اکیلا ہی اک...

...eith: Vedic Index, I. 390.

اس طرح کے خیالوں نے لوگوں میں قیامت اور اُس دنیا کے خیالات پیدا کئے۔ کبھی کبھار مرے ہوئے رشتیدار خواب میں دیکھنے میں آتے ہیں، اور ان کو دکھی یا سکھی دیکھا جاتا ہے۔ ایسی باتوں نے بعد کے دکھ اور سکھ کے خیالات پیدا کئے۔ اس طرح مذہب کے تصور کی بنیاد پڑی، اور پھر ہر ایک قوم اپنے اپنے نمونے سے مذہب پر چلنے کی راہیں ٹھہرائیں۔

ہندو مذہب اور اس کا اوائلی وطن: ہندو دھرم کس نے جاری کیا، اور اس کی شروعات کب ہوئی، اس بات کا کسی کو بھی پتہ نہیں۔ جیسا کہ عیسائیوں کے مذہب کی بنیاد ڈالنے والے حضرت عیسیٰؑ، اسلام کی بنیاد ڈالنے والے حضرت محمد صلعم، پارسیوں کے مذہب کی بنیاد ڈالنے والے زردشت (زورسٹر) سمجھے جاتے ہیں، اس طرح ہندو دھرم کسی بنی بشر کے نام پیچھے نہیں کہلاتا۔ ہندو دھرم کی بنیاد ''ست'' ہے، یہ ستیہ سروپ خدا خود سمجھا جاتا ہے۔ ہندو یوں سمجھتے ہیں کہ ''جب دھرم کو نقصان پہنچایا جاتا ہے، اور ادھرم زور پکڑتا ہے، تب دھرم کی حفاظت کرنے کے لئے خدا خود مظہری صورت لے کر آتا ہے''۔ ہندوؤں میں سری رامچندر، سری کرشن اور دیگر کئی مظہرِ خدا بنے ہیں، جنہیں ہندو آج تک پوجتے ہیں، تب بھی انہیں ہندو دھرم کا بانی نہیں سمجھا جاتا، اور نہ ہی انہوں نے خود اس طرح کا کوئی دعویٰ کیا۔ ہندو دھرم ان سے بہت بہت پہلے کی بات ہے، اور عام طور پر ''سناتن'' (قدیم) دھرم کہلاتا ہے، جیسا کہ پہلے مذکور ہو چکا۔

ہندو دھرم کی بنیاد جن اصولوں پر مبنی ہے، وہ بھی کسی ایک فرد کے جاری کردہ یا پھیلائے ہوئے ہیں۔ یہ ویدک دھرم ہے اور وید کی رچائیں کئی رشیوں کی کہی ہوئی ہیں۔ جیسے جیسے انہیں الہام یا سرسوتی بات کرتا تھا، ویسے ویسے انہوں نے بولا۔ قدیم رشیوں میں سے بعض اول دریائے کنارے، تو بعض سرسوتی پنجاب کے دریاؤں کے کناروں پر رہتے تھے، اس لئے ہندو دھرم کے اوائلی مقامات سندھ اور پنجاب ہیں، جن میں سے سندھو نام اتنا افضل تھا، کہ ہندو اور سارا ہندستان آج تک ''سندھو'' (ہندو) نام پیچھے پکارا جاتا ہے۔

جتنا خود کشادہ ہے، اتنی ہی کشادہ خیالی اس نے قدیم رشیوں میں پیدا عقیدہ کا ہو، اور کسی بھی طرح کی پوجا کرے، تو اس کے لئے اُسے کھلی مذہب پر چلنے سے بھلے کوئی بھی ہندو اپنے آپ کو کسی بھی فرقہ کا ''پنتھ'' لفظ وہ ہی ہے، جس کا تلفظ سندھی میں ''پندھ'' (راہ، وہ سارے سچے مالک سے ملنے کے لئے ''پندھ'' (راہیں) کیونکہ سارے راستے بالآخر اُسی تک پہنچاتے ہیں، جو کا کام ہے۔ شریمد بھاگوت گیتا میں سری کرشن

ell and R

ہندو یہ دعویٰ بھی نہیں کرتے کہ، صرف ان ہی کے مذہب سے نجات ممکن ہے۔ اس سلسلے میں اُپنشدوں میں کہا گیا ہے کہ ''جس طرح گائیں مختلف رنگوں کی ہوتی ہیں، لیکن سب گائیں ایک ہی جیسا سفید دودھ دیتی ہیں، اسی طرح دھرم (مذہب) اگرچہ کئی انواع کے ہیں، پھر بھی سب کا مقصد صرف ایک ہی ہے''۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو لوگ تمام مذہبوں کی عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور ان کا مقصد ایک ہی اور نہایت بیش بہا سمجھتے ہیں۔

ہندوؤں کے دیوتا: قدیم آریہ لوگ قدرت کے کاموں میں غور وفکر کرتے تھے، اور قدرت کی ہر ایک بات پر سوچ و بچار کر کے، قدرت میں سے قادر کے ساتھ ملنے کا راستہ انہوں نے ڈھونڈھ نکالا۔ ان کی اندر والی آنکھ کھلی تھی۔ قدرت کی ہر ایک بات کی طرف جیسے جیسے وہ جس شاعرانہ نظر سے دیکھا کرتے تھے، ویسے ویسے ان کے اندر میں امنگیں جنم لینے لگیں، اور واحد کی بڑائی اور بزرگی بیان کرنے میں پھوٹ پڑتے۔ ان کے خیال کی ساری رفتار کا رگ وید سے بلکل واضح طور پر ادراک کیا جاسکتا ہے، اور پھر سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ ہندوؤں کے دیوتاؤں کی تعداد کیسے بڑھی، اور کس طرح قدیم آریوں نے کثرت سے وحدت کا کھوج نکالا۔

آکاس اور پرتھوی۔۔ ماں باپ: قدیم لوگوں نے اپنے اوپر اتنا سارا آسمان دیکھا، جو قدرت کا ایک عجیب کرشمہ ہے: اس پر دن کو سورج اور رات کو چاند تارے چمکتے ہیں، جو حیرت انگیز رونق لاتے ہیں۔ اس کا نام انہوں نے رکھا ''آکاش''، جس کے معنی ہیں آسمان، لیکن اس کے بنیادی معنی ہیں ''وہ جو چاروں طرف چمکتا ہے۔''(1) اس چمکتے ہوئے آسمان کے دیوتا کو انہوں نے کہا ''دیوس پتر'' یعنی ''باپ آکاس'' (The sky father)۔ ''دیوتا'' لفظ کے معنی ہی ہیں چمکنے والا (Shining being)، اور اس کا مادہ ہے ''دو'' معنی ''چمکنا یا روشنائی کرنا''۔ پھر ''دیوتا'' لفظ وسیع معنی میں استعمال ہونے لگا، جس وجہ سے پرتھوی (زمین)، پون (ہوا) وغیرہ بھی دیوتا کہلانے لگے۔

قدیم لوگوں نے اپنے پاؤں تلے اتنی بڑی زمین دیکھی، تو اس کا نام رکھا ''پرتھوی''، جس کے بنیادی معنی ہیں ''وہ جو چوڑی ہے'' اسے ''دھرتی'' بھی کہا گیا، جس کے لفظی معنی ہیں ''وہ جو جھلی کھڑی ہے۔'' ''دھر'' معنی ''جھلن''۔ یہ پرتھوی یا دھرتی، جنگلی جانوروں یا دیگر جاندار خواہ بے جان چیزوں کو ماں کی طرح اپنی گود میں لیے ہوئے ہے، اور سب جانداروں کو اس طرح کھانا پہنچا رہی ہے، جس طرح ماں اپنے بچوں کو پہنچاتی ہے۔ اس طرح کے خیالات کی وجہ سے پرتھوی کو کہنے لگے ''دھرتی ماتا''۔ دھرتی کے اوپر جس وقت سورج موجود ہوتا ہے، تب

(1) سنسکرت میں ''آ'' معنی ''چاروں طرف'' اور ''کاش'' معنی ''چمکنا'' (کاشی کی اینٹ معنی چمکنے والی اینٹ۔) ''آ'' کے معنی ''بلکل'' کے بھی ہیں۔ اسی وجہ سے آکاش کے معنی ہوئے ''جو بلکل چمکتا ہے'' یا ''جو بلکل روشن ہے''۔

درخت اور پودے ایک عمدہ رونق لگائے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، اور ہر ایک چمن میں رونق لگ ہوئی ہے۔ اس وقت دھرتی گویا کہ تابندہ دکھتی ہے۔ چاندنی رات میں دھرتی پر گویا کہ چاند اُنڈیلی جاتی ہے، اور دریاؤں اور تالابوں کا پانی چاندی کی طرح چمکنے لگتا ہے، اسے لئے دھرتی کو بھی دیوتا کہا گیا۔

دھرتی پر کسی بھی جگہ کھڑے ہو کر دور دور نگاہ کی جاتی ہے تو یوں لگتا ہے کہ جیسے دھرتی او آسمان ایک جگہ آ کر مل گئے ہوں۔ گویا کہ ان کے ملاپ سے یہ ساری دنیا پیدا ہوئی ہے۔ آسمان سے برسات کی بوندیں گرتی ہیں، تو دھرتی انہیں جھپٹ لیتی ہے اور اسی طرح اپجتی ہوتی ہے (اتھرو وید، منڈل بارہواں، ۱، ۱۲، ۴۲)۔ ائتر ییہ براہمن، (۴، ۲۷) میں آکاس اور پرتھوی کی شادی کا ذکر ہے۔ یہ سارے شاعرانہ خیال ہیں۔ ایسے خیالوں کی بنا پر آکاس اور پرتھوی (زمین) کو سارے جہاں کا ماں باپ کہا گیا (رگ وید، منڈل پہلا، ۱۵۵، ۳، منڈل تیسرا، ۳، ۱۱، منڈل ساتواں، ۵۳، ۲)۔ قدیم یونانی لوگوں نے بھی اسی طرح شاعرانہ طریقے سے آکاس اور پرتھوی کو سارے جہاں کا ماں باپ کہا ہے۔

ادتیہ اور دئت: رگ وید میں آکاس اور پرتھوی (زمین و آسمان) کو دیوتاؤں کا بھی ماں باپ کہا گیا ہے۔ اس بات میں ایک اور خیال مضمر ہے، جس کی وضاحت کی جاتی ہے۔ زمین سے لے کر آسمان تک اور آسمان سے اوپر جو کچھ بھی ہے اس کی کوئی حد نہیں۔ اس سارے خلا کو بھی دیوی کا روپ سمجھا گیا، اور اس کا نام رکھا گیا ''ادتی'' (Aditi)، جس کے لفظی معنی ہیں ''بے حد یعنی آزاد یا ''انتتا'' یعنی جس کی کوئی حد نہ ہو (لاحد (Ifinity''۔ ''ادتی'' کے دوسرے معنی ہیں ''وہ جو کاٹی جانے یا ناس ہونے والی نہیں ہے''۔ اس لئے پروفیسر راتھ Professor (Roth کے خیال مطابق یہ ہمیشگی (Eternity) کا روپ ہے؛ آسمان کے دیوتا (سورج وغیرہ) اس ہمیشگی کی اولاد ہیں، اور ہمیشہ کھڑے ہیں، اس لئے وہ ''آدتیہ'' یعنی اُدتی کے بیٹے کہلاتے ہیں۔ اُدتی کو دیو ماتا یعنی دیوتاؤں کی ماں کہا گیا ہے۔ اوائل میں صرف سات اُدتیہ کہلاتے تھے جن میں سے اہم ورن دیوتا تھا، جس کا تذکرہ علیحدہ کیا جائے گا۔ دیوتا ہمیشہ اَمر ہیں یعنی مرنے والی چیز نہیں ہیں، لیکن رگ وید کے منڈل دسویں (۷۲، ۸۔۹) میں درج ہے کہ اُدتی نے ایک بیٹا مارتنڈ (سورج: امر دیوتاؤں کے دفعے سے نکال لیا، اس لئے جنم لینے اور مرنے کا قاعدہ اس کے ساتھ لاگو ہو گیا۔ یہ رنگین زبانی ہے۔ سورج روزانہ صبح کو جنم لیتا ہے، اور رات کو مر جاتا ہے، دوسرے دن صبح کو پھر جنم لیتا ہے، اس لئے اسے اَمر نہیں کہا جائیگا۔

ویدوں کے بعد براہمن والے زمانے میں اَدتیوں کی تعداد بڑھ کر بارہ ہوگئی، یہ سال کے بارہ مہینوں کے سورج کے سروپ ہیں۔ سندھی میں آدتیہ کا تلفظ ہے ''آڏت'' اور اس کے معنی ہیں ''سورج''۔ ادتیہ وار (آڏتوار یا آرتوار) کے معنی ہیں سورج دیوتا کا دن (Sunday)۔ ''ادتی'' کا ضد ہے ''دتی'' معنیٰ محدود۔ اس میں عالمِ پاتال شمار کیا گیا ہے۔ دتی کی اولاد کو ''دئتیہ'' یعنی دتی کے بیٹے کہا گیا ہے۔ دئتیہ کا تلفظ سندھی میں ہے ''دئت'' اور اس کے معنی ہیں بھوت یا راکاس۔ ادتی اور دتی کو پھر مجسم (Personify) کر کے، ان سے متعلق کچھ کہانیاں بنائی گئی ہیں، جو اتہاسوں اور پرانوں میں درج ہیں۔

ورن دیوتا: آسمان میں جو ادتیہ ہیں، ان کے اوپر ورن دیوتا ہے۔ ''ورن'' لفظ کا مادہ ہے ''ور'' (Vri) معنیٰ اوپر سے ڈھانپ لینا۔ زمین کو آسمان نے اوپر سے ڈھانپ لیا ہے، اس لئے آسمان ''ورن'' ہے۔ آسمان اور سمندر اُفق کے مقام پر ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے نظر آتے ہیں، اور سارے دریا سمندر میں جا کر گرتے ہیں، اس لئے ''ورن'' سمندر خواہ دریاؤں کا بھی دیوتا ہے، اور وہ پانی کو اوپر سے ڈھانکے ہوئے ہے۔ اس طرح زمین خواہ آسمان سارے ورن دیوتا کے حکومت کی حدود کے اندر سمجھے جاتے ہیں۔ رگ وید میں ورن دیوتا سے متعلق یوں لکھا ہوا ہے:

''وہ آکاس خواہ دھرتی کا سہارا ہے، اور سب جہانوں میں حاکم بن کر رہتا ہے (منڈل آٹھواں، ۴۲، ۱)۔ سونے جیسے سورج کو وہ آسمان میں چلاتا اور چمکاتا ہے (منڈل چھٹا، ۷۰، ۱ اور ساتواں، ۸۶، ۱، ۸۷، ۶)۔ ہوا جو تند رفتاری سے چلتی ہے، وہ اس کی سواس (سانس) ہے (منڈل ساتواں، ۸۷، ۲)۔ دریاؤں کے پیٹ اس نے بنائے ہیں، اور سارے دریا اس کے حکم کے مطابق بہتے ہیں'' منڈل پہلا، ۲۴، ۸، منڈل دوسرا، ۲۸، ۴ اور منڈل ساتواں، ۸۷، ۱)۔ ایسی عجیب حکمت رکھی ہے اس نے کہ سارے دریا سمندر میں جا کر گرتے ہیں، لیکن اسے کبھی بھی بھر نہیں سکتے (منڈل پانچواں، ۸۵، ۶)۔ اس کے کام مقرر ہیں، اور وہ امر کوئی پھلانگ نہیں سکتا (منڈل تیسرا، ۵۴، ۱۸)۔ اس کے حکم مطابق چاند اپنی چاندنی بکھیرتا ہے، دن کو تارے غیبی طرح غائب ہو جاتے ہیں (منڈل پہلا، ۲۴، ۱۰)۔ آسمان میں پرندے جو راستے لے کر اڑتے ہیں، سمندر میں جہاز جس راستے سے جاتے ہیں، اور ہوا دور دور تک کس راستے سے جاتی ہے، ان سب باتوں کا علم صرف اُسی کو ہے۔ جو مخفی کام ہو رہے ہیں، یا ہونے ہیں، وہ سارے کے سارے وہ خود ہی دیکھ رہا ہے (منڈل پہلا، ۲۵، ۷)۔ کوئی بھی پرانی یا جاندار اس کے بغیر آنکھ بھی نہیں جھپک سکتا، اور لوگوں کے سچ خواہ جھوٹ کا وہ گواہ ہے (منڈل ساتواں، ۲۸، ۶)۔ مطلب یہ کہ ورن دیوتا سارے جہاں کے اوپر ہے، اور ہر جگہ حاضر اور سب کچھ جاننے والا ہے،

اور قدرت کی ساری باتوں پر اسے ضابطہ ہے۔ یہ خدائی طاقت جہاں کا چرخہ ایک نظام تحت چلا رہی ہے اور ہر بات اس کی ڈور سے بندھی ہوئی ہے، اس لئے سورج، چاند وغیرہ بھی بلکل باقاعدہ اپنا کام کرتے ہیں، اسی ''طرح'' (Cosmic order) کو ''ورن دیوتا'' کہا گیا ہے، اور کہا گیا ہے کہ اخلاقی باتوں میں بھی ایک طرح سے چلنا چاہئے ورنہ خطا کا احتمال ہے''۔

اندر دیوتا اور ورتر دئت: رگ وید والے زمانے میں ہی کسی وقت ورن دیوتا کی اختیاری کم ہوگئی، اور اس کے اسباب آج تک قدرت میں نمایاں ہیں۔ گرمی کے موسم میں جب گھٹن، اور پسینہ زیادہ ہوتا ہے، تب لوگ ٹھنڈی ہوا کے لئے ترستے ہیں، مزید برآں جب دیکھتے ہیں کہ آسمان پر کالے بادل چھا گئے ہیں، لیکن برسات کا ایک قطرہ بھی نہین برس رہا، تب انہیں قدرتاً غصہ آنے لگتا ہے۔ سورج، چاند، تارے وغیرہ جو آسمان میں ہیں، وہ ہمیشہ سب کا اچھا کرتے ہیں، اس لئے قدیم آریوں نے رنگین زبانی میں سمجھایا کہ آکاس کے دیوتا سب لوگوں کی بھلائی میں ہیں، اور کسی کے بھی بدخواہ نہیں ہوتے، لیکن آکاس میں کچھ دئت بھی ہیں، جن کے بداثرات کی وجہ سے وبائیں پھیلتی ہیں، خوفناک طوفان برپا ہوتے ہیں، اور سیلاب آتے ہیں۔ یہ دئت برسات کو برسنے سے بھی روکتے ہیں، جس وجہ سے زمینیں سوکھ جاتی ہیں، مال مویشی کے لئے کافی چارہ پیدا نہیں ہوتا، اور گھٹن کے باعث لوگ بے حال ہو جاتے ہیں۔ ان دئتوں کا سردار ''ورتر'' (چھپانے والا) کہا گیا ہے، جس کے لئے کہا گیا ہے کہ وہ کئی روپ رکھتا ہے۔ اس کا ایک روپ کالے بادل ہیں، جو سورج دیوتا، چندرما دیوتا (چاند) اور سیاروں اور تاروں کو چھپاتے ہیں، گویا کہ کسی ایسے قیدخانے میں انہیں قید کیا جاتا ہے کہ جو کئی روز تک وہ دیکھنے میں بھی نہیں آتے، اس لئے انہیں دیوتاؤں کا دشمن کہا گیا ہے۔ یہ سب جانداروں کے بھی جانی دشمن ہیں، کیونکہ وہ برسات کو برسنے سے روکتے ہیں، جس وجہ سے لوگ خواہ جنگلی جانور بلکہ پرندے اور دیگر جاندار سارنگ کو ترستے ہیں۔ (1)

رگ وید میں ورتر دئت کا دوسرا نام ''اَھی'' یعنی ''سانپ'' بھی درج ہے۔ اس سے علماء نے یہ قیاس آرائی کی ہے کہ یہ اشارہ بجلی کر طرف ہے۔ جسے کے بل شل سانپ کی طرح کے ہیں۔ آسمانی برق کڑکے، اور پھر بھی برسات نہ برسے، تو یہ جھوٹی برق کہی جائیگی اور یہ بھی ورتر دئت کا ایک روپ سمجھی جائیگی۔ ایسے مواقع پر قدیم لوگوں نے شاید یوں سمجھا کہ ورن دیوتا کو اتنی طاقت نہیں ہے، کہ وہ ورتر دئت کا مقابلہ کر سکے۔ اس لئے ورتر اور اس کے دئتوں

(1) «سارنگ کي سارين، ماڻهو، مرگ، مينهون،
آڙيون ابر آسري، تاڙا تنوارين.» (شاھ)
[آدمی، ہرن اور بھینسیں بارش کو پکارتے ہیں
مرغابیاں اور تاڑے (پرندے) بارش کی آس میں ہیں]

سے جنگ کرنے اور اسے شکست دینے کے لئے کسی زیادہ طاقتور دیوتا کی انہوں نے ضرورت محسوس کی۔ لگتا ہے کہ کسی وقت آسمان میں گھگھور ہوئی اور بجلی کڑکنے لگی، اور برسات رم جھم برسنے لگی، تو انہوں نے سمجھا کہ یہ بڑا دیوتا ہے اور ورتر سے زیادہ طاقتور ہے، جو اپنی وجر (Thunder - bolt) سے دئتوں کے آسماں میں قائم اڈے (کالے بادلوں کے قلعے) توڑتا ہے، تو میٹھی میٹھی برسات برستی ہے، جس وجہ سے میدانوں میں گھاس اگتی ہے، راستوں پر گھاس اگتی ہے، تو نہ صرف آدمی بلکہ چرند پرند اور جیت وغیرہ بھی خوش ہوتے ہیں۔ برسات برسنے کے بعد، آسمان صاف ہو جاتا ہے، تو سورج، چاند اور تارے نکل کر ظاہر ہوتے ہیں، گویا کہ قید سے انہیں رہائی مل جاتی ہے۔ یہ طاقتور دیوتا، جو ورتر خواہ اس کے دئتوں کو زیر کرتا ہے، اس کا پہلے نام رکھا گیا ''ترتہ'' (Trita) یعنی موسمی برسات کے تیسرے مہینے میں برسات برسانے والا، بعد میں ''پرجنیہ'' یعنی بادل (برسنے والا بادل)، اور پھر ''اندر'' جس کے معنی ہیں ''طاقتور''۔ (اِند معنیٰ طاقت والا ہونا)۔

ورتر خواہ اس کے دئت کوئی آسان گروہ نہیں ہیں۔ ایک دفعہ وہ اِندر دیوتا کے ہاتوں قتل ہو جائیں، تو بار بار جنم لے کر، شرارت کر کے، برسات کو آ کر روکتے ہیں۔ یوں اندر دیوتا کے ساتھ وہ جگا جگ جنگیں جوتتے آتے ہیں، لیکن اندر دیوتا ہر دفعہ انہیں مار کر ختم کر دیتا ہے۔ اندر اور ورتر کی لڑائی کا تذکرہ رگ وید میں نہایت ہی دلچسپ انداز میں کیا گیا ہے۔ اس کا انگریزی زبان میں ترجمہ بھی ایک عمدہ طریق سے کیا گیا ہے، جس میں سے چند ایک مصراعیں یہاں نمونے کے طور پر دی جاتی ہیں:

Who is that, without arm,
Defies the might of Indra's arms;
That stands and sees without dismay,
The approaching Maruts' dread array;
That does not shun, in wild affright,
The terrors of the deadly fight?
Tis Vrittra, he whose magic powers,
From earth with held the genial showers;
Of mortal men the foe malign,
And rival of the race-divine;
Whose demon hosts from age to age,
With Indra war unnumbered, crushed and slain.
Is ever newly born again:
And evermore renews the and strife,

In which again he forfeits life.
(J. Muir: Original Sanskrit Texts: Vol: V)

اندر بڑا یا ورن۹: ورن دیوتا یا چمکنے والے آسمان کا دیوتا، جو سارے جہاں کے اوپر ہے، وہ بہت بہتر، لیکن جو گجگوڑ کرنے والے آسمان کا دیوتا (اندر دیوتا)، جو برسات برساتا ہے، وہ زیادہ بہتر ہے۔ قدیم آریوں کے گزارے کا دارومدار کھیتی باڑی اور دوسرے مال مویشی پر تھا، اس لئے برسات کے دیوتا (اِندر) کی پوجا کا رواج انہوں نے جاری کیا۔ پہلے ورن دیوتا کے ساتھ ''متر'' (سورج) کا نام ایک ساتھ لیتے تھے، لیکن بعد میں ورن دیوتا کے نام کے ساتھ اندر دیوتا (Jupiter Plurius) کا نام شامل کرلیا (رگ وید، منڈل پہلا، ۷، اور منڈل تیسرا، ۳۸)۔

اندر دیوتا کی پوجا کا رواج جاری ہوا، تو جو اصل میں ورن دیوتا کو مانتے تھے، ان میں بعض نے اعتراض کیا۔۔ مثلاً نیم (Nema) نامی ایک رشی نے کہا کہ ''اندر دیوتا ہے ہی نہیں۔ کسی نے دیکھا بھی ہے؟ ہم کیوں اس کی تعریف کریں؟'' (منڈل آٹھواں، ۱۰۰، ۳)۔ اس پر اندر دیوتا نے اسے زیارت کروا کر کہا کہ ''لے، میں تیرے پاس آ گیا ہوں، میری طرف دیکھ''۔ لگتا ہے کہ برسات برسا کر اسے اپنا مشاہدہ کروایا۔ اس کے باوجود بھی اندر دیوتا کے برخلاف کئی لوگ تھے، اور اس پر بڑے تصادم ہوئے تھے۔

رگ وید کے منڈل چوتھے (۴۲) میں اندر دیوتا اور ورن دیوتا کے مابین گفتگو درج ہے۔ اندر کہتا ہے کہ میں بڑا، تو ورن کہتا ہے کہ میں بڑا۔ رفتہ رفتہ ورن صرف پانی کا دیوتا کہلانے لگا، اور عام طور پر لوگ اندر کو برسات کا دیوتا سمجھ کر پوجنے لگے۔ یہ رواج مہا بھارت کے زمانے تک مسلسل جاری تھا۔ اس زمانے میں اندر دیوتا کی پوجا کے برخلاف سری کرشن نے تبلیغ کی۔ اس بات کا شریمد بھاگوت کے دسویں اِسکندھ میں تذکرہ ہے۔ اس کے بعد بھی اِندر کی پوجا کا رواج جاری رہا۔ ۶۰۰ برس ق۔م گوتم بدھ نے اندر دیوتا کی پوجا کے خلاف آواز بلند کی۔ اندر دیوتا کے لئے لوگ قربانیاں چڑھاتے تھے، یہ رواج اس نے بند کروایا۔ اس وقت ان میں قربانیاں چڑہانے کا رواج نہیں ہے، تو بھی سارے ہندستان کے ہندو اندر کو برسات کا دیوتا کہتے ہیں، اور ورن دیوتا کو پانی کا دیوتا سمجھ کر پوجتے ہیں۔ جو ہندو دریا پنتھی ہیں، وہ سری اڈیرے لعل صاحب کو ورن دیوتا کا مظہر مانتے ہیں۔ وہ آٹے کا ایک بڑا گولہ بنا کر، اس پر سیندھر، پھول شول لگا کر، اور چوکھو دیئہ جلا کر ''بحرانو'' یعنی بحر کا نذرانہ نکالتے ہیں۔ یوں ورن دیوتا کی پوجا آج تک جاری ہے۔

ایو، مروت اور ردر: دھرتی اور آکاس یا پولار (Ether) کے علاوہ دوسرے عناصر ہوا، آگ، اور پانی ہیں، جنہیں اتنی طاقت ہے، جو کسی بھی بنی بشر کو نہیں ہے۔ اس لئے قدیم لوگ انہیں بھی دیوتا سمجھ کر پوجتے تھے۔ ہوا کو ''وایو'' کہتے تھے، جس کا تلفظ سندھی میں ہے ''واءُ''، اور اس کا مادہ ہے ''وا'' معنیٰ لگنا۔ وایو یا واء وہ ہے، جو لگتا (چلتا) ہے۔ ہوا کے بغیر کوئی بھی جاندار زندہ نہیں رہ سکتا، اس لئے اس کی بڑی قدر کر کے، اسے دیوتاؤں کے دفعے میں شمار کیا گیا۔

برساتی موسم میں جو تیز ہوائیں یا طوفان آتے ہیں، انہیں قدیم لوگوں نے ''مَروَت'' کا نام دیا۔ وہ برسات کو بڑی تیزی سے لاتے ہیں، اس لئے انہیں اندر دیوتا کے معاون کہا گیا ہے۔ ان مدد سے اندر دیوتا ''ورتردئت'' کو زیر کرتا ہے، تو برسات تیزی سے برستی ہے۔ آسمان میں جو بادل آپس میں ٹکرا کر، خوفناک کڑک کرتے ہیں، اسے قدیم لوگوں نے نام دیا ''ردر'' (خوفناک)، کیونکہ ان کی کڑک کی وجہ سے جبڑے بھی کانپنے لگتے ہیں۔ یہ شو بھگوان کے روپ شمار کیے گئے ہیں۔ ''شو'' اور ''شنکر'' لفظوں کے معنی ہیں ''کلیان کرنے والا''۔ ہیبت ناک آواز ہونے کے باعث شو بھگوان ''ردر'' (خوفناک) روپ والا سمجھا جاتا ہے، یہی برسات برسا کر زندگی آسان کرتا ہے، اس لئے ''شو'' اور ''شنکر'' کہلاتا ہے۔ ''شمبھو'' لفظ کے بھی معنی ہیں ''وہ، جن سے کلیان ہوں''۔

اگنی دیوتا: آگ جلانے کا ہنر قدیم آریہ لوگ اس قدیم زمانے میں سیکھے، جس زمانے میں یورپی لوگوں کے آباء واجداد بھی میرو پربت طرف ان کے ساتھ رہتے تھے۔ یہ بات اس لئے کہی جا رہی ہے، کیونکہ سنسکرت میں آگ کو ''اگنی'' کہا جاتا ہے، اور یہی لفظ لاطینی زبان میں بھی ہے اور اس کا تلفظ ہے ''اگنس'' (Ignis)۔

رگ وید میں اندر دیوتا کے بعد اگن دیوتا کی جتنی تعریف ہے، اُتنی کسی اور دیوتا کی نہیں ہے۔ ان تعریفوں سے قدیم آریوں کی شاعرانہ خصوصیات اچھی طرح نمایاں ہیں۔ رگ وید کے منڈل پہلے (۱۰۳، ۱) میں کہا گیا ہے کہ ''اے اگنی، تیرا عنصر اگرچہ ایک ہی ہوگا، تاہم تیرے روپ تین ہیں۔ اس زمین پر تو آگ بن کر بھڑکتی ہے، بیچ آسمان میں تو بجلی بن کر چمکتی ہے اور بالا آسمان پر تو سونے کا سورج بن کر چمکتی ہے۔ تیرا جنم اصل میں آکاس میں ہوا تھا، لیکن جو ویدوں کے عالم تھے، وہ اپنی حرفت چلا کر، تمہیں زمین پر لے آئے، گویا کہ آسمان کے باعث بجلی لوگوں کے چولہوں میں آکر قدم رکھا۔ قدیم رشیوں نے لکڑی کو لکڑی سے رگڑ کر آگ پیدا کی، گویا کہ دو لکڑیوں کا اپنے ہاتوں سے ہتھیالہ بنا کر ان کی شادی کروائی گئی، جس سے دہکتی ہوئی اگنی پیدا ہوئی، لیکن آسمان اور زمین، میں سچ کہتا ہوں کہ وہ بچہ جو غیر فطری طریقے سے پیدا ہوتا ہے، وہ اپنے ماں باپ (دو لکڑیوں) کو جلا کے رکھ دیتا ہے۔ یوں ماں کی سانسیں جلد ختم ہو جاتی ہیں، اور جس طرح بچے کو پالنا

چاہیئے اس طرح نہیں کر سکتی۔ لیکن یہ عجیب بچہ (اگن دیوتا) پھر بھی زندہ رہتا ہے۔۔۔ دھویں کے جھنڈوں والی اگنی تو کڑکڑ کرتی ہے، تیرے بال شعاع کرتے ہیں۔۔۔ گھر گھر میں تو مہمان بن کر آتی ہے، تو ہر کوئی تیرا احترام کرتا ہے۔۔۔ لیکن اے دیوتا، جب تو آفت بن کر، بھیانک شعاع کرتی ہے، اور سب کچھ ناس کرنے کی طاقت جو تجھ میں ہے، وہ ظاہر کرتی ہے، تب سارے جاندار تجھ سے یوں بھاگ جاتے ہیں، جس طرح غالب ہونے والے غنیم کا پیچھا کرنے کے سبب (کمزور پارٹی کا لشکر) بھاگ جاتا ہے۔ تو جس کو لگتی ہے اسے بھسم کر کے مٹی میں ملا دیتی ہے۔ بڑے بڑے جنگلوں کی تو اس طرح صفائی کرتی ہے، جس طرح نائی استرے سے داڑھی کی صفائی کر دیتا ہے۔ آگ کے اوڑاہ کو ہوا دیتی ہے تو سمندر کی لہرون کی طرح آواز کرتی ہے، پرندے ڈر کر بھاگ جاتے ہیں، اور جب وہ اوڑاہ ختم ہو جاتا ہے، تب سارے راستے میں صرف سیاہی نظر آتی ہے۔ لیکن اے مہا اگنی، تو ہمیشہ اس طرح کا بھیانک روپ نہیں رکھتی۔ تو کمزور ہو کر ہمارے چولہوں مین چمکتی ہے، اور ہم خیال سے تجھے رکھتے ہیں تو ہمارے گھر روشن ہو جاتے ہیں۔ جو لوگ ان تھک ہو کر محنت کرتے ہیں، انہیں تو بلکل طعام پہنچاتی ہے، تو وہ خوش ہو جاتے ہیں۔ تیری خوراک سوکھے ہوئے تنے ور مکھن ہیں، جو تمہیں پسند ہیں۔ میرے پاس نہ کوئی گائے ہے، اور نہ ہی کوئی جمع شدہ مکھن، نہ ہی لکڑیاں جمع کرنے کے لئے کوئی کلہاڑا ہے؛ لیکن اے دیالو دیوتا، میں نے تیرے لئے یہ چند ایک سوکھی لکڑیاں لے آیا ہوں۔ دوسری لکڑیاں میرے پاس نہیں ہیں، اس لئے میری یہ غریبانہ قربانی قبول کر"۔ اس سارے مضمون کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا ہوا ہے، جس میں سے چند ایک مصراعیں یہاں نمونے کے طور پر دی جاتی ہیں:

Great Agni, though thine essence be but one,
They forms are three: as fire thou blazest here,
As lighning flashest in the atmosphere,
in heaven thou flamest as the golden sun.
It was in heaven thou hadst they primal birth,
By art of sages skilled in sacred lore
Thou was drawn down to human hearths of yore,
And thou abid'st a denizen of earth,
Sprung from the mystic fair[1] by priestly hands
In wedlock joined, forth flashes, Agni bright,
But, O ye Heavens and Earth, I tell you right,
The unnatural child devours the parent brands,

(1) The two pieces of fuel by the attrition of which fire is produced, and which are represented as husband and wife.

And yet this orphaned god himself survives
Although his hapless mother soon express,
And cannot nurse the babe, as babe requires,
Great Agni, wondrous infant, grows and thrives,
Dr. J. Muir: Original Sanskrit Texts Vol. V, P.221.

جب کبھی کچھ پکایا جائیگا، تو آگ کی ضرورت تو پڑے گی ۔۔ بار بار لکڑی لکڑی سے رگڑ کر آگ پیدا کرنے سے آسان طریقہ تو یہ ہے کہ آگ میں ایک لکڑی ڈال دی جائے تا کہ آگ جلتی رہے۔ قدیم لوگ گھی اور مکھن بھی آگ میں ڈالتے تھے تا کہ اچھا خاصہ بھنبھٹ ہو جائے۔ یگیہ اور ہون ہوم کی شروعات اس طرح ہوئی۔ اگنی میں آہوتی (گیہ وغیرہ) ڈالا جاتا ہے تو آگ بھڑک کر آسماں سے لگ جاتی ہے۔ اس سے بھی قدیم رشیوں کو کوئی شاعرانہ خیال آیا، جو ویدوں میں اگن دیوتا سے متعلق درج ہے کہ وہ ایک سبک رفتار قاصد ہے، جو فوراً آسمان تک پہنچ جاتا ہے۔ یگیہ کی اگنی میں جو کچھ ڈالا جاتا ہے، اس کا جوہر آسمان میں رہائش پذیر دیوتاؤں تک پہنچ جاتا ہے، اور اپنے ساتھ لے کر انہیں زمین پر انکے پوجاریوں تک لے آتا ہے، جو یگیہ کی اگنی جلاتے ہیں۔ ان دیوتاؤں کی دعا اور کرم سے پوجاری ترقی کرتے رہتے ہیں اور بڑے خوش بخت ہو جاتے ہیں۔

کسی پرانی کا اگنی سنسکار کیا جاتا ہے، اور لکڑے دیے جاتے ہیں، تو بھی آگ عرش تک پہنچ جاتی ہے۔ اس وقت گویا کہ زمین اور آسمان کے درمیان اگنی ایک پل کے مثل ہوتی ہے، جس پر سے پرانی کی روح گزر کر سرگ میں جا کر بس جاتی ہے۔ یہ تھے اگنی سے متعلق قدیم آریوں کے خیالات۔

سورج دیوتا: رگ وید میں بھی سورج دیوتا کی بڑی تعریف کی گئی ہے، اس اس کے کئی ایک نام درج ہیں۔ ''سورج'' اصل میں ہے سنسکرت لفظ ''سُوریہ''، اور اس کا مادہ ہے ''سوُ'' معنیٰ پیدا ہونا۔ ہر قسم کی پیدائش سورج کی روشنی سے ہوتی ہے، اس لئے وہ سب کا ''متر'' (رشتیدار) ہے۔ ورن دیوتا کا بڑا تعلق تاروں بھری رات سے ہے، لیکن دن کو دیوتا سورج ہے، اس لئے رگ وید میں ورن دیوتا کے نام کے ساتھ ''متر'' کئی دفعہ استعمال ہوا ہے، جس کے کسی جگہ معنی ہیں ''سورج'' تو کسی جگہ اس کے معنی ہیں وہ قوت جو سورج کو پورے وقت پر طلوع کر کے سارے جہاں کے اوپر روشنی پھیلاتی ہے۔(1)

سورج کی روشنی پر سبزہ ہوتا ہے، اس لئے سورج کو ''پُوشن'' بھی کہتے تھے۔ جس کے لفظی معنی ہیں ''طلوع کرنے والا''۔ قدیم آریہ لوگ جب مال مویشی چرانے جاتے تھے، تب پوشن دیوتا (سورج دیوتا) کو اپنا ایک عمدہ رہبر سمجھتے تھے۔ سورج کی روشنی پر اچھے چراگاہ ڈھونڈھ نکالے جا

(1) Z.A. Ragozin, Vedic India, P. 149.

سکتے ہیں، جہاں مال مویشی گھاس کھا کر صحتمند ہو جاتا ہے، اس لئے پوشن دیوتا کو ''پشوپا'' یعنی مویشیوں کا پروردگار بھی کہا گیا ہے۔ جنگلی جانور اگر مال مویشی پر، یا خود مالدار پر حملہ آور ہوں گے تو سورج کی روشنی میں دور ہی سے پتہ چل جائیگا۔ ان سب وجوہ کی بنا پر قدیم لوگ کہتے تھے کہ ''راستوں میں جو بھیڑئے اور دوسرے خوف و خطر ہیں، انہیں یہ دیوتا دفع کرتا ہے، (منڈل پہلا، ۴۲، ۱۔۔۳)۔ ''اے پوشن دیوتا، تو ہمارے لئے راستہ آسان کر، اور مال مویشی کے چارہ کے لئے ہمیں کسی اچھے چراگاہ میں لے جا''۔ (منڈل پہلا ۴۲، ۷۔۔۸)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورج کی خوبیوں کو ذہن میں رکھ کر اس طرح کی باتیں کی گئی ہیں۔

سورج دیوتا کو اخلاق کی راہ میں اپنا اچھا رہبر سمجھتے تھے۔ رگ وید میں کہا گیا ہے کہ آکاس میں جو دیوتائیں ہیں، ان کی آنکھ سورج دیوتا ہے۔ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے، ان سب کا وہ گواہ ہے، کسی بھی طرح کے کام ہم چھپا کر کریں گے، پھر بھی وہ دیکھتا ہے، اس لئے ہمیشہ سوچ سمجھ کر چلنا چاہیئے کیونکہ وہ گواہ ہمارے اوپر کھڑا ہے۔ اس طرح سورج کی روشنی نے قدیم آریوں میں روحانی خیالات پیدا کئے۔ رگ وید کے منڈل چوتھے (۱۴، ۲)، منڈل ساتویں (۶۳، ۱) اور منڈل دسویں (۱۵۸، ۱۔۔۴) میں سورج کا دوسرا نام ''سوتر'' (Savitr) درج ہے۔ دن کو سورج روشنی کرتا ہے، اور شام کو غروب ہو جاتا ہے، لیکن رات ہونے کے بعد بھی وہ اوپر آکاس میں چلا آتا ہے (منڈل پہلا، ۳۵، ۳، اور منڈل چوتھا ۳۸، ۳۔۔۴)۔ رات کو وہ سب ذی حیات کو نیند بخشتا ہے، اور صبح کو انہیں بیدار کرتا ہے (منڈل چوتھا، ۵۳، ۳، اور منڈل ساتواں ۴۵، ۱)۔ اسی سورج کی تیزی ''ساوتری'' ہے، اور اس کا دوسرا نام ''گاتیری'' ہے۔ مطلب یہ کہ گاتیری منتر پڑہا جاتا ہے، تو اگیان کا اندھیرا ٹل جائے، اور ہماری سمجھ کھلے تو جوتی سروپ پرماتما سے یوں مل کر ایک ہو جائیں، جیسے جوت سے مل کر ایک ہو جایا جاتا ہے۔ قدرت میں سے قادر سے ملنے کا راستہ یوں وہ ڈھونڈ کر نکالتے تھے۔

ہندو لوگ وشنو بھگوان کو جوتی سروپ پرماتما کا اوتار کہتے ہیں۔ سری رامچندر اور سری کرشن وشنو بھگوان کا اوتار سمجھے جاتے ہیں۔ یہ اتہاسوں والے زمانے میں گزر چکے ہیں۔ لیکن ان سے بہت پہلے رگ وید میں وشنو سے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ در اصل سورج کے ایک روپ کا نام وشنو ہے۔ آج تک ہندو لوگ سورج دیوتا کو ہاتھ جوڑ کر نمسکار کرتے ہیں، تا کہ یہ جوتی سروپ پرماتما کا روپ ہمارے اندر میں جوت جگائے اور اگیان کا اندھیرا دفع کرے۔

رگ وید میں وشنو سے متعلق کہا گیا ہے کہ تو تین قدم لیتا ہے۔ ایک قدم سے ساری زمین، دوسرے قدم سے وسط آسمان اور تیسرے قدم سے آسمان کے اوپر (وشنو لوک) لے لیتا ہے۔ اس بالائی آکاس میں وہ لوگوں کو دیکھنے میں نہیں آتا، لیکن دیوتاؤں کو یوں دیکھنے میں آتا

ہے، جو گویا کہ آسمان میں آنکھ گاڑی ہوئی ہے (رگ وید، منڈل پہلا، ۱۵۴، ۵)۔ وہاں (وشنو لوک میں) دیوتائیں سکھ سے رہتی ہیں (منڈل آٹھواں، ۲۹، ۷)۔ یاسک منی کی مرتب کردہ ''نرکت'' (۱۲، ۱۹) میں درج ہے کہ ان تین قدموں کا مطلب ہے ۔۔سورج کا طلوع ہونا، اوپر چڑھ آنا اور غروب ہونا۔ کن یورپی علماء کا بھی یہی کہنا ہے کہ سورج دیوتا کا ایک روپ وشنو بھگوان ہے، جو بڑے قدم اُٹھا کر سارا جہاں لے لیتا ہے۔

اُشا دیوی: قدیم لوگوں نے قدرت کے ایک نظارے کا نہایت عمدہ تذکرہ کیا ہے۔ سورج طلوع ہونے کی وجہ سے اندھیرا ٹل جاتا ہے، لیکن سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی جو دیوی اپنا درشن دیتی ہے، وہ ''اُشا'' یعنی (Dawn) ہے۔ رات جب نقاب ہٹاتی ہے، تو اس دیوی کے جلوہ اور جمال کی وجہ سے صاف صفائی ہو جاتی ہے، اور سارا آسمان نہایت نزاکت بھرا لگتا ہے۔ قدیم رشیوں نے یہ نرمل نظارہ دیکھا تو ان کے اندر میں ایک امنگ پیدا ہوئی۔ پربھات سے متعلق انہوں نے جو شاعرانہ پلٹ پلٹی ہے، اس کے پڑھنے سے روح کو راحت نصیب ہوتی ہے۔ اُشا دیوی سے متعلق جو کچھ انہوں نے کہا ہے، اس میں سے جزوی مضموں کا اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:

''یہ آکاس کی بیٹی، دور دراز عالم سے اپنے تابندہ رتھ (گاڑی) میں سوار ہو کر آتی ہے ۔۔ اس کے رتھ میں لال رنگ کے گھوڑے جوتے ہوئے ہیں (جن کی لالی آسمان کو رنگ دیتی ہے)، اور جیسے نزدیک آتی ہے، زیادہ چمکتی ہے۔ اس دیوی کی شکل حسین اور مسکراہٹ دلپسند ہے، اور اپنے جوبھن کی ساری نزاکت دکھاتی ہے۔ اے دیوی، تیری چھاتی روشن ہے، تیرا چہرہ تابندہ ہے اور تیرے سون جیسے بال تجلیدار ہیں جیسا کہ کوئی سندری اپنے شوہر کو اپنے اوپر موہت کرنے کے لئے اپنے بدن پر چمکیدار لباس پہنتی ہے، اور اس کی آنکھوں کے سامنے اپنے حسن کا اظہار کرتی ہے، اس طرح یہ دیوی چمکتی ہوئی آتی ہے۔ سورج دیوتا عاشقوں کی طرح اس کے پیچھے دوڑتا ہوا آتا ہے، اور دوڑ میں اس سے شرط جیت جاتا ہے، اور دونوں ایک دوسرے کی بانہوں میں آ کر ایک ہو جاتے ہیں۔ بختور اُشا، آج ہم پر اس جگہ اپنا پرکاش کر!

''جو صبح گزر گئے ہیں، اور بے شمار صبح جو اس کے بعد ہونے والے ہیں، ان کے راستے سے یہ اُشا آتی ہے، تو اندھیرا دفع کر دیتی ہے، اور جو لوگ نیند میں مردہ مثل پڑے ہوئے ہیں، ان میں بیداری پیدا کرتی ہے۔''حسین اُشا، تو اگرچہ بے شمار برسوں سے زندہ رہتی آ رہی ہو، تو بھی ہر صبح کو نیا جنم لیتی ہے، اس لئے تم بوڑہی بھی ہو، اور جواں بھی۔

''آج کی صبح اُسی ہی راستے سے جائیگی، جس راستے سے اس سے پہلے ہر کسی صبح گذر گئی۔ اس کے بعد جو صبح ہوگی، وہ بھی اُشا کے پیچھے چلی جائیگی۔ قدیم زمانے میں جو لوگ اُشا کا نظارہ

کرتے تھے، وہ گزر گئے۔ آج اس کی آمد پر ہم اُسے دیکھ رہے ہیں، اور ہمارے بعد جو دوسرے پیدا ہونگے، وہ آئندہ اس دیوی کی شعائیں دیکھیں گے۔" (رگ وید، منڈل پہلا، ۱۱۳، ۷۔۱۱)۔

"Fair Ushas, though through years untold
Thou hast lived on, Yet thou art born
Anew on each succeeding morn,
And so thou art both young and old."
"All those who watched for thee of old
Are gone, and now, tis we who gaze
On the approach; in future days
Shall other men they beams behold,"
Muir: Original Sanskrit Text, Vol. V. P. 196

یہ خالصتاً شاعرانہ بھر مار ہے۔ اس کا جو مزہ اصل زبان میں آیگا، وہ ترجمہ سے نہیں آ سکتا۔ تاہم، اتنا کہا جا سکتا ہے کہ رگ وید کے اس مضمون کو اگرچہ ہزارہا برس گزر چکے ہیں، تو بھی آج بھی تازہ لگتا ہے، جس طرح اس زمانے میں قدیم لوگوں کو لگتا تھا۔

دیگر اہم دیوتا: رگ وید میں جن دیوتاؤں کا تذکرہ ہے، ان میں سے ہر ایک کا مذکورہ بالا طریق پر بیان کیا جائے، تو ایک اچھی خاصی کتاب بن جائے گی۔ اسی سبب یہاں صرف اتنا درج کیا جاتا ہے کہ رگ وید میں دیگر اہم دیوتا پرجاپتی (برہما)، اشونی کمار (شاید شفق اور صبح کے تارے)، یم دیوتا اور منو بھگوان ہیں۔ جس طرح عیسائی، یہودی اور مسلمان وغیرہ مانتے ہیں کہ پہلا انسان آدم تھا، جس سے انسان ذات پیدا ہوئی، اسی طرح ہندو سمجھتے ہیں کہ اول منو بھگوان تھا، جس سے دوسرے آدمی پیدا ہوئے۔ "ماڻھو" (آدمی) در اصل ہے "منشیہ" یعنی "منو کی اولاد"۔ اسی طرح "آدمی" معنی "آدم کی اولاد"۔

قدیم آریہ لوگ سوم نامی ایک جڑی بوٹی کا رس پیتے تھے، جو چاند کی طرح سفید اور روشن ہوتی تھی۔ وہ نہایت گنا کاری تھی، اس لئے اس جڑی بوٹی کے اُگانے والے دیوتا کو بھی "سوم" کہتے تھے۔ رگ وید کا سارا نواں منڈل سوم کی تعریف سے بھرپور ہے۔ جس طرح سورج کا روپ اگنی ہے، اسی طرح سوم کا روپ چندرما (چاند) ہے، اور اسے بھی "سوم" کہا جاتا ہے۔ "سومر۔۔ سومار" معنی "سوم یا چندرما (چاند) کا دن" (Monday: Moon-day)۔ ویدوں کے براہمنوں میں سوم (چاند) کو امرت کا تالاب کہا گیا ہے۔ چاند کی چاندنی میں دیوتا یہ امرت پیتے ہیں تو چاند کی کلا دن بدن بڑھتی جاتی ہے، اور اندھیرے پکھ میں پتر یہ امرت پیتے ہیں تو چاند کی کلا کم ہوتی جاتی ہے۔ یہ باتیں پرانوں میں بھی لکھی ہوئی ہیں۔

قدیم لوگ دریائے سندھ کو ایک اہم دریا کے طور پر سمجھتے تھے، اس لئے اس کی بڑی تعریف کی گئی ہے۔ لیکن سرسوتی دریا کو ایک پاک دریا کے طور پر سمجھتے تھے، اس لئے اُسے دیوی کہا گیا ہے۔ سرسوتی دریا کنارے کئی لوگ یگیہ کرتے تھے اور ویدوں کے منتر پڑھتے تھے۔ اسی سبب سرسوتی دریا کو کہیں پاک دریا تو کہیں ودیا کی دیوی کہا گیا ہے، اور اس کی بڑی تعریف کی گئی ہے۔ اسی قدیم رواج کے مطابق آج تک سرسوتی ودیا کی دیوی سمجھی جاتی ہے۔

قدیم لوگ سمجھتے تھے کہ پریاں بھی ہیں۔۔ انہیں وہ ''اپسرائیں'' کہتے تھے۔ اپسراؤں سے متعلق ان کا خیال تھا کہ ان کو پانی میں ڈبکیاں لگا کر نہانا اچھا لگتا ہے، اس لئے ان پر یہ نام رکھا گیا۔ ''اپ'' معنی پانی اور ''سر'' معنی ''سرٹ یا چرٹ''، جس وجہ سے اپسرا معنی پانی میں ڈبکیاں لگانے والی۔

دیوتاؤں کی تعداد: رگ وید کے منڈل پہلے (۱۳۹، ۱۱) مطابق، خواہ اتھرو وید اور براہمن مطابق اہم دیوتا تینتیس ہیں: گیارہ زمین کے جیسا کہ: پرتھوی، اگنی، برہسپتی اور سوم وغیرہ، گیارہ دیوتا ''مدھیم، استھانی'' (Intermediate or aerial) یعنی آکاس کے جیسا کہ: اندر، ردر (گجگوڑ کرنے والی بجلی)، مروت وایو وغیرہ، گیارہ ''دیواستھانی (Celescial) جیسا کہ: دیوس پتر (باپ آکاس، ورن دیوتا، اُشا، اشونی کمار دیوتا اور سورج، جسے علحدہ علحدہ متر، پوشن، سوتر اور وشنو کہتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو: یاسک منی کا ''نرکت'' ۷، ۵)۔

شتپتھ براہمن میں دیوتاؤں کے نام دوسری ترتیب سے درج ہیں، تو تینتیس دیوتا جو اہم ہیں ان میں ـــ گیارہ ردر، بارہ آدتیہ، آٹھ وسو، ایک اندر دیوتا اور ایک پرجاپتی (برہما) ہیں۔ رددوں میں اہم ہے شنکر، آدتیوں میں سورج (وشنو) اور وسن میں اگنی۔ شریمد بھاگوت گیتا میں بھی اسی طرح ہی درج ہے۔ یہ تینتیس دیوتا پھر وبھوتیوں کا وستار کر کے، بڑھ کر تینتیس کروڑ ہوئے ہیں، اسی سبب بعض لوگ ہندوؤں پر ہنستے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا ایک ہی ہے، لیکن اس کے صفاتی نام بے شمار ہیں اور قدیم آریوں نے ہر ایک کو مجسم (Personify) کیا ہے۔ اسی طرح اگر تینتیس کروڑ کو اور بھی بڑھایا جائے تو بڑھا سکتے ہیں۔ قدیم لوگوں نے یہ بات خود کہی ہے جس طرح ذیل میں درج ہے:

کثرت میں وحدت: رگ وید کے منڈل دسویں (۸۲، ۱۔۳) میں درج ہے کہ ''سب کچھ پیدا کرنے والا عظیم ہے، وہ ہی سب کو پیدا کرتا ہے، وہ ہی سب کو سنبھالتا ہے، اور وہ ہی سب کے اوپر ہے ـــ جس باپ نے ہمیں پیدا کیا ہے، جسے سب قوموں اور سب چیزوں کا علم ہے، وہ ایک ہی ہے، لیکن اس پر نام بہت ہی ہیں۔'' اس سے واضح ہوتا ہے کہ رگ وید والے قدیم زمانے میں اگرچہ عناصروں یا تتوں کو ملانے والی قوتوں کو دیوتا سمجھ کر پوجتے تھے، تو بھی

یوں سمجھتے تھے کہ سارے جہاں کا پیدا کرنے والا ایک ہی قادر مطلق خدا ہے۔ رگ وید کے منڈل پہلے (۱۶۴، ۴۶) میں بھی اسی طرح کہا گیا ہے کہ جو عقلمند ہیں وہ علحدہ علحدہ دیوتاؤں میں ایک ہی خدا کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

ویدک دھرم کس زمرہ میں شمار کیا جائے؟: ویدک دھرم سے متعلق جو مذکورہ بالا حقائق رگ وید میں درج ہیں، ان پر غور کرنے سے قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ویدک دھرم کی خصوصیت (Character) کیا ہے؟ اسے کس زمرہ میں شمار کیا جانا چاہئے؟ رگ وید میں فی الجملہ ۱۰۲۸ سُوکت ہیں، جو بھی سُوکت پڑھا جاتا ہے، اس میں کسی نہ کسی دیوتا کی تعریف ہے۔ اسی طرح کئی دیوتاؤں کے نام درج ہیں، اور ان کی پرستش کا بھی تذکرہ ہے، اس لئے ہر کوئی یوں کہہ سکتا ہے کہ قدیم آریوں کا دھرم ''بھون دیو مت'' (Polytheism) تھا۔ ان ہی دیوتاؤں کی شکل شبیہ کا اس طرح انہوں نے ورنن کیا ہے، جو گویا کہ ان دیوتاؤں کی صورت وغیرہ آدمیوں جیسی تھی، اس لئے اسے ''منکھ روپ دیومت'' (Anthropomorphism) بھی کیا جائیگا۔ رگ وید میں پتروں کی پوجا کا بھی تذکرہ موجود ہے، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ''ہر ایک آدمی کی روحانی ہستی علحدہ سمجھنے کا مت'' (Animism) بھی ان کے ہاں بہت تھا۔ ساتھ ساتھ رگ وید میں کئی مقامات پر یوں بھی درج ہے کہ خدا ہر چیز (جاندار خواہ بے جان) میں محیط ہے۔ ''سمندر جس کے راستے (Loins) ہیں۔ وہ پانی کے قطرے میں بھی سمایہ ہوا ہے'' ۔ اس طرح کے جملے صاف صاف ظاہر کر رہے ہیں کہ ''ویدانت مت'' (Pantheism) ان دنوں ہی پھیلا ہوا تھا۔ یوں بھی کہا گیا ہے کہ ''خدا ایک ہی ہے، اور اس پر نام بہت ہی رکھے ہوئے ہیں، اور جو عقلمند ہیں، وہ علحدہ علحدہ دیوتاؤں میں ایک ہی خدا کا مشاہدہ کرتے ہیں''۔ یہ واضح اشارہ ''ایک ایشور واد'' (Monotheism) کا ہے۔ اس طرح باریک بینی سے جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ رگ وید والے زمانے میں ہی بہت مذاہب کا بیج بویا ہوا تھا۔ ساتھ ساتھ یہ بات بھی ذہن نشیں رہے کہ رگ وید کے منڈل علحدہ علحدہ زمانوں کے مرتب کردہ ہیں، لیکن رگ وید والے قدیم، وسطی خواہ اخیر والے زمانے میں نہ ہی مڑھیاں تھیں اور نہ ہی مندر، نہ ٹھاکر داوارے یا شوالے، نہ ہی ٹکانے۔ قدیم سے قدیم منڈلوں میں یوں ہی درج ہے کہ یہ قدرت کا کارخانہ قدیم آریوں کا مندر تھا، اور آکاس، پرتھوی، سورج، پون (ہوا)، اور دیگر عناصر، جو شروع سے چلے آرہے ہیں، وہ ان کے ٹھاکر تھے۔ بالفاظ دیگر یوں کہا جا سکتا ہے کہ ان کا اوائلی دھرم تھا ''پرکرتی پوجا'' یعنی الاہی قوتوں کی پوجا (Nature Worship or Naturalism)۔ ان علحدہ علحدہ قوتوں کو بعد میں دیوتائیں سمجھنے لگے تو ان کا دھرم ''بہوں دیومت'' (Polytheism) لگ رہا ہے۔ اسی کثرت ہی میں سے انہوں نے وحدت ڈھونڈ نکالی، اس لئے وہ ''ایک ایشور واد''

(Monotheism) کہلاتا ہے۔ اُسی ایک خدا پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے ہر ایک پھول میں سے انہیں اُسی کی خوشبوء آئی، اور ہر چیز میں اُسی ایک کا مشاہدہ کرنے لگے۔ «جیڈانھن کریان پرک تیڈانھن صاحب سامھون.» حاصل مطلب یہ کہ قدرت میں سے ہی قادر سے ملنے کا راستہ مل جاتا ہے، اور یہی قدیم آریوں کا اوائلی دھرم تھا۔

ٹھاکروں کی مورتی: پروفیسر مَیکس ملر نے رگ وید کا مطالعہ کرکے درج کیا ہے کہ ویدک دھرم میں ٹھاکروں کی مورتیوں کی پرستش کی بات ہے ہی نہیں۔ [1] دوسروں بھی ملکی خواہ غیر ملکی علماء کا کہنا ہے کہ ویدوں والے زمانے میں بت پرستی نہیں تھی۔ اس کے باوجود رگ وید میں سے کئی علماء کو یوں سمجھ میں آتا ہے کہ ٹھاکروں کا مورتیاں بنانے کا رواج رگ وید والے کسی عرصے میں ہی جاری ہوا تھا۔ منڈل چوتھے میں ایک رشی کہتا ہے کہ ''دس گائیں دے کر، میرا یہ اندر کوئی لے گا؟ جب اندر دیوتا اس کے دشمن دفع کرے، تب میرا اندر مجھے واپس کرے!''

رگ وید کے منڈل آٹھویں (۱، ۵) میں درج ہے کہ ''اے وجر چلانے والے (اندر دیوتا) میں تجھے کتنے بھی پیسوں میں نہیں دے دوں گا۔ بھلے کوئی مجھے ہزار، دس ہزار بلکہ اس سے بھی زیادہ پیسہ دے''۔ رگ وید کے منڈل دوسرے (۳۳، ۹) میں ردر (شومہراج) کی مورتی کا تذکرہ ہے۔ اس سے یوں سمجھا جاتا ہے کہ ٹھاکروں کا مورتیاں بنانے اور انہیں فروخت کرنے کا رواج بھی تھا۔ عام طور پر لوگ جب ٹھاکروں کی مورتیوں کو نہیں پوجتے تھے، تو بھی ان کی طرف عزت والی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور کافی رقم دے کر ان مورتیوں کو اپنے گھر میں رکھتے تھے۔

یگیہ، پوجا اور نذرانہ: دنیا کے کئی قدیم لوگ یوں سمجھتے تھے کہ جب دیوتا ہم پر راضی ہونگے، تب وہ ہمارے دل کی مرادیں پوری کریں گے۔ دیوتاؤں کے رضامندی حاصل کرنے کے لئے قدیم ملک مصر کے لوگوں نے نہایت عمدہ مینار بنائے، جو دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتے ہیں۔ قدیم ہندوؤں نے اپنے دیوتاؤں کو راضی کرنے کے لئے یگینیں کرنے پر زور رکھا۔

یگین کرنے کا رواج قدیم آریوں اور پارسیوں کے علاوہ دوسری کسی بھی قوم میں نہیں تھا، اس لئے ''یگیہ'' کے لئے دوسری کسی بھی زبان میں موزوں لفظ ہے ہی نہیں۔ یگین کرنے کا خیال قدیم آریوں کو قدرت میں سے ملا۔ قدرت کی باتوں سے متعلق انہوں نے جس طرح سے خیالات دوڑائے، وہ نمونہ ہی نرالہ تھا، اور وہ آج بھی سمجھنا آسان ہے۔

آسمان کی طرف نظر دوڑاتے ہوئے قدیم آریوں کو یوں سمجھ میں آیا کہ سورج اور بجلی یگیہ کی اگنی کا روپ ہیں۔ برساتی موسم میں آسمان میں کڑک ہوتی ہے، اور برسات برسنے کے وقت آوازیں

(1) Prof. Max Muller: Chips from a Geman Workshop. 1 - 38

اٹھتی ہیں، گویا کہ آسمان میں ساز، سارنگیاں، سرندے بج رہے ہوں، اور گویا ویدوں کے منتروں کا راگ ہو رہا ہو! برسات میں بہتے ہوئے دریا اور نالوں کا پانی گویا کہ جل انجلی ہو، اور دیوتا یہ یگیہ گویا کہ خود کرواتے ہیں۔[1] خود دیوتاؤں سے متعلق یوں سمجھتے تھے کہ انہوں نے بڑے یگیہ کیے ہیں، اس لئے یہ رتبہ انہیں ملا ہے۔ نہ فقط دیوتا، لیکن سارا جہان وہ یگیہ میں سے پیدا شدہ سمجھتے تھے۔ اسے بھلے کوئی گہرا فلسفہ کہے یا فقط شاعرانہ خیال کی دوڑ کہے، پھر بھی اتنا کہا جا سکتا ہے دھرم شاستروں کی تعلیم ہے ''قربانی''۔ سب سے زیادہ قوت ہے ہی قربانی۔ عاشق اپنے معشوق کے لئے اپنا سر قربان کر دیتا ہے، اور یہ ایک بڑا یگیہ ہے۔ وطن دوست اپنے وطن کے لئے سینکڑوں سختیاں اپنے سر لیتا ہے، بلکہ اپنے آپ کو قربان کر دیتا ہے، اور یہ بھی ایک بڑا یگیہ ہے۔ ہم جیسا کوئی رواجی آدمی اگر کسی کے بھلے کے لئے خود کو تھوڑی ہی مشقت میں ڈال دے گا، یا کچھ خرچ کریگا تو کہا جائیگا کہ اس نے یہ بھی ایک ۔ یگیہ کیا۔ اس طرح یگیہ میں قربانی کا خیال مضمر ہے۔ یگیہ کی اگنی جلا کر، پوری دھیان سے ویدوں کے منتر پڑھنا، اور خدا کی پرستش میں مگن ہونا، خود کو بھول جانا، یہی دیوتاؤں کی رضامندی حاصل کرنے کا راستہ قدیم ہندوؤں کو سوجھا۔ اس لیے یگیہ کا دستور ہندوؤں کے علاوہ کسی دوسری قوم میں نہیں ہے۔ پارسی بھی دراصل ہندو تھے۔

قدیم آریہ لوگ آگ جلانے کا ہنر سیکھے، اور آکاس کی اِتھر بجلی گویا کہ ان کے گھروں کے چولہوں میں آکر قیام کیا۔ اس کے بعد اس یگین کا دستور جاری ہوا، اور اگنی پوجا عام ہوگئی۔ اگنی پوجا اور یگین کا رواج بھرگو رشی کی نسل والوں میں عام تھا۔ بھرت آریہ لوگ بھی اگنی کے اوائلی پوجاریوں میں سے تھے، اس لئے خود اگنی ''بھارت'' کہلایا ہے۔ (رگ وید، منڈل دوسرا، ۷، ۱، اور منڈل چوتھا ۲۵، ۴) اتھرو وید پر اتھرون رشی کا نام پڑا ہوا ہے۔ اس رشی نے ''اتھرون'' یعنی آگ جلانے کا رواج جاری کیا تھا، اس لئے اس نام سے پکارا جانے لگا۔ پارسی بھی دراصل ہندو آریہ تھے، اور وہ اپنے پروہتوں کو ''اتھرون'' کہتے تھے، اور وہ اتھرون ان سے اگنی پوجا کرواتے تھے۔

رگ وید سے ظاہر ہے کہ قدیم آریوں نے یوں سمجھا تھا کہ یگیہ کی اگنی جلا کر، اس میں آہوتی ڈالی جاتی ہے، تو اگنی شعلہ فشاں ہو کر آسمان سے لگ جاتی ہے، اور آہوتی کی خوشبوء اگن دیوتا آکاس اور دیگر دیوتاؤں تک پہنچاتا ہے، تاکہ دیوتا راضی ہو کر، ہمارے چولہوں کے اردگرد جمع ہو جاتے ہیں، اور جو بھی بھوجن وغیرہ اگنی میں ڈالا جاتا ہے، اس کی خوشبوء لیتے ہیں۔ انہیں حاضر ناظر جان کر، ہم جو ویدوں کے منتر پڑھتے ہیں، وہ سن کر وہ خوش ہوتے ہیں، اور ہمارے دل کی مرادیں پوری کرتے ہیں۔ یہ اگنی سے متعلق مضموں انگریزی شعر میں میوئر صاحب نے لکھا ہے، جس میں سے ایک چھوٹا سا ٹکڑا یہاں نمونے کے طور پر دیا جاتا ہے:

(1) Barth: The Religion of India, page 37.

A swift winged messenger, thou callest down
From heaven, to crowd our hearths, the race divine
To taste our food, our hymns to hear, begnign
And all our fondest aspirations crown.
(J. Muir, Original Sanskrit Texts,Vol. V. Page 221)

قدیم آریہ لوگ سمجھتے تھے کہ یگیہ کرنے ہی سے وقت پر برساتیں ہوتی ہیں، فصلیں اچھی ہوتی ہیں، جس وجہ سے سب ذی حیات کی زندگی سکھ سے گزرتی ہے، ورنہ سارے عالم کا چرخہ ڈاوانڈول ہو جائے۔ اس وقت کے راجا تو یوں بھی سمجھتے تھے کہ جنگوں میں فتح بھی یگین کرنے کی وجہ سے ہوتی ہے، اور دل کی دوسری سب مرادیں بر آتی ہیں۔ وہ دوسروں کے ممالک جیت کر اشو میدھ یگیہ اور راجسو یگیہ کرتے تھے، اور دور دور کے راجا ان یگیوں میں آ کر شامل ہوتے تھے، اور یگیہ کرنے والے راجا کو اپنے اپنے ملک کی قیمتی سوغاتیں لا کر دیتے تھے، جس وجہ سے راجاؤں کو یگین کراتے ہوئے زیادہ خوشی ہوتی تھی۔ یہ یگیہ براہمن کی رہنمائی میں ہوتے تھے، اس لئے براہمنوں کی بڑی عزت ہوتی تھی۔

"یگیہ" کی بجائے "یجنیہ" بھی کہتے ہیں، جس کا تلفظ سندھی میں ہے "جُج"۔ "جُج" لفظ میں ہی خوشی کا خیال مضمر ہے، تو "جُج" کرانے والے کو بذاتِ خود کتنی خوشی ہوتی ہوگی، اس کا تصور ہر کوئی کر سکتا ہے۔

رگ وید سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوتاؤں کو راضی کرنے کے لئے قدیم آریہ لوگ طرح طرح کے یگیہ کرتے تھے۔ اتھرو وید سے معلوم ہوتا ہے کہ چاند کی آخری تاریخ، چاند کی پہلی تاریخ اور چاند کی چودویں تاریخ کو قربانیاں چڑھاتے تھے (اتھرو وید، منڈل ساتواں، ۷۹، ۸۰، ۸۱)۔ دو سالیانہ یگیہ ہوتے تھے، جن کا تعلق ربیع اور خریف کی فصلوں سے تھا۔ (اتھرو وید، منڈل تیسرا)۔

رگ وید والے زمانے میں "ستر" (Sattra) کرتے تھے، یہ ایک بڑا یگیہ تھا۔ یہ یگیہ تیرہ دن سے لے کر ایک سو دنوں تک مسلسل جاری رہتا تھا۔ یہ یگیہ اکثر ساونن مہینہ میں کیا کرتے تھے، تا کہ وقت پر برساتیں ہوں، برساتی موسم اچھی ہو، تا کہ فصلیں اچھی ہوں۔ اتھرو وید سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ یگیہ نو دس مہینے، تو کچھ بارہ مہنے مسلسل جاری رکھتے تھے (اتھرو وید، منڈل پہلا، ۳، ۴)۔

یگیہ ودوان پنڈت کی رہنمائی میں ہوتے تھے، جو ویدوں کے منتر پوری ودھی کے ساتھ پڑھتے تھے۔

پوجا کے وقت ایک ویڈی (Attar) بناتے تھے، جس میں یگیہ کی اگنی جلاتے تھے۔ جو پروہت پوجا کراتا تھا، اُسے یہ بھوجن کھلاتے تھے، جو "دکشناگنی" (دکشن + اگنی) یعنی ویڈی

(ہندوؤں کا نکاح) کے جنوب[1] طرف والی اگنی (آگ) پر تیار کیا ہوا ہوتا تھا۔ اسی 'دکشنا گنی'' لفظ سے ''ذکنا'' لفظ ماخوذ ہے۔ مطلب یہ کہ اصل ''ذکنا'' (بھیٹا یا ارداس؛ وہ تھی، جو پروہتوں کو ''دکشنا گنی'' تیار شدہ بھوجن کھلاتے تھے۔ ایسے مواقع پر پروہتوں کو گئودان کرتے تھے، جو پوجا کے وقت جنوب کی طرف کھڑی کرتے تھے، اس لئے ''ذکنا'' لفظ کے بعد میں معنی ہوئے ''وہ دودھ دینے والی گائے جو پروہت کو پوجا کے وقت بھیٹا کے طور پر دی جائے''۔ بعض لوگ گائے بجنسی دیتے تھے، اس لئے پھر ''ذکنا'' لفظ کے معنی ہوئے ''وہ نقدی رقم جو پروہت کو پوجا کرانے کے وقت بھیٹا کے طور پر دی جائے''۔ یا ''وہ نقدی رقم جو پروہت کو پوجا کرنے کے لئے دی جائے۔'' یوں ''ذکنا'' لفظ کے معنی ہوئے بھیٹا یا ارداس۔ ایسے مواقع پر راجا بڑا دل کر کے پروہتوں کو موتی بھی خیرات کرتے تھے۔ سنسکرت ادب میں کئی ایسی مثالیں ملتی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ترازو کے ایک پلڑے میں رجا خود بیٹھتا تھا، اور دوسرے پلڑے میں اپنی تول جتنا سونا ڈلواتا تھا، اور وہ سارا سون پروہت کو ملتا تھا۔ اس بات سے پتہ چلتا ہے کہ ملک بڑا مالدار تھا۔ راجاؤں کے پاس مال مویشی بھی بے انداز ہوتے تھے، اور وہ بڑا دل کر کے رشیوں کو مال مویشی اور سونا دان کرتے تھے، جس وجہ سے رشی بھی نہایت خوش بخت ہوتے تھے۔

پرش میدھ یا نر قربانی Human Sacrifice: قدیم زمانے میں بیوی کے زندہ ہوتے ہوتے دوسری شادی کرنا کی بد رسم کے علاوہ ایک دوسرا ہیبتناک رواج عام تھا، جس کا یکین سے واسطہ ہے۔ قدیم ہندو جب کسی جنگ میں فتحیاب ہوتے تھے، تب کسی آدمی کی قربانی چڑھاتے تھے۔ اسے ''پُرش میدھ'' یعنی آدمی کی قربانی کہتے تھے۔ پرانوں میں اسے ''نَرَ بَلی'' یعنی ''نر یا مرد کی قربانی'' بھی کہا گیا ہے۔ جنگ میں مخالف طرف کے جو افراد گرفتار کرتے تھے، انہیں اپنا غلام بناتے تھے، اور ان میں سے ایک قربانی نکالتے تھے۔[2] اس رواج نے بعد میں ایک عجیب موڑ لیا۔ یگیہ میں قربانی وہ نکالی جائے، جو خود کو پیاری لگتی ہو۔ اسی سبب شاید یوں سمجھنے لگے کہ کوئی اجنبی شخص قربان کیا جائے، اس سے بہتر ہے کہ کوئی اپنا قریبی عزیز قربانی پر چڑھایا جائے، تو دیوتا زیادہ خوش ہوں، اور اس کا ہمیں کوئی اچھا پھل دیں۔ وہ پھر اپنے گھر کا کوئی فرد قربان کرنے لگے!

(1) ''ذکن'' لفظ کے اصل معنی تھے ''مشرق'' یا ''دائیں جانب والا حصہ''، بعد میں معنی تبدیل ہوئے۔ اس طرح کئی الفاظ کے معنی تبدیل ہوئے ہیں۔ مثلاً، ''اُشٹری'' لفظ کے معنی تھے ''بھینس'' (Buffalo) اور اب اس کے معنی ہیں ''اُونٹنی'' (She-camel)۔

(2) آسٹریلیا کے قدیم باشندے بھی یہی کرتے تھے۔ کولوں اور سنتھالوں سے متعلق علماء کا کہنا ہے کہ وہ آسٹریلیا کی طرف سے آئے تھے، اس لئے لگتا ہے کہ ہندستان میں کولوں اور سنتھالوں نے یہ ''پُرش میدھ'' کا رواج جاری کیا تھا، جو بعد میں آریوں نے بھی اختیار کیا۔ مصنف

قدیم زمانے میں باپ کو اپنی اولاد اور کنبے کے سارے افراد پر کلی اختیار ہوتا تھا۔ باپ اپنے بیٹے کو قربان کر دیتا تھا، یا کوئی اولاد پیسوں پر فروخت کر دیتا تھا تو کسی کو یہ اختیار نہیں ہوتا تھا کہ کوئی اس سے چوں و چراں کرے۔ اس سے متعلق اتر یہ براہمنہ میں درج ہے کہ ستوادی رجا ہرشچندر نے منت مانی تھی کہ ''مجھے جو پہلا بیٹا پیدا ہوگا، اسے ورن دیوتا کے نام قربان کروں گا''۔ اسے بعد میں روہت نامی ایک بیٹا ہوا، لیکن اپنے اکلوتے بیٹے کو قربانی پر چڑھانے پر اس کا دل آمادہ نہیں ہوا، اس لئے پرش میدھ کرنے سے کترانے لگا۔ روہت بعد میں بڑا ہوا تو اس کے باپ نے اسے اپنی منت سے متعلق بتایا۔ روہت کو اپنی جان جانے کا ڈر ہوا، اس لئے وہ جنگل کی طرف بھاگ نکلا، سو چھ برس کسی بیابان میں چھپ کر گزارے۔ یوں بائیس برس بیت چکے۔ کسی وقت راجا ہرشچندر برص میں مبتلا ہو گئے۔ اسے اس وہم نے آ گھیر لیا کہ ورن دیوتا کی منت میں نے پوری نہیں کی، اس لئے یہ مصیبت بھگت رہا ہوں۔ روہت کو کسی طرح اس بات کا علم ہو گیا۔ اس صالح بیٹے نے کہا کہ ''میرا باپ تندرست ہو جائے، میرا سَر گیا تو قربان ہے!'' اس اعلیٰ خیال آنے سے وہ جنگل چھوڑ کر شہر کو چلا گیا، اور اپنا سر قربان کرنے کے لئے تیار ہوا۔ راستے میں اسے آجیگرت نامی ایک براہمن مل گیا، جو بھارگو رشی کی نسل سے تھا۔ وہ فاقہ کشی میں گزار رہا تھا۔ روہت نے اس سے کہا کہ ''اے برہمن، اگر تو اپنے بیٹوں میں سے ایک میری جگہ پر دے دوگے تو میں تمہیں ایک سو گائیں دوں گا''۔ اس پیشکش پر براہمن کا منہ پانی سے بھر گیا۔ اس براہمن کو تین بیٹے تھے، جن میں سے بڑا بیٹا دینے کے لئے اس کا دل آمادہ نہیں ہوا۔ اور چھوٹے بیٹے دینے پر اس کی بیوی کا دل آمادہ نہیں ہوا۔ اسی سبب درمیانی بیٹا شنہ شیپ نامی روہت کو دے دیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے باپ راجا ہرشچندر سے ایک سو گائیں اسے دلا دیں۔ ان دنوں میں دستور ہوتا تھا کہ جس آدمی کو قربانی پر چڑھاتے تھے، اسے پہلے ''یُوپ'' یعنی قربانی والے کھنبے سے قابو باندھ دیتے تھے، اور پھر اس کا ایک ایک عضو کاٹ کر، یگیہ کی اگنی میں ڈالتے تھے۔ راجا ہرشچندر کے لوگوں میں سے کسی کا بھی دل آمادہ نہیں ہوا کہ براہمن کے بیٹے کو یوپ سے باندھے۔ اس پر لڑکے کے لالچی باپ نے کہا کہ ''مجھے اگر دوسری ایک سو گائیں ملیں گی تو میں اپنے بیٹے کو یوپ سے باندھونگا''۔ راجا ہرشچندر نے اس بات سے اتفاق کیا، تو اس نے اپنے بیٹے کو یوپ سے باندھا، لیکن بچے کو ذبح کرنا کسی نے بھی نہیں مانا۔ اس پر اس بے رحم براہمن اجیگرت نے کہا کہ ''مجھے اگر تیسری ایک سو گائیں ملیں گیں، تو میں اپنے ہاتھوں سے اپنا بیٹا ذبح کروں گا''۔ راجا نے اس بات پر بھی متفق ہوا اور پھر وہ اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے چھری تیز کرنے لگا۔ شنہ شیپ نے دیکھا کہ اب میں ٹکڑے ٹکڑے ہونے والا ہوں۔ اپنا کوئی بھی یار و

مددگار نہ دیکھ کر، اس نے سچے دل سے دیوتاؤں کو پکارا، اس کی اس دردناک حالت کو دیکھ کر، شاید دیوتاؤں کو بھی افسوس ہوا، جو دیکھیں قادر کی قدرت، جو جن زنجیروں میں وہ جکڑا ہوا تھا، وہ خود بخود اتر گئیں، اور یہ آزاد ہو گیا۔ پھر تو راجا کا مرض بھی ختم ہو گیا۔ اس لئے برش میدھ کی کوئی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ شنہ شیپ کو باپ نے کھتری راجا (ہرشچندر) کے ہاں بیچ دیا تھا، اس لئے وہ براہمنوں کے زمرہ سے نکل گیا۔ اس کے بعد وشوامتر نے اسے اپنا دھرم کا بیٹا بنایا، اور اس کا نام دیوراتھ رکھا۔ یہ کہانی شریمد بھاگوت (اسکندھ نویں) اور وشنو پران چوتھے میں درج ہے۔ اس کتھا سے دو اہم باتیں ظاہر ہوتی ہیں:

(۱) پرش میدھ کا رواج تھوڑا یا زیادہ، مگر تھا ضرور۔

(۲) باپ کو اتنا اختیار ہوا کرتا تھا کہ کسی بھی بیٹے کو قربان کرسکتا تھا۔ باپ کو اپنے بیٹوں پر اتنی اختیاری قدیم رومی لوگوں میں بھی ہوا کرتی تھی، جسے (Patria Potestas) کہتے تھے۔ آج تک ماں باپ اپنی اولاد پر اختیاری چلاتے ہیں، لیکن وہ اَور طرح کی ہوتی ہے۔ مثلاً، کچھ لوگ جب اپنی بیٹیوں کی جن سے شادی کرواتے ہیں ان سے پہلے اچھی خاصی رقم لیتے ہیں۔ اس طرح کچھ بیٹیاں فروخت کرتے ہیں۔ یہ رواج رگ وید والے زمانے میں بھی بعض لوگوں میں ہوتا تھا (منڈل پہلا، ۱۰۹، ۲)، ورنہ عام طور پر جہیز پر خرچ کرتے تھے۔ سارے ہندستان کے لوگ آج کل دوسری اختیاری یہ چلاتے ہیں کہ، وہ اپنا بچہ کسی کی گود میں دے سکتے ہیں۔ ایسا کرنے سے بچے کو کوئی بھی نقصان نہیں پہنچتا، وہ تو خود کسی دوسرے کی ملکیت کا وارث بن جاتا ہے، پھر بھی اتنا ضرور کہیں گے کہ ماں باپ اپنی اختیاری چلاتے ہیں۔ اس اختیاری چلانے پر بھی ایک بندش ہے۔ ساری ہندو ذات کے لئے یہ قاعدہ ہے کہ کوئی بھی ہندو اپنا اکلوتا بیٹا کسی دوسرے کی گود میں نہیں دے سکتا۔ اگر کوئی لیگا بھی تو پھر وہ دھرم کا بیٹا اس کی ملکیت کا وارث نہیں بن سکتا، کیونکہ وہ بیٹا اپنے حقیقی ماں باپ ہی کا کہلائے گا۔ آج کل یہی قاعدہ کورٹوں میں جاری ہے۔

قدیم لوگ پھر کسی آدمی کو قربانی پر چڑھانے کے بجائے کسی جانور کے قربانی پر چڑھاتے تھے۔ بعد میں یہ رواج بھی ختم کر کے چاولوں کی چھوٹی روٹی قربانی طور پیش کرتے تھے۔ (1)

پرش میدھ کا رواج کئی صدیوں سے بند ہو گیا ہے، پھر بھی آج تک کچھ قومیں کوئی آدمی قربان کرتی ہیں۔ اس طرح کی مثالیں بعض دفعہ اخباروں شایع ہوتی رہتی ہیں۔ ایسی ایک مثال سندھ میں بھی واقع ہوئی تھی، وہ سندھ گزیٹیر میں درج ہے۔ یہ حقیقت اس طرح ہے:

ننگر پارکر شہر سے تقریباً چار میل دور مغرب میں کارونجھر پہاڑی کے پہلو میں ایک جگہ ''بھوڈیسر'' نام سے ہے۔ بھوڈو نامی ایک لٹیرا راجپوت چھٹی عیسوی میں گزر چکا ہے۔ اس کے

(1) Upendra Nath Ball, Ancient India, P. 50.

باپ کا نام حیسو پرمار تھا۔ اس نے یہاں ایک تالاب تیار کروایا تھا، جو چوڑائی میں دوسوفوٹ اور لمبائی میں اس سے دگنا تھا۔ اس تالاب کی وجہ سے وہ جگہ ''بھوڈیسر'' یعنی بھوڈے کا تالاب کہلاتی ہے۔ وہاں کا حاکم بھی وہ خود ہی تھا۔

بھوڈے پرمار نے بڑی رقم خرچ کرے کے، تکالیف اٹھا کر، اپنی رعایا کے سکھ کے لئے یہ اتنا سارا تالاب تیار کروایا تھا، لیکن خدا کی ایسی قدرت کہ جیسے ہی یہ تالاب تعمیر ہوا تو برسات کا ایک قطرہ بھی نہیں برسا، جس وجہ سے کبھی بھی وہ تالاب پانی سے نہیں بھرا۔ وہ پھر اپنی چھٹی لے کر کسی پنڈت کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ ''مجھے چھٹی دیکھ کر دیں کہ کونسا گرھ آ کر بیٹھا ہے، کہ تالاب بھر ہی نہیں رہا''۔ پنڈت نے اس سے کہا کہ ''اپنا بیٹا دیوی کے نام پر قربان کر تو بلا پوچھے تیرا کام بن جائے گا''۔ پنڈت کی اس بات پر پکا جم کر، بھوڈے پرمار نے جا کر اپنا بیٹا قربانی پر چڑھایا! خدا کی قدرت جو اس پرش میدھ کے بعد برسات برسی اور تالاب بھر گیا! یہ کہانی سندھ گزیٹیئر کی جلد (ب) حصہ چھٹیں میں تھرپارکر کا احوال دیتے ہوئے درج کی ہے۔ کیپٹن ریکس اپنی کتاب تھر کا احوال میں بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔ اگر یہ بات سچی ہے تو پھر کہا جا سکتا ہے کہ سنہ ۵۴۴ع کے دوران جب بھوڈو پرمار زندہ تھا، تب بھی پرش میدھ کا رواج تھا، جس وجہ سے پنڈت نے اس طرح کا مشورہ دیا، اور بھوڈے نے اس کی پیروی کی۔

قربانیاں کرنا: وادیٔ سندھ کے باشندوں کے ہاں کوئی کارج منگل ہوتا تھا تو بیس بیل یا تین سو بھینسیں اندر دیوتا کے نام قربانی پر چڑھاتے تھے (رگ وید، منڈل پانچواں، ۲۹، ۷، اور منڈل دسواں، (۸۶، ۱۴)۔ اشومیدھ یعنی گھوڑوں کی قربانی کی یگیہ راجا کرتے تھے (منڈل پہلا، ۱۶۲، ۱۲)۔ وقت گذرے کئی لوگوں نے مچھلی کھانا بلکل بند کر دیا، اور ذبح خانہ بھی بند کر دیا۔ بعض لوگ گوشت کھانے اور قربانیاں چڑھانے کا رواج بعد میں بھی قائم رکھتے آئے۔ کالی یا دیوی کے پوجاری کالی کے مندروں میں جا کر قربانیاں چڑھاتے تھے۔ ۱۸۹۴ع تک سندھ کے عاملوں خواہ بھائیبندوں میں عام رواج تھا کہ شادی کے وقت دولہے اور دلہن کے اوپر کوئی بکرا صدقہ کرا سے قربانی چڑھاتے تھے۔ سنہ ۱۸۹۵۔ ۱۸۹۶ع کے دوران حیدرآباد کے شہر میں بھائی کلاچند صوفی نے یہ رواج بند کروایا، لیکن دیہاتوں میں کچھ بھائیبند یہ قدیم رواج آج تک جاری رکھے ہوئے ہیں۔ کئی قدیم قوموں میں رواج تھا کہ جو جانور قربانی چڑھاتے تھے، اس کی سری ایک ہی چوٹ سے الگ کر دیتے تھے۔ کئی سکھ ''جھاٹکو'' کرتے ہیں، یہ قدیم رواج کی علامت ہے۔

ہندو تہذیب کے بانیکار: ہندو تہذیب کے بانیکار ''رشی'' ہیں۔ ''رشی'' انہیں کہا جاتا ہے، جنہوں نے ویدوں کی رچائیں (Hymns) کہی ہیں۔ مطلب یہ کہ رشی ''کوی'' یعنی شاعر تھے۔ آج جو علم عروض کے قواعد کے مطابق شعر بناتا ہے، وہ ہی شاعر کہلاتا ہے۔ یوں کئی لوگوں کو شوق نے شاعر بنا دیا ہے، ورنہ سچ تو یہ ہے کہ وہ صرف ''سگھڑ'' (Poetasters) ہیں۔ شاعری اور چیز ہے۔ شاعر یا کوی کے اصل معنی تھے ''جاننے والا''۔ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کی معلومات جتنی شاعر کو ہے کسی اَور کو نہیں ہوسکتی۔ بھلے کوئی کتنا بھی علم حاصل کرے، عالم اور فاضل بن جائے، اور وید پڑھ کر بڑا پنڈت بن جائے۔ لیکن کوی یا شاعر کو اندرونی فہم کا ورثہ ملا ہوا ہے۔ یہ اندرونی فہم ایک قدرت کا عطیہ ہے، جس کا کسی ذات پات سے کوئی تعلق نہیں۔ رشیوں میں سے بعض براہمن، تو بعض کھتری، تو بعض غلام عورتوں کے بچے (شودر) تھے۔ مثلاً، وسشٹ منی براہمن تھا، وشوامتر اصل میں کھتری تھا، اور کاکشون رشی اُشج نامی ایک غلام عورت کا بیٹا تھا۔

«ذات نه آهي ذات تي، جو وهي سو لهي.»
(شاهه)
[عطا شخصیت (ذات) پر نہیں ہوتی، جو ڈھونڈتا ہے وہ پاتا ہے۔]

رشیوں کا کوئی علحدہ فرقہ نہیں تھا۔ رواجی لوگوں کی طرح ان کی بھی منگنیاں اور شادیاں ہوا کرتی تھیں، اور با عیال ہوتے تھے۔ وہ مال مویشی رکھتے تھے، کھتی باڑی کرتے تھے، ہتھیاروں کو چلانے میں ماہر تھے، یگیہ کرتے تھے، قربانیاں چڑھاتے تھے، اور دیوتاؤں کا پوجن اور خدا کی استتی کرتے تھے۔ رواجی لوگوں اور رشیوں میں اہم فرق یہ تھا کہ ان رشیوں کو جس طرح الہام ہوتا تھا، یا سرسوتی بلواتی تھی، اس طرح ویدوں کی رچائیں کہتے تھے۔ یہ بڑے ذہین ہوتے تھے، اور ان کا ذہن کھلا ہوا تھا۔ وہ زمین سے لے کر آسمان تک اپنی شاعرانہ نظر ڈال کر، پھر اپنے اندر میں جھانک کر، طرح طرح کی کامیابیاں حاصل کرتے تھے۔ یہ رشی ہی تھے، جنہوں نے پہلے ریوڑ پالنے اور کھیتی باڑی کرنے کے رواج جاری کیا، اور آگ جلانے کا ہنر اور دیگر ہنر اور کاریگریاں ڈھونڈ نکالیں۔ لوگوں کی جان و مال کے تحفظ کی خاطر گوتر بھی پہلے انہوں نے بنائے۔ گوتروں میں بھائیچارہ کی خوبی پیدا کرنے کے لئے، اُسی گوتر سے شادی کرنے سے انہوں نے منع کیا، کہ سب گوتری ایک دوسری کی بیویوں اور بیٹیوں کو اپنی ماں اور بہنوں جیسا سمجھیں۔ یہی راستہ اختیار کرنے سے لوگوں میں غیرت کی خوبی انہوں نے پیدا کیا۔

چراگاہوں اور زمینوں کی حدود میں دوسری ایسی باتوں پر دیہاتیوں کا آپس میں تکرار نہ ہو او امن اور سکوں سے زندگی گزاریں، اس کے لئے کئی دیہاتوں کی انہوں نے پنچایتیں بنائیں۔

یوں سماجی ڈھانچہ ایسا بنایا کہ عوامی راج برپا ہوئے، اور بالآخر علحدہ علحدہ جگہوں کے لئے راجا مقرر ہوئے، جن پر انہوں نے لوگوں کی جان اور مال ملکیت کی سلامتی کا بوجھ ڈالا۔ راجاؤں کو کس طرح راج کرنا چاہیئے، اور رعایا کو اپنے راجا سے کس طرح چلنا چاہیئے، اس طرح کے قواعد بھی وضع کیئے، کہ ہر کوئی نیک دیس واسی بن کر گزارے، اور برے بدکاروں کو بھی جرئت نہ ہو، جو خود سے کمزوروں کو ڈرائیں دھمکائیں یا ان کا مال مویشی لوٹ لیں۔

لوگوں کو دھرم اور نیتی کی باتیں بھی انہوں نے سکھائیں: سب لوگوں کی زندگی سکھ سے گزرے، اور وقت پر برساتیں پڑیں، تا کہ وطن میں قحط نہ ہو، اس کے لئے بھی اندر دیوتا، ورن دیوتا، اور دیگر دیوتاؤں کی پوجائیں، یگیوں اور ہون ہوم اور دیگر رسومات کے رواج جاری کئے۔ یوں شروع سے لے کر تہذیب کی گاڑی راہِ راست پر چلا کر، ساری ہندو ذات کو بڑے اوج پر انہوں نے پہنچایا۔ اس وقت کے سب ہندو لوگ راء خواہ رنک یوں سمجھ رہے تھے کہ یہ رشی اور براہمن ہی ہیں، جو ویدوں کے منتر پوری توجہ سے پڑھتے ہیں، تو دیوتا خوش ہوتے ہیں، اور جس وجہ سے لوگوں کے دل کی مرادیں بر آتی ہیں، اور جنگوں میں فتح، اور دیگر سب کاموں میں کامیابی ہوتی ہے۔ اسی سبب سب لوگ رشیوں اور براہمنوں کو پوجنے لگے، اور انہیں اپنے خاندان کا پروہت کیا۔ خود راجا ان کے سامنے اپنا سر جھکاتے تھے، اور ان کے چرن دھوتے تھے۔ اشومیدھ یگیہ، راجسویہ یگیہ اور دیگر یگیہ ان سے کرواتے تھے، اور انہیں موتی، سونا، وستر، رتھ اور مال مویشی بڑے دل سے ان کو دان کرتے تھے، جس وجہ سے رشی بڑے صاحب ثروت ہوتے تھے۔ ان کا اثر رسوخ بھی اتنا ہوتا تھا کہ راجاؤں کو تخت پر بٹھانا اور تخت پر سے اتارنا ان کے بس کی بات تھی۔ راجا عام خلق کی رائے کے پابند ہوتے تھے، اور عام خلق مانتی تھی رشیوں اور براہمنوں کو، اس لئے حکومت کا سارا کاروبار رشیوں اور براہمنوں کے صلاح مشورے سے چلتا تھا۔ یوں وہ کئی صدیاں راجاؤں کے وزیر بن کر رہے تا کہ حکومت کا چرخہ اچھے طریق سے چلتا رہے۔ کبھی کبھار رشیوں کی آپس میں انبنت ہو جاتی تھی، جس طرح وسشٹ منی اور وشوامتر کی ہوئی تھی، لیکن عام طور پر وہ حسد وبغض سے آزاد ہوتے تھے۔ بعض تو اچھی خاصی زندگی چھوڑنے کو واجب سمجھ کر، دنیا کو ترک کر کے، جنگل میں جا کر گزارا کرتے تھے۔ انہوں نے تنہائی میں بیٹھ کر، جو فیلسوفی اور ایشوری گیان کی باتیں سوچیں، وہ آرنیکن اور اپنشدوں میں درج ہیں، جن کی تعریفیں یورپ، آمریکا اور دیگر دور دراز ملکوں کے باشندے آج تک کر رہے ہیں۔ یہ رشی فصاحت اور بلاغت کے صاحب تھے۔ بلاغت کا اہم اصول یہ ہے کہ بات کم کی جائے لیکن اس میں معنی بڑے ہوں۔ اس بات کا ثبوت سُوتروں سے ملتا ہے، جن میں الفاظ کم، لیکن بڑے مایہ دار ہیں۔ زیادہ بولنا ان

کا شیوہ نہیں تھا، اس لئے ان کے بلیغ نکتے بہت ہیں۔ اس سے متعلق ایک بات یہاں مثال کے طور پر درج کی جاتی ہے:

ایک دفعہ یاہوَ رشی کو راجا واشکلی نے منت کی کہ ''مہربانی کر کے مجھے بتائیں کہ آتما کیا ہے؟ رشی خاموش ہو گیا۔ اس پر راجا نے پھر اس سے درخواست کی کہ ''مہربانی کر کے مجھے سمجھائیں''۔ رشی نے اس سے کہا کہ ''بیٹا، میں تمہیں سمجھا رہا ہوں مگر تو سمجھ ہی نہیں رہا''۔ ''شانتویم آتما'' یعنی آتما سانت ہے (شانتی سروپ ہے)۔ دیکھا آپ نے، یہ تھی ان کی گفتگو! پیارے لعل لطیف نے بھی ایسا ہی فلسفیانہ نکتہ بیان کیا ہے کہ:

«جني ڄاتي سٽ، تني ڪڇيو ڪينڪي.»
(شاهه)
[جس نے گیان پایا، وہ خاموش رہا۔]

اُپنشدوں میں جو گیان ہے، وہ صرف اور صرف رشیوں کا نہیں ہے۔ قدیم رشیوں کے وقت میں جو راجا تھے، ان میں سے بھی کئی بڑے فیلسوف تھے۔ جن کے فلسفیانہ اُپنشدوں سے معلوم ہوتا ہے کہ: مثلاً، کیکیہ علاقے کا راجا آشوپتی جو ساوتری کا باپ تھا، وہ ایک بڑا فیلسوف تھا، جیسا کہ چاندوگیہ اُپنشد میں درج ہے۔ یوں تو فلسفے کی باتیں راجاؤں نے بھی کیں، پھر بھی اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ہندو تہذیب کے اہم بانیکار قدیم رشی تھے، جو بعد میں براہمنوں کے دفعے میں شمار ہونے لگے۔ موجودہ سارے براہمن ان کی نسلوں میں سے پیدا ہوئے ہیں۔ اپنے آباء و اجداد کی طرح وہ آج تک پوجا کرواتے ہیں، اور ان کے چیلے ان کے پاؤں دھوتے ہیں، اور انہیں تحائف دیتے ہیں۔ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ جو شردھا سابقہ ججمانوں میں تھی، وہ اب بہت کم ہے، اور وہ بھی عمر رسیدہ ہندو عورتوں میں ہے۔ رشیوں اور براہمنوں کا مرتبہ کس قدر تھا، اور وہ کتنی طاقت رکھتے تھے، اس طرح کی ساری باتیں پہلے ہی اوپر بیان ہو چکی ہیں۔

قدیم اور جدید تہذیب کا مقابلہ: رگ وید والے زمانے میں تہذیب، جس کا تذکرہ اوپر ہو چکا، وہ وادیٔ سندھ کی تہذیب ہے، اور وہ آج بھی وُہی ہے۔ پرش میدھ، اشو میدھ اور دیگر بعض جزوی باتوں کے علاوہ رسم و رواج وُہی، تو کھانے پینے، پہننے سہننے کے نمونے بھی وُہی، مطلب یہ کہ نار اور کنگریاں آج تک جاری و ساری ہیں۔

☆